بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد ۱	فہرست مضامین کہکشاں ماہ دسمبر ۱۹۱۸ء	نمبر ۴

تنبیہ:- جتنے مضامین کہکشاں کے اس نمبر میں درج کئے گئے ہیں۔ ان سب کے حقوق محفوظ ہیں:-

تقریب

تاریخ صقلیہ کا ورق۔ عیسائی مورخین کیسے ہی بے تعصب کیوں نہ ہوں پھر بھی اُن کی تحریروں میں جہاں اسلام کا ذکر آجائے وہاں اُن کی طینت چھپی نہیں رہتی۔ یہ مضمون چونکہ ایک عیسائی کی لکھی ہوئی تاریخ کا ترجمہ ہے لہذا اس میں بھی بعض ایسی باتیں پیدا ہوگئیں جو مورخ کے تعصب یا غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ مولوی خلیل الرحمن صاحب قابل الزام نہیں لیکن جہاں انہوں نے ترجمہ کی تکلیف گوارا فرمائی تھی۔ وہاں اگر ایسی باتوں پر حواشی بھی لکھ دیتے تو اُن ناگوار فقروں کے اثر کا سدباب ہوجاتا ÷

کلام درد۔ مکرمی مولوی عارف حسن صاحب عارف ہسوی کے تنقیدی مضمون کا دوسرا حصہ ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے کلام درد کی خصوصیات جس سلیقے اور جس خوش اسلوبی سے دکھائی ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ ایسے مضامین سے ابنائے وطن کا مذاق شعری بہت کچھ سُدھر سکتا ہے ÷

مولانا طباطبائی کی دو نظمیں۔ نواب حیدر یار جنگ مولانا علی حیدر صاحب نظم طباطبائی (حیدرآباد دکن) دور حاضر کے باکمال بزرگوں میں سے ہیں جن پر ادب جس حد تک ناز کرے بجا ہے۔ مولانا شاعر ہونے کے علاوہ عالم وفاضل پختہ مشق اور ہمہ دان ادیب بھی ہیں۔ ان کی دو نظموں پر پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی نے چند اعتراضات لکھ کر بھیجے ہیں چونکہ کہکشاں کے مقاصد میں تنقید و اصلاح بھی شامل ہے اس لئے ہم اسے شکریے کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ پنڈت کیفی صاحب ایک پختہ مشق ناظم اور واقف فن بزرگ ہیں۔ انہوں نے اس تحریر میں متانت و وقار کو قائم رکھا ہے۔ جو صاحب مولانا طباطبائی کی طرف سے اس تحریر کا جواب دیں ہم اُن سے بھی اسی احتیاط کے متوقع ہیں ÷

روح کی فریب کاریاں عالم محبت میں۔ جناب مولانا نیاز کا یہ دوسرا مضمون ہدیۂ ناظرین ہے۔ مولانا موصوف کی تحریر میں شکوہ الفاظ و شوکت تراکیب ایک ممتاز خصوصیت سمجھی جاتی ہے لیکن اس قصے میں انتہا درجے کی سلاست و سادگی نمایاں ہے۔ اگرچہ قصہ ملخص ہے لیکن مولانا موصوف نے اس کے لئے انداز بیان نہایت پیارا اختیار کیا ہے قصے کے متعلق ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اگر ہماری زبان میں ایسے قصص لکھنے والے پیدا ہوجائیں تو چند سال میں ادب اردو آسمان عروج پر پہنچ جائے ÷

بہار از یار و گل از یار الخ جناب قاضی عبدالغفار صاحب کے مختصر مضامین شاعری کی جان ہوتے ہیں۔ یہ مضمون سرتاپا جذبات عشق میں ڈوبا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہر فقرہ دل کی گہرائیوں سے نکل کر زبان قلم پر آیا ہے اور تیر کی طرح سُننے والے کے دل میں اُترا جاتا ہے ÷

آنکھوں کی زبان۔ دہلی کے ادیب معنی آفرین پر ہزار آفرین۔ کیا مضمون لکھا ہے۔ "چشم سخن گو" کی تفسیر اس مضمون سے بہتر کہیں نہ ملے گی۔ آنکھیں جذبات کا آئینہ ہیں۔ آنکھیں ایک نظر میں وہ کچھ کہہ جاتی ہیں جو زبان کی لمبی لمبی تقریروں اور قلم کے بڑے بڑے دفتروں میں ادا نہ ہوسکے۔ حضرت خواجہ صاحب نے انغلو انزا کے حسین بیمار کی بے بسی ایسے لفظوں میں لکھی کہ اُن سے بہتر نہیں لکھی جاسکتی۔ جہاں عاشق و معشوق کی گفتگو آنکھوں سے کرائی ہے وہاں دو تصویریں آمنے سامنے رکھ دی ہیں۔ ایک میں حجاب خوف رسوائی اور اندیشہ بدگمانی ہے۔ دوسری میں شرم شوخی اور آرزو سے گرفت ہے۔ کسی ایرانی شاعر نے اپنے ایک مطلع میں

تمکین وحیرت کی گفتگو کیا خوب دکھائی ہے۔ ؎

تو از تمکین من از حیرت نہ تحریرے نہ تقریرے
بداں ماند کہ ہم بزم است تصویرے بہ تصویرے

خندۂ کائنات۔ آج ہم ناظرین کہکشاں سے ایک نئے انشا پرداز کا تعارف کراتے ہیں۔ ہمارے مکرم دوست سید احمد شاہ صاحب بخاری پنجاب کے نہایت قابل اور مذاق سلیم رکھنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے ہیں۔ خندۂ کائنات اُن کا نقشِ اوّل ہے۔ لیکن اس نقش کی رنگ آمیزی آیندہ نقوش کے بہترین ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ جن اصحاب نے مشہور انگریزی شاعرہ ایلا وہیلر ولکاکس کی نظم (Dream Kisses) پڑھی ہے اُن کو معلوم ہو جائیگا کہ بخاری صاحب نے اس پاکیزہ ادبی ٹکڑے میں خیال اس نظم کے ایک بند سے لیا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ ولکاکس کے بند میں وہ دلفریبیاں نہیں ہیں جو ہمارے انشا پرداز نے خندۂ کائنات میں پیدا کر دی ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ بخاری صاحب ہمیشہ بزم کہکشاں کی رونق افزائی میں حصہ لینگے اور ہم پر عنایات کا سلسلہ جاری رہیگا۔

عیدِ باراں۔ محترمی جناب میر نیرنگ صاحب کی یہ دُوسری نظم ہے۔ میر صاحب اپنے گرامی نامے میں فرماتے ہیں کہ یہ نظم اُن دنوں میں لکھی گئی تھی جب بہت انتظار کے بعد بارانِ رحمت کا نزول ہوا تھا۔ اگرچہ اب اس نظم کو مرورِ ایام نے سرودِ بے ہنگام بنا دیا ہے لیکن کہکشاں کے مطالبے کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ہم میر صاحب موصوف کے نہایت [illegible] ہیں کہ اُنھوں نے ایسی گرجتی برستی نظم کہکشاں کو عنایت فرمائی۔

استغنائے نومیدی۔ جناب سید کلب [illegible] صاحب مانی جائسی جذبات نویس [illegible] ہیں اس سے ہمارے ناظرین خوب واقف ہیں۔ نثر کے علاوہ مانی صاحب کی نظم میں بھی جذبات کا جوش و خروش کافی حد تک موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دلاویز و دردانگیز نظم اس کا روشن ثبوت ہے۔

حیاتِ جاوید۔ پنجاب کے نوجوان شاعروں میں مولوی محمد اکبر صاحب منیر [illegible] شاعر ہیں۔ آپ کے خیالات بلند اور شاعرانہ ہیں۔ ان کی یہ نظم ندرتِ خیال و پاکیزگی [illegible] ابھی نومشقی کا عالم ہے۔ لیکن اگر فنِ سخن کی پابندیوں کو آپ نے ملحوظ رکھا اور پنجاب کے بعض مشہور شاعروں کی قیود کو اختیار کرنا عار نہ سمجھا تو یقیناً کسی دن پنجاب کے بہترین شاعر ہونگے۔ آپ نے اس نظم میں دلاوری، اختری کا قافیہ "شاعری" بھی باندھا ہے۔ فارسی شعرا کے نزدیک یہ درست ہو تو ہو۔ لیکن اُردو میں ایسے قوافی ناجائز ہیں۔

کلامِ تپش۔ شیخ عبد اللطیف صاحب تپش کی یہ دُوسری غزل ہے۔ ہم اُن کی نوازش کے ممنون ہیں۔ یہ غزل بھی پہلی غزل کی طرح زبان کی سلاستگی، بندش کی چُستی اور خیالات کی بلند پروازی کے اعتبار سے اعلےٰ درجے کی ہے۔ اس پامال زمین میں ایسے ایسے گُلہائے معانی [illegible] اعتبار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

شذرات

جس وقت ہم نے کہکشاں جاری کیا تھا۔ تو دُوسرے ادبی رسالوں کی حالتِ زار بہت حوصلہ شکن تھی۔ لیکن رسالہ نکلنے کی دیر تھی کہ حسنِ قبول نے نہایت تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ اور نامی گرامی کُبرائے قوم نے اس کی پسندیدگی کے اظہار میں خطوط لکھے۔ اس کے علاوہ خریداروں کی تعداد روز افزوں ہے اور ہم سمجھتے [illegible]

چند ماہ کے عرصے میں کسی ادبی رسالے نے خریداروں کی تعداد کے اعتبار سے اتنی نمایاں ترقی نہ کی ہوگی۔ جتنی کہکشاں نے کی ہے۔ اس میں ہماری کوئی قابلیت نہیں۔ صرف خدا کا فضل اور ابنائے ملک کی قدر دانی ہے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ملک کے بڑے بڑے شہروں میں وہ احباب جنہیں کہکشاں دو سے محبت ہے کہکشاں کی اشاعت کے لئے انجمنیں قائم کر رہے ہیں۔ اور اُن کی معرفت خریداری کی درخواستیں دھڑا دھڑ دفتر میں موصول ہو رہی ہیں۔ ان سب انجمنوں میں سے "انجمن اشاعتِ کہکشاں مدراس" نے بہت نمایاں کام کیا ہے۔ میں اس کے قابل اور سرگرم سیکرٹری مسٹر محمد یعقوب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

بعض معاصرین "کہکشاں" کے مضامین نثر و نظم بلا حوالہ نقل کر لیتے ہیں۔ اُن کا یہ طرزِ عمل اخلاق و انسانیت سے گرا ہوا ہے۔ ہم کسی اخبار یا رسالے کو کہکشاں کے مضامین اپنے پرچوں میں نقل کرنے سے منع نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جتنے زیادہ اصحاب کی نظروں سے گزریں اُتنا ہی اچھا ہے۔ لیکن براہِ کرم یہ ظلم تو نہ کیجئے کہ جن مضامین کے حقوق کہکشاں کے پاس محفوظ ہیں اُنہیں آپ بلا اجازت و بلا حوالہ نقل کر کے قانونی و اخلاقی لحاظ سے مجرم کہلائیں۔ ہم معاصرین کرام کی خدمت میں نہایت ادب سے التماس کرتے ہیں کہ آیندہ جو مضمون وہ کہکشاں سے نقل فرمائیں اُس پر براہِ نوازش "منقول از رسالہ کہکشاں لاہور" لکھ دیا کریں۔

مخدوم قوم جناب قاضی عبد الغفار صاحب سابق اڈیٹر جمہور (کلکتہ) قلمی سرپرستی کے علاوہ بھی کہکشاں کی ہر طرح امداد فرما رہے ہیں۔ ان کی امداد و اعانت ہمارے لئے بے انتہا فخر کا باعث ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل ان کا اخبار بعض وجوہ سے بند ہے ورنہ اُس حالت میں وہ بہت زیادہ مدد دے سکتے۔ یہ کہکشاں کی خوش قسمتی ہے کہ ایسے ایسے دردمند بزرگانِ قوم اس کی سرپرستی فرماتے ہیں۔ قاضی صاحب کی عنایات کے لئے ہمارے پاس شکریے کے کافی الفاظ نہیں ہیں۔

مولانا راشد الخیری کی "ماہِ عجم" کے لئے تقاضے پر تقاضے آ رہے ہیں۔ لیکن "ماہِ عجم" ہے کہ طلوع ہونے ہی میں نہیں آتی۔ ماجرا یہ ہے کہ جن کاتب صاحب کو ماہِ عجم لکھنے کے لئے دی گئی تھی وہ انفلوانزا میں مبتلا ہو گئے جب خود تندرست ہوئے تو اُن کے بھائی نے چند روز بیمار رہ کر سفرِ آخرت اختیار کیا۔ ان حالات میں بیچارے بہت پریشان رہے۔ اب وہ کتاب کو بہت جلد ختم کر دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ناظرین مطمئن رہیں۔ انشاء اللہ چند روز تک ماہِ عجم چھاپ کر اُن کے نام بھیج دی جائیگی۔

ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ کہکشاں میں ابھی علمی حصۂ نثر جیسا چاہئے ویسا نہیں ہوتا۔ کاش یہ احساس ملک کے قابل و فاضل انشا پردازوں کو بھی ہو اور وہ کہکشاں کی قلمی اعانت پر آمادہ ہو جائیں۔ ہمیں مولانا عبد الماجد۔ مولانا سید سلیمان۔ مولانا عمادی اور دیگر مشہور اہلِ قلم کی قلمی سرپرستی کے محتاج ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ حضرات ہماری التجا کو رد نہ فرمائیں گے۔

کہکشاں

جلد ۱	ماہِ دسمبر ۱۹۱۸ء	نمبر ۴

تاریخ صقلیہ (سسلی) کا ایک ناتمام ورق

جمال ذی الارض کانوا فی الحیاۃ وہم — بعد الممات جمال الکتب والسیر

(۴)

اس عقیل و فہیم شہزادے کی تدابیر سے سپاہ کی شوخی و نافرمانی مسدود ہو گئی اور فتوحات کا سلسلہ پھر تیزی کے ساتھ شروع ہو گیا۔ اُس نے جہازوں کا ایک چھوٹا سا بیڑہ تیار کیا جس میں نارالیونانیہ (جو تیزاب کا کام دیتی تھی) لگوائی۔ اور اس ترکیب سے وہ تمام ساحل پر قابض و متصرف ہو گیا۔ قرب و جوار کے جزائر جو اب تک صقلیہ کی سی حالت کو نہ پہنچے تھے جنگی میدان بنا دئے گئے۔ کوریلون، پلاٹانی، مارکی نیو اور بہت سے اور شہر لے لئے جو شہر کہ اب تک عیسائیوں کے قبضہ میں تھے اُن کی محافظ فوج ایسی ڈر گئی کہ سپاہی فصیل شہر سے باہر جاتے ہوئے کانپتے تھے۔ سنہ ۸۴۳ء کے آخر میں جزیرہ صقلیہ کے تہائی حصے پر عرب قابض ہو گئے۔ اور اس کی وہ حالت نہیں رہی کہ گویا یہ لوگ صرف قتل و غارت ہی کے لئے آئے تھے۔ بلکہ یہ معلوم ہونے لگا کہ اُن کا قبضہ و تصرف مستقل ہے۔

چند روز تک لڑائی ملتوی رکھنے کا معاہدہ ہو گیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ معاہدہ بیزنطینی سلطنت سے طے کر لیا گیا تھا۔ بہرحال اس سے طرفین کو گونہ اطمینان ہو گیا۔ خاص کر رعایا کو۔ کیونکہ وہ کم از کم عارضی طور سے آئے دن کی مصیبت سے بچ گئی۔ ادھر مصر، افریقہ اور اندلس سے جو تجارت بڑھی تو یہ معلوم ہوا کہ کم از کم تجارت کے نقطۂ نظر سے تو اس جزیرے کے دن پھرنے والے ہیں۔ ابھی تین برس ہی میں حکومت صقلیہ کی طاقت اور رعب بھی اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس کے طبعی اور قدرتی دشمن والیان آملوا یا میسینا نے بڑی خوشامد سے اُن کے حلیف بننے کی خواہش کی۔

شارلیمین کے مرنے سے کلیسیا کا بڑا مربی اُٹھ گیا تھا اس لئے پادریوں کو اپنے احکام کے نفاذ کے لئے اب کوئی سہارا باقی رہ گیا تھا تو صرف غضب الٰہی کی دھمکی اور اپنی رُوحانیت کا رُعب۔ اسی پر اُن کی ہستی قائم ہوئی تھی اور اسی پر اُن کے رُعب کا دار و مدار تھا۔ لیکن عوام الناس کا اُن کی گرفت میں ہونا کوئی اثر نہ رکھتا تھا کیونکہ اُمرا پر اُن کا کوئی اقتدار نہ تھا اور وہ اپنے احکام کی پابندی بزورِ شمشیر کرا نہ سکتے تھے۔ اس زمانے میں لومبارڈ کی اولاد سے شاہزادگان بے دین تمام اٹلی کے زیادہ تر جنوبی حصے پر حکومت کرتے تھے۔ نیپلس۔ گےایٹا۔ سارینٹو اور ایملفی کی چھوٹی چھوٹی جمہوری ریاستیں اُس زمانۂ نظام الاقطاع میں آزاد تھیں۔ یہی ریاستیں شہزادگان لومبارڈ کی بلند نظری کی مانع تھیں۔ اہالی نیپلس جانتے تھے کہ اگر وہ بغیر کسی حامی کی مدد کے تن تنہا لڑتے تو اُن کی خیر نہیں۔ مسیحی بادشاہوں سے اُن کو امداد ملنے کی اُمید نہ تھی۔ آخر ان مایوسان نیپلس نے مسلمانان صقلیہ سے مدد مانگی۔ امداد باہمی کا جو معاہدہ ان دونو کے درمیان ہوا تھا وہ پچاس برس تک قائم رہا۔ باوجودیکہ کلیسا نے اُس کی مخالفت کی اور صلیبی جنگ چھڑ جانے کی دھمکی دی گئی۔ بعض بعض جگہ چھوٹی چھوٹی گُلغپ بھی ہوئی۔ بلکہ دو چار موقعوں پر تو یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ ممکن تھا کہ یورپ کی سیاسی و ذہنی حالت مستمرہ میں انقلاب عظیم پیدا ہو جائے مگر جو حلف کہ ہو چکے تھے وہ جُوں کے تُوں قائم رہے۔

خاندان لومبارڈ کے بادشاہ سکارڈس نے نیپلس کا محاصرہ کیا تو امیر ابوالاغلب نے فوراً ایک بیڑہ اُن کی مدد کے لئے بھیج دیا جس نے شہر نیپلس کی گلوخلاصی کی۔ اور محاصرین کچھ اس طرح پھنسے کہ اُنہوں نے مجبور ہو کر جمہوریہ نیپلس سے صلح کی درخواست کی اور اُس کے تمام قیدیوں کو بغیر کسی فدیہ کے رہا کر دیا۔ ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ اہالی نیپلس کو ایک ایسی ہی اہم مہم میں اپنے نئے حلیف کی مدد کرنی پڑی۔ مسلمانوں کی فوج کا ایک دستہ بغیر کسی اطلاع سابقہ کے میسنیا پر جا پڑا۔ نیپلس والوں نے فوراً اُن کی مدد کی۔ فوج محصورین کی تمامتر توجہ تو متحدہ بیڑے کی طرف لگی ہوئی تھی کہ عقب سے ایک چیدہ فوج فصیل شہر پر چڑھ گئی اور تھوڑی ہی دیر میں تقریباً بلا کسی خونریزی کے صقلیہ کے مسلمانوں کو ایک اور بہت بڑا شہر مل گیا۔ اس نئی فتح سے مسلمانوں کا دل بڑھا تو انہوں نے اپنا علم اور آگے بڑھایا اور اپنی مقبوضات کو وسیع کرنے کی طرف سختی کے ساتھ مائل ہو گئے۔ اہالی عرب کی تاریخوں نے ہمارے لئے اُن بہت سے آباد و شاد شہروں کے نام قائم رکھے ہیں (مثلاً ایلی مے؟ لین ٹی نی۔ بوٹیرا وغیرہ) جنہوں نے باد [illegible] بیزنطینی غفلت کے اپنی ہستی اور شہرت [illegible] سب شہروں نے مسلمان فاتحین کے ہاتھ میں پڑ کر اُن کے رُعب و شہرت کو اور بھی بڑھا دیا۔ افسوس ہے کہ ان شہروں کی تاریخ بلکہ جائے وقوع تک کا اب پتہ نہیں رہا۔

ابھی یہیں تک نوبت پہنچی تھی کہ جنگ آزمودہ امیر ابوالاغلب پکی عمر میں جان بحق ہو گئے اور اپنے پیچھے وہ شہرت و ناموری چھوڑ گئے جو تا قیام قیامت باقی رہیگی۔ اہالی پلرمو اپنی کامیابیوں سے پھولے ہوئے تھے۔ اُن کے دماغوں میں آزادی اور غداری کی ہوا بھری ہوئی تھی۔ اُنہوں نے بلا اطلاع دربار قیروان متفقاً گو نہ شان و شوکت سے عباس ابن فضل کو جزیرہ کا والی مقرر کر لیا۔ یہ شخص اپنے ارادوں کا پکا اور طبیعت کا جابر تھا۔ اس کے زمانۂ حکومت میں جنگ پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ جاری رہی۔ محنتی کاشتکاروں کی کھیت باڑی خواہ کہیں ہو عربی لٹیروں کے دست بُرد سے محفوظ نہ تھی۔ جو عیسائی کہ دولتمند تھے اُن کی جائدادوں کو ایک مقررہ لگان کی ادائگی کی شرط پر

بحال رکھا گیا تھا۔ یہ لگان بہ نسبت اُس کے جو شرع شریف
نے مقرر کیا ہے کہیں زیادہ تھا۔ مگر اس پر بھی وہ حکام کی
زیادتی سے محفوظ نہ تھے۔ جو حاکم جتنا زیادہ طامع ہوتا تھا
اُتنا ہی زیادہ وصول کر لیتا تھا۔ چونکہ جنگ کا سلسلہ کبھی
نہ ٹوٹتا تھا اس لئے لازمی طور پر کاشتکاری کے واسطے
ملازموں کی زیادہ ضرورت تھی۔ غلام صرف قیدیان جنگ
ہی ہوتے تھے بلکہ اُس خراج کا بھی ایک جزو یہی غلام
ہوتے تھے جو بُزدل بیزنطینی ادا کرتے تھے۔ ایک عارضی
امن کے لئے یہ کمبخت خود اپنے ملازموں بلکہ اپنے عزیزوں
کو غلام بنا کر خراج میں دے دیتے تھے۔ مسلمان اچھی طرح
جانتے تھے کہ کفار بالکل بے دست و پا ہیں۔ جو لوگ کہ اُن
کی رعایا نہ تھے اُن کو بھی وہ اپنا مفتوح ہی سمجھتے تھے
اکثر ایسا ہوتا کہ فاتحین کے سامنے طلا و نقرہ نیز دیگر قیمتی
اشیا پیش کی جاتی تھیں۔ مگر وہ اُن کو مسترد کر کے آدمی
مانگتے تھے اور دینے پڑتے تھے۔ چونکہ اُن لوگوں کو چاولوں
کے کھیتوں۔ نمدار جنگلوں۔ دلدلوں اور مضر آب و ہوا میں کام
کرنا پڑتا تھا اس لئے وہ بہت جلد موت کا شکار ہو جاتے
تھے۔ چاولوں کی کاشت سے فاتحین کو بہت نفع ہوتا تھا
اس لئے اُن کو یہ کاشت بہ نسبت اُن غلاموں کی جانوں
کے زیادہ عزیز تھی۔

اس موقع پر ایک واقعہ پیش آیا جو بظاہر تو نہایت
خفیف تھا مگر اس سے اتنا اہم نتیجہ نکلا کہ جس نے مسلمانوں
کے رُعب و اقتدار کو بہت بڑھا دیا۔ ایک معزز بڑے
پایہ کے بیزنطینی کو مسلمانوں کی ایک طلایہ فوج نے کسٹرو
گیاوَنی کے قریب گرفتار کر لیا۔ جب یہ شخص پلرمو پہنچا تو معلوم
ہوا کہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اُس سے مشقت لی جائے
نہ وہ مطلوبہ زرِ فدیہ ادا کر سکتا تھا۔ چونکہ موجودہ والی عباس
ابن فضل کی پالیسی کسی بیکار قیدی کو زندہ رکھنا نہ جانتی
تھی اس لئے اس بے رحم نے اس کو بھی قتل کرنے کا حکم
دے دیا۔ اس قیدی کو جلاد قتل کرنے کے واسطے لئے ہی جا
رہا تھا کہ اُس نے نہایت عاجزی کے ساتھ امیر سے رحم
کی درخواست کی اور یہ وعدہ کیا کہ اگر میری جان بخشی کر دی
جائے تو میں کسٹرو گیاوَنی پر قبضہ کرا دوں گا۔ عباس نے
اُس کی درخواست کو سُنا جو عین اُس کی منشا کے موافق
تھی اور اُس کی شہرت و رفعت کا باعث بھی ہونے والی
تھی۔ ایک ہزار چیدہ سوار اور سات سَو بہادر پیادے
نہایت احتیاط سے خفیہ طور پر جمع کئے گئے۔ نمک حرام بیزنطینی
کو بدرقہ بنایا گیا اور خود امیر نے فوج کی سرکردگی و سپہ سالاری
اپنے ہاتھ میں لی اور راتوں رات پلرمو سے چل پڑے۔ اس
مہم کے لئے ایسا راستہ اختیار کیا گیا جس طرف سے لوگوں
کی آمد و رفت کم ہوتی تھی۔ کبھی پہاڑوں پر چڑھے۔ کہیں
جنگلوں میں اُترتے اور شہر کسٹرو گیاوَنی کے محاذ میں جا پہنچے
تمام رسالہ اور پیدل فوج کا ایک حصہ شہر کے جنوب کی
طرف ایسے موقع پر کمینگاہوں میں چھپا دئے گئے کہ جدھر
سے نکلنا اور حملہ کرنا آسان ہو۔ سامنے ہی باغات تھے اور
اُمرا کے مکانات جن کی وجہ سے اتنی بڑی فوج چھپی رہ
گئی۔ چیدہ سپاہیوں کا ایک دستہ غدار بیزنطینی کے ساتھ
سخت تکلیف اور مصیبت سے ایک پہاڑی پر چڑھا جو شہر
کے شمال کی جانب تھی اور فصیل کے نیچے پہنچ کر بے صبری سے
صبح کا انتظار کرنے لگی۔ صبح کاذب کے وقت چوکیدار رات
بھر جاگتے جاگتے سو گئے تھے۔ اُنہوں نے اس مقولہ کو
بالکل بھلا دیا کہ "سپاہی کا سب سے پہلا فرض رات بھر جاگنا
اور صبح کو غافل نہ ہونا ہے"۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قلعہ خود اتنا
مضبوط ہے کہ وہ اپنی حفاظت آپ کرے گا۔ جیسے ہی مسلمانوں
نے دیکھا کہ تمام چوکیدار غافل ہو گئے ہیں وہ ایک قطار بن کر
اُس چور راستے سے جو دیوار شہر کے نیچے سے گزرتا تھا فصیل
پر پہنچ گئے۔ چند راہ رَو جو جٹ اُن کو قتل کر دیا اور فوراً شہر
کے دروازے کھول دئے۔ تکبیروں کی آواز اور تلواروں

کلامِ درد

(گزشتہ سے پیوستہ)

لیکن اس معیار پر میر کے بعد کسی کو اگر امتیاز حاصل ہے تو وہ خواجہ میر درد ہیں۔ چنانچہ یہ مطلع بجا طور پر اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ آپ اس کو پڑھئے اور غور سے پڑھئے کہ اس مطلع کا ایک ایک لفظ سوز و گداز کی ایک ایک دُنیا اپنے اندر مخفی رکھتا ہے۔ خصوصاً دوسرا مصرع تو موثرات درد کا ایک طلسم یاس ہے اور دوسرے مصرع میں بھی اس کا پہلا ٹکڑا "بس ہجوم یاس" میں خدا معلوم کتنی دُکھ کی کہانیاں اور کتنے درد و الم کے فسانے اور کس قدر ناکامیوں اور نامرادیوں کی داستانیں ملفوف ہیں جس کے پڑھنے کے بعد بے اختیار دل میں ایک طوفان کرب و بے چینی پیدا ہو جاتا ہے اور آنکھوں کی راہ رسنے اور بہنے لگتا ہے۔

انداز بیان ہی تو ہے کہ اس نے چند الفاظ کے مجموعے میں خدا معلوم کیا کچھ بھر دیا ہے۔ ان نا کام دلوں کے لئے یہ شعر حرمان نصیبی و نا اُمیدی کا ایک آئینہ بن کر رہ گیا ہے ورنہ ایک ایک مصرع میں حسرت و ناکامی کے اظہار سے بہت زیادہ الفاظ لوگوں نے جمع کر دئے ہیں لیکن یہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکی بلکہ مذاق سلیم کے نزدیک جس شعر میں ناکامی و نامرادی کا مفہوم ادا کرنے والے الفاظ جمع ہو جاتے ہیں اس سے سوز و گداز کی کیفیت کم ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے بہترین طریقہ یہ سمجھا گیا ہے کہ حسرت و یاس ناکامی و نامرادی اور حرمان نصیبی وغیرہ کے الفاظ نہ لائے جائیں بلکہ صرف اسلوب بیان اور انداز ادا اس قسم کا اختیار کیا جائے جس سے جذبات غم اثر پذیر ہوتے ہوں۔ مثلاً میر تقی میر کا مشہور شعر ہے ؎

میرے تغیر حال پر مت جا ✤ اتفاقات ہیں زمانے کے

اس شعر میں مذکورہ بالا قسم کے الفاظ مطلق نہیں آئے لیکن باوجود اس کے انداز بیان ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ شعر پڑھتے ہی مذاق سلیم پر ایک وجدانی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ شعر میر کے بہتر نشتروں میں سے ایک ہے۔ درد نے بھی اس رنگ میں انہیں جذبات کو اسی انداز سے نظم کیا ہے اور گو میر کی سی کیفیت پیدا نہیں کر سکے مگر میر کے بہت ہی قریب پہنچ گئے ہیں اور یہ کہنا بالکل صحیح اور درست ہوگا کہ میر کے بعد درد ہی کا کام تھا کہ اس رنگ میں اس حد تک کامیاب ہو گئے۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں ؎

میرے احوال پر نہ ہنس اتنا
یوں بھی اے مہربان پڑتی ہے

اس شعر میں بھی دوسرا مصرع قیامت کا ہے اور اس میں بھی انداز بیان ہی ایک چیز ہے جس نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔

بہرحال درد کا سابق مطلع تاثیر و اثر اور جذبات غم کے لحاظ سے لاجواب ہے اور باوجود اس امر کے کہ اس میں بھی الفاظ حسرت و یاس کے موجود نہیں ہیں لیکن پھر بھی اسلوب بیان کچھ اس قیامت کا اختیار کیا گیا ہے کہ شعر پڑھتے ہی بے اختیار آہ نکل جاتی ہے۔

ہاں تو ذکر یہ تھا کہ دیوان درد میں متعدد ایسی غزلیں موجود ہیں جن میں بھرتی کے شعر کم اور قابل انتخاب اشعار کی تعداد زیادہ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس غزل میں بھی جس قدر شعر ہیں سب مختلف خوبیوں کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہیں۔ ملاحظہ ہو: ؎

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جُز جفا
پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا
کُھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصوّر آ گیا
مَیں تو کچھ ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا
پی گئی کتنوں کا لوہو تیری یاد
غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا

غور فرمائیے کہ یہ غزل کس قدر مرتبع ہے اور اُس کے تمام اشعار کیسے پاکیزہ جذبات سے معمور ہیں اور کس درجہ دلفریب و دلپذیر انداز میں وہ جذبات بیان کئے گئے ہیں جو صرف ایک حقیقت آگاہ قلب ہی میں پیدا ہو سکتے ہیں ۔

دُوسری غزل ملاحظہ ہو:-

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دُنیا کو دیکھا نہ دیکھا

کس قدر بلند مطلع ہے اور کیسا عالی جذبہ اور پُر رفعت خیال ہے۔ یہی متصوفانہ پاکیزہ خیالی ہے جو کلام درد کے ساتھ مخصوص ہے۔ ؎

یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں
کوئی دُوسرا اور ایسا نہ دیکھا

یہ شعر بھی اور اس میں جو خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ کلام درد کی اولیات میں شمار کرنا چاہئے کیونکہ اس قسم کے مضامین درد سے پہلے کسی نے نظم نہیں کئے۔

اذیت مصیبت ملامت بلائیں
اس اک عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

اس شعر کے دُوسرے مصرعہ میں "اس اک" کے بجائے اکثر نسخوں میں "ترے" کا لفظ پایا جاتا ہے مگر میرا ذوق پہلی صورت میں شعر کو زیادہ دلاویز و کیف انگیز پاتا ہے۔ اگرچہ پہلی صورت میں دُوسرے مصرعہ کے پہلے جُزو کا ایک حرف گرتا ہے مگر (اس) کے بعد الف کے آجانے سے یہ عیب جاتا رہتا ہے جیسا کہ اکثر اساتذہ کے کلام میں پایا جاتا ہے ۔ (ترے) کے لفظ سے مخاطب کے ساتھ عشق کی تخصیص و تعیین ہو جاتی ہے جس کو مذاق سلیم نسبتاً پہلی [illegible] صورت کے کمتر الم خوشگواری کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ ؎

حجاب رُخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب، کوئی پردہ نہ دیکھا
شب و روز اے درد درپے ہوں اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

تیسری غزل ملاحظہ کیجئے:-

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ایک ہیں دلریش ہوں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سُنا ہے بھر چلے
شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

مطلع کے بعد یہ تینوں شعر تاثرات الم کی کیسی درد انگیز مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ زبان کا ترنم اور اُس کی شیرینی اور ردیف و قافیہ کی برجستہ نشست ان تمام باتوں نے کلام میں کیسی خوشگوار روانی و موسیقی پیدا کر دی ہے۔ خصوصاً ردیف و قافیہ اس قدر باہم گھل مل کر شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ کوئی علیحدہ اور جُداگانہ چیز معلوم ہی نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ اس امر پر بھی غور کیجئے کہ درد کی شاعری آج کی نہیں بلکہ آج سے ایک سو چالیس [۱۴۰] سال قبل کی ہے۔ اُس وقت کی اور آج کل کی زبان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمۃ القرآن اور مولانا اسمٰعیل شہید وغیرہ کی تصنیفات کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ سیکڑوں ہزاروں

محاورات تو ایسے آپ کو ملیں گے جن کا سمجھنا بھی اب دشوار ہو گا لیکن درد نے زبان کی صفائی و سلاست کا یہاں تک اہتمام فرمایا ہے کہ آج بھی اُس کا کلام ویسا ہی پُرلطف ہے جیسا کہ آج سے چالیس سال قبل تھا۔ اور اگر چند الفاظ و محاورات نکال ڈالے جائیں تو مشکل سے اندازہ ہو سکے کہ یہ کلام زمانہ حال کے شاعر کا ہے کہ کسی قدیم شاعر کا۔

یہ پوری غزل نہایت پاکیزہ ہے اور اس کے تمام اشعار روانی زبان اور موثر طریق بیان کے لحاظ سے تغزل کی بہترین مثال ہیں۔

ہر چند تیری سمت سوا راہ ہی نہیں
تس پر بھی آہ یاں کوئی آگاہ ہی نہیں
ہم بھی فلک سے کرتے کسی چیز کی طلب
ڈھونڈھا بر اپنے جی میں تو کچھ چاہ ہی نہیں

مطلع کی متصوفانہ رفعت و بلندی محتاج تشریح نہیں دوسرا شعر بھی بے مثل ہے اور ایک ایسا جذبہ بیان کیا گیا ہے جس کے علو و رفعت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس خیال کو دوسری جگہ یوں ادا فرماتے ہیں :-

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کریں

یہ مطلع بھی نہایت مشہور و مقبول ہے۔ اور اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔

کلام درد کی ایک خصوصیت اَور بھی ہے یعنی اُن کے یہاں مطلع عموماً نہایت بلند اور پاکیزہ ہوتا ہے جس طرح میر کے ہاں اُن کا مقطع لاجواب ہُوا کرتا ہے چنانچہ متعدد مطلع اب تک آپ سُن چکے ہیں۔ ان میں سے کسی کی نسبت آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں مطلع پھیکا یا پھسپھسا ہے۔ بندش چست نہیں اور الفاظ کی نشست غیر متناسب و بے محل ہے۔ اس قسم کے تمام عیوب سے درد کا کلام عموماً اور اُن کے مطلع خصوصاً پاک ہوتے ہیں۔ ذیل کا مطلع ملاحظہ فرمائیے :-

مجھے در سے اپنے تُو ٹالے ہے یہ بتا مجھے تُو کہاں نہیں
کوئی اَور بھی ہے تیرے سوا تو اگر نہیں تو کہاں نہیں

اس مطلع کو ذرا غور سے پڑھئے کہ مذاق سلیم اور وجدان صحیح کی کیف پروری کے لئے اس میں ایک دنیائے معرفت پوشیدہ ہے کس قدر بلند خیال اور عالی جذبہ ہے سبحان اللہ

دوم شیفتہ کا ایک بہت مشہور شعر ہے :-

شاید اس کا نام محبت ہے شیفتہ
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہُوئی

شیفتہ کا یہ شعر مذاق سلیم کے بہترین انتخاب میں آسکتا ہے اور حق یہ ہے کہ نہایت پاکیزہ اور بے مثل شعر ہے۔ لیکن شیفتہ سے پہلے خواجہ میر درد اس خیال کو ادا کر گئے ہیں۔ فرماتے ہیں

کیا جانیے کیا دل پر مصیبت یہ پڑی ہے
اِک آگ سی کچھ ہے کہ وہ سینے میں گڑی ہے

شیفتہ کے شعر (شاید) کا لفظ نہایت بامعنی اور برمحل ہے اور اس نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مصرعہ میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے محبت کے ساتھ اس کی تخصیص کر دی گئی ہے گو (شاید) کے لفظ نے اس تخصیص کو یقین کے درجہ تک نہیں پہنچنے دیا ہے۔ اور یہی لُطف کی بات ہے لیکن درد کے یہاں دونو پہلو موجود ہیں (کیا جانیے) "شاید" کے مفہوم کو ادا کر رہا ہے اور اس کے بعد کا ٹکڑا (کیا دل پہ مصیبت یہ پڑی ہے) اس خاص مفہوم قلبی کی ترجمانی کر رہا ہے جس کو شیفتہ نے محبت سے تعبیر کیا ہے بہرحال اگر شیفتہ اور درد کی زبان کے فرق کو الگ کر دیا جائے جو سَو برس کے فصل کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے تو درد کا شعر شیفتہ سے کہیں بہتر نکلے گا۔

اس غزل کا مقطع بھی درد کا لاجواب ہے :-

اس طرح سے اک لخت جو آنسو نہیں تھمتے
معلوم ہُوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

ہم مُردہ دل اے جانِ جہاں جیتے ہیں
تجھ بن اسے واے جو سمجھے تو کہاں جیتے ہیں
زندگی جس سے عبارت ہے سو وہ زیست کہاں
یُوں تو کہنے کے تئیں کہئے کہ ہاں جیتے ہیں

کس قدر پُرسوز و پُرحسرت اور موثر اندازِ بیان ان شعروں میں اختیار کیا گیا ہے مطلع کے دُوسرے مصرعہ میں "جو سمجھے" کے لفظ نے جو کام دیا ہے وہ ایک دفتر سے بھی بمشکل پورا ہو سکتا تھا۔ اسی کو قوتِ بیان و قدرتِ کلام کہتے ہیں کہ معمولی الفاظ کے ذریعہ نہایت وسیع جذبات ادا کر دئے جائیں۔ درد کے ہاں اس کی بکثرت مثالیں آپ کو ملیں گی کہ وہ ان جذبات کو جو ہر قلب میں پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ہر شخص اُن کو ادا نہیں کر سکتا۔ درد نہایت خوبی کے ساتھ اور مکمل طریق سے بہت سادہ اور سلیس زبان و الفاظ میں اس طرح ادا کر جاتے ہیں کہ فوراً سامع کے دل پر ان کا اثر پڑتا ہے اور چونکہ جذبات کی صحیح اور سچی تصویر اتارتے ہیں اس لئے سامع کے لئے ان میں بے حد کیف و سرور پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو:-

ان دنوں کچھ عجب ہے دل کا حال
دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے

سبحان اللہ کس قدر کیف پرور شعر ہے۔ جذبِ عشق کی کیسی پاکیزہ تصویر کھینچی ہے کہ بے اختیار دلِ درد آشنا میں کیف و سرور کی لطیف موجیں اُٹھنے لگتی ہیں اور وجدانِ صحیح سر دُھننے لگتا ہے ❊

اس خیال کو میر تقی میر نے بھی نظم کیا ہے۔ اور خوب ادا کیا ہے:-

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا مُنہ
کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانا تھا

دونو نادر الکلام اساتذہ کے ان دونو شعروں میں کسی ایک کو ترجیح دینا ذرا مشکل ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ ایک طرح کی سُوءِ ادبی ہوتی ہے اس لئے اس کا فیصلہ ہم خود اربابِ مذاقِ سلیم پر چھوڑتے ہیں ❊

خواجہ میر درد کی اس غزل کا اَور شعر سُن لیجئے۔ فرماتے ہیں:-

دل بھی تیرا ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

اس دل کی رنگینی و رعنائی کا کیا پُوچھنا جو کسی کی ادا ہائے رنگین و ناز آفرین سے فیضیاب ہو یہ فخر درد ہی کے دل کے لئے مخصوص تھا۔ درد کا یہ خیال بالکل نیا ہے اور نہایت نازک و لطیف خیال ہے کہ دل کی مضطربانہ حالت کو محبوب کی تلون مزاجی سے تشبیہ دی گئی ہے ❊

ایک سی حالت خواہ عیش و سرور ہی کی کیوں نہ ہو لیکن کسی کیفیت کا دوام ہمیشہ اُس کے لُطف کو برباد کر دیا کرتا ہے اور بے اختیار دل میں اُس کے برخلاف جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً شب و روز کی صحبتِ احباب لطف و سرور عیش و نشاط کی کیفیت اگر دائمی ہو جائے تو یقیناً کبھی نہ کبھی وقتِ تنہائی کی خواہش دل میں پیدا ہوگی یا اگر کوئی شخص خلوت پسند ہے اور وہ اکثر تنہائی میں رہتا ہے اب اگر خلوت کے سوا کبھی جلوت نصیب ہی نہ ہو تو لازمی طور سے ایک عرصے کے بعد یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ کوئی صحبت ملے اور اس میں مل کر جی بہلائے۔ غرضیکہ یہ ایک جذبہ ہے جو ہر دل میں مختلف صورتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ خواجہ میر درد نے بھی نازک مزاج دلِ دیوانہ کی اس حالت پر روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

مدت تلک جہاں میں ہنستے پھرا کئے
جی میں ہے خوب رویئے اب بیٹھ کر کہیں

اس شعر میں کوئی خاص رنگینی نہیں ہے لیکن ایک صحیح جذبہ ہے جو کبھی نہ کبھی ہر درد آشنا دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی کو نہایت سادگی اور صفائی کے ساتھ درد نے نظم کر دیا ہے:-

دل تو سمجھائے سمجھتا ہی نہیں
کہئے سودا ہے تو سودا بھی نہیں
اس کی باتیں مجھ سے کیا پوچھو ہو تم
مدتیں گزریں کہ دیکھا بھی نہیں

خیال آفرینی اور دل کی بجائے دماغی پیدا وار سے گلزارِ سخن کی چمن بندی بھی ایک مشکل کام ہے اور جس قدر اس میں عمق پیدا ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس صنف سخن کا مرتبہ بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً غالب کا بیشتر کلام اس معدن کے جواہر پارے ہیں لیکن اس کے علی الرغم اقلیم قلب کی واردات عالیہ کا قید نظم میں لے آنا شاید پہلی صورت سے بھی زائد دشوار و مشکل ہے اس لئے کہ امورِ ذوقی و حالی کے اظہار کے لئے بہت کم الفاظ وضع ہوئے ہوئے ہیں پھر اُن کو اس طرح ادا کر دینا کہ سامع اپنے قلب میں وُہی لذت محسوس کرنے لگے بہت ہی مشکل کام ہے ؎

درد اور اُن کے ہمپایہ تمام معاصرین کا امتیاز شعری کہ وہ جذبات عالیہ قلبی اور حسیات دلی کو بہت خوبی کے ساتھ نظم کر دیتے ہیں۔ اس دَور کے شعرا میں نازک خیالی او معنی آفرینی کی تلاش بالکل بے سُود ہوگی۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حقیقی تغزل وُہی ہے کہ سادہ سلیس اور مترنم زبان میں جذبات صحیحہ عاشقانہ ادا کئے جائیں اس معیار پر اگر آپ کلام درد کو جانچیں گے تو اُس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ آپ کو ہو سکے گا ؎

مذکورہ بالا شعروں کو اس معیار سے دیکھئے کہ سہل ممتنع کی بہترین مثال میں اسی قسم کا ایک اور شعر سُنئے فرماتے ہیں:-

اگر بے حجابانہ وہ بُت ملے
غرض پھر تو اللہ ہی اللہ ہے

یہ شعر اپنی لطیف کیفیات اور پاکیزہ تاثرات کے لحاظ سے وجدان صحیح کی زندہ تصویر ہے جس بیان کی کیف انگیز دلپذیری و دل آویزی دیکھئے کہ چند صاف و سلیس الفاظ کے اندر نزاکت معنوی کے بہشت زار بند کر دئے ہیں اور صرف دو مصرعوں میں جذبات صحیحہ عالیہ کی ایک وسیع ترین دُنیائے کیف و سرور پنہاں کر دی ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر درد ساری عمر میں صرف یہی ایک شعر کہتے تو اُن کے مسلم الثبوت شاعر ہونے میں کوئی کلام نہ ہوتا۔ یہ شعر نہیں ہے بلکہ ایک ایسا طلسم کیف ہے جس میں وجدانی حسیات و حقیقی جذبات کے سیکڑوں چمن زار نشاط کھلے ہُوئے ہیں۔ اس قسم کے شعر کو سہل ممتنع سے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں تخیل و محالات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اور ملاحظہ ہو:-

پُوچھے کوئی جس کی بات مجھ سے
کرنا ہے مجھے تیرا ہی مذکور

یہ شعر بھی مذکورہ بالا قسم کے لاجواب شعروں میں سے ہے۔ اس محویت و استغراق کی کوئی انتہا ہے اور کیسی پُرکیف زندگی ہوگی اُس کی جس کا یہ عالم ہو:-

ہمنشیں پُوچھ نہ اُس شوخ کی خوبی مجھ سے
کیا کہوں تجھ سے غرض جی کو مرے بھاتا ہے

محبت کا کس قدر صحیح فلسفہ بتایا گیا ہے اور کیسے صاف و سلیس الفاظ میں کہ خواہ مخواہ دلنشیں ہو جاتے ہیں:
ذیل کے شعر میں رموز محبت پر کس خوبی سے روشنی ڈالتے ہیں:-

ہر چند نہیں صبر تجھے درد و لیکن
اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

ذیل کا شعر درد کے مشہور شعروں میں سے ہے:-

اپنے بندہ پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
یہ نہ آجائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو

حقیقی محبت کا اقتضا یہی ہے کہ لاکھ جفائیں ہوں مگر

کبھی ایک لمحہ کے لئے قطعِ اُلفت گوارا نہیں۔

عبث دل بے کسی اپنی تو ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اسے دوانے عشق تو ایسا ہی ہوتا ہے

مصرعہ ثانی میں کیسے دلنشین و دل آویز انداز کے ساتھ دل دیوانہ کی تسکین و تسلی کے سامان فراہم کئے گئے ہیں۔ سبحان اللہ

عاشقانہ جذبات اور متصوفانہ کنایات کے متعلق ہم بکثرت اشعار نقل کر چکے ہیں۔ صرف اخلاقی مضامین پر مشتمل اشعار کا ذکر نہیں ہوا۔ اور چونکہ مضمون بہت طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

آخر میں اس ایک بات کو ذہن نشین کر لیجئے کہ کمال شعری صرف اس امر پر موقوف ہے کہ خواہ کچھ بیان کیجئے مگر اُس کی تصویر کھنچ جانی چاہئے۔ اگر ایک شاعر رندانہ اور ہوس کارانہ جذبات و خیالات کو نظم کرتا ہے تو کچھ حرج نہیں لیکن دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ جو کچھ اُس نے بیان کیا ہے وہ مطابق حال اور موافق واقعہ کے بھی ہے یا نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جو شاعری جذبات عالیہ پر مشتمل ہوگی وہ رندانہ شاعری سے بہت افضل ہوگی۔ لیکن اگر جذبات صحیحہ کو ایک شاعر اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا تو اس سے اس شاعر کا مرتبہ یقیناً بلند ہوگا جو ہوس کارانہ شعر کہتا ہو مگر مطابق حال و واقعہ کے لکھتا ہو۔ اس لئے کہ شعر کی خوبی صرف یہی ہے کہ وہ مطابق واقعہ ہو اور اس میں تحریر کی تبعیت کی گئی ہو۔ اسی نظر سے آپ حضرت خواجہ میر درد کا کلام دیکھئے میرے نزدیک اس میں دونو خوبیاں موجود ہیں یعنی عالی و پاکیزہ جذبات مطابق واقعہ اور موافق حال کے کلام درد میں پائے جاتے ہیں۔

عارف ہسوی

کشکول

عورت کی پسلیوں کے نیچے گرم روح پیدا کر سکتے ہو! ہمارا یہ تہذیب و شائستگی کی انتہا و وحشیانہ زندگی کی ابتدا ہے۔

تجربہ ایک نشتر ہے، جو تکلیف تو دیتا ہے۔ مگر پھانس کو نکال دیتا ہے۔

چہرے پر شکن ہو سکتی ہے مگر دل کی سطح پر شکن نہیں ہوتی!

کاہل آدمی وہ پانی ہے جو کسی گڑھے میں جمع ہو گیا ہو کر ہر روز خود بخود اس کی گندگی بڑھتی رہتی ہے۔

رنج ایک ایک لمحہ کو شمار کرتا ہے، خوشی ساعت، گھنٹے، دن مہینے اور سال سب بھول جاتے ہیں۔

لاکھوں وہ ہیں کہ اگر اُن کو اپنی تعریف اور دوسروں کی مذمت کرنے سے روک دیا جائے تو وہ گونگے ہو جائیں۔

عورت پیدا کی گئی ہے کہ وہ انسان کی وحشت اور بہیمیت کو دور کرے۔

مظلوم ظالم سے زیادہ طاقتور ہے۔

دُنیا اکثر کسی شخص کی اخلاقی خوبیوں کو اس وقت دیکھتی ہے جبکہ اُس کی (دُنیا کی) ناانصافیاں اس شخص کا خاتمہ کر چکی ہوتی ہیں۔

سنگینوں اور برچھیوں کی طاقت سے ہزار گنی زیادہ طاقت ایک اور ہے ــــ وہ تخیل کی طاقت ہے۔

دُنیا والوں کی کوئی غلطی ایسی نہیں جس کا ارتکاب ہم خود نہ کر سکتے ہوں۔

مقصد کے جس قدر قریب پہنچو گے دشواریاں اُسی قدر زیادہ ہو جائیں گی۔

معاشرت کی کمزوریاں سیاست کے لئے مہلک ہیں۔

خاموش

مولانا طباطبائی کی دو نظمیں

جناب مولانا علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی جو بلند پایہ آج انشا و ادب اردو میں رکھتے ہیں اُسے کون نہیں جانتا؟ آپ کا رُتبہ لکھنؤ میں وہی بتایا جاتا ہے جو دہلی میں پچھلے زمانے میں مفتی صدرالدین مرحوم اور قدیم زمانے میں خان آرزو کا تھا۔ آپ کے نکتہ رس اور ادیب ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ کچھ عرصہ ہُوا ادب الشاعر والکاتب کے عنوان سے جو مضامین آپ شائع کرتے رہے۔ انہیں گویا شعر گوئی اور انشا کا ضابطہ کہنا چاہئے۔ یہ سب کچھ تو ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مقنن اور ضابطہ باندھنے والے خود کہاں تک اس قانون و ضابطہ پر چلتے ہیں جو انہوں نے وضع کیا ہے اور آیا جن قواعد کی پابندی کی دُنیا کو ہدایت کی جاتی ہے ان کی پابندی خود ان پر بھی لازم ہے یا نہیں؟ اگر صاحب ضابطہ خود اپنے ضابطہ کے پابند ہیں تو بیشک ان کے قواعد مقررہ کے مطابق وہ ادیب مانے جا سکتے ہیں۔ اور ان کا ضابطہ واجب التعمیل۔ ورنہ اگر وہ خود اپنی وضع کردہ میزان میں پورے نہ اُترے تو ناظرین سمجھ لیں گے۔ کہ حضرت نے فلاں سقم یا قبح کی نظیر میں فلاں فلاں اُستاد کا کلام تو پیش کر دیا۔ لیکن جب آپ لکھنے بیٹھے تو اُس سے بچ نہ سکے اور اس سے غرض صرف خاص خاص اصحاب کی تحقیر تھی نہ کہ انشا و نظم اُردو کے آداب بتانا۔ لہٰذا اس جانچ کے لئے ہم یہاں مولانا موصوف کی دو نظموں پر تنقیدی نظر ڈالیں گے۔ ان میں سے ایک جو ایک لمبا قطعہ ہے۔ چند سال ہُوئے ادیب میں شائع ہوئی تھی اور دوسری جو ایک قصیدہ ہے نومبر سنہ رواں کے مخزن میں شائع ہوئی ہے۔ ان نظموں کے نام بالترتیب آہِ سرد اور قصیدۂ احزاب ہیں ◆

۱- آہِ سرد

ایک دن میں اور شریکِ رنج و راحت ایک دوست -
مہربان و مشفق و اخلاص مند و با صفا +
یک دلی کہئے کہ یک رنگی کہ فرطِ اتحاد -
اس کے دل میں میں تھا میرے دل میں وہ جلوہ نما +
آشکارا اُس پہ تھی جو بات میرے دل کی تھی -
وہ زباں پر تھا مری جو کچھ کہ اُس کے دل میں تھا +
ایک کا دل ایک سے تھا صاف مثلِ آئنہ -
ایک کا راز ایک سے مخفی نہ ہرگز تھا ذرا +
اُس کی باتوں کو میں سمجھوں جھڑ رہے ہیں مُنہ سے پھول -
گفتگو کو میری وہ سمجھے نسیمِ جاں فزا +
ایک ٹھنڈی سانس نکلی دل سے میرے ناگہاں -
ہو گیا بے چین سُن کر وہ رفیقِ با صفا +
اور کہا اس طرح ٹھنڈی سانس تُونے تو بھری -
جیسے ہوتا ہے کسی کے دل میں دردِ جاں گزا +

یہ شروع کے چند اشعار ہم نے بالترتیب نقل کر دئے ہیں تاکہ ناظرین ہمارا مطلب آسانی سے سمجھ سکیں + ان اشعار کی عبارت میں سے زواید دور کر کے اگر ضروری ارکان جملہ نثر میں لکھے جائیں تو وہ نثر یوں ہوگی "ایک دن میں اور میرا ایک دوست جو مجھ سے ایسا ایسا تعلق رکھتا تھا۔ ناگہاں میرے دل سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی" الخ۔ اس نثر یا نظم کی عبارت میں میں اور ایک دوست مبتدا یا مسند واقع ہُوئے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ مسند الیہ یا خبر یا ان کی بابت اس جملہ کو قصداً ادھورا چھوڑ کر ایک ٹھنڈی سانس سے دوسرا جملہ شروع کر دیا گیا ہے۔ کسی قسم کے متقدرات

سے بھی اس لمبدرانہ کھاسپچے کی شکم پُری نہیں کر سکتے۔ نہ مطلع کے شروع میں "ایک دن" لے آنے سے مطلب برآری ہوتی ہے۔ "ایک دن" خود کلام سے اگر کچھ ربط پاتا ہے تو کہیں چھٹے شعر میں جاکر۔ غرضیکہ "میں اور میرا ایک دوست" سلسلۂ بیان میں اوّل سے آخر تک معلّق اور پا در ہوا رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مولانا نے علمِ بدیع کی کوئی صنعت اس تمہید میں رکھی ہو۔ بہرحال اصطلاح میں یہ اشعار کلام مہمل قرار دئے جائیں گے ؛

علاوہ ازیں ان اشعار میں سے کوئی بھی نقص سے خالی نہیں۔ دُوسرے شعر میں "ہم میں" نے ثقل تلفظ سے سخت تنافر پیدا کر دیا ہے۔ تیسرے شعر میں "جو کچھ" کے بعد "کہ" حشو قبیح ہے۔ چوتھے شعر میں "ذرا" بھی اسی قبیل سے ہے، ہرگز کے بعد اس کی ذرا ضرورت نہ تھی۔ مگر مولانا کیا کرتے وہاں قافیہ تنگ ہوتا تھا اس لئے مجبور تھے۔ چھٹے شعر میں آپ نے سانس دل سے نکالی ہے اور علمِ طب میں یہ ایک جدّت پیدا کی ہے۔ یوں تو سب عضو مل جل کر کام کرتے ہیں لیکن تنفس کا تعلّق براہِ راست شُش یعنی پھیپھڑوں سے ہے نہ کہ قلب سے۔ اسی اعتراض سے بچنے کو شعرا اور اہل درد آہ سے کام لیتے ہیں اور اُسے دل سے نکالتے ہیں۔ اسی شعر میں شاعر راوی ہے کہ اس کی اس ٹھنڈی سانس کو اس کے حبیب لبیب نے سُن لیا اور سن کر بیچین ہو گیا۔ ایسی ٹھنڈی سانس جس سے شاعر کا مطلب ہے سُننے میں نہیں آسکتی۔ سانس صرف اسی صورت میں سُنائی دیتی ہے جب قصبہ ریہ میں جسے نرخرہ کہتے ہیں بلغم وغیرہ کا انجماد ہو یا گھرا لگ گیا ہو۔ مگر خدانخواستہ ایسی حالت راوی پر طاری نہ تھی۔ پھر اُن کے دوست صمیم نے وہ سانس کیسے سُن لی۔ وہ اُس کو دیکھ سکتا تھا۔ ایسی ٹھنڈی سانس جس کا ذکر ہے معمولی سانسوں سے تنفس میں زیادہ لمبی ہوتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ سینہ زیادہ دیر تک نیچے کو دبنے کے بعد زیادہ دیر تک بھرا رہتا ہے اور یہ کیفیت دیکھی جا سکتی ہے قوت سامعہ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہاں آہ سُنی جا سکتی ہے ؛

اور کہا اس طرح ٹھنڈی سانس تُو نے تو بھری۔
جیسے ہوتا ہے کسی کے دل میں درد جاں گزا ؛

"تو" یہاں حشو ہے۔ نہ تو تحسین کلام اور نہ تخصیص کسی مصرف کا نہیں۔ اس مصرع کو یوں لکھتے تو بہتر تھا۔ ع

اور کہا اس طرح ٹھنڈی سانس یہ تُو نے بھری۔

اور میں بھی خفّت حرکت الف کا نقص عاید ہے ؛

اپنی ٹھنڈی سانس لینے کا سبب مجھ کو بتا۔

اس مصرع میں "اپنی" بے ضرورت آیا ہے۔ ایک آدمی اپنی ہی سانس لیتا ہے نہ کہ دُوسرے کی۔ علاوہ ازیں تیسرے اور چوتھے شعر میں صاف کہ آئے ہیں کہ اس کا دل مثل آئنہ تھا اور میرے دل کا حال تمام وکمال اُس پر آشکارا تھا۔ یہ تھا تو پھر اس دوست کو مولانا سے دریافت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس ٹھنڈی سانس کا سبب خود بخود جان لینا چاہئے تھا۔ اسے خواہ سہو شاعرانہ کہئے یا اجتماع نقیضین ؛

کھینچی ایک اَور آہِ سرد اور یہ جواب اس کو دیا

اس میں ایک تو "اَور" کی مذکورہ بالا پالغز ہے دُوسرے "اَور" کا الف اور "اُس کو" کا الف تقطیع سے ساقط ہیں۔ آجکل کے فصحا اور خود مولانا اسی قسم کے ادغام کے خلاف ہیں۔ اس سے تنگ کی احتیاج پرستی پائی جاتی ہے ؛

لیکن اس وقت آتشِ غم سے تھا دل خالی مرا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بڑے جابر ادیب ہیں۔ جہاں الف نے سرکشی کی کہ آپ نے گوشمالی فرمائی ؛

سچ اگر پُوچھو تو مدت سے ہے دل دُکھا ہُوا

مولانا ادب الشاعر وضع کرتے ہُوئے تو اس پر زور دیتے ہیں کہ اٹھا۔ لکھا۔ رکھا وغیرہ بہ تشدید ثانی فصیح ہے۔ لیکن خود اپنے قول پر عمل نہیں کرتے۔ بقولیکہ ہر کسے ناصح برائے دیگراں۔ چنانچہ آپ کے تازہ قصیدہ احزاب میں آیا ہے۔

تری قسمت میں ہے اے جسم خاکی خاک ہو جانا
لکھی ہے خاک کی قسمت میں بعد اس کے پریشانی

یہاں لکھی بلا تشدید آیا ہے۔ جب آپ وجوباً خود اس قاعدے کے پابند نہ تھے تو غریب دکھا پر تشدید کا تشدد کیا کرتا تھا یہاں تشدید سے ایک قسم کی غرابت پیدا ہو گئی جس سے یہ لفظ مخالفت قیاس لغوی کی مد میں آجاتا ہے۔ اسے آپ بلا تشدید رہنے دیتے تو بہتر تھا۔ لیکن وہاں تو وزن پورا کرنے کو پاسنگ کی ضرورت تھی ✤

اب جو دیکھا وہ بشاشت تھی نہ حُسنِ التفات
ہو گیا اک دم میں وہ افسردہ دل مجھ سے سوا

جب مولانا نے اپنی اس ٹھنڈی سانس کی حقیقت سُنائی تو اُن کے دوست کی یہ کیفیت ہوئی جس کا اظہار اس شعر میں ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ التفات کا لفظ یہاں بالکل بے موقع اور لایعنی ہے۔ خواہ مولانا اس کے قبل حسن بڑھائیں یا محاسن۔ مطلب شاعر کا یہ ہے کہ جب دوست نے اُس سانس کی وجہ سنی تو کیفیت دگرگوں ہو گئی یعنی پہلے جو بشاشت تھی وہ نہ رہی۔ بجائے اس کے افسردگی چھا گئی۔ بشاشت کا متقابل ہے رنج۔ غم۔ حزن۔ افسردہ دلی وغیرہ یہ ٹھیک۔ التفات کا متقابل ہے بے توجہی۔ بے رُخی۔ پہلو تہی وغیرہ ایسے ہمدرد اور اہل دل دوست سے جیسا کہ خوش قسمتی سے مولانا کو مل گیا تھا یہ بعید ہے کہ وہ اس ٹھنڈی سانس کی وجہ سُن کر اُن سے بے التفاتی کرنے لگتا یا اُن کی طرف سے مُنہ موڑ کے بیٹھ جاتا۔ واقعی ہمارا بھی دل افسردہ ہوتا ہے کہ مولانا جیسے ادیب نے التفات کا لفظ یہاں نومشقوں کی ادا سے استعمال فرمایا ہے ✤

تیرا دل خود تو مکدّر تھا مگر یہ تو سمجھ

معلوم ہوتا ہے کہ تو۔ تو مولانا کا سخن تکیہ ہے۔ اس صورت میں تو امر مجبوری ہے ورنہ یہ تو تو بھی تنافر سے خالی نہیں اور یہ خود تو (خود تو) بھی ثقل تلفظ کا نقص لئے ہوئے ہے اُو

دم کا پہلو پیدا کرتا ہے ✤

اور چٹک کر دیتی ہیں کلیاں پیام مرحبا (بادِ صبا کو)

یہ سلام پیام ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ صبا باغ میں موجود ہے اور کلیاں بھی وہیں ہیں پھر کلیاں صبا کو جو پیام دیتی ہیں وہ کہاں سے آیا۔ کوئی شخصیت مذکور ہونی چاہئے جس نے کلیوں کو پیام دیا اور کہا کہ صبا کو پہنچا دینا۔ چنانچہ پیغام تین شخصیتوں کا وجود لابُد گردانتا ہے۔ یہاں صیغہ تثنیہ کی گردان ہے۔ پیام مرحبا ویسے بھی ناقص ترکیب واقع ہوئی ہے ✤ مقطع میں فرماتے ہیں:-

شادی و غم جبکہ دونوں ہیں جہاں میں بے ثبات۔
وقت اپنا کاٹ دے ہنس بول کر مردِ خدا ✤

مولانا نظم کی یہ نظم نہایت کمزور اور پھُسپھُسی ہے۔ معلوم نہیں ان کا اور کلام کیسا ہے۔ شاذ ہی دیکھنے میں آتا ہے ادیبوں کو چاہئے بھی یہی کہ خود شعر نہ کہا کریں بس گھر بیٹھے شعر گوئی اور انشا کے قواعد ڈھالا کریں۔ خلاصہ کلام جو مطلب مولانا اس ۲۶ ۳ شعر کے قطعے میں خوش اسلوبی سے نہ نکال سکے وہ داغ مرحوم دو مصرعوں میں کس خوبی سے ادا کر گئے ✤

دل دے تو اس قماش کا پروردگار دے۔
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے ✤

۲۔ قصیدۂ احزاب

فریب ہستی موہوم پر ہے نصِ قرآنی۔
سراب دشت ہے پیاسے سمجھتے ہیں جسے پانی ✤

یہ مطلع ہے اس قصیدہ کا۔ اہل زبان نے وجوباً قرار دے دیا ہے کہ یائے معروف آخر کلمہ کا بوجہ کسرۂ اضافت یا واو عاطفہ مشدد غیر فصیح ہے ہستی پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے[1] ✤

[1] یہ تو صریح غلط بیانی ہے ہستی کی یائے معروف اس مطلع میں مشدد نہیں ہے۔ مطلع پھر پڑھیے ✤ اڈیٹر

صدف کی آنکھ کا آنسو ہے موتی جس کو سمجھے ہیں
جگر کا کان کے اِک داغ ہے یاقوتِ رمّانی

اگر مصرع اُولےٰ میں سے ایک ک لے کر مصرع ثانی میں اور شامل کر دیں تو پُورے پانچ ک ہو جائیں۔ چار وہاں بھی موجود ہیں۔ اسے اصطلاح میں کہتے ہیں تنافر ٭

ستم ہے جزر و مدِ بیم و رجا کا شادی و غم کا سو طوفانی

ہمارے خیال میں تو شادی و غم بیم و رجا کے اندر ہی آجاتے ہیں۔ یہ الفاظ محض بھرتی ہیں۔ بیت پڑ ر ن ٭

یہ کبر و ناز یہ جوشِ طبیعت کچھ ٹھکانا ہے۔
کہیں سر سے گزر جائے نہ موجِ چینِ پیشانی ٭

پیشانی اور سر کا ڈانڈا مشترک ہے یعنی یہ دونوں حصے جسم کے متصل بہم واقع ہوئے ہیں اس لئے ان کا آپس کی افراط تفریط سے متاثر ہونا ایک امر طبعی ہے۔ اگر پیشانی کی چین کی موج سر تک پہنچ جائے تو تعجب ہی کیا ہے۔ علاوہ ازیں اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ چینی طوفان کیونکر اُٹھا مولانا اس کی بنا کبر ناز اور جوش طبیعت پر رکھتے ہیں۔ اول تو یہ تینوں کلمے اپنے اپنے خاص معنی رکھتے ہیں۔ خیر مان بھی لیں کہ یہ تینوں کیفیتیں ایک وقت میں ظہور پذیر ہو سکتی ہیں اور باہم متباین بھی نہیں لیکن علم تحقیق القوی کی رو سے ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان سے پیشانی پر چین پڑ سکتی ہے یا نہیں۔ ہر دو کی ایک کیفیت اگر مختلف بواعث سے ظاہر ہوتی ہو تو ان میں سے اس باعث کو خصوصیت ہوگی جو اکثر بیشتر اس کیفیت کا مظہر ہوتا ہے۔ چین پیشانی کے باب میں یہ باعث خفگی اور ناراضگی ہے جس کا شعر میں ذکر نہیں۔

مانا اچھا نہیں جزوِ ضعیف اور سرکشی اتنی
نکل جائیگے تو۔ مرتا ہے اس دیوار میں پانی

اعتراض یہ ہے کہ یہ دیوار کہاں سے آگئی اور اگر جزو ضعیف اپنے گھر میں بیٹھا ہو یا کسی تنگ گلی میں سے گزر رہا ہو اور مینہ موسلا دھار برس رہا ہو تو یہ نہایت باموقع ہے اور تنبیہ کچھ معنی رکھ سکتی ہے۔ مگر یہاں تو یہ دیوار بالکل بادر ہوا ہے۔ پانی پر بھی اس کی بنا نظر نہیں آتی لہذا بے محل ہے

لکھی ہے خاک کی قسمت میں بعد اس کے پریشانی

لکھی بہ تشدید کاف چاہئے جیسا کہ پہلے کہہ آئے ہیں۔ اب یہ قاعدہ کُلّیہ قرار پا چکا ہے کہ لکھا۔ رکھا۔ اُٹھا وغیرہ میں حرف ثانی وجوباً مشدد آتا ہے۔ کوئی نومشق اور متشاعر ضرورت شعری کے آگے سر جھکائے تو مضائقہ نہیں۔ مولانا جیسے عالم لوذعی اور ادیب کے کلام میں ہرگز یہ نقص نہ ہونا چاہئے۔

وبالِ سرکشی و خونِ ناحق سب کی گردن پر۔
خیالِ شورش و فتنہ گری و فتنہ سامانی ٭

سرکشی اور فتنہ گری میں یائے معروف بوجہ واؤ عاطفہ مشدد ہو جاتی ہے اور اسے فصحا قبیح قرار دے چکے ہیں جیسا کہ پہلے کہہ آئے ہیں۔ پھر فتنہ گری کی ہا آخر کلمہ نے اتنا سر اُٹھایا کہ الف سے ذرا اُنگل اُوپر نکل گئی۔ اسے بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ دیکھئے یہی ہا سامانی کے ساتھ اپنی حد کے اندر ہے لیکن گری کے ساتھ شتر بے مہار بن گئی ہے ٭

نہ تھی پرکالۂ الماس جب کاٹھی سے نکلی تھی۔
لہو میں ڈوب کر اب ہوگئی لعلِ بدخشانی ٭

شعر بہت اچھا ہے مگر پرکالۂ الماس ہی میں کلام ہے۔ الماس نعل۔ الماس رنگ۔ الماس گوں اور الماس بار تشبیہات تیغ میں آتے ہیں۔ لیکن پرکالۂ الماس فارسی میں کہیں نہیں آیا نہ اُردو میں دیکھا گیا اور اگر ہمارے ہاں کسی نے باندھ بھی دیا ہو تو وہ سند فارسیاں کا تابع رہیگا۔ اگر اسے مولانا کا تصرف کہیں تو اس کی مناسبت سے بحث کی جائیگی۔ پرکالہ کے معنی ہیں ٹکڑا۔ ایک جزو منتشر کا پرکالہ۔ آتش کا پرکالہ وغیرہ مستعمل ہیں۔ چنانچہ اول الذکر کے معنی ہوتے ہیں چنگاری اور دوم آتش کا ایک جزو

خفیف ہے۔ اسی طرح تلوار کو اگر پرکالۂ الماس بوجہ اس کی چمک دمک کے کہیں تو وہ ایک ریزہ الماس سے زیادہ نہ ٹھیرے گی۔ جو تیغ اور پھر اس تیغ کے قد و قامت سے غیر متناسب ہے جس کا مذکور شاعر کر رہا ہے۔ فارسیوں نے الماس پیکانی ایک محاورہ استعمال کیا ہے جسے وہ نوعے از الماس نوکدار کے معنی میں لاتے ہیں یعنی مشبّہ بہ پیکان ہے۔ ایک چھُری یا پیکان نظر یا تیر نظر کو پرکالۂ الماس تفرقاً کہ سکتے ہیں لیکن اتنی بڑی چیز کو جیسی کہ تیغ ہے پرکالۂ الماس کہنا غیر واقعی ہے۔ لہذا اگر یہ تصرف ہے، تو ٹھیک نہیں ٭

لچکتے ہیں کہیں میداں میں صد ہا نیزۂ خطّی ـــ صفاہانی

گرا اِک پہلواں کا جسم یہاں سب کے سب بھاگے
سوار آئے تھے اس کے ساتھ جو یارانِ رُوحانی
کچھ ان میں پار اُترے رہ گئے خندق میں کچھ گرکر
رہا میدان میں باقی نہ کوئی دُشمنِ جانی

اعتراض ہے کہ اوّل اور دوم مصرعوں میں میداں اور پہلواں میں نون کا اعلان چاہئیے۔ اب یہ کُلیہ بن چکا ہے کہ اختلاطِ الفاظ کے سوا نون آخر کلمہ بالاعلان آنا چاہئیے اگر اس کے کلمۂ ماقبل کے آخر کسرۂ اضافی یا واؤ عطف نہ ہو فصحا اور ادبا اس کے پابند ہیں۔ آخر کے شعر میں کوئی نقص نہیں دو یاران رُوحانی کی تشریح کی غرض سے لکھا گیا۔ یہ یارانِ روحانی اُس کافر بدکیش کے رفقا تھے جو حضرت امیرالمومنینؑ سے جنگ کرنے آیا تھا۔ ان بہائم کو یارانِ روحانی سے تعبیر کرنا نازیبا تھا کوئی اور کلمہ لانا چاہئیے جبکہ اس سے قبل ہی یاران رُوحانی اور معنی میں آچکے ہیں۔ چنانچہ تمہیدی اشعار میں مولانا فرما چکے ہیں :-

ادھر سے اے صبا ہو کر جو بزم اُنس تک جانا
سلام اُن کو مرا کہنا جو ہیں یارانِ رُوحانی

وہ تو جگہ کلمہ یاران رُوحانی بلا تخصیص و تعریف آیا ہے۔

بہائم کفار کی شان میں اس کا استعمال مذموم ہے۔ چونکہ یہ شعر اب یہاں لکھ دیا گیا اس لئے ہم یہ اَور کہے دیتے ہیں کہ مصرعۂ اُولےٰ کے آخر میں جانا بھی غلط ہے۔ مولانا غالباً اس فعل کی حقیقت نہ سمجھے۔ جانا صیغہ امر ہے۔ مگر یہاں حکم یا استدعا کا عنصر جانا میں نہیں بلکہ کہنا میں ہے۔ جانا کے پہلے جو حرف شرط پڑا ہُوا ہے۔ اس لئے موقع یہ کہنے کا ہے کہ اے صبا جو تو بزمِ اُنس تک جائے تو ـــ

اُٹھا اِک پہلوانِ پیلتن عمرو بن عبدُود ـــ پٹھانی

اٹھا بلا تشدید تا ے ہندی واقع ہُوا ہے۔ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

اُلٹ دی آستیں جھُجک کر عبا مولا نے گردانی

عبا ایک پوشاک کا نام ہے جو مثل جُبّہ یا چُغہ کے ہوتی ہے۔ اُسے گردانے سے یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ اُسے اُتار کر اور اُلٹا کر کے پہننا۔ ربطِ کلام سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ایسا کرنے کا موقع تھا کیونکہ دُشمن ملعون مع اپنی جمعیت کے جنگ کے لئے سامنے کھڑا تھا۔ مولانا کے دل میں نہ معلوم کیا تھا اور کیا کر گئے۔ اگر عبا کا کوئی خاص حصہ گردانا گیا تھا تو آستین کی طرح اُس کا بھی نام لیتے ٭

تصدق ہو گئی شان و شکوہِ فرِ سلطانی

فر کے معنی خود شان و شکوہ کے ہیں۔ پھر یہ شان و شکوہ کی شان و شکوہ چہ معنی دارد ٭

کہا کافر سے دو باتیں ہیں۔ کر ایک اختیار اُن میں۔ صفاہانی

اس مصرعہ میں دو نقص ہیں۔ ان میں کا ایک الف حسب دستور وزن سے گرتا ہے اور "اُن میں" کی بجائے "اُن میں سے" چاہئیے ٭

وُہ اُترا اسپ سے اور پے کیا اس طرح توسن کو

اسپ اور توسن ایک ہی جانور سے مراد ہے جس پر وُہ سوار تھا لیکن سیاق عبارت تعدد کے ابہام میں ڈالتا ہے۔ پے کیا کے اُردو میں کچھ معنی نہیں۔ کلام فصیح کی تعریف علم معانی میں یہ آئی ہے کہ جو کلام تنافر حروف۔ غرابت۔ مخالفت قیاس...

قیاس لغوی اور عیوب ترکیب سے مبرا ہو۔ اگر پے کرنا کچھ معنی ہیں تو غرابت کا نقص عاید ہے۔ فارسی میں پے کردن ایک محاورہ ضرور ہے جو کم مستعمل ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں گوشت پاشنہ بُریدن برائے منع دویدن۔ طالب آملی فرماتے ہیں:۔

تا نامۂ بُلبُل نبرد جانب گلزار
گر پیک نسیم ست کہ پے مے کنم امشب

اگر واقعی عمرو بن عبدود نے ایسا ہی کیا تھا۔ تو بجائے پے کیا کے کُوچیں کاٹ ڈالتے جو اُردو کا محاورہ ہے۔ اور یہاں بہت برمحل ہے۔ ناسخ مرحوم ایسے ہی مقام پر فرماتے ہیں:۔

خاک اے قاصد جواب خط کی ہو تم سے اُمید
کاٹتے ہیں اپنی کُوچیں ساکنانِ کُوئے دوست
ہُوا نازل خُدا کا قہر شکلِ بادِ صرصر میں
چلی آندھی کہ قومِ عاد کو ہے جس سے حیرانی

ایک سرگزشت یا تاریخی واقعہ لکھتے ہوئے ماضی کو حال کے صیغہ میں لاتے ہیں۔ مگر یہ نہیں ہوتا کہ ایک جگہ ماضی اور ایک جگہ حال۔ جو رنج و الم حضرت سیدالشہداء کو جناب علی اکبرؑ کی شہادت سے ہُوا اُس کی کیفیت میرانیس مرحوم اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

اُٹھتی ہے کبھی دل میں کبھی ہُوک جگر میں۔
ہے درد کبھی سینہ میں اور گاہ کمر میں۔
رن میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں گھر میں۔
ہے دن کا اُجالا یہ اندھیرا ہے نظر میں۔
غُل کرتے ہیں اعدا۔ یہ سُنائی نہیں دیتا۔
لاشہ علی اکبرؑ کا دکھائی نہیں دیتا۔

اگر آپ یوں فرماتے "باد صرصر کی شکل میں خدا کا قہر نازل ہوتا ہے وہ آندھی چلتی ہے کہ قوم عاد کو حیرانی ہے"۔ تو ٹھیک تھا۔ قہر نازل ہُوا کے ساتھ "حیرانی ہے" اُنمل بے جوڑ ہے۔ اس ہے کو تھی سے بدل دیجئے تو یہ نقص نکل جائے۔

مولانا بیخبر نہیں ہو کر یہ نہیں فرما سکتے کہ "شعر مرا بمدرسہ کہ بُرد"؟ کیونکہ وہ خود ادب شاعری کا علم لیکر "مدرسہ کھولے بیٹھے ہیں اُن کے کلام پر ضرور اُن کے اور اُن کے معاصرین کے بنائے ہوئے آداب کی رُو سے تنقید کی جائیگی جس کا اُنہیں شکوہ نہ ہونا چاہئے۔ ع
ہر کسے ناصح برائے دیگراں ۔ ناصح خود یافتم کم در جہاں

کیفی دہلوی

ایک نکتہ

جو لوگ فلسفے کی دقیق تصویروں کو شعر میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ شعر کی لطافت کو فلسفے کی گرانی سے زیر بار کر دینا مناسب نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر بلند خیال ہونا چاہئے مگر اس کی وہ بلند خیالی فلسفے کی بڑی بڑی کتابوں کی مرہون منت نہیں۔ بلکہ مطالعۂ زندگی کی ممنون احسان ہونی چاہئے۔ شاعر ترجمان فطرت ہے۔ نہ کہ معلم فلسفہ و حکمت۔ شعر کا اثر یہ نہ ہونا چاہئے کہ سامع اُسے سُن کر شعر کے معانی و مطالب کو پہنچنے اور اُس کا مدعا سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہو جائے بلکہ شعر کی اصلی تعریف یہ ہے کہ اُسے سُن کر سامع تڑپ اُٹھے۔ اس کی رُوح شعر کی رُوح سے متاثر ہو جائے اور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ ملٹن کے قول کے مطابق "شعر سادہ سلیس۔ پُر جوش اور اصلیت پر مبنی ہو"۔

"گمنام"

ہ صرف ایک قطرہ کو لے کر اپنی خوردبین سے دیکھتا ہے
ر اُس کے اندر جاندار کیڑوں کی ایک چھوٹی سی دُنیا
دیکھتا ہے' میں جب اُسی قطرہ میں اُس دُنیا کو دیکھتا
ہتا ہوں تو مجھے اس ذرا سے قطرۂ آب میں بھی تمہارا
راز قدر صاف نظر آتا ہے اور میں سائنس کے اُس خدا
سے پوچھتا ہوں کہ اِس قطرہ میں تیری دُنیا کہاں ہے'
تو میری کائنات ہے!

برسوں گزرے' ابتداے شباب میں' مجھے یاد ہے
ـ ایک شب کو بھری محفل میں' ایک مغنّیہ نے جبکہ وہ
ہر طرف سے خراجِ تحسین و آفرین وصول کر رہی تھی'
یک شعر پڑھا تھا جس کو سننے والوں نے سُنا اور سُن کر
ھُول گئے! پر میں اُس شعر کو آج بھی اپنے صفحۂ قلب
پر نقش کالحجر پاتا ہوں! دن رات میں کتنی ہی دفعہ اُس
و پڑھتا ہوں اور ایک وارفتگیِ عشق کے ساتھ پکار
ٹھتا ہوں کہ یہ بات کس نے کہی؟ کیا وہ بھی مجھ جیسا
تھا یا میرے حال سے واقف تھا! . . . . .

مغنّیہ اپنے حُسن کی عارضی دولت جس فیاضی کے
ساتھ چاہے تقسیم کرے' پر وہ (خدا اُس کے گناہ معاف
کرے) عشوہ فروش مجھے تو وہ ایک نعمتِ ابدی دے
گئی' ایک نقشِ سلیمانی عطا کر گئی' جس کی گُوناگُوں
کیفیات' دل سے زبان تک اور دماغ سے قلم تک نہیں
آسکتیں! وہ ایک عجیب وقت تھا' آدھی رات گزر چکی
تھی اور اس محفل میں سیکڑوں نظریں مغنّیہ کے چہرے
پر پڑ رہی تھیں' لیکن میں اُس محفل میں اپنے کو
بالکل تنہا پاتا تھا اور میری رُوح پر ایک عالمِ
وجد طاری تھا۔ میں بار بار اُس شعر کی فرمائش
کرتا تھا اور وہ بار بار اُس کو دُہراتی تھی:-

نمی گویم دریں گلشن کہ ایں باغ و بہار از من'
بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یار از من'

(خاموش)

جب تو دوپٹہ چُن رہی تھی

مجھے یاد ہو یہ نہ ہو مگر میں کیوں کر بھول سکتا ہوں ساون کی وہ شام جب آسمان پر اُودی اُودی گھٹائیں ایک سیلاب [illegible] کی طرح پھیل رہی تھیں۔ معطر ہوائیں [illegible] پھولوں [illegible] درختوں سے [illegible] تھے اور تو صحن میں ایک تخت پر [illegible] بیٹھی اپنا کوئی دوپٹہ چُن رہی تھی۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ تو ایک شمعِ حُسن ہے اور تیری ہی شراب تو [illegible] کائنات [illegible] ہے!

مجھے معلوم نہ تھا' تو اپنا دوپٹہ چُننے میں محو تھی مگر میں تجھے دیکھ رہا تھا۔ تیرا دھانی دوپٹہ تیرے [illegible] کر شانے کی بلائیں لے رہا تھا۔ تیری گردن تیرے سر کو کبھی داہنی بازو پر [illegible] دیتی تھی اور کبھی [illegible] تو جھک کر ایک [illegible] لیتی تھی تو وہ آہستہ آہستہ جھک کر [illegible] بازو پر رکھ دیتی تھی۔

تو نے دوپٹے کا تمام عرض اکٹھا کر کے اس کا کچھ حصہ [illegible] کے درمیان تان لیا تھا اور تیرے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلیاں دوپٹے کا ذرا ذرا سا حصہ [illegible] آہستہ آہستہ [illegible] تیری مٹھیوں میں قائم کر رہی تھیں۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دوپٹے کے ساتھ ساتھ میری [illegible] ایک [illegible] دل [illegible] سے سمٹ سمٹ کر تیرے ہاتھوں میں جمع ہو رہی ہیں۔

دوپٹہ چُن کر تو نے لپیٹا اور اُس کی ایک [illegible] بنائی پھر تو اس کو لے کر اندر چلی گئی [illegible] معلوم کہاں رکھ آئی۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ اس وقت میرا چہرہ زرد تھا اور [illegible] واقعی جب تو دوپٹے کو اندر رکھ آئی۔ تو میں سراسیمہ ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ میری تمام آرزوئیں تلف ہو گئی ہیں۔

مگر ایک روز میں نے دیکھا کہ دوپٹے کے بل کھل گئے ہیں اور اس کی شکنیں تیرے بازو اور سینے پر لہرا رہی ہیں۔ مگر آہ میری آرزوئیں تو ان میں نہ تھیں!

تاج

لالۂ صحرا

آفتاب نصف النہار کی تمازت بادیۂ عرب کے تودہ ہائے ریگ کو آتش افشاں حرارت پہنچا رہی تھی اور ریت کے ذرّے شراروں کی طرح درخشاں ہو ہو کر بادِ سموم کی آغوش میں چہرہ چھپائے مصروفِ پرواز تھے اور جب کسی ذی حیات کے جسم سے مس کر جاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ شعلہ ہائے آتش کی بوچھار تھی جو برس گئی یا چھرّوں کی ایک باڑہ تھی جو چل کر بدن کو چھلنی چھلنی کر گئی ۔

ایک بلند سلسلۂ کوہ جس کے قدموں کے ساتھ ساتھ قافلہ اپنی راہ طے کر رہا تھا وسطِ صحرا میں نہایت تمکین و استقلال سے کھڑا تھا۔ اُس کی بلندی دوسری جانب کے نظارے کو اپنے وجودِ مستحکم سے پنہاں کئے ہوئے تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس طرف کائنات اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہے ۔

پہاڑوں کی سرخ چوٹیاں پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں کہ قدرت کا دستِ ستم انہیں نہایت بے دردی سے جھلسنے میں مشغول ہے اور لو کے زبردست تھپیڑے باؤ اور سنگریزوں کو اس طرح مسلسل اُٹھائے تھا کہ ان کے چہرے پر تلخ رہے تھے گویا تہیہ کئے بیٹھے ہیں کہ زبان شکایت کے وا کرنے کی مہلت ہی نہ دیں گے ۔

ریگ رواں کی سطح سمندر کی طرح لو کے بے قرار جھونکوں سے متلاطم ہو ہو کر مظلوم پہاڑیوں کو تھپیڑے دے رہی تھی۔ ہر دشت پیما اس ناپیدا کنار سمندر کی بے چین لہروں میں غوطے کھاتا پھرتا تھا اور لہروں کے ہٹنے کے بعد جب سر اُٹھاتا تھا تو ساحلِ مقصود۔ منزلِ مقصود بے سراغ اور راہ گم پاتا تھا ۔

فلک بوس بگولوں کا یکایک دیوانہ وار چکر لگا کر بیٹھ جانا قیس عامری کا عشقِ جنوں مایہ یاد دلا رہا تھا اور تمام قافلہ تیزی سے اُڑا جاتا تھا کہ شمعِ آفتاب کے گل ہونے سے پیشتر کسی محفوظ و پُر امن مقام پر پہنچ جائیں ۔

تو کہ بھنتی ہوئی وادی میلوں سنسان پڑی تھی اور تند جھونکوں کے چلنے کے بعد جب تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے ہوا اک سکون میں تبدیل ہو چکتی تو ریت کی سطح پر سے بالو کی ہلکی ہلکی لہریں اُٹھتی تھیں گویا کسی آئینہ سیما حسین کی روشن پیشانی پر غصے کی شکنیں پڑ رہی ہوں ۔

اُونٹوں کے سُموں اور پیدل ساربانوں کے قدموں سے گرد و غبار کے بادل اُٹھ اُٹھ کر سورج کی روشنی کو دھندلا کر رہے تھے اور جب یہ بادل غائب ہو جاتے تھے تو مطلع صاف ہو کر نگاہوں کے روبرو ایسا نیا نظارہ پیش کرتا تھا کہ حیرت آنکھوں کو پوری وسعت تک اجازتِ کشادگی دیتی تھی - جو تودہ چند قدم کے فاصلے پر سر بلند کھڑا تھا اب یُوں غائب ہو گیا۔ گویا زبانِ قدرت نے اُسے سطرِ غلط کی طرح اُٹھا لیا۔ اور اس صاف میدان میں جو اس سے پہلے نشیب و فراز سے قطعاً خالی تھا۔ نئے نئے تودے یُوں گردنیں بلند کئے کھڑے تھے گویا اپنی اس پُر اسرار طلسم بازی پر فخر و ناز سے مسکرا رہے ہیں ۔

جس طرح جگنو کی چمک کسی ننھے معصوم بچے کی نگاہوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ اور جب وہ للچا کر اپنا دستِ شوق اُسے پکڑ لینے کو بڑھاتا ہے۔ تو جگنو رات کی سیاہ چادرِ حریر میں لپٹ جاتا ہے اور کسی دُوسری جگہ پہنچ کر چہرہ باہر نکال مُسکرا مُسکرا کر

جھانکتا ہے۔ بعین اسی طرح سراب کا نظر فریب منظر بھی
افقِ صحرا پر شدتِ تشنگی سے دعوتِ آب کا مذاق
کر رہا تھا۔

کہیں کہیں ببول کے خشک اور برہنہ درخت اپنی
دو ایک ویران ٹہنیاں اُٹھائے یُوں کھڑے تھے۔
گویا آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے پکار رہے ہیں کہ
"اے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے تو اس
تپش سے جس نے کوہ و صحرا میں اک آگ سی لگا رکھی
رکھی ہے ہمیں نجات دلا"!

تمام قافلے والوں کے چہرے اور لباس گرد سے
اٹے ہُوئے تھے۔ بال پریشان تھے۔ حلق سُوکھ رہے
تھے۔ ہونٹ خشک تھے اور ان پر پپڑیاں جم گئی
تھیں۔ پیشانی کی شکنوں نے سر میں درد پیدا کر
دیا تھا۔ نگاہیں اس تپتے منظر کو دیکھ کر عاجز آ گئی
تھیں اور جب کوئی اُونچا سا ٹیلا نظر آتا تھا۔ تو وہ بے
اختیار ہو کر اُس کی پُشت پر اُمیدوں کے ایک سرسبز
و شاداب لہراتے ہُوئے باغ کا تصور اپنے روبرو
پیش کر لیتی تھیں مگر جب قافلہ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچتا تھا
تو سامنے ایک اور وسیع اور ہولناک میدان کو میلوں
تک پھیلا ہُوا دیکھ کر وہ چشم تمنا [illegible] میں ایک ماہیٔ
بے آب کی طرح بے تاب ہو کر تڑپنے لگتی تھیں۔

وحوش و طیور کسی کی کچھ خبر نہ تھی اور معلوم ہوتا
تھا تمام ذی حیات اس آگ سے پناہ لینے کو اپنی اپنی
جائے پناہ میں چھپے ہوئے ہیں [illegible]
کے دامن میں ہرن اپنی [illegible] آلود آنکھیں کھولے
کھڑے دکھائی دیتے مگر قافلے کو دیکھتے ہی پہاڑ کی گود
میں بچوں کی طرح اُچھل [illegible] آ چھپتے
سارا [illegible] گرد گرد کے

منظر سے بے پروائی اس دشت سے نا آشنا مسافروں
کے دلوں کو جلا جلا کر کباب کر رہی تھی مگر وہ بے فکر
خوش گپیاں کرتے پیدل چلے جا رہے تھے۔ راستے
کے عین درمیان ایک بلند تودہ راستہ روکے کھڑا
تھا لیکن تھوڑی دیر بعد ہوا کے جھونکوں نے اس
کو یوں اُڑانا شروع کیا۔ گویا شکر تھی جو لُو کے پانی
میں تحلیل ہو گئی۔ اس تودے کے ہٹنے کے بعد ہی
بھٹکتی اور پریشان نگاہوں کو سامنے درختوں کا
ایک ایسا سایہ دار جھنڈ دکھائی دیا جیسے باغ فردوس
ہے جو اپنی گوناگون شادابیوں سے جہنم کے گنہگاروں
کو للچا للچا کر بلا رہا ہے اور وہ تودہ دوزخ اور بہشت
کے درمیان ایک پردہ تھا جسے قدرت نے نگاہوں
کے سامنے سے ہٹا دیا۔ گھبرائی ہوئی نگاہیں چمک اُٹھیں
مُرجھائے ہُوئے چہرے کھِل گئے اور ہر ایک نے تسکین
اطمینان کے لمبے لمبے سانس لینے شروع کئے اور دُگنی
رفتار سے سفر شروع کر دیا کہ اس رُوح پرور نظارے
کو دیکھ کر کسی میں تاب ضبط نہ رہی تھی۔

وہ کھجور اور پیلو کے عظیم الشان درختوں کا ایک
جھنڈ تھا جو رخسارِ صحرا پر ایک تل کی مانند دکھائی دے
رہا تھا۔ اُن کے سائے میں ایک چشمۂ شفاف بے قرار
ہو کر اُبل رہا تھا اور اس کے کنارے چند لڑکیاں
بیٹھی ہُوئی خوبصورت پتھروں سے کہیں [illegible]
چشمے کے کنارے [illegible] کے زرد پھول [illegible]
کی پنکھڑیاں اُس وقت ڈھلکے [illegible] کسی خیال میں مستغرق
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اس سے زیادہ [illegible]
اپنے کھیل میں [illegible] مصروف تھیں اور [illegible]

وہ ایسی محو تھیں کہ اُن کو قافلے کے آنے کی خبر بھی نہ
ہوئی۔ یہاں تک کہ قافلے والوں کے شور و غل نے
اس گوشۂ تنہائی کو اپنی گوناگون آوازوں اور الحمد
للہ کے مطمئن نعروں سے آباد کر دیا۔ لڑکیاں اُچھلتی
ہوئی اُٹھیں اور اپنی بستی کے دروازے پر مہمانوں
کو کھڑا دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگیں اور کہنے لگیں +

"اے آنے والو تم پر خدا کی رحمت ہو۔ تمہاری
موجودگی ہماری چھوٹی سی بستی کو رونق۔ ہمارے غریبانہ
دسترخوان کو عزت اور ہماری ناچیز میزبانی کو برکت
بخشے گی" +

ان میں سے ایک دوڑ کر اپنی چھولداری میں گھسی
اور وہاں سے مٹی کا ایک بڑا سا پیالہ نکال لائی۔ اور
چشمے کا صاف اور سرد پانی بھر بھر کر سب کو پلانے لگی۔
واپس جا کر اُس نے اپنی بوڑھی ماں کو چھولداری
میں سے باہر بھیجا۔ اُس محترمہ نے باہر آ کر سب کو خوش آمدید
کہا اور اُن کے آرام و آسایش کے انتظام میں مصروف
ہوگئی۔ وہ لڑکی خود کچھ کھجوریں کچھ گوشت کچھ گول گول
روٹیاں لے آئی۔ ان کو اہلِ قافلہ کے آگے رکھا اور شرما
کر مسکراتی ہوئی چلی گئی +

میں حیرت سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا اور چاہتا تھا
کہ وہ بجائے ہماری راحت کے سامان مہیا کرنے کے
وہاں بیٹھے اور میں اس صحرائی پھول کو جی بھر کر دیکھوں
جو اس گلشن میں لہلہا رہا ہے۔ اس حور کے روشن چہرے
کا دیدار کروں جو اس فردوس میں مصروفِ خرام ہے۔
وہ کبھی ذرا آئی اور گئی۔ لیکن اس طرح گویا ایک
بجلی تھی جو کوندی اور غائب ہوگئی +

شہسوار آفتاب کا چہرہ ملکۂ شب کے [illegible] کو غور کرتا
دیکھ کر [illegible] اور جب اس نے [illegible] طرف

مایوسی اور ناکامی کو بڑھتے دیکھا تو اُس کا چہرہ شرم سے
تمتما اُٹھا اور وہ مجبور ہو کر میدانِ جنگ سے اپنی ہزیمت
خوردہ فوج کے ساتھ بھاگ کر اُفق میں غایب ہوگیا اور
ملکۂ شب نے قلمروِ کائنات پر اپنا عمل دخل کرا لیا +

وہ لالۂ صحرا۔ وہ اس جنت کی حور شام کے وقت سے
بالکل غایب تھی اور میرا خیال صحیح تھا کہ وہ کھانے پکانے
میں مصروف ہے۔ رات کو جب اُس کی مہمان نواز ماں نے
ہمیں کھانا کھلایا تو اُس نے فخریہ کہا "میری بیٹی اسماء جیسا
کھانا پکاتی ہے ان تمام لڑکیوں میں سے کوئی اَور نہیں
پکاتی" لیکن میری پریشان نگاہیں اس کے حسن کی۔ آہ
کی معصومیت کی۔ اُس کی سادگی کی بھوکی تھیں مگر اُسے منہ
آنا تھا نہ آئی۔ لوگ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر سونے
لگے۔ اور میں اب اس کو دیکھنے سے مایوس ہوگیا۔ میں سوچنے
لگا کہ اس ننھے سے سرد آشیانے میں جس پر خدا کی رحمت
اپنے پروں کا سایہ ڈالے رکھتی ہے جہاں کھانے کو صرف
خرمے پینے کو چشموں کا پانی اور تمام دُنیا کے نظاروں کی
جگہ اسماء کی آنکھیں ہیں زندگی گزارنا کیسا خوشگوار ہے
لُو کے جھُلسنے والے غضب ناک جھونکے چاروں طرف چلتے
ہیں مگر اس پرستان میں داخل ہوتے ہی گویا وہ نرمی اور
حلم کا سرد لباس پہن لیتے ہیں۔ اُفق نگاہ تک صحرا ویران
پڑا ہے مگر اس ننھی سی دنیا میں کیسا پُر لطف سکون ہے
جس کا سلسلہ چشموں کی روانی۔ پتوں کی جنبش۔ پرندوں
کی [illegible] اسماء اور اَور لڑکیوں کی نغمہ ریزی ہی سے
ٹوٹتا ہے۔ پہاڑیاں چاروں طرف تیز و خشک لگا ہوا ہے
گھورتی دکھائی دیتی ہیں مگر اسماء کے خندۂ حیات بخش نے
اس مقام کو کیسا پُر لطف بنا رکھا ہے۔ آہ زندگی اور اس
جگہ! دُنیا کی شورشوں سے دُور۔ شہروں کے ہنگاموں سے
علیحدہ اور جہان کے ہجوم سے الگ۔ دُنیا میں یہی جنت ہے
یہی فردوس ہے۔ یہی بہشت ہے +

بربط کے تاروں سے دریائے نغمہ کی ننھی ننھی رُوح پرور موجیں سنسان فضائے محیط میں تیرتی ہوئی میرے کانوں کے پردوں تک آئیں اور اُن میں اس طرح سما گئیں جیسے سمندر کی لہریں آغوشِ ساحل میں جذب ہو جائیں۔ دفعۃً اس تاریک نظارے پر "اس" کی آواز کے چاند نے افق سے جھانکا اور موسیقی کے تختۂ امواج پہ ایک اضطرابِ نَو پیدا کر دیا!

وہ کانپتی ہوئی آواز جس کا آغاز محض ہوا کے اس ہلکورے کی طرح تھا جو موجوں کی پیشانی پر ہلکا سا رنگِ تبسم نمایاں کردے رفتہ رفتہ طوفانِ موسیقی میں بدل چکی تھی اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں اس بے پایاں بحرِ لطافت کی سطح پر ایک ننھے کنول کی مانند تیر رہا ہوں لہریں مجھ پر غالب آ رہی ہیں ——— میں بیٹھا جاتا ہوں ——— اب میں ڈوب رہا ہوں ———

غرق ہو رہا ہوں ٭

اُس ڈوبتے ہوئے شخص کی مانند جو تھک ہار کر طوفانی سمندر میں اپنے آپ کو موجوں کے رحم پر چھوڑ دے اور جب ہوش میں آئے تو خود کو کسی ساحلِ امن و عافیت پر محفوظ و سلامت پائے۔ مجھے بھی میری محویت کی لہروں نے معلوم کہاں جا پھینکا اور جب میں اپنے آپے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رات ماضی کے غیر محدود سمندر میں کمر تک ڈوب چکی ہے۔ سناٹے کا عالم ہے اور چاند ہوا کے لطیف و رقیق جھونکوں کی مدد سے ایک خاموش و پنہاں تلاطمِ جذبات پیدا کر رہا ہے۔ لیکن آہ! وہ نغمہ سیّال جس سے فضا معمور تھی تمام ہو چکا تھا وہ نوائے رنگیں جس نے چاند کی شعاعوں کو ہفت رنگ بنا رکھا تھا ختم ہو چکی تھی اور چاندنی اپنے غیر محسوس پروں پر بے تابی و بے قراری کا بادل اُٹھائے یا دلِ ناخواستہ کائنات پر لپٹ رہی تھی ٭

میرا دل سینے میں اُچھل رہا تھا۔ بے چین تھا کہ رہا تھا کہ اس چاند کو دیکھوں گا جس کی ضیا پاش موسیقی نے کائنات کو روشن کر رکھا ہے مگر خود اُفق کے پردے میں پنہاں ہے۔ میں دبے پاؤں دُزدیدہ قدموں سے خیموں کے پاس سے گزرا اور اُن کی آڑ سے نکلتے ہی چشمے کا کنارا میرے سامنے تھا جس کے قریب عرار کے سرسبز پھول اپنے شگفتہ چہروں کو اُٹھائے کسی بے نظیر پھول کا پہرا دیتے معلوم ہوتے تھے۔ لطیف و سرد ہوا کے معطر جھونکے آ رہے تھے میں نے قدم آگے بڑھایا تو میری نظروں کے سامنے وہی شعلۂ حسن بھڑک رہا تھا نگاہیں رُکیں۔ ٹھیریں۔ لیکن تاب نہ لا کر گر پڑیں ٭

اسماء چشمے کے کنارے آنکھیں بند کئے بازو پر لیٹی تھی۔ اس کا بربط اُس کے قریب پڑا تھا۔ چاند کی روشنی نے اس تمام منظر کو روشن کر رکھا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ چاند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس مجسمۂ حسن و لطافت کو دیکھ رہا ہے۔ سیاہ لمبے بال جو ہر قسم کی بندشوں سے آزاد تھے چہرے کے گرد لہرا رہے تھے۔ اُن سُرخ اور پتلے لبوں کی ایک ذرا سی شگفتگی کہہ رہی تھی کہ گلشنِ خواب کی روشوں پر کوئی دلاویز خیال رقص کر رہا ہے ٭

ہر جا خاموشی تھی۔ روشنی بالکل دُھندلی تھی۔ لیکن اس جانِ حسن کا تنفس اس آہستہ آہستہ اُبھرتے ہوئے سینے سے نکلنے والا تنفس ایک ہنگامۂ نُور پیدا کر رہا تھا ٭

وہ نیند کے بوجھ سے جُھک کر گری ہوئی پلک، وہ کالے کالے گیسو۔ وہ سُرخ و سپید رُخسار قیامت برپا کر رہے تھے چاند کی مضطرب کرنیں اس نُورانی چہرے پر قربان ہو رہی تھیں۔ میں چاہتا تھا۔ آہ کس قدر چاہتا تھا کہ میں بھی اُس جُوئے نُور میں تحلیل ہو کر حُسن کے اس بے پایاں سمندر میں جس میں چاند سے نکل کر آنے والی شعاعوں کی ندیاں گر رہی تھیں۔ ڈوب جاؤں۔ غرق ہو جاؤں

اپنے آپ کو کھو دوں +

اسماء نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھولیں اور مجھے کچھ فاصلے پر کھڑا دیکھ کر وہ دفعتہً اُٹھی۔ مجھے پہچان لیا۔ اپنا دوپٹہ سنبھال کر پوچھنے لگی:۔

"معزز مہمان آپ یہاں کس تلاش میں ہیں۔ مجھے بتلائیے کہ میں آپ کی امداد کروں" +

میں نے کہا "اسماء خاتون جس چیز کی تلاش میں یہاں آیا تھا وہ تو کھوئی جا چکی ہے مگر ہاں تمہاری امداد سے اُسے حاصل کر سکتا ہوں +

اسماء کھڑی ہو گئی اور اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"معزز مہمان آپ فرمائیے۔ اسماء حاضر ہے"۔

میں نے کہا۔ اسماء میں تمہارے گیت کی آواز سن کر آیا تھا۔ کیا تم اتنی مہربانی کرو گی کہ مجھے کچھ گا کر سنا دو" +

اسماء کچھ شرما گئی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ پھر مسکرا دی اور بولی: "آپ یہاں بیٹھیں مجھے جو کچھ آتا ہے میں سنائے دیتی ہوں" میں بیٹھ گیا اور اسماء نے اپنی بربط اُٹھالی۔ کچھ دیر مضراب کو تاروں پر لگا لگا کر اُس کی آواز کو درست کیا اور اس کے بعد مضراب نے تاروں سے ایک دردبھرا نغمہ نکالا کہ میرا دل اچھل پڑا۔ میں ابھی سنبھلا نہ تھا کہ اسماء نے گانا شروع کر دیا۔ اس آواز میں کوئی خاص ہُنر نہ تھا۔ اس موسیقی میں کوئی خاص تانوں کے پیچ نہ تھے بلکہ وہ ایک سادہ نغمہ تھا۔ ایک بے پناہ تیر تھا جو دل کو چھید رہا تھا۔ اس کی آواز لحہ بہ لحہ نغمے کے ساتھ ملتی جاتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ دور کھڑی ہوئی پہاڑیاں بھی اس کے ساتھ گا رہی ہیں۔ چشمے کا پانی بھی اُسی کے ساتھ گا رہا ہے۔ پھول بھی اُسی کے ساتھ گا رہے ہیں۔ اور میرا دل بھی اُس کے ساتھ گا رہا ہے +

اس نے اپنا گیت ختم کر کے بربط ریت پر رکھ دیا۔

میں گانے میں محو تھا اور خاموش۔ آخر اسماء نے آہستہ سے میرا شانہ ہلا کر کہا:۔

"معزز مہمان آپ اس قدر خاموش کیوں ہو گئے کیا میرے گیت نے آپ کو تکلیف دی"

میں نے کہا "نہیں اسماء میں تیری مہربانی کا بہت ممنون ہوں۔ میں تمہارے گیت میں محو تھا۔ مگر اسماء تم نے آبادی سے اس قدر دور رہ کر ایسا اچھا بربط بجانا کس طرح سیکھ لیا" +

اسماء نے کہا "افسوس میرا بھائی یہاں نہیں ورنہ میں اس سے آپ کو بربط سنواتی۔ میں نے یہ اُسی سے سیکھا ہے" +

میں نے دریافت کیا:۔

"اسماء اس جگہ صرف ایک آدھ ہی مرد ہے باقی یہاں کے تمام لوگ کہاں گئے ہیں"

اسماء نے کہا "وہ تمام لوگ خرید و فروخت کے لئے آبادی کی طرف گئے ہیں" +

پھر اسماء نے دریافت کیا:۔

"معزز مہمان آپ کتنے روز ہماری اس ننھی سی بستی کو اپنی موجودگی سے رونق بخشیں گے" +

میں نے کہا "اسماء کل صبح ہی ہم لوگوں کو روانہ ہونا ہے"۔ اسماء نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ لیکن کیا آپ چند روز اور نہیں ٹھیر سکتے" +

میں نے کہا "اسماء میرے تمام ہمراہی کل جانے کے لئے تیار ہیں۔ میں مجبور ہوں گا مگر اسماء تمہاری مہربانی اور شریفانہ برتاؤ مجھے تمام عمر نہ بھولے گا اور صحرائے عرب کی یہ مہمان نوازی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی +

اسماء کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "آپ صبح جائیں گے اور رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اب آپ کو

آرام کرنا چاہئے۔ میں بھی اُٹھ کھڑا ہُوا اور ہم دونو خیمے کی طرف چلے۔ اسماء نے عرار کا ایک پھول توڑ کر مجھے دیا اور کہا:-

"یہ پھول ایک ناچیز صحرائی لڑکی کی محبت یاد دلا دیا کرے گا" اور اس کی آواز ایسی تھی گویا وہ بمشکل اپنے جذبات غم و رنج اور آنسوؤں کو روک رہی ہے۔

میں نے پھول لے لیا اور کہا:-

"اسماء تم فرشتہ ہو۔ خدا تمہاری عمر میں برکت۔ تمہارے نیک اعمال پر رحمت اور تمہاری زندگی کو بے پایاں مسرت بخشے"۔

اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ اپنا غمگین قدم اُٹھاتی ہُوئی اپنے خیمے کو چلی گئی اور میں سو رہا۔

صبح کو قافلہ روانہ ہُوا۔ اسماء جاگ رہی تھی اور ہمارے اُونٹوں کے قریب ایک بُت کی طرح ساکن و جامد کھڑی تھی۔ ہم جب رُخصت ہوئے اور جب ساربانوں نے اُونٹوں کو بڑھایا تو میں نے دیکھا کہ اسماء کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ میری آنکھیں بھی پُرنم ہو گئیں اور میں نے اُسے رُخصت کا سلام کیا۔

قافلہ چل دیا اور جب تک قافلہ اُسے دکھائی دیتا رہا وہ برابر وہیں کھڑی ہمیں رخصت ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

اسماء! اے لالۂ صحرا۔ اے جنت ارضی کی حور۔ اے اس نخلستان میں چہکنے والی چڑیا! تیری خوشبو سے میرا دماغ معطر ہے۔ تیرے اس سادہ مگر ملکوتی حسن سے میری آنکھیں روشن ہیں اور تیرے نغمے میرے کانوں میں اب تک گونج رہے ہیں۔

تیرا صحرا کا وہ تختۂ صحرا کا پھول جسے تیرے ہاتھوں نے بویا سینچا اور اس شگفتگی تک پہنچایا۔ میرے پاس محفوظ ہے۔ دوست کہیں کہ یہ خشک ہو گیا ہے۔ لوگ کہیں کہ یہ سُوکھ چکا ہے۔ دُنیا کہے کہ یہ مُرجھا گیا ہے۔ مگر میرے لئے بدستور شاداب ہے۔ ویسا ہی رنگین ہے ویسا ہی خوشبودار ہے جیسا اُس روز تھا جب تُو نے اشک آلود آنکھوں سے اُس کو شاخ پر سے توڑا اور اپنے چند گھنٹوں کے مہمان کو اپنی یادگار کر دیا تھا۔ اُس کی عجیب سرسبزی کو دیکھ کر میری مخمور نگاہوں سے بادۂ غرور چھلک چھلک جائے گا۔ اُس کی رنگینی سے میرا دل وفورِ مسرت سے اچھل اچھل پڑے گا اور اُس کی خوشبو سے میرا مشامِ جان تا دمِ آخریں معطر رہے گا۔ کیونکہ

"اے اسماء یہ پھول تُو نے مجھے دیا تھا"

"تاج"

میری محبوبہ میرے دل سے اس قدر نزدیک ہے جتنا چراگاہ کا پھول زمین سے۔ وہ میرے لئے ایسی شیریں ہے جیسے تھکے ہُوئے اعضا کے لئے نیند۔ اُس کی محبت میری زندگی ہے اور اُس دریا کی طرح لبریز ہو کر بہ رہی ہے جو فصلِ خزاں کی طغیانی میں نہایت سنجیدہ بے پروائی سے بھاگتا چلا جاتا ہے۔ میرے گیت میری محبوبہ کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہیں جیسے ندی کی روانی اپنی تمام لہروں اور موجوں کے ساتھ گاتی چلی جاتی ہے۔

"ٹیگور"

آنکھوں کی زبان

عربی سنسکرت میں مذہب کی بحث۔ اُردو ہندی میں سیاست کا جھگڑا۔ باقی جتنی اور زبانیں ہیں اُن میں بھی یہ قصہ کہ محنت کرنے سے آتی ہیں اور مشقت کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ عربی سنسکرت میں محنت کروں تو ایمان ہاتھ آئے اور ہندی سیکھوں تو سیاسی قوت پیدا ہو۔ ان کے سوا ہر زبان کی محنت بیکار اور فضول ہے۔ انگریزی زبان سیکھنے میں سُنا ہے روٹی ملتی ہے۔ مگر مجھے اس کی سند اور دلیل نہیں ملی۔ مَیں تو جس نان بائی کے پاس گیا اُس نے کبھی روٹی دیتے وقت انگریزی جاننے کی شرط نہ لگائی۔ بنیئے نے آٹا تولا تب بھی انگریزی زبان جاننے کو نہ پوچھا ÷

اس میں شک نہیں کہ ہر زبان محنت کرنے سے آتی ہے۔ مگر مَیں محنت ہمیشہ اسی کام میں کرسکتا ہوں جس کا نتیجہ معلوم ہو۔ بے نتیجہ کام کے لئے تو ہاتھ کو حرکت دینا بھی دوبھر معلوم ہوتا ہے ÷

آج کل مَیں نے دیکھا۔ مذہبی جھگڑے اور سیاسی فساد اتنے بڑھ گئے ہیں کہ عربی اور سنسکرت۔ اُردو اور ہندی کسی زبان میں جی نہیں لگتا۔ اور بے اختیار خواہش ہوتی ہے کہ ایک ایسی زبان سیکھوں جو مذہب۔ سیاست تمدن اور ہر قسم کے بکھیڑوں سے پاک صاف ہو۔ بغیر سیکھے آجائے اور بلا محنت کئے حاصل ہو جائے۔ نہ کتاب میں لکھی جاسکتی ہو۔ نہ زبان سے پڑھی جائے نہ اس کا کوئی اسکول ہو۔ نہ اُستاد ہو۔ نہ شاگرد ہو۔ میری یہ خواہش ذاتی ہے۔ قومی اور ملکی نہیں ہے۔ جب کبھی اپنے وجود اور اپنے پیکر کا تصور کرتا ہوں اُس کو اتنا بڑا اور گونا گوں پاتا ہوں کہ افراد بیرونی انسان ہوں یا حیوان جمادات ہوں یا نباتات سب ماسوا اور غیر معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ غیر اور ماسوا کا ترک مجھ کو اچھا نظر آتا ہے۔ مجھ کو یاد ہے عربی سیکھنے میں مولوی صاحب نے مجھ کو بہت مارا ہے۔ خیال کا بدن گزری ہُوئی قمچیوں سے اب تک زخمی ہو رہا ہے۔ راتوں کو جاگتا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے آنکھوں کو بھگوتا تھا۔ نیند اور شباب کی نیند سے لڑتا تھا۔ جب فَعَلَ۔ فَعَلَا۔ فَعَلُوا کے صیغے یاد ہوتے تھے۔ اس پر بھی مولوی صاحب کو صبر نہ آتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ رات بھر میں ساری عربیت پر عبور ہوجائے۔ آج اپنے اُن شفیق اُستاد کے احسان کو اپنے علمی کندھوں پر دیکھتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ کاش ایسی زبان سیکھتا جس میں نہ محنت کرنی پڑتی۔ نہ راتوں کو جاگنا ہوتا نہ مار کھاتا نہ کسی کا احسان اُٹھاتا ÷

مگر خدا کی قدرت کے قربان جائیے کہ اُس نے ایسی ہی زبان کا پتہ آج بتادیا جس کو چاہتا تھا۔ اگرچہ بڑھاپے کے دروازے پر پہنچ کر یہ نعمت ملی تاہم خوب ملی۔ اور بہت ہی خوب ملی ÷

یورپ میں ایک زبان اسپرنٹو نکلی ہے جو کہتی ہے۔ کہ میں سب قوموں کو رفتہ رفتہ ہم زبان بنادُونگی۔ مجھے تو اُمید نہیں کہ اس کا یہ ارادہ درست ہوسکیگا۔ خدا نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ زبانوں کا اختلاف خدا کی پہچان کی ایک نشانی ہے۔ پھر بھلا خدا اس اختلاف کو آدمی کی کوشش سے دور کردے گا؟ ہرگز نہیں۔ یہ اختلاف تو ہمیشہ رہیگا اور خوب رہیگا ÷

مجھ کو جو زبان تعلیم کی گئی ہے وہ آدمی کی کوشش اور کسب سے پاک اور جُدا ہے۔ اس میں نہ حروف ہیں نہ

زیریں نہ زبریں۔ نہ بیشی ہیں نہ مرکز اور مد ہیں۔ وہ نہ ایشیائی ہے نہ یورپی ہے نہ افریقی ہے نہ امریکی ہے وہ تو ہر جگہ ہے ہر ملک میں ہے ہر قوم میں ہے۔ ہر شہر میں ہے اور ہر گھر میں ہے۔

یہ جس قدر زبانیں دُنیا میں مروج ہیں مصنوعی اور بناوٹی ہیں۔ قدرتی ان میں ایک بھی نہیں۔ نیچرا اور فطرت کے موافق وہ چیز ہے جو خود بخود ہو۔ کسی بیرونی درس اور کسب کے ماتحت نہ ہو۔ جیسے بھوک اور پیاس کسی تعلیم کی محتاج نہیں ہے اور جیسے تکلیف اور راحت کا حس بیرونی تعلیم کے بغیر ہر آدمی کو ہوتا ہے اور جیسے کہ نیند کسی کے سکھانے سے نہیں آتی فطرتی تقاضے سے آتی ہے اسی طرح زبان بھی نیچرل وہ ہے جو نیند اور بھوک کی طرح تعلیم بیرونی سے آزاد اور بے تعلق ہو۔

دانتوں کے پاس۔ تالو کے نیچے۔ دونو کلوں کے وسط میں گوشت اور پٹھوں کا بنا ہوا ایک عضو ہے جس کو زبان کہا جاتا ہے مگر حقیقت میں یہ چکھنے والی قوت کا دروازہ ہے جس طرح کان سننے۔ آنکھ دیکھنے اور ناک سونگھنے کو بنی ہے۔ اسی طرح زبان کا کام چکھنا اور ذائقہ کا معلوم کرنا اور کھانے میں دانتوں کو مدد دینا ہے۔ بولنا اس کے فرائض میں نہیں ہے۔ قدرت نے کان دو دئے ہیں۔ آنکھیں بھی دو ہیں۔ ناک کے نتھنے بھی دو ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے فرائض زیادہ ہیں۔ اور زبان چونکہ ایک ہے لہذا اس کی نوکری کم ہے۔ آدمی زبان سے بولنے۔ کھانے اور پینے اور چکھنے وغیرہ کے متعدد کام لیتا ہے جو بالکل ناجائز اور قدرت کے منشا کے خلاف ہے۔

ہر قوم اور ملک کے بولنے والے اپنی بولیوں کو زبان کہتے ہیں حالانکہ زبان سے بولی کو کچھ تعلق نہیں۔ بولی دماغ سے سمجھی جاتی ہے اور دماغ ہی اس کے الفاظ مہیا کرتا ہے حلق۔ تالو۔ دانت۔ گلے اور زبان مل جل کر ان الفاظ کی ایک آواز بناتے ہیں۔ اور آدمی اس آواز کو باہر نکالتے ہیں۔ پس جبکہ الفاظ کی آواز مشترکہ قوت عمل سے بنتی ہے تو محض زبان کو بولی کا قائم مقام کہنا اور سمجھنا غلطی ہے اور دانتوں۔ کلوں۔ حلق اور سانس کے ساتھ بے انصافی ہے کہ کام کریں سب مل کر اور نام ہو فقط زبان کا۔ حالانکہ زبان اعضا کی مشترکہ کمپنی کا ایک معمولی ممبر ہے۔

زبان میں ایک نقص اور ہے کہ وہ ملک و قوم کی عادات و خصائل سے متاثر ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک قوم ٹ۔ ڈال۔ ڑ۔ ادا نہیں کر سکتی اور باوجود کوشش کے اس کی زبان پر یہ حروف نہیں آ سکتے۔ جیسے اہل پنجاب قاف بمشکل ادا کرتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر صاحب اور ظفر علی خاں صاحب کے سوا اکثر نامور اردو دان پنجابیوں کو دیکھا اور سُنا کہ اُن کی زبان سے قاف نہیں نکلتا۔ یہ زبان کا بہت بڑا نقص ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان کا فرض بولنا نہیں ہے اور بولیوں کا زبان کے عضو پر منحصر رکھنا بالکل خلاف فطرت ہے۔

طبی اعتبار سے بھی عضو زبان سے بولی کا کام لینا بہت مضر ہے۔ اگر سانس کم خرچ ہوں تو آدمی کی عمر میں اضافہ ہوگا اور اس کی جسمانی مشین جلدی خراب نہ ہوگی۔ زبان کو بولنے کی خدمت انجام دینی پڑتی ہے تو سانس زیادہ خرچ ہوتے ہیں اور وہ جلدی جلدی الفاظ کے ساتھ باہر آتے جاتے ہیں۔ آدمی زبان سے نہ بولا کرے تو اس کی عمر بہت بڑھ جائے اور وہ بہت کم بیمار ہو۔ اکثر بیماریاں اور کمزوریاں زیادہ بولنے سے ہوتی ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ سانس زیادہ خرچ ہوتے ہیں اور وہ ہاضم لعاب دہن جو کھانا چبانے کی اعانت کے لئے قدرت نے بنایا ہے زبان کو بولنے میں مصروف رکھنے سے یا تو کمزور ہو جاتا ہے یا اس کی وہ خاصیت نہیں رہتی اور یا آدمی اس کو

تھوک تھوک کر ضائع کر دیتا ہے۔ کیونکہ زیادہ بولنے میں بعض لوگ تھوکتے بہت ہیں یا وہ خود خشکی و حرارت سے سوکھ جاتا ہے اور یا اس میں نقص بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ جب حلق کی خشکی اور گرمی کے دور کرنے کو جو زیادہ بولنے سے پیدا ہوتی ہے انسان پانی پیتا ہے تو قدرتی رطوبت کی قوت لعابی فنا ہو جاتی ہے۔

قصہ مختصر ان تمام حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان کی بولی قدرتی نہیں ہے اور اس کو رفتہ رفتہ چھوڑنا چاہئے اور وہ بولی اختیار کی جائے جو قدرت اور فطرت کے موافق ہے اور وہ قدرتی بولی کا آلہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آنکھیں ہیں۔ جہاں زبانیں عاجز ہو جاتی ہیں وہاں آنکھیں ہی کام دیتی ہیں۔ آنکھ کبھی نہیں گھبراتی۔ اُس کو کبھی لڑکھڑاتے نہیں دیکھا۔

اس کائنات میں ہر ہستی مخلوق آنکھ سے بات کرتی ہے۔ سورج زبان سے کبھی نہیں بولتا۔ آنکھ سے اپنا مطلب ادا کرتا ہے۔ یہ دھوپ کی شعاعیں اُس کی نظروں کے تار ہیں جو ہم سے باتیں کرتے ہیں۔ چاند بھی آنکھ سے بولتا ہے۔ تارے بھی آنکھوں سے چُھپکے چُھپکے کیا باتیں کیا کرتے ہیں۔ ہوا اور بجلی کا جسم نظر آ سکے تو اُس کی بولی بھی آنکھوں میں پائی جائیگی۔

سمندر کی موجیں اُس کی آنکھیں ہیں جو طوفانی اور غیر طوفانی حالت کا پتہ بتاتی ہیں۔

جتنے حیوان ہیں وہ سب آپس میں آنکھوں کے ذریعہ بات کرتے ہیں۔ کوئی شخص غور کرے تو اُن کی آنکھوں کی گفتگو سمجھ سکتا ہے۔ محبت کے وقت اُن کی آنکھ کی حالت کچھ ہوتی ہے۔ نفرت و عداوت کے وقت کچھ اور خوف و وحشت کے وقت کچھ اور۔ ہم کو اس طرف توجہ نہیں ہے ورنہ ہم اس قدرتی زبان کو بہت جلدی سیکھ لیں۔

انسان کا بچہ مدتوں آنکھ سے بولنے کی کیفیت دکھاتا ہے۔ مگر آدمی مجبوراً اُس کو زبان سے بُلواتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پیدائش کے بہت عرصہ بعد بولنا سیکھتا ہے۔ مگر آنکھ کی بولی وہ پیدا ہوتے ہی شروع کر دیتا ہے۔

شہنشاہ اکبر نے زبانوں کی تحقیقات میں بہت کوشش کی تھی اگر اُس کو معلوم ہوتا کہ زبان کا کام بولنا نہیں ہے تو وہ آنکھوں کی بولی کا رواج دیتا۔ اور اسی کی تحقیقات میں وقت خرچ کرتا۔

مجھے یہ قدرتی فلسفہ کس نے بتایا

میں بھی سب آدمیوں کی طرح زبان ہی کو بولی کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ مگر ایک حسین مرنے والے کی چشم جادوگر نے میری اس رائے کو بدل دیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ بولنا آنکھوں کا کام ہے زبان کا نہیں ہے۔

انفلوانزا کی وبا تمام جہان میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں ایک بہت خوبصورت بیمار کے بستر کے پاس بیٹھا تھا۔ یہ وہ بیمار تھا جس کی آنکھوں کی دنیا میں ہزاروں آدمی اصلی موت مر چکے تھے۔ (میں عشق کی موت کو اصلی مرنا تصور کرتا ہوں) میں نے دیکھا کہ مریض کا حلق بھنچ گیا ہے۔ آواز بیٹھ گئی ہے اور وہ ایک لفظ کیا ایک حرف بھی زبان سے ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ بڑے بڑے ڈاکٹر بڑے بڑے دیسی حکیم اس کے پاس بیٹھے ہیں۔ قرابت داروں اور دوستوں کی بے قراری چاروں طرف گھری ہوئی ہے خصوصاً ماں کی بے قراری تو دیکھی نہیں جاتی۔ مگر کسی شخص کا بس نہیں چلتا کہ بیمار کی تکلیف کو دور کر سکے۔ یا کم سے کم کچھ حصہ بٹا لے۔

سب سے بڑی قیامت یہ تھی کہ بیمار کے ہوش و حواس درست تھے۔ دماغی احساس میں فرق نہ آیا تھا۔ وہ ہر شخص کو پہچانتا تھا۔ وہ ہر چیز کو جانتا تھا۔ وہ ہر بات کو سمجھتا تھا۔ مگر افسوس زبان سے بول نہ سکتا تھا۔ اس کی

حالت عرب کے ایک شاعر نے کیا خوب دکھائی تھی :-

نَظَرَتْ اِلَیْکَ بِحَاجَۃٍ لَمْ تَقْضِھَا
نَظَرَ الْمَرِیْضِ اِلیٰ وُجُوْہِ الْعُوَّدِ

(اس محبوبہ نے تیری طرف ایک ایسی خواہش سے دیکھا جس کا پُورا کرنا تیرے امکان میں نہ تھا جس طرح کہ بیمار اپنے عیادت کرنے والوں کو دیکھتا ہے۔ جس کی بیماری وہ دُور کرنے کی قدرت نہیں رکھتے)۔

اس جانِ عالم بیمار کی بیکسی دیکھی نہ جاتی تھی۔ خبر نہیں اس کو کیا تکلیف تھی اور اس پر اس تکالیف نے کیا قیامت برپا کر رکھی تھی۔ وہ تو آنکھوں سے اُس کو بیان کر رہا تھا۔ مگر ہم لوگ ناواقفیت کے سبب اس کو سمجھتے نہ تھے۔

لاچاری اُس کی آنکھوں میں آنسو لاتی تھی اور آنسو پلکوں کے پاس تھرتھراتے ہوئے آتے تھے اور کچھ کہتے تھے مگر کوئی اُن کی بات نہ سُنتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ چیختے چیختے پلکوں کی جڑوں میں غش کھا کر گر پڑتے تھے۔ اور پلکیں اُن کو اپنی جنبش سے نیچے گرا دیتی تھیں۔

مَیں دیکھتا تھا مریض کی آنکھ جب ڈاکٹر پر جاتی تھی تو اُس کے تیور کچھ اَور کہتے تھے اور جب قرابت داروں کو دیکھتی تھی تو اُس کا انداز کچھ اَور ہو جاتا تھا اور گود میں کھلانے والی ماں کو دیکھتے وقت اُن کی کیفیت کچھ اَور ہوتی تھی۔ اور اپنے حُسن کے فداکاروں کی دید میں اُن آنکھوں کا عالم ایک اَور ہی نرالی شان اختیار کرتا تھا۔

نگاہوں کا یہ تفاوت مجھ کو آنکھوں کی زبان کا فلسفہ بتلانے والا ثابت ہُوا اور فوراً میرے ذہن میں آیا کہ بیمار آنکھوں سے کچھ کہہ رہا ہے اور اس کا کہنا سب سے الگ الگ ہے۔ ڈاکٹر سے کہتا ہے میرا کچھ اَور علاج کرو۔ قرابت داروں سے کہتا ہے دوڑ دھوپ اور کوشش میں کسر نہ اُٹھا رکھو۔ ماں سے کہتا ہے تم ہراساں اور مایوس نہ ہو۔ دوستوں سے کہتا ہے اب تم کسی دُوسرے پری چشم سے دل لگاؤ گے اور مجھ کو بھول جاؤ گے۔

کسی نے سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو میں نے تو آنکھوں کی اس گفتگو کو سمجھ کر سب کی طرف سے جواب دیا۔ اور ہر جواب کو اُس کی آنکھوں نے اس طرح قبول کیا گویا وہ تسلیم کرتی ہیں کہ ہماری یہی گفتگو تھی اور تُو نے اُس کو خوب سمجھا۔

تم دیکھتے نہیں غُصّے کی آنکھ بغیر زبان کے سہارے کے بتا دیتی ہے کہ میرے مالک کو اس وقت غُصّہ ہے اور محبت کی آنکھ نفرت اور عداوت کی آنکھ۔ خوشامد اور چاپلوسی کی آنکھ سب کی سب زبان سے بات کئے بغیر دل کا حال کر دیتی ہیں۔

لوگوں نے قیافہ کا علم نکالا ہے جس کی بنا پر وہ اچھے بُرے کی تمیز کر لیتے ہیں۔ قیافہ میں عضو چشم کو بڑا دخل ہے۔ آنکھ کی بناوٹ۔ آنکھ کی چمک۔ آنکھ کی سُرخی۔ آنکھ کی رنگت سے خصائل و عادات کا پتہ چلا لیا جاتا ہے۔ اگر قیافہ دان لوگ آنکھ کی زبان کے فلسفہ پر غور کریں گے تو اُن کو معلوم ہوگا کہ اُن کے اصول مقررہ ایک جداگانہ سمت کی طرف چلے گئے اگر وہ ان سے آنکھ کی گویائی کا نتیجہ نکالتے تو انسان کو بہت فائدہ ہوتا۔ گو اب بھی اُن کے اصول نادانستہ طور پر کلامِ چشم کے شاہد و معاون ہیں۔

وہ زمانہ کس تندرست و نوجوان کو یاد نہیں جبکہ زبان کے الفاظ اُس کے دُشمن ہوتے ہیں اور آنکھ کے حروف اُس کی مونسی و ہمدمی کا حق ادا کرتے ہیں وہ جس کو دیکھتا ہے تو کیا اس سے بولنے کی قدرت بھی اس کو ہوتی ہے ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ حجاب۔ خوف رسوائی۔ اندیشہ بدگمانی اُس کی زبان کو حرکت نہیں کرنے دیتا۔ اور وہ بے بسی سے کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہے۔ مگر آنکھیں اس وقت اس کی غمخواری کرتی ہیں اور دیدہ ہی دیدہ میں ایسی موثر فریادوں کی بولی ادا کرتی ہے کہ سامنے والا اس کو سمجھ جاتا ہے اور اپنی تشانہ باز

آنکھوں سے کبھی شرم میں کبھی شوخی میں کبھی آرزوئے گرفت میں اُس کے سخن عشق کا جواب دے دیتا ہے ٭

کوئی سنجیدہ مزاج بڈھا اعتراض کرے کہ چشم حُسن کی مثال کو پیش کرنا اخلاق کی آوارگی ہے تو میں جلدی سے اپنے جذبات پُرخروش کو منہدم کرلوں گا اور کہوں گا۔ کہ جناب عالی حاکم کی چشم حکمراں کو دیکھئے۔ تاجر کی چشم دولت پرست کو دیکھئے۔ مسکین و فقیر کی سوالی آنکھ کو دیکھئے۔ وہ سب کچھ بولا کرتی ہیں۔ اُن کی دید میں ہمیشہ ایک کلام ہُوا کرتا ہے۔ حاکم جب مقدمہ کا فیصلہ سناتا ہے تو اُس کی آنکھ ہارنے والوں کو کسی اَور نظر سے دیکھتی ہے اور جیتنے والوں پر کوئی اَور نگاہ ڈالی جاتی ہے اور یہ فرق و تفاوت ہی آنکھ کی بولی ہے ٭

بچہ ماں باپ کو محبت سے دیکھتا ہے۔ خوف و ہراس سے دیکھتا ہے۔ کسی چیز کی خواہش و طلب سے دیکھتا ہے اور ہر دید کا مقصد بھی الگ معلوم ہو جاتا ہے اور اس کے تیور بھی علیحدہ پہچان لئے جاتے ہیں ٭

کُتے کی آنکھ کہ دیتی ہے کہ وہ دُشمنی سے دیکھ رہا ہے۔ یا دوستی سے۔ اسی طرح دوست دُشمن کی پہچان آنکھوں کے تیور سے انسان بھی کر لیتے ہیں۔ یہ عمل تو جاری ہے مگر توجہ اس طرف نہیں ہے کہ آنکھوں کی زبان کی مشق بڑھائی جائے ٭

مَیں نے اُوپر دعویٰ کیا ہے کہ زبان کی بولی کسب اَور محنت پر منحصر ہے اور آنکھ کی بولی بالکل نیچرل اور فطرتی ہے جس میں سیکھنے کی محنت کا دخل نہیں۔ اگر کوئی شخص اعتراض کرے کہ آنکھ کی بولی بھی مشق کی محتاج ہے تو مَیں کہوں گا ہرگز نہیں۔ چونکہ ہم سب دُنیا والے عرصۂ دراز سے ایک ذاتی پیدا کردہ عادت میں مبتلا ہیں اس واسطے مشق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اگر سب کے سب آنکھوں کی زبان بولنے لگیں تو پھر نہ مشق کی ضرورت ہوگی نہ غور و خوض کی۔ کیونکہ اب بھی زبان کی معطلی کے وقت آنکھ بغیر کسی مشق کے بولتی ہے اور سب اس کا مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے بچہ اور بیمار و معشوق کی مثالوں سے اُوپر سمجھا گیا ہوگا ٭

ضرورت زبان کے معطل ہونے یا معطل کرنے کی ہے۔ یہ ہو جائے گا تو آنکھوں کی زبان بغیر مشق و محنت کے کام دینے لگے گی ٭

کتابوں میں جو تحریر ہوتی ہے۔ اُس کو آنکھیں ہی لکھتی ہیں اور آنکھیں ہی پڑھتی ہیں۔ زبان اس وقت معطل ہوتی ہے۔ اس کے اندر ایک گہری دلیل آنکھوں کے بولنے کی ہے۔ آنکھوں کی یہ بولی دیرپا ہے۔ اور زبان کی بولی کا سوائے گراموفون کے اَور کوئی تحفظ خانہ نہیں ہے ٭

زبان کھانے کو بنی ہے۔ حلق اور آواز گانے کو۔ دانت چبانے کو۔ بولنا کام آنکھ کا ہے ٭

عرب نے کہا تھا "مَنْ سَکَتَ سَلِمَ۔ وَمَنْ سَلِمَ نَجَا" جو چُپکا رہا۔ سلامت رہا۔ اور جو سلامت رہا اُس نے نجات پائی۔ عقل جدید کہتی ہے بولنے میں زندگی ہے چُپ رہنے میں موت ہے۔ اس اختلاف کا سدباب بھی اس سے ہو جائے گا کہ آنکھ سے بولو۔ جس کا بولنا بمنزلہ سکوت کے ہے۔ اور زبان کو چُپکا رکھو تاکہ یہاں کی بھی نجات ہو اور وہاں کی بھی ٭

"حسن نظامی"

اگر آسمان مع اپنے تمام ستاروں کے اور دُنیا مع اپنی لازوال دولت کے مجھے مل جائے جب بھی میرا دامن طمع دراز ہی رہے گا۔ لیکن میں زمین کے ایک چھوٹے سے چھوٹے گوشے پر بھی مطمئن ہو سکتا ہوں اگر صرف "وہ" میری ہو جائے ٭

"ڈاکٹر ٹیگور"

پیامِ خروش

سحر رسید بگوش دلم صدائے سروش
کہ خیز و گیر صراحی بکف سبو بر دوش

بلا کے خوگر غفلت کو جام بادۂ ہوش
سکوتِ محفلِ ملت کو دے پیامِ خروش

نوائے غم کو بنا آشنائے پردۂ گوش
کہ بزم دہر میں ہے سازِ عافیت خاموش

بنوش بادہ و رندی کن و بہ عیش گزار
مگر بہ پیشِ حریفاں مشو ضمیر فروش

چو زندۂ بشنو شعر حافظ شیراز
کہ بُرد از دلِ رنداں قرار و طاقت و ہوش

"بہ بانگ چنگ بگوئیم آں حکایت ہا
کہ از نہفتنِ او دیگ سینہ می زد جوش
شراب خانگی از بیم محتسب تا کے
بروئے یار بنوشیم و بانگ نوشا نوش"

"گمنام"

عیدِ باراں

وہ بھیجا ابرِ دربار خالق کی عطاؤں نے
اثر آخر دکھایا تشنہ کاموں کی دعاؤں نے

منادی رعد نے کی آمدِ بارانِ رحمت کی
دیا بے تار پیغامِ طرب ٹھنڈی ہواؤں نے

دکھایا خود نمائی نے جو حسنِ برق کا جلوہ
چھپایا منہ نقابِ ابر میں اُس کا حیاؤں نے

گہر برسے فلک سے لعل و نیلم خاک سے نکلے
جواہر ریزیاں کیا کیا دکھائی ہیں گھٹاؤں نے

وہ آبِ زندگی برسا۔ زمینِ مردہ جی اُٹھی
دکھایا بن کے ظلماتِ خضر کالی گھٹاؤں نے

غضب ہے ابروئے قوسِ قزح کا غمزۂ رنگیں
نگاہوں کو بنایا خوں بجاں اس کی اداؤں نے

لگایا ناخنِ قوسِ قزح نے زخمۂ رنگیں
سماں باندھا ہے کیا سازِ تماشا کی نواؤں نے

مچی ہیں رنگ رلیاں جنگلوں میں سبزہ و گل کی
منائی عیدِ باراں باغ کے رنگیں قباؤں نے

سُریلے راگ سُوجھے مطربانِ بزمِ فطرت کو
اُڑائیں چھوٹ کی تانیں چمن کے خوشنواؤں نے

تمناؤں میں جوش اُٹھے جنوں کو وحشتیں سوجھیں
جگایا آرزوے خفتہ کو ٹھنڈی ہواؤں نے

اثر برسات کا اُلٹا ہوا۔ نیرنگ! فرقت میں
لگا دی جان و تن میں آگ سی ٹھنڈی ہواؤں نے

حبیب

استغنائے نومیدی

ہاں! زمانہ تھا کہ تھا دامنِ اُمید بکف — رُوح تھی جامِ مئے عشرتِ جاوید بکف
رہتی تھی ہر شبِ ارماں سحرِ عید بکف — آج دل داغِ تمنّا سے ہے خورشید بکف

یعنی اب وہ سروسامانِ مسرّت نہ رہا — قلبِ آرام کا شرمندۂ منّت نہ رہا
سازِ ہستی میں مرے نغمۂ راحت نہ رہا — ذائقہ زیست کا ممنونِ حلاوت نہ رہا

اب نہ اُمید ہے باقی نہ تمنّا باقی — حوصلہ کوئی نہ باقی نہ ارادا باقی
شورشِ ولولۂ دل میں نہیں حاشا باقی — بسترِ یاس پہ ہُوں اب تو ہے مرنا باقی

ہے نہ کچھ اُن سے شکایت نہ مقدّر سے گلا — کہ میں اب جان گیا فلسفۂ مہر و وفا
اِن دنوں گورِ غریباں سے میں اکثر گزرا — مرقدِ مانیؔ مرحوم کا دیکھا کتبا
"دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہُوا"
"ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہُوا"

اب دل افروزئ عشرت نہ بہم ہو، نہ سہی — رُوح فرسائے اندوہ نہ کم ہو، نہ سہی
نالہ میرا نہ حریفِ شبِ غم ہو، نہ سہی — جور اُن کا نہ مبدّل بہ کرم ہو، نہ سہی

وقفِ بیداد رہوں، دادِ محبّت نہ ملے — نہ ملے آہ! مجھے اجرِ مصیبت نہ ملے
دم نکل جائے جزائے غمِ فرقت نہ ملے — ہاں! میں راضی صلۂ کاہشِ اُلفت نہ ملے

ہر نفس موردِ صد کلفت و آلام رہے — حسرت و یاس نصیبِ سحر و شام رہے
ہاں! مری جانِ وفا کوش غم انجام رہے — یعنی تقدیرِ محبّت یونہی ناکام رہے

وہ مرے دردِ جُدائی کا مداوا نہ کریں — فکرِ تسکینِ دلِ مضطرب اصلا نہ کریں
صرفِ عیسیٰ نفسی مجھ پہ گوارا نہ کریں — یہی اچھا، کہ وہ بیمار کو اچھّا نہ کریں
لب ہلیں شکرِ مسیحا میں یہ دم بھی نہ رہا — ضعف یہ ہے کہ سرِ بارِ کرم بھی نہ رہا

حیاتِ جاوید

نورِ سحر کی ہوتی ہے عالم میں جب نمود
اُٹھتی ہے خوابِ ناز سے ہنگامہ گستری

چہرے پہ خون مل کے نکلتا ہے آفتاب
دُنیا کے کاروبار میں کرتا ہے رہبری

ذرّوں کو آکے پیار سے لیتا ہے گود میں
ہر ایک شے کی کرتا ہے جا جا کے دلبری

جلتا ہے اس لئے کہ زمانے میں نور ہو
ہر دم نظر میں اہلِ جہاں کی ہے بہتری

مصروفِ کار رہ کے جہاں میں تمام دن
کرتا ہے طے منازلِ گردونِ اخضری

آخر شفق کی چادرِ خونیں کو اوڑھ کر
سوتا ہے شب کی گود میں خورشیدِ خاوری

ہوتے ہیں انجم و مہ و اختر فروغ یاب
بنتے ہیں شمعِ انجمنِ چرخِ چنبری

مانندِ مہر ہے شہدا کا بھی ماجرا
روشن ہے جن کے نور سے بزمِ وفاگری

خورشید وار ماتھے چمکتے ہیں نور سے
رُخ سے ہے آشکار ضیائے پیمبری

مخلوق کے لئے ہے ودیعت رکھی ہوئی
سینوں میں شفقتِ پدری حُبِّ مادری

مقصد ہے اُن کی ہستیٔ روشن مثال کا
حق داری عدل گستری و داد پروری

پیشِ نظر ہے آئینۂ تیغِ آبدار
رقصاں ہے جس سے جلوۂ رُخسارِ صفدری

سوتے ہیں وہ بھی خون کی چادر کو اوڑھ کر
ہے مستنیر جس سے رُخِ ماہِ مہتری

مرتے ہیں اس لئے کہ ملے غیر کو حیات
دیتے ہیں خاک والوں کو پیغامِ برتری

دونو جہاں میں خوں ہے شہیدوں کی آبرو
سُرخی ہے اس کی پرتوِ خورشیدِ سروری

خونِ شہید ہے ابدی زندگی کا نور
یہ واقعہ ہے اس میں نہیں دخلِ شاعری

سورج غروب ہو کے نکلتا ہے صبحدم
خونِ شفق سے سر پہ ہے اکلیلِ افسری

برگِ حنا کی موت حسینوں کے ہاتھ پر
لاتی ہے شانِ دلبری و آنِ خودسری

پوشیدہ ہیں شہید زمانے کی آنکھ سے
تاباں ہے اُن کے خون سے صبحِ دلاوری

دل پر ترے ہے پردۂ ظلمت پڑا ہوا
اُن کو جو تو سمجھتا نہیں موت سے بری

پہلے ہو آفتابِ شہادت سے مستنیر
پھر کر جہاں میں خضر و مسیحا کی ہمسری

رہنا ہے گر جہاں میں تو جی حق کے واسطے
روباہ حق میں ہوتی ہے شانِ غضنفری

انوارِ حق سے زندۂ جاوید ہیں شہید
شاہد ہے اس پہ آئینۂ تیغِ حیدری

اس آئنے میں دیکھ جمالِ حیات کو
پیدا کر اس سے پھر شہدا کے ثبات کو

"محمد اکبر منیر"

کلامِ تپش

(جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش)

شکستِ عہدِ اُلفت باعثِ آرامِ جاں کیوں ہو
قفس کا ٹوٹ جانا سازگارِ آشیاں کیوں ہو

بلند و پستِ عالم گر نہ ہو خمیازۂ ہستی
زمیں پاؤں کے نیچے کیوں ہو سر پر آسماں کیوں ہو

نزاکت نے بچا ہی ظالم کھینچنا ہے سرفروشوں کو
اگر تو کھینچ لے خنجر تو شوقِ امتحاں کیوں ہو

مقدر میں تو پامالِ عدو ہونا ہی لکھا تھا
سرِ شوریدہ میرا اُن کا سنگِ آستاں کیوں ہو

گراں ہے عذرِ جذبِ دل بھی او نامہرباں اچھا
اب اتنا بھی نہ پوچھیں گے کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

حجاب اُن کا مری تمکین ہے وہ ٹوٹا تو یہ چھوٹی
وہ کیوں بے پردہ آنکھیں عیاں رازِ نہاں کیوں ہو

بلطفِ خاص بھی بیداد سے کچھ کم نہیں ظالم
قیامت ہے مرے ہوتے عدو کا امتحاں کیوں ہو

نزاکت ان کی بن جائے اگر میری سبک روحی
تو پھر یہ پیار دل کی زندگی بارِ گراں کیوں ہو

تپِ غم سے نہ ہو گر ذوقِ گریہ شمع کی صورت
شرابِ اشکِ خوں آلود مغزِ استخواں کیوں ہو

وہ آئیں یا اجل دم جائے یا یہ غم مگر یا رب
مقدر میں جو کچھ ہونا ہے سب ہو ناگہاں کیوں ہو

تماشا نقشِ ہستی کیوں رہیں نقشِ قدم بن کر
کہ جب ہے خاک میں ملنا تو پھر باقی نشاں کیوں ہو

نشیمن اک طرف نظارۂ گل کے بھی لالے ہیں
بلائے آسماں تو خیر جورِ باغباں کیوں ہو

نہ ہو جب آگ ہی غم کی تو آہوں سے تپش مطلب
ہوئے جب راکھ جل بجھ کر تو پھر پیدا دھواں کیوں ہو

مقالاتِ حسرت

عشق اُن کے عاصیوں کا اک نورِ تام نکلا
گویا سحابِ شب سے ماہِ تمام نکلا

عشاقِ منتظر کو یہ صبحِ نو مبارک
خورشید اک نرالا بالائے بام نکلا

آخر یہ کیا ستم ہے اے مقصدِ تمنا
اک مجھ ہی خستہ جاں کا تجھ سے نہ کام نکلا

کس درجہ جاں فزا تھا نظارہ بزمِ مے کا
جب بعدِ صبحِ مینا خورشیدِ جام نکلا

وصلِ بتاں کی خواہش خوئے عوام ٹھہری
حسرت خیالِ خوباں سودائے خام نکلا

خیالاتِ رفعت

(جناب رفعت بخاری - پشاور)

محوِ خیالِ یادِ غمِ رفتگاں رہے
ہم اس چمن میں صورتِ برگِ خزاں رہے

وقفِ جبینِ غیر ہو جب آستانِ یار
سر کیوں نہ میرا دوش پہ بارِ گراں رہے

سارے جہاں میں غم کو کوئی پوچھتا نہیں
دل میں رہے نہ میرے تو آخر کہاں رہے

اُفتادگی وہ ہے صفتِ نقشِ خاکِ پا
کوئی اُٹھا سکا نہ ہمیں ہم جہاں رہے

مشتاقِ لذتِ خلشِ دردِ دل ہوں میں
تیرِ نگاہِ یار الٰہی کہاں رہے

کم تھا غمِ جہاں-غمِ عقبےٰ بھی دے دیا
اک جانِ ناتواں کو غمِ دو جہاں رہے

مال و متاعِ رہروِ ملکِ عدم یہاں
مانندِ گردِ راہ پسِ کارواں رہے

ارمانِ دل نہ چھوڑنا پیکانِ یار کو
خاطر یہ میزباں کی نہ مہماں گراں رہے

جس کو تلاشِ جلوۂ دیدارِ یار ہو
پہلے وہ آپ اپنی نظر سے نہاں رہے

رفعت نگیں کی طرح ہو وقفِ نمودِ غیر
بندے خدا کے-بندۂ عشقِ بتاں رہے

جنوری سنہ ۱۹۱۹ء

سے

کہکشاں بلحاظ مضامین اور بلحاظ صورت ظاہری پچھلے چار نمبروں کی نسبت بھی زیادہ دھوم دھام سے شائع ہُوا کریگا۔ ملک کے فاضل مضامین نگاروں اور انشا پردازوں کے مضامین موصول ہو رہے ہیں۔ سرورق بہت شاندار اور دلفریب بنوایا گیا ہے۔ اڈیٹوریل میں بہت سی خوشگوار تبدیلیاں واقع ہونگی۔ غرض کہکشاں روز بروز صوری و معنوی دونو حیثیتوں سے ترقی کر رہا ہے اور کریگا۔ جو لوگ بہترین ادبی رسالوں کی تلاش میں سرگرم رہتے ہیں اُن کو مژدہ ہو کہ کہکشاں اُن کے مُدعا کو بہت خوش اسلوبی سے پورا کرے گا۔ خریداری کی درخواستیں دھڑا دھڑ موصول ہو رہی ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں۔ کہکشاں کے پاس ایسے قابل انشا پرداز موجود ہیں۔ جن کے ہر لفظ کو ادبی دُنیا آنکھوں پر رکھتی ہے ؎

قیمت سالانہ چار روپے (للعہ) فی پرچہ ۶/

مینجر سنٹرل پبلشنگ ہوس لاہور

پنجابی سٹیم پریس لاہور میں باہتمام لالہ جیگوپال ٹنڈن کے چھپا اور دفتر رسالہ کہکشاں لاہور سے سید ممتاز علی مالک و
مینیجر نے شائع کیا

اُردو کا ادبی رسالہ

کہکشاں

مرتبہ

امتیاز علی تاج

مقام اشاعت

دارالاشاعت پنجاب لاہور

قیمت سالانہ چار روپیہ

فی پرچہ چھ آنہ

تنبیہ۔ جتنے مضامین کہکشاں کے اس نمبر میں درج کئے گئے ہیں۔ ان سب کے حقوق محفوظ ہیں:-

ریویو

گہوارۂ تمدّن

کہکشاں کے مضمون نگارِ خصوصی مولانا نیاز فتحپوری محتاج تعارف نہیں۔ ان کے ذوقِ علمی اور مذاقِ ادبی کی بلندی کا ایک زمانہ قائل ہے + اس وقت وہ فرمانروائے بھوپال جیسے روشن خیال حکمران کے زیرِ سایہ علمی خدمات پر مامور ہیں۔ اور انہوں نے اپنی پہلی تصنیف "گہوارۂ تمدن" کے نام سے شائع کی ہے + اس کتاب میں نہایت شرح و بسط سے بتایا ہے۔ کہ آدم سے لے کر تا ایں دم عورت نے انسان کی انسانیت۔ شائستگی اور تمدن کی تعمیر میں بے انتہا کوششیں کی ہیں۔ اور جہد للحیات میں ہمیشہ مرد سے آگے رہی ہے + مرد کے لئے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے سامان مہیا کرنا۔ اس کے آرام کے لئے شبانہ روز کی محنت شاقہ برداشت کرنا۔ اناج بونا۔ ہل چلانا۔ کھیت کاٹنا۔ چکی ایجاد کرنا۔ آٹا پیسنا۔ روٹی پکانے کے اوزار دریافت کرنا اور روٹی پکانا۔ زندگی کے ہر شعبے میں بیش قیمت ایجاد کرنا یہ سب عورت کے کارنامے ہیں + اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عورت نے ابتدائے آفرینش سے دنیا کی تہذیب کے لئے جتنے کام کئے ہیں۔ مرد اُن سے دسواں حصہ بھی نہیں کر سکا۔ اور مردوں کی دنیا پر صنفِ لطیف کے بے شمار احسانات ہیں۔ باوجود ان تمام باتوں کے جب تہذیب و شائستگی منتہائے کمال کو پہنچ گئی۔ اور مرد بھی جنگل کے درندوں سے نکل کر درجہ انسانیت پر فائز ہوا۔ تو اس نے عورت جیسی کارآمد اور محسن ہستی پر سخت مظالم توڑے۔ اور اس کے احسانات کے عوض اس کے گلے میں غلامی کا طوقِ لعنت ڈال دیا +

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نیاز نے اس کتاب کی تصنیف کے لئے غیر زبانوں کی کتابوں کے ہزارہا صفحات پڑھے ہیں۔ اور نہایت غور و خوض کے بعد اس جامعیت سے لکھنے کے قابل ہوئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے۔ کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اُردو میں بے مثال اور پہلی تصنیف ہے۔ تو ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ بہرحال اُردو اور حامیانِ اردو کو مولانا کا شکرگزار ہونا چاہیئے۔ کہ انہوں نے اس کتاب سے ادبِ اُردو میں نہایت بیش بہا اضافہ کیا۔ کتاب جناب بیگم صاحبہ بھوپال کے نامِ نامی پر معنون کی گئی ہے۔ ڈیڈیکیشن اور اس کے بعد کے چند صفحات نیاز صاحب کی مخصوص ادبی دلفریبیوں سے معمور ہیں کتابت و طباعت کے لئے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ پریس کا نام کافی ضمانت ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مولوی قمر الحسن صاحب۔ علی گنج۔ بھوپال +

آپ بیتی خواجہ حسن نظامی

اقصائے مغرب میں یہ دستور عام ہے۔ کہ مشاہیر اپنے سوانح حیات خود اپنے قلم سے لکھتے ہیں۔ اس طرزِ عمل کے فوائد پوشیدہ نہیں۔ دوسرے سوانح نگار کی تحریر کے متعلق احتمال ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے کوئی واقعہ غلط لکھ دیا ہو۔ یا اسے

کسی خاص واقعہ کے متعلق کافی معلومات حاصل نہ ہوئی ہوں لیکن آپ بیتی لکھنے والے کی تحریر ہر طرح قابل وثوق و اعتماد ہوتی ہے، ہندوستان میں خود نوشت سوانح عمری کا رواج نہیں۔ اس بارے میں دہلی کے اس مشہور و معروف انشا پرداز نے پہل کی ہے۔ جو اپنی جدت طرازی کی وجہ سے مقبول خلایق ہے +

خواجہ حسن نظامی اپنے ہزاروں مریدوں کی معلومات بڑھانے اور ان کو ارشاد و ہدایت سے مستفیض کرنے کے لیئے عرصے سے ایک بہت ضخیم کتاب "الی اللہ پیر بھائی" لکھ رہے ہیں۔ اس میں انہیں ضروری معلوم ہوا۔ کہ اپنے حالات بھی قلمبند کریں۔ چنانچہ یہ آپ بیتی اسی کتاب کا ایک حصہ ہے + اس میں خواجہ صاحب نے اپنے خاندانی حالات۔ بزرگان تصوف سے استفادہ مصروفیتیں۔ بچپن کے حالات۔ زندگی کے نشیب و فراز۔ ظاہری و باطنی اختلاف حالات۔ اپنی تصانیف۔ اپنے اخلاق و عادات کے متعلق نہایت نیک نیتی سے مضامین لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی کمزوریوں کو بھی صاف صاف ظاہر کر دیا ہے۔ اور یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ غریبی اور گمنامی و بے سروسامانی کی حالت سے شہرت و تمول تک جو کچھ حالات و تجربات پیش آئے۔ وہ سب نہایت سلاست و سادگی سے لکھ دیئے ہیں تاکہ قوم کے نوجوانوں کو ترقی کے زینے پر چڑھنے میں وہ باتیں کام آئیں جو چالیس سال کے تجربے کا نچوڑ ہیں + آخر میں "لاہوتی آپ بیتی" کے عنوان سے اپنے مخصوص رنگ میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون کو سمجھنے کے لئے ناسوتیوں کا دماغ بیکار ہے۔ اس کے لئے "شاید" لاہوتی عقل" اور "لاہوتی مذاق" کی ضرورت ہے +

اس کتاب پر محترمہ خواجہ بانو صاحب جناب واحدی صاحب اڈیٹر نظام المشایخ۔ مولوی احسان الحق صاحب اڈیٹر اسوۂ حسنہ نے دیباچے لکھے ہیں۔ اور ان پر خود خواجہ صاحب نے ایک "دیباچوں کا دیباچہ" بھی چڑھا دیا ہے۔ اپنی دو تصویریں بھی شامل کی ہیں۔ ایک میں تو خواجہ صاحب صرف تہہ باندھے ننگے بدن تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ اور دوسری میں جبہ و قبا و کلاہ و پاپوش سے ایک شان تقدس پیدا ہے + غرض کہ یہ کتاب بھی خواجہ صاحب کی ذات مبارک کی طرح دلچسپیوں کی پوٹ ہے + لکھائی چھپائی۔ کاغذ سب کچھ عمدہ ضخامت کوئی ڈیڑھ سو صفحے۔ مجلد کی قیمت ایک روپیہ دس آنہ۔ بے جلد ایک روپیہ چار آنہ کارکن حلقۂ المشایخ۔ دہلی سے طلب کیجئے +

کلام محروم

حصہ دوم

منشی تلوک چند صاحب محروم پنجاب کے خوش فکر شاعروں میں سے ہیں۔ ان کا کلام مخزن کے دور اول میں ہمیشہ شایع ہوتا اور پسند کیا جاتا تھا۔ اور اب بھی ملک کے ادبی رسالوں میں کبھی کبھی نظر آ جاتا ہے۔ چند سال پہلے انہوں نے اپنی نظموں کے مجموعہ کا حصہ اول شایع کیا تھا۔ وہ بہت مقبول ہوا۔ اور پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے بھی محروم صاحب کو انعام دے کر قدردانی سخن کا ثبوت دیا + اب کلام محروم حصہ دوم شایع ہوا ہے اس میں متعدد نظمیں بہت اچھی اور حب وطن کے جذبات

صداقت سے معمور ہیں - سلاست زبان - سوز و گداز اور مفید مطالب کے لحاظ سے صبح وطن - شام وطن - مرثیہ گوکھلے - بہت کر دجوانو - ہندوستانی لڑکے کا گیت - تعلیم نسواں - حیات جاوید - شکوۂ صیاد وغیرہ بہت قابل تعریف ہیں - پہلے حصے اور دوسرے حصے میں نمایاں فرق یہ ہے - کہ پہلے میں نیچرل شاعری کا بہت زور شور ہے - اور دوسرے میں حب وطن اور قومی جذبات کا جوش و خروش ہے + کہیں کہیں معمولی سی فروگذاشتیں بھی ہیں - لیکن خوبیوں کے مقابلے میں قابل عفو ہیں + تعجب ہوتا ہے - کہ شمال مغربی سرحد کے دور دراز اضلاع میں رہ کر مرحوم صاحب اس قدر اچھا کہتے ہیں + ملک کو ان کے کلام کی قدر کرنی چاہئے - حصہ دوم کی ضخامت ۱۴۴ صفحے - لکھائی چھپائی - کاغذ معمولی - قیمت بارہ آنہ - ملنے کا پتہ :- میسرز رزائن دت اینڈ سنز تاجران کتب بیرون لوہاری دروازہ لاہور

خورشید محشر

لکھنؤ کے مشاہیر شعرا میں سے جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر کا دم بھی بسا غنیمت ہے - انہوں نے بھی جناب مرزا عزیز کی طرح لکھنؤ کے پرانے رنگ شاعری کے تکلفات کو خیرباد کہا - اور زمانے کی ہوا کے ساتھ ہولئے - خورشید محشر ان کا نیا دیوان ہے + ان کے کلام میں بھی جذبات عالیہ اور حسن تخیل کا وہی رنگ موجود ہے - جو مرزا عزیز کے ہاں پایا جاتا ہے + دور از کار تشبیہات و استعارات سے پرہیز کیا ہے - ابتذال اور نامناسب شوخی کا کہیں نام تک نہیں - زبان کے چٹخارے جابجا نظر آتے ہیں اور تڑپا جاتے ہیں - اس وقت اتنی فرصت نہیں - کہ ان کے کلام پر مبسوط تنقید کی جائے - اور محاسن و معائب کیجا دکھائے جائیں کسی وقت فرصت میں کچھ لکھا جائے گا - بہر حال جناب محشر اس وقت متغزلین اردو کی صف اول میں ہیں - ان کے کلام کی پختگی اور صحت مذاق کے اندر رہنا بہت قابل تعریف ہے + بامذاق حضرات ضرور اس دیوان کو منگا کر پڑھیں - اور لطف اندوز ہوں ضخامت ۱۴۴ صفحے - لکھائی چھپائی اچھی - کاغذ خاصا + آغا اشہر لکھنوی نے دیباچہ لکھا ہے - اور محشر صاحب نے مختصر حالات تحریر کئے ہیں قیمت عہ - ملنے کا پتہ : جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر بخاری ٹولہ لکھنؤ

پنجۂ نگارین

جن دنوں میاں سراج الدین صاحب رئیس لاہور کو خان بہادر کا خطاب ملا - ان کے بعض احباب نے اظہار مسرت کے طور پر پانچ دعوتیں دیں - ہر خوان دعوت پر جہاں دیگر اطعمہ لذیذہ کا اہتمام ہوتا - وہاں طبائع احباب کی ضیافت کے لئے جناب ناظم مرحوم کی ایک نظم بھی جلسۂ دعوت کا جزو لازمی سمجھی جاتی تھی - ان پانچ نظموں کا مجموعہ "پنجۂ نگارین" کے نام سے شائع ہوا ہے - مولانا سید حامد حسین صاحب بیدل شاہجہانپوری نے بھی اپنے معزز دوست کی خطاب یافتگی پر دو قطعات تاریخ لکھے تھے - وہ بھی اسی پنجۂ نگارین میں شامل کئے گئے ہیں - ہمیں ناظم صاحب کی ان نظموں کے متعلق تو ہمیں دبی زبان سے یہ کہنا ہی پڑتا ہے - کہ وہ شائع نہ کی جاتیں تو بہتر تھا - کیونکہ یہ نظمیں ناظم صاحب خلد آشیاں کے حقیقی پایۂ شاعری سے پست ہیں - اور ان کو ناظم صاحب کی "پرائیویٹ نظمیں" کہنا چاہئے - جو شاید کسی حالت میں اشاعت کے خیال سے نہ لکھی گئی ہوں گی - بلکہ ان سے محض گرمیٔ محفل احباب مقصود ہوگی + بہر حال یہ کتاب اس اعتبار سے قابل قدر ہے کہ میاں سراج الدین صاحب کی خطاب یافتگی کی یادگار ہے + مولانا بیدل نے جو قطعات تاریخ لکھے ان

کہکشاں

جلد ۴ لاہور - ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء نمبر ۱

ہم خود

کہکشاں ماہ ستمبر سنہ ۱۹۱۸ء سے جاری ہے۔ اور اس وقت سے اب تک ملک کے بہترین انشا پردازوں کے نتائج افکار سے مزین ہوتا رہا ہے۔ سید سجاد حیدر بی اے۔ خواجہ حسن نظامی۔ مولانا راشد الخیری۔ مولانا نیاز فتحپوری۔ قاضی عبدالغفار اڈیٹر جمہور۔ مولانا حسرت موہانی۔ منشی پریم چند صاحب۔ جناب نیرنگ صاحب۔ مولانا علی حیدر طباطبائی۔ حکیم سید ناصر نذیر فراق۔ جناب مرزا [illegible] وغیرہم کے اسمائے گرامی ایسے ہیں۔ کہ ان پر کوئی علمی و ادبی رسالہ بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔

بعض اصحاب کی شکایت ہے۔ کہ کہکشاں نے اپنے اجرا سے پہلے جن جن مضمون نگاروں کے مضامین مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ مضمون نگار کہکشاں میں لکھتے تو ہیں لیکن کم۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آج تک کہکشاں کا کوئی ایسا پرچہ نہیں نکلا جس میں ہندوستان کے دو تین نہایت نامور انشا پردازوں کے مضامین موجود نہ ہوں۔ ہندوستان کے قلیل الضخامت رسالوں میں یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ تمام مشہور اصحاب کے مضامین ایک ہی پرچے میں جمع کر دیئے جائیں اور ہر نمبر میں ان سب کے مضامین موجود ہوں۔ جو صاحب معاوضے پر لکھتے ہیں ان کے مضامین تو کسی نہ کسی طرح ہر ماہ بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں لیکن دیگر حضرات کی اپنی اور ہزاروں مصروفیتیں ہیں۔ ان کو کیونکر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ کہکشاں ہی کے ہو رہیں۔ اور بلا ناغہ ہر مہینے اس کی محفل میں تشریف لایا کریں۔

ہر ایک علمی ادبی رسالے کا ایک یہ بھی فرض ہوا کرتا ہی کہ وہ نئے انشا پرداز پیدا کرے۔ ہمارے پاس بہت سے نومشق مضمون نگاروں کے مضامین آتے ہیں۔ اور چونکہ ان کا درجہ کہکشاں کے معیار ادبی سے کم ہوتا ہی۔ اس لئے درج نہیں کئے جاتے۔ اور انہیں وجہ شکایت پیدا ہو جاتی ہی + اصل بات یہ ہی۔ کہ آج کل عشق و محبت کے مضامین لکھنا یعنی "جذبات نویسی" اس قدر عام ہو گئی ہی۔ کہ ہر کہ و مہ عشق و محبت کے جذبات لکھنا ہی کمال انشا پردازی سمجھتا ہے + ہم ایسے مضامین بھی درج کرتے ہیں۔ پر آمادہ ہیں اور درج کرتے ہیں۔ لیکن وہی مضامین جن میں کچھ ندرت و جدت ہو پرانے فرسودہ اور پامال خیالات لکھ دینا تعریف کی بات نہیں۔ آج کل ٹیگور کے رنگ میں "باغوں میں اور چاندنی راتوں میں معشوق سے ملاقات" اور "تم سے" اس قسم کے مضامین لکھنے کی طرف نومشق انشا پردازوں کا بہت رجحان ہی + ایسی چیزوں کو کما حقہ نفاست و نزاکت سے لکھنا نہایت مشکل ہی۔ اور ان کا اثر بھی اچھا نہیں پڑتا۔ اس لئے ہم نہیں چاہتے۔ کہ یہ مذاق عام ہو۔ نوجوانوں کو چاہیئے۔ کہ بہت عمیق مطالعہ کے بعد اول تو علمی و تنقیدی مضامین لکھیں۔ لیکن اگر ادب لطیف کا بے انتہا شوق ہو۔ تو چھوٹے چھوٹے افسانے لکھیں۔ جن میں فطرت انسانی کے گہرے اسرار اور روز مرہ زندگی کے سچے واقعات بیان کئے جائیں۔ اور ان قصوں میں ایسے بلند کیرکٹر مرتب کریں۔ جن کی تقلید ابنائے ملک کے لئے موجب خیر و فلاح ہو +

ہمیں نہایت شرمندگی کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ کہکشاں کی اشاعت میں ایک دفعہ جو تعویق ہوئی۔ تو پھر وہ اب تک صحیح وقت پر نہیں آیا۔ درحقیقت یہ نقص کہکشاں کے دامن پر ایک نہایت بدنما دھبا ہی۔ بات یہ تھی۔ کہ پچھلے سال جنوری کے پرچے کا فیضی سرورق چھاپنے میں بہت مدت صرف ہو گئی۔ اس کے بعد ہم بے انتہا کوشش کر رہے تھے۔ کہ رسالہ وقت پر آ جائے۔ کہ یکایک رولٹ ایکٹ کے پاس ہونے سے ہڑتال اور مارشل لا اور اور نہایت افسوسناک حالات ظہور پذیر ہوئے جن سے بہت دنوں تک مطابع بند رہے جس مطبع میں کہکشاں پہلے چھپتا تھا۔ اس نے شدت خوف و ہراس کے عالم میں تمام موقت الشیوع پرچوں کے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اور ہمیں کہکشاں کو دوسرے مطبع میں لے جانے کے متعلق بہت مشکل پیش آئی۔ بہت دنوں بعد جا کر ڈیکلریشن منظور ہوا۔ اور نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کہکشاں اپنی اصلی تاریخ اشاعت سے دو مہینے پیچھے جا پڑا +

وہ دن اور یہ دن۔ ہم برابر اس امر کی کوشش کرتے چلے آئے ہیں کہ رسالہ وقت پر آ جائے۔ چنانچہ ستمبر اور اکتوبر کے دونوں پرچے اکٹھے ڈاک میں ڈالے گئے۔ اور نومبر دسمبر دونوں مہینوں کا ایک ہی پرچہ شائع کیا گیا۔ لیکن اب تک کچھ کسر ضرور باقی ہی + فروری کا رسالہ لکھا جا رہا ہی۔ اور ہمیں نہایت پختہ امید ہے کہ وہ جلد شائع ہو گا اور رسالے کی اشاعت باقاعدہ ہو جائے گی + ہمیں ندامت سے اقرار کرنا پڑتا ہی۔ کہ ایسے گزشتہ وعدوں کا ایفا واقعات و اتفاقات کے ماتحت نہ ہو سکا۔ اور اب ہم دعا کرتے ہیں۔ کہ خدا ہمیں اس وعدے کے ایفا کی توفیق بخشے +

ہمارا ارادہ ہی۔ کہ ماہ جولائی سے کہکشاں میں ہر ماہ ایک رنگین تصویر شائع ہوا کرے اور ہندوستانی آرٹ (فن مصوری) کے محاسن و معائب پر مضامین بھی لکھے جایا کریں۔ یہ انتظام یقیناً کہکشاں کی موجودہ دلفریبیوں میں نہایت دلچسپ اضافہ ہو گا۔ اور ہمارے ناظرین کرام اسے تہ دل سے پسند کریں گے + ہم اپنے محترم دوست مسٹر عبدالرحمان چغتائی (آرٹسٹ) کا پیشگی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں تصاویر سے امداد دینے کا وعدہ فرمایا ہی۔ اور وہ کہکشاں کو اپنا رسالہ

بکٹیریا

عام لوگوں کے ذہن میں بکٹیریا یا اس سے ملتے جلتے دیگر اجسام نامیہ (عضویہ) کو امراض و ہلاکت سے اس قدر تعلق ہے - کہ گویا لازم و ملزوم ہیں - بکٹیریا کا نام لیا نہیں - کہ ہیضہ و طاعون و دق و سل کا خیال معاً ذہن میں آیا - وہ اسے بے حد ضرر رساں سمجھتے ہیں - جس سے جتنی بھی جلدی مخلصی ہو اسی قدر اچھا ہے - یہ خیال بالکل طبعی ہے - اور ضرور ایسا ہی ہونا لازم تھا - کیونکہ اس میں ذرا بھی شک نہیں - کہ ان اجسام نامیہ میں سے بہت سے ایسے ہیں - جو ظاہراً نسل انسان کے لئے موجب ہلاکت ہیں - البتہ اس امر میں شک ہے - کہ ان کا فعل درحقیقت ویسا ہی مذموم ہے جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے - خیر خواہ کچھ ہی ہو - ہمیں اس پر ایسی تنگ خیالی سے اور بالکل سطحی طور پر نظر نہیں ڈالنی چاہئے - کیونکہ یہ امر بآسانی پایہ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے - کہ بکٹیریا بہ ہیئت مجموعی کارخانہ قدرت کے ایک ضروری جزو معلوم ہوتے ہیں - بلکہ سچ پوچھو تو ان اجسام صغار کے حیات و افعال کے علم سے جس قدر صنعت الٰہی کی شان و حکمت بالغہ عیاں ہوتی ہے - وہ سائنس کے کسی اور انکشاف جدید سے نہیں ہوتی - درحقیقت بکٹیریا کے معلوم ہونے سے ہماری تحقیقات کے لئے ایک نئی دنیا کا راستہ کھل گیا ہے - جو ایسے عجائب و غرائب اسرار قدرت سے بھری ہوئی ہے - جو ہمارے آبا و اجداد کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے - اور جن مشکلات لاینحل کی ہماری ناخن عقل سے عقدہ کشائی نہ ہوئی تھی - ان پر بے حد روشنی پڑنے لگی ہے - عمل حیات کا دایرہ بہت وسیع ہو گیا ہے - جن افعال کی نسبت قبل ازیں یہ خیال کیا جاتا تھا - کہ یہ عناصر بے جان (غیر عضویہ) کے نتائج ہیں - ان کی نسبت اب یہ تحقیق ہوا ہے - کہ جن کروڑوں اجسام نامیہ نے ہمیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے - انہیں کے افعال زندگی کے یہ نتائج ہیں +

اشجار و نباتات کے باب میں اب سے کچھ عرصہ پہلے تک ہمارا صرف یہ خیال تھا - کہ جو اجزا قیام حیات کے لئے لابدی ہوتے ہیں - وہ ان کو ہوا اور زمین میں سے منتزع کر لیتے ہیں - اور پھر نئی ترکیبوں سے انہیں ملا جلا کر حیوانات کے لئے طرح طرح کی غذائیں تیار کرتے ہیں - کیونکہ حیوانات عناصر بے جان کو معمولی حالت میں جزو بدن نہیں بنا سکتے - جب نباتات یا حیوانات مر جاتے تھے - تو ہم یہ سمجھتے تھے - کہ یہ مرکبات از خود یا بوعث ہوا کے اثر سے تحلیل ہو کر پھر اپنی صورت سابقہ اختیار کر لیتے ہیں - اور اصلی سادہ صورت عنصری میں آ کر پھر غذائے نباتات کا کام دیتے ہیں لیکن اب تحقیق ہوا - کہ ہمارا یہ خیال غلط تھا - اگر مردہ اجسام پر صرف عناصر بے جان ہی عمل کرنے والے ہوتے - تو وہ اجسام کبھی بھی بوسیدہ ہو کر تحلیل نہ ہوتے - اور مردہ و ناکارہ مواد کا دنیا میں اس کثرت سے انبار ہو جاتا - کہ ان کے بخارات کی وجہ سے جانداروں کو سانس لینا دشوار ہو جاتا جیسے جانور مرا کرتے - وہ نہ بوسیدہ ہوتے - نہ تفرق اتصال سے ریزہ ریزہ ہوتے - بلکہ جس طرح زمانہ قدیم کے بعض دیو ہیکل حیوانات برف میں دب کر اب تک صحیح و سالم پڑے رہے - اسی طرح یہ پڑے رہا کرتے +

تو اچھا پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا - کارخانہ قدرت میں ایسی کون سی بات ہے - جو حالت مصرحہ بالا پیدا نہیں ہونے دیتی -

مولود ردیہ کا متواتر اجتماع کس وجہ سے رکا رہتا ہی؟ ان سوالات
کا جواب یہ ہے۔ کہ بکٹیریا اور حیوانات خمیر و دیگر حیوانات صغار
کے افعال اس حالت کو پیدا نہیں ہونے دیتے۔ ان افعال
کا بیان جن الفاظ میں دنیا کے نامور ڈاکٹر پاسیٹور صاحب نے
لکھا ہی۔ اس سے بہتر نہیں لکھا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف لکھتے
ہیں۔ کہ ہر جاندار کی ہلاکت کے بعد اس پر تین قوتیں عمل کرتی
ہیں۔ تخمیر۔ تعفین۔ اور احتراق۔ یعنی جب کوئی پودا یا حیوان
مرجاتا ہی۔ تو سب سے اول اس پر عمل ہوا عارض ہوتا ہے جب
ایک جان جسم سے مفارقت کر جاتی ہی۔ تو اسی جسم میں اور
بے شمار جانیں دوسری شکلوں میں جگہ کر لیتی ہیں جسم کے جن
حصوں میں ہوا نفوذ کر سکتی ہی۔ وہاں بے انتہا چھوٹے جراثیم انڈے
بچے دے کر حیرت انگیز کثرت سے بڑھنا شروع کرتے ہیں۔ ہوا کی
حموضت (یعنی آکسیجن کے اثر) اور ان جراثیم کے عمل حیات سے
جسم مذکور کا کاربن۔ ہیڈروجن اور نیٹروجن بدل کر کاربالک ایسڈ
ابخرہ آبی۔ امونیا گیس کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ کسی
چیز کے متعفن ہونے سے جو سخت بدبو آتی ہی۔ وہ امونیا گیس کی
بو ہوتی ہی۔ جب تک مواد عضویہ اور ہوا موجود رہتے ہیں۔ یہ تدریجی
عمل احتراق جاری رہتا ہی۔ مگر یہ احتراق صرف ظاہر جسم پر موثر
ہوتا ہی۔ عمل تخمیر و تعفین باطن جسم میں عمل کرتے ہیں۔ اور یہ عمل ایسے
جراثیم کے ذریعے سے ہوتا ہی جنہیں قیام حیات کے لئے تازہ ہوا
(آکسیجن) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ برعکس تازہ ہوا ان کے شمع
حیات کو بجھانے والی ہی۔ یہ سب جانتے ہیں۔ کہ ہر جاندار خواہ وہ
از قسم نباتات ہو۔ یا حیوانات۔ ہوا میں ہو یا زیر خاک۔ اس میں
بھی تھوڑی بہت ہوا موجود رہتی ہی۔ بالآخر اپنی صورت نوعی کو
چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہی۔ ان جملہ واقعات سے یہ ان جدید
خیالات کی بھی کہ یہ غیر مرئی اجسام ہمارے درحقیقت حل و عقد دنیا
میں کارکنان قدرت کا درجہ رکھتے ہیں۔ بخوبی تائید ہوتی ہے۔
وہ اپنے جس کار مفوضہ کو انجام دے رہے ہیں۔ اگر وہ کسی وجہ سے
رک جائے۔ تو روئے زمین پر مواد عضویہ کے وہ تودے جمع ہوں
کہ اَلْعَظَمَۃُ لِلّٰہِ۔ دنیا پر بسنے تو کیا تل دھرنے کی جگہ نہ رہے۔
اس سے یہ بخوبی قیاس میں آسکتا ہی۔ کہ یہ حقیر و ناچیز جاندار اپنے
عظیم الشان دورہ حیات میں کیسا اہم اور مفید کام کر رہے ہیں۔
درحقیقت آباد کاران دنیا یہی جاندار ہیں۔ یہ کسی چیز کو ضایع و
بے کار نہیں جانے دیتے۔ ناکارہ سے ناکارہ چیز جو محض بار زمین
معلوم ہوتی ہی۔ ان صناعان قدرت کے ہاتھ میں آکر فوراً اس کی
کایا پلٹ ہو جاتی ہی۔ اور وہ دوسرے جانداروں کے لئے سامان
غذا بن جاتی ہی۔ غرض جس چیز کو فنائے کلی کہتے ہیں۔ وہ تو
دنیا میں کہیں نظر نہیں آتی۔ موت صرف تبدیلی صورت کا نام
ہی۔ بازار ہستی میں ایک ہی متاع ہی۔ جو دست بدست آتی جاتی
اور ہمیشہ اسی طرح غیر متناہی دورہ لگاتی ہی۔

بکٹیریا کی ماہیت اصلی کیا ہی۔ اس کے متعلق مدت تک علماء
محققین کا بہت اختلاف رائے رہا۔ بعض محققین انہیں حیوانات
میں داخل کرتے تھے۔ اور بعض دیگر علماء نباتات میں۔ سچ
یہ ہی کہ اعلےٰ درجے کے حیوانات و نباتات میں اس قسم کا فرق بتانا
کچھ مشکل نہیں لیکن درجہ ادنیٰ میں یہ امتیاز بڑا مشکل سوال بن
جاتا ہی۔ ادنیٰ درجے کے حیوانات اور نباتات میں باہم اس قدر
شدید مماثلت ہوتی ہی۔ اور دونوں میں اس قدر صفات مشترک
ہوتے ہیں۔ کہ کسی صریح علامات سے دونوں میں تمیز قائم کرنا
قطعاً ناممکن ہوتا ہی۔ تاہم اب عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہی کہ بکٹیریا
اور اس قسم کے دیگر اجسام نامیہ درحقیقت نباتات میں۔ از قسم

فنگائی رفرمنٹ - لیکن ان میں کوئی واضح خط امتیاز بطور حد فاصل نہیں کھینچ سکتے۔ یہ دونوں انواع بتدریج ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہیں۔ اور یہ معلوم نہیں ہوسکتا۔ کہ ایک کا کہاں خاتمہ ہوا۔ اور دوسری کا کہاں سے آغاز ہوا۔ بالعموم بکٹیریا کا اطلاق ان اجسام پر محدود ہے۔ جو معاینہ خوردبین میں چھوٹے سے چھوٹے پائے گئے ہیں۔ سابق میں اس اصطلاح کا اجسام مذکورہ کے صرف چند انواع خاص پر ہوتا تھا۔ مگر اب اس کا اطلاق کل جماعت پر ہونے لگا ہے *

بکٹیریا بے انتہا ننھے اجسام ہیں۔ ان کے خط کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے تو اس سے کرلو۔ کہ ایک انچ کی لمبائی میں بارہ ہزار بکٹیریا جگہ لے سکتے ہیں۔ لیکن قد و قامت میں جس قدر کوتاہ ہیں وہ اسی قدر تعداد میں غیر متناہی ہیں۔ وہ ہر جگہ اور ہر طرف اس بے حد و قیاس کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں۔ کہ کروڑوں اور اربوں کھربوں سے بھی ان کی گنتی نہیں ہوسکتی۔ اور کوئی جگہ ان سے خالی نہیں۔ تنفس کی ہوا میں وہ موجود ہیں۔ پینے کے پانی میں وہ تیر رہے ہیں۔ زمین میں تہ خاک وہ پنہاں ہیں۔ اور اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ کہ وہ ہمارے تن بدن تک میں گھسے ہوئے ہیں۔ اتنا تو سب جانتے ہیں کہ ہوا نہایت ننھے ننھے ذرات خاک سے پر ہے۔ اور یہ ننھے سے ذرے اس میں ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں۔ کسی تاریک کمرہ کا دروازہ بند کرکے ذرا سی شعاع کو کسی درز کے راستے سے اندر آنے دو۔ تو یہ ذرات اس روشنی میں اڑتے ہوئے صاف دکھائی دیں گے۔ ان ذرات میں سے بہت سے بکٹیریا ہیں۔ یا ان کے تخم ہیں جو موافق جگہ میں جڑ پکڑ کر بہت جلد اگ سکتے ہیں۔ اگر ہم ایک پانی کا گلاس لے کر اسے کسی معمولی گرم کمرے میں کھلا ہوا رکھ دیں۔ تو تھوڑے سے عرصے میں اس کی سطح بالائی پر ایک چیز مثل غبار کے بیٹھ جائے گی جو بظاہر خاک معلوم ہوگی۔ لیکن اگر خوردبین سے دیکھیں۔ تو ایک جہان مختصر دکھائی دے گا۔ جہاں ہزارہا زندہ مخلوق حرکت کرتی اور ادھر ادھر دوڑتی پھرتی نظر آئے گی۔ یہ کیا ہے۔ یہی بکٹیریا ہیں۔ ہوا میں ان کی تعداد موسم اور حالات ہوا کے لحاظ سے کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ شدید بارشوں سے یہ تعداد کم ہوجاتی ہے۔ اور موسم کی خشکی سے یہ تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ آبادی کے قرب و جوار میں ان کی کثرت کا کوئی حد و حساب نہیں۔ اور پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر ان کا نام نہیں۔ پانی میں بکٹیریا ہوا سے بھی کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے ہمیں ہر جگہ اور ہر طرف سے احاطہ کر رکھا ہے۔ اس لئے ہزارہا بکٹیریا ہمارے جسم میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے یہ بھی صاف ظاہر ہے۔ کہ بکٹیریا کا بہت سا حصہ بالکل بے ضرر ہے۔ ورنہ یوں ان کے نرغے میں آکر ہم زندہ کس طرح رہ سکتے تھے۔ ہم انہیں کسی طرح برباد بھی نہیں کرسکتے۔ اور اگر کر بھی سکتے۔ تو نتیجہ بدتر ہوتا۔ یعنی فضلہ حیوانی و نباتاتی سے دنیا اٹ جاتی۔ نوع انسان کا فرض یہ ہے۔ کہ ان کی ماہیت۔ ان کے عادات۔ اور ان کے طریق حیات کا خوب غور سے مطالعہ کرے۔ اور جس قسم کے بکٹیریا درحقیقت ہماری صحت و زندگی کے لئے ضرر رساں ہیں۔ ان کا علم حاصل کرکے ان سے بچنے کی تدابیر سوچے۔ اور مناسب احتیاطیں عمل میں لائے *

بکٹیریا کی ساخت جہاں تک قوی سے قوی خوردبین سے معلوم ہوئی ہے۔ نہایت سادہ ہے۔ وہ انڈے کی سفیدی کی طرح ایک بے انتہا چھوٹا سا قطرہ مادۃ الحیات کا ہے۔ جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اور جو ہر قسم کی زندگی کے لئے ایک لابدی

شئے ہی۔ مبدء الحیات کے یہ قطرات بعض حالت میں تو بالکل شفاف ہوتے ہیں۔ لیکن بعض حالات میں ان کی شکل چھوٹے چھوٹے دانوں کی سی ہوتی ہی۔ اور ہر دانہ کے گرد نہایت باریک جھلی کا غلاف ہوتا ہی۔ اس میں وہ بوند بند ہوتی ہی۔ وہ قطرات چھوٹے چھوٹے گول خلیات بناتے ہیں۔ عموماً ان کی صورت ذرا لمبوتری سی ہوتی ہی۔ یہ خلیے بے انتہا چھوٹے ہوتے ہیں مگر وہ بہت سرعت سے بڑھتے ہیں۔ اور ایک خاص درجہ تک پہنچ کر ایک کے دو اور دو کے چار خلیے بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ پیش ازیں بیان ہوا۔ اگرچہ خلیات منقسم ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن منقسم ہوکر وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو جاتے۔ بلکہ منقسم شدہ خلیے ایک دوسرے کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔

دوسرے نباتات و حیوانات کی طرح ان اجسام کی زندگی کے لئے بھی آکسیجن کی ضرورت ہے۔ یہ کبھی تو ان کو آس پاس کی ہوا میں سے مل جاتی ہی اور کبھی پانی اور غذاؤں میں سے حاصل ہوتی ہی۔ پانی کا امتحان کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ بکٹیریا میں قوت حرکت بھی رکھی گئی ہی۔ درحقیقت وہ کبھی حالت سکون میں نہیں دیکھے گئے۔ اس بات میں وہ حیوانات کے مشابہ ہیں۔ لیکن تعجب کی بڑی بات یہ ہے کہ ان کی یہ حرکت شاید بالارادہ نہیں ہے۔ وہ گھڑی کی چھوٹی کمانی کی طرح ہر وقت متحرک ہی نظر آتے ہیں اس حرکت کا اصلی سبب ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ ان کے اجسام اس قدر بے انتہا ننھے ننھے ہیں۔ کہ خوردبین سے بھی ان کے کوئی اجزا نظر نہیں آ سکتے۔ اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں کوئی اعضا حرکت بھی موجود ہیں یا نہیں۔ علاوہ ازیں ان کی افزائش بڑھنے اور منقسم ہونے پر ہی محدود نہیں۔ بلکہ بذریعہ تخم بھی ان کی نسل بڑھتی ہے۔ یہ تخم ایسے ہوتے ہیں۔ جیسے خلیے کے مرکز میں چھوٹے چھوٹے نقطے وہ بتدریج بڑھتے ہیں۔ اور بالآخر پھٹ جاتے ہیں۔ اور پھٹے پرانے خلیہ میں سے سی جان نکل کھڑی ہوتی ہی۔ یہ بیج ہوا کے ذریعے سے کہیں کے کہیں جا پہنچتے ہیں۔ اور جہاں موافق جگہ ملتی ہے۔ وہیں پھولنے پھلنے لگتے ہیں۔ اور فصلوں پر فصلیں تیار ہوتی رہتی ہیں +

بکٹیریا کے تخم زندگی کے اعتبار سے بکٹیریا سے زیادہ جاندار ہوتے ہیں۔ اور برسوں خوابیدہ سی حالت میں زندہ رہتے ہیں + وہ کھریا کی چٹانوں میں پائے جاتے ہیں۔ وہاں وہ خدا جانے کس زمانہ سے ہوں گے۔ انہیں جب موافق و موزوں محل میں رکھا تو ان میں پوری زندگی عود کر آئی۔ وہ پتھر کے کوئلے میں بھی ہیں جو زمانہ کے لحاظ سے کھریا سے بھی قدیم تر ہے۔ لیکن جو بکٹیریا کوئلے میں سے لے انہیں ہر چند اصلی حالت پر لانے کی کوشش کی گئی۔ مگر زندگی نے عود نہ کیا۔ اور معلوم ہوا کہ ان میں مطلق زندگی نہیں رہی۔ لیکن کوئلے کے طبقات میں ان کی اس طرح کی موجودگی سے بعض محققین کو یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ کہ کوئلے کی ساخت میں ان ادنیٰ حیوانات کے کسی فعل کو بھی ضرور دخل ہے +

یہاں تک تو ہم نے یہ بتایا۔ کہ یہ صغیر الجثہ مخلوقات کیا کیا مفید کام کر رہے ہیں۔ لیکن اس قسم کی مخلوقات کا ایک اور کام بیان کرنا باقی ہی جسے کوئی پسند نہ کرے گا۔ بہتیرے مہلک امراض کی بابت یہ تحقیق ہوا ہے۔ کہ ان کے اصلی سبب یہی بکٹیریا ہیں۔ اور اس لئے اس امر کا یقینی اور قطعی علم حاصل ہونا نہایت اہمیت رکھتا ہی۔ یہ امراض ایسے نہیں کہ ان سے بچاؤ ممکن نہ ہو۔ صفائی۔ اعتدال۔ آفتاب کی روشنی و کثرت تازہ ہوا کی مدد سے ہم ان پوشیدہ دشمنوں کی زد سے محفوظ رہ سکتے ہیں +

سید ممتاز علی

ہسپانیہ کی اسلامی سلطنت

کمارِیز کے بلند و رفیع الشان برج میں بیت السفرا کے درمیانی
دریچے کا شہ نشین میرے مرغوب مقامات نظارہ میں سے ہے۔
میں ابھی وہاں بیٹھ کر ایک طویل درخشاں دن کے اختتام کا
لطف اٹھا چکا ہوں۔ آفتاب عالمتاب البیاسکا کے ارغوانی پہاڑوں
کے پیچھے غروب ہو ہو کر دَرّو کی وادی پر ایک دریائے تجلی برسا
رہا تھا۔ اس سے الحمرا کے بروج لالہ رنگ پر ایک لطیفہ خمار
آگیں چھا رہا تھا۔ ویگا ایک خفیف سے گرم غبار میں ملفوف تھا۔
جس میں شعاع غروب جذب ہو رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔
جیسے دُور فاصلے تک ایک سنہری سمندر موجیں مار رہا ہے۔ ہوا کا
ایک سانس بھی اس وقت کے سکون میں مخل انداز نہ ہوتا تھا
اور اگرچہ دَرّو کے خیابانوں میں سے لحظہ لحظہ موسیقی و مسرت کی
ہلکی ہلکی خفیف آواز اٹھتی تھی۔ لیکن اس سے اس کھنڈر کا سکوت
مزار اور بھی زیادہ مؤثر ہو جاتا تھا۔ یہ وقت اور یہ نظارہ وہ
تھا جس میں قوت حافظہ طاقت ساحرانہ کی عمل ہوتی ہے۔ اور
جس طرح شام کا سورج اُن ٹوٹے ہوئے برجوں پر چمکتا تھا۔
اسی طرح یہ بھی اپنی یادآوری کی شعاعیں زمانہ ماضی کی عظمتوں
کو مجلّٰی کرنے کے لئے بھیجتی ہے ۔

میں موروں کے اس کھنڈر پر ڈھلتے ہوئے دن کے اثرات
کا معائنہ کر رہا تھا۔ کہ میں نے اس لطیف پاکیزہ اور تحیر انگیز
ترکیب پر غور کرنا شروع کیا۔ جو اس کی اندرونی صنعت میں
عمومیت کے ساتھ جاری و ساری تھی۔ اور ساتھ ہی اُن گاتھک
طرز تعمیر کی عمارتوں کی پُر عظمت مگر تاریک متانت کے ساتھ
موازنہ کرنے لگا جن کی ہسپانی فاتحین بہت حفاظت کرتے
ہیں۔ چنانچہ طرز تعمیر ہی سے اُن دونوں جنگجو قوموں کی مختلف
و متقابل خصوصیات فطرت کا پتہ چلتا ہے۔ جو عرصے تک اس
جزیرہ نما پر حصول اقتدار کے لئے مصروف کارزار رہیں۔ میں
تدریجی ان عربوں یا ہسپانی موروں کی عجیب قسمتوں کے
تصورات میں مستغرق ہو گیا جن کی ساری ہستی ایک افسانے
کی مانند ہے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ وہ افسانہ اگرچہ بے
ربط ہو۔ لیکن تاہم تاریخ عالم کی شاندار داستانوں میں سے
ان کی عظمت طاقتور اور پائدار تھی۔ اور ہم نہیں جانتے
کہ انہیں کس نام سے یاد کریں۔ وہ ایک قوم تھی۔ جس کا کوئی
حقیقی وطن یا نام نہ تھا۔ عرب کے معرکہ آرا سیلاب کی ایک دُور
افتادہ لہر یورپ کے سواحل تک آن پہنچی تھی۔ لیکن ایسا معلوم
ہوتا تھا۔ کہ اس میں طوفان کے پہلے ریلے کی ساری قوت
رفتار موجود ہے۔ ان کی فتوحات کا دَور جبل طارق کی چٹانوں
سے لے کر پیری نیز کے سلسلۂ کہسار تک بعینہ ایسا سریع
اور پُر شوکت تھا۔ جیسے شام و مصر میں اسلامی فتوحات کی
رفتار تھی۔ نہیں۔ اگر وہ کہیں طورز کے میدانوں میں روک
نہ دیئے جاتے۔ تو سارا فرانس۔ کُل یورپ ممالک مشرقیہ کی
طرح نہایت آسانی سے پامال کر دیا جاتا۔ اور آج پیرس اور
لندن کے کلیساؤں پر ہلال اپنی تابانی و درخشانی دکھا رہا
ہوتا!

افریقہ اور ایشیا کا یہ ملا جلا خانہ بدوش گروہ جس نے یہ

عظیم انقلاب پیدا کیا تھا۔ جب پیری نیز کی حدود کے اندر ہسپانیہ ہوا تو اس نے فتوحات کا اسلامی اصول ترک کر دیا۔ اور ہسپانیہ میں ایک پُر امن اور مستقل سلطنت کے قیام کی کوشش شروع کر دی۔ فاتحین کی حیثیت سے ان کی شجاعت کا مقابلہ سوائے ان کی اپنی رواداری کے اور کوئی نہ کر سکتا تھا۔ اور ایک زمانے تک وہ ان دونوں خصائل میں اپنی مخالف قوموں سے گوئے سبقت لے گئے۔ اپنے وطن مالوف سے جدا ہو کر وہ اس سرزمین سے پیار کرنے لگے۔ جو ان کے اعتقاد میں اللہ کی بخشش تھی۔ اور اسے ہر ایسی شے سے آراستہ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ جو انسان کی مسرت کا سر انجام کر سکے۔ انہوں نے اپنی سلطنت کی بنیادیں دانشمندانہ اور منصفانہ قوانین پر رکھیں۔ نہایت محنت سے علوم و فنون کی آبیاری کی۔ زراعت صنعت اور تجارت کو ترقی دی۔ اور رفتہ رفتہ ایک ایسی زبردست سلطنت قائم کی۔ کہ عیسائیت کی کوئی سلطنت خوشحالی میں اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ارد گرد وہ دلآویزیاں اور شائستگیاں۔ جن کے لئے ایشیا کی عربی سلطنت اپنے انتہائی تہذیب و تمدن کے زمانے میں مشہور آفاق تھی۔ جمع کر کے انہوں نے تاریک یورپ کے مغربی خطوں میں مشرقی علوم کی روشنی سے اُجالا کر دیا۔

عربی ہسپانیہ کے شہر ان سبھی اہل فن کے مرجع قرار پائے۔ جو مفید فنون کی تحصیل کے مشتاق تھے۔ دوسری سرزمینوں سے طلبا جوق جوق طلیطلہ۔ قرطبہ۔ اشبیلیہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں میں آنے لگے۔ تاکہ عربوں کے علوم اور فنون قدیمہ کے خزائن سے فیضیاب ہوں۔ فنون لطیفہ کے شائقین نے مشرق کی شاعری اور موسیقی سے بہرہ اندوز حلاوت ہونے کے لئے قرطبہ و غرناطہ کا رُخ کیا۔ اور شمال کے فولاد پوش جنگجو بھی شجاعت کے آداب و رسوم اور شائستہ ورزشوں میں ید طولیٰ حاصل کرنے کے لئے ادھر ہی ٹوٹ پڑے۔

اگر ہسپانیہ میں مسلمانوں کی یادگاروں پر۔ قرطبہ کی مسجد پر اشبیلیہ کے القصر پر اور غرناطہ کے الحمرا پر آج تک ایسے کتبے موجود ہیں۔ جن میں عربوں نے اپنی مملکت کی طاقت اور استقلال کا ادعا کیا ہے۔ تو کیا اسے بے جا کبر و غرور پر محمول کر کے اس کی تضحیک کی جا سکتی ہے؟ نسلوں کے بعد نسلیں گذر گئیں صدیوں کے بعد صدیاں ہوا ہو گئیں۔ اور پھر بھی اس سرزمین پر ان کا قبضہ اقتدار برقرار رہا۔ انگلستان کو نارمن فاتح کے زیر نگیں ہوئے جتنی مدت ہوئی۔ اس مدت سے بھی زیادہ زمانہ گزر چکا۔ اور بہادر موسیٰ اور طارق کی نسلوں کے وارثوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ کہ وہ انہی آباؤں کے راستے جلاوطن کئے جائیں گے۔ جن میں سے ان کے فیروز مند آبا و اجداد گزرے تھے۔ عین اسی طرح جیسے رولو اور ولیم کی نسلوں کے وارث اور اُن کے بہادر لارڈ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔ کہ وہ پھر ملک بدر کر کے نارمنڈی کے ساحلوں پر بھیج دیئے گئے ہیں۔

ان سب امور کے باوجود ہسپانیہ کی اسلامی سلطنت ایک کامیاب گزشتنی سلطنت تھی۔ اور جس سرزمین کو ان لوگوں نے آراستہ کیا تھا۔ اس میں مستقل جڑ نہیں پکڑی تھی۔ ان کے اور مغربی ہمسایوں کے درمیان مذہب و آداب کے اختلاف کی گہری اور ناقابل عبور خلیج مزاحم تھی۔ اور اپنے مشرقی اعزا و اقارب کے درمیان سمندر اور صحرا مائل تھے۔ پس

وہ تو ایک محصور قوم تھے۔ ان کی ساری ہستی۔ ایک طویل گو بہادرانہ و شجاعانہ جدوجہد تھی۔ محض اس لئے کہ ایک مفتوحہ سرزمین میں کھڑے ہونے کی جگہ مل جائے +

انہیں "اسلام کے سرحدی مقامات" کہنا چاہئے۔ یہ جزیرہ نما ایک بڑا میدان کارزار تھا۔ جہاں شمال کے گاتھک فاتحین اور مشرق کے مسلم فاتحین ملے۔ حصول اقتدار کی خاطر لڑے۔ اور آخر کار عرب کی آتشیں جرأت کو گاتھ کی سرکشانہ اور ثابت قدم شجاعت نے مغلوب کر لیا +

جس طرح ہسپانیہ کے مور تباہ ہوئے۔ اس سے زیادہ مکمل تباہی کسی قوم کی نہیں ہوئی۔ آج وہ کہاں ہیں۔ بربر کے سواحل اور اس کے غیر آباد علاقوں سے پوچھو! اس زبردست سلطنت کے بقیۃ السیف غریب الوطن افریقہ کے بربریوں میں غائب ہو گئے۔ اور ان کی قوم معدوم ہو گئی + وہ بدنصیب اپنا کوئی امتیازی نام بھی نہ چھوڑ گئے۔ حالانکہ تقریباً آٹھ صدیوں تک وہ ایک ممتاز قوم رہے تھے۔ وہ ملک جو نسلوں تک ان کا مسکن اور وطن رہا۔ آج انہیں حملہ آور اور غاصب کے سوا کچھ نہیں کہتا + جس طرح ملک کے اندرونی حصے میں چند سنسان چٹانیں یہ پتہ دے رہی ہیں۔ کہ کسی زمانے میں یہاں ایک وسیع اور زبردست طوفان آیا تھا + اسی طرح محض چند ٹوٹی پھوٹی یادگاریں اس قوم کی سطوت و جبروت کی شہادت دیتے ہوئے کھڑی ہیں۔ انہی میں سے الحمرا ہے۔ مسیحی سرزمین کے بیچ میں مسلمانوں کا ایک کھنڈر۔ مغرب کی گاتھک عمارتوں کے درمیان ایک مشرقی محل۔ اور ایک ایسی بہادر۔ ذہین اور شان دار قوم کی نفیس یادگار رہ گیا ہے۔ جو نمتند ہوئی۔ بر سر حکومت رہی۔ اور گزر گئی!

(واشنگٹن ارونگ)

"الحمرا"

گمنام

بانسری

رات زیادہ آ گئی تھی۔ اشٹمی کا چاند خواب گاہ میں جا چکا تھا۔ دوپہر کے کنول کی طرح صاف و شفاف آسمان میں ستارے کھلے ہوئے تھے۔ کسی کھیت کے رکھوالے کی بانسری کی آواز جسے دوری نے تاثیر۔ سناٹے نے سریلا پن اور تاریکی نے روحانیت کی دلکشی بخشی تھی۔ یوں کانوں میں آ رہی تھی۔ گویا کوئی مبارک روح ندی کے کنارے بیٹھی ہوئی پانی کی لہروں کو یا دوسرے ساحل کے خاموش و پرکشش درختوں کو اپنی زندگی کی داستان غم سنا رہی ہے +

"پریم چند"

جہان خانم

فن تاریخ پر مسلمانوں کے جو احسانات ہیں۔ ان کے اعتراف میں۔ دوست دشمن۔ موافق مخالف۔ سب متفق اللفظ ہیں۔ مگر اس افسوسناک حقیقت کا انکشاف شاید اچھی طرح نہیں ہوا۔ کہ تاریخ کے مردہ فن میں روح پھونکنے والے حضرات کا دامن عمل اس گناہ سے ملوث ہے کہ انھوں نے مسلمان خواتین کے ساتھ نہایت سرد مہری کا سلوک کیا ہے۔ ان کے حیرت انگیز سیاسی۔ علمی۔ اور مذہبی کارنامے کافی شرح وبسط سے نہیں لکھے گئے۔ اور جا بجا بہت سے ضروری متعلقات کو چھوڑ دیا گیا ہے متعدد علامہ۔ اہل قلم۔ شاعر۔ متصوف۔ مجاہد خواتین اس پایہ کی ہو گزری ہیں۔ کہ ان کی مبسوط سوانح عمریاں قلم بند کی جاتیں۔ مگر کیسے افسوس کی بات ہے کہ ان کے کارناموں پر تفصیلی ریویو کی بجائے سرسری طور پر لکھا گیا۔ اور انہیں گئی بلکہ موٹے موٹے واقعات کو چھوٹے چھوٹے الفاظ میں بیان کر کے سر سے بوجھ اتار دیا گیا ہے +

یوں تو عربی۔ فارسی۔ اردو میں کئی زنانہ تذکرے موجود ہیں۔ مگر بالکل غیر مکمل۔ بالکل ناکافی +

اگر آپ چاہیں کہ مسلمان عورت کے عروج و زوال کی ابتدا سے لیکر انتہا تک تاریخ اور اس کی عہد بہ عہد کی تبدیلیوں کے مشرح حالات ضبط تحریر میں لائیں تو آپ کبھی اس کا کافی مواد فراہم کرنے میں کامیاب نہ ہوں گے اس بخل قلم کو مردوں کے تعصب یا تنگ نظری پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہمارے مایہ ناز مورخین جا بجا نہایت قدردانی کے لہجے میں فاضل خواتین کا نام لیتے ہیں۔ اور ان کے عہد میں عورت کی اہانت ایک ناقابل معافی گناہ خیال کی جاتی تھی +

وجہ صرف یہ ہے کہ مورخ مرد تھے۔ اس لئے انہیں قدرتاً عورتوں اور ان کے معاملات سے دلبستگی نہ تھی۔ مردانہ اولوالعزمیوں کی داستان چھوڑ کر حرم سرا کے واقعات پر خامہ فرسائی ان کے لئے دشوار بات تھی +

خیر اصلی سبب خواہ کچھ ہی ہو۔ ہمارے بدقسمت فرقہ کو بہرحال اس ظالمانہ اغماض سے ناقابل تلافی نقصان پہونچا۔ اور ان کی اعلیٰ دماغی قابلیت پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا +

جس عالی صفات خاتون کا نام ہمارے مضمون کا طراز عنوان ہے۔ اس کے کمالات بھی انہیں حضرات کے تغافل کے شکوہ سنج ہیں +

اردو پبلک نے تو شاید اس کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ فارسی لٹریچر کی متعدد کتابوں کا جائزہ بھی ہمارے لئے کوہ کندن و کاہ برآوردن تھا۔ سلاطین قاجاریہ کے تذکرہ نویس خواتین کے نام و ذکر سے اس طرح پہلو تہی کرتے ہیں۔ جیسے متعصب پادری سرور عالم کے تابناک محاسن سے۔ ممکن ہے۔ کہ کسی فارسی تصنیف میں جہان خانم

کے مفصل حالات درج ہوں۔ مگر ہمارا علم اس خیالی کتاب
تک محیط نہیں +

مرزا مہدی شیرازی اپنی کتاب تذکرۃ الخواتین میں
اس اولوالعزم ملکہ کے ذکر کو صرف ایک ورق دیتے ہیں
اور وہ بھی زیادہ تر لفظی ثنا گستری سے معمور ہے۔ اس پر
ستم ظریفی دیکھئے۔ کہتے ہیں "کہ اگر ہم اس کے کمالات بیان
کریں تو چاہیئے کہ ایک جداگانہ کتاب تالیف کریں۔ پھر
اس کتاب کی بابت فرماتے ہیں یہ مثنوی ہفتاد من کاغذ شود"

اسی شان استغنا کا نتیجہ ہے کہ میں جہان خانم کے حالات
کو کتاب کی جگہ مضمون میں لکھ رہی ہوں۔ اور ڈرتی ہوں
کہ مضمون بھی مکمل نہیں ہے ؎

ترسم اے میوہ درخت بلند
کہ نیائی بدست کوتاہم

(نام و نسب) جہان خانم امیر کبیر محمد قاسم خاں ابن
سلیمان خاں۔ اعتضاد الدولہ قاجار کی بیٹی تھی۔ اس کی
والدہ فتح علی شاہ قاجار کی نہایت قریبی رشتہ دار تھیں +
شاہی خاندان کی عالی قدر رکن ہونے کی وجہ سے اسکی
تعلیم و تربیت کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا +

(شادی) جہان خانم کی شادی ولی عہد سلطنت محمد شاہ
قاجار سے ہوئی۔ ۶ صفر سنہ ۱۲۴۷ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۱۸۲۹ء
کو اس کے بطن سے ناصر الدین قاجار متولد ہوئے +

سنہ ۱۲۵۰ھ میں محمد شاہ اپنے والد فتح علی شاہ کی وفات
کے بعد تخت نشین ہوئے۔ محمد شاہ قاجاری خاندان کے
پانچویں فرماں روا تھے۔ اور نہایت رحیم سادہ دل اور
عذر پذیر آدمی تھے +

جہان خانم نے اپنی ذاتی خوبیوں اور اطاعت شعاری
کے زور سے اپنے تاجدار شوہر کے دل کو پوری طرح
مغلوب کر لیا تھا۔ اور وہ اس پر حد سے زیادہ اعتماد کرتے
تھے۔ جہان خانم نے اپنے اقتدار و اختیار کو عامۃ الناس
کی فیض رسانی پر وقف کر رکھا تھا +

اس کی اطاعت شوہر کا ذکر مرزا حبیب قاآنی اپنے
ایک لاجواب قصیدے میں اس طرح کرتے ہیں ؎

خلوص شاہ جہاں جائے روح و خوں شب و روز
رواں ہمی رودش در عروق و در اعصاب +
زبسکہ دل کشدش سوئے شاہ۔ پنداری
فگندہ شاہ جہاں در عروق او قلاب +

(بیوگی) محمد شاہ نے ۴۰ برس کی عمر میں سنہ ۱۲۶۴ھ مطابق
۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۴۸ء میں انتقال کیا۔ ۱۴ برس دو مہینے سلطنت کی
جن میں آخری سات سال بیماری کی تلخی میں گزرے +

بیوگی۔ اور پھر بادشاہ بیگم کی بیوگی۔ جس قدر حسرتناک
ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک طرف دل و
جان کا مالک عمر بھر کے لئے جدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف
سلطنت ہاتھ سے جاتی ہے۔ ایک معمولی دل و دماغ
والی عورت ایسے دردانگیز موقع پر اپنے حواس بجا نہیں
رکھ سکتی۔ مگر جہان خانم نے جس عالی حوصلگی سے ذاتی مصیبت
کا خیال چھوڑ کر ملکی معاملات پر توجہ کی اس نے بڑے بڑے
مدبروں کو نقش حیرت بنا دیا +

محمد شاہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی ارکان سلطنت میں
نزاع برپا ہو گیا اور ہر متنفس ذاتی مصلحتوں کی بنا پر جوڑ توڑ
میں مشغول ہو گیا +

ناصر الدین کی عمر اس وقت ۱۹ سال کی تھی۔ اور وہ پایۂ تخت سے صدہا فرسنگ کے فاصلہ پر تبریز میں مقیم تھے اعیان دولت کے سیاسی ساز باز کی انھیں مطلق خبر نہ تھی۔ اس نازک موقعہ پر جہان خانم کے زبردست تدبر نے گرتی ہوئی دیوار کو تھام لیا۔ اس نے وزرا کا بدلا ہوا رنگ دیکھ کر عنان سلطنت کلیتاً اپنے ہاتھ میں لے لی۔ تمام عمال کے نام انتظامی فرمان صادر کئے۔ اور نزدیک و دور کے کسی والی و حاکم کو قابو سے باہر نہ ہونے دیا +

آخر نوجوان شاہزادہ نہایت امن و امان کے ساتھ دار السلطنت میں داخل ہوا۔ اور شفیق ماں نے اپنے ہونہار نور چشم کو سلطنت کا چارج دے دیا +

ناصر الدین شاہ کی تاج پوشی کے بعد بھی اس خاتون کی قابلیت سے "شیر و خورشید" کے نشان والی حکومت متمتع ہوتی رہی۔ کیونکہ سعادت مند بیٹا اپنی آزمودہ کار ماں سے ہر مہم میں استصواب کرتا تھا۔ اور اس کے عاقلانہ مشوروں پر بالالتزام عمل پیرا ہوتا تھا +

جہان خانم کی زندگی کا یہ انقلاب اس کے فیض عام میں کچھ تغیر نہ کر سکا۔ اور وہ جس طرح "ملکہ معظمہ" کی حیثیت سے رعیت کے لئے "چشمۂ رحمت" تھی۔ اسی طرح "مہد علیا ستر کبریٰ" بنکر رہی +

(قابل ماں کا قابل بیٹا) جہاں تک پتہ چلا ہے اکابر عالم کی مائیں عالی دماغ خاتونیں ثابت ہوئی ہیں۔ ناصر الدین شاہ شہید بھی ایک ایسی ہی خاتون کے فرزند تھے۔ اس لئے اگر انھیں جامع الصفات آدمی بتایا جاتا ہے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے +

ناصر الدین صرف ایک مدبر بادشاہ ہی نہ تھے۔ بلکہ ایک عالم ایک مصنف ایک شاعر ایک مصور ایک موسیقی داں ایک سپاہی بھی تھے۔ اور قدرت نے انھیں تمام صوری و معنوی خوبیوں میں نہایت فیاضی کے ساتھ حصہ دیا تھا +

افسوس ہے۔ کہ ان کا دامن حکومت لغزشوں سے بے داغ نہیں ہے۔ پان اسلام ازم (اتحاد اسلامی) کو ان کے ہاتھ سے یقیناً نقصان عظیم پہنچا +

مگر منصفانہ نظر سے دیکھا جائے تو مشرقی شہنشاہیت کی گھٹی میں خود مختاری کا بیج ڈالا جاتا ہے۔ درخت حریت کی بیخ کنی میں معذور سمجھا جا سکتا ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے اگر کج کلاہ ایران کو اموی خلیفہ عمرؓ بن عبد العزیزؒ تصور کیا تو یہ ان کی سخت غلطی تھی +

بہرحال اس میں شک نہیں کہ ناصر الدین اپنے وقت کا بڑا شخص تھا۔ پروفیسر وامبری جو سلاطین اسلام کی ہجو گوئی میں انوری۔ سوزنی۔ عبید زاکانی۔ وغیرہ سے کم سحر طراز نہیں ہیں۔ ناصر الدین شاہ کو "واجب التعظیم مستثنیات" میں شمار کرتے ہیں +

قاآنی نے بیٹے کی خوبیوں کو اس طرح ماں کا پر تو صفات ظاہر کیا ہے ؎

الا۔ نزاد مادرے۔ شہے۔ قرین شاہ او
بخود ازیں شرافتش سزاست افتخار ہا۔

(ایک دلچسپ واقعہ) ناصر الدین شاہ کے دل میں جہان خانم کا جس قدر اعتقاد۔ وقار اور احترام تھا۔ اس کا کچھ اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہو سکتا ہے +

اہل ایران گیہوں کی روٹی کو جو ہماری طرح ان کی
عام غذا ہے۔ گھروں میں نہیں پکاتے بلکہ وہ نان پزوں
کی دکان پر طیار کی جاتی ہیں۔ طہران میں نان پزوں کی
صدہا دوکانیں ہیں۔ یہ روٹی لمبی پٹیوں کی شکل میں طویل
اور آدھی انچ عریض ہوتی ہے +

ایک دفعہ ایران میں سخت قحط رونما ہوا۔ طہران کے
نان پزوں نے طماعی سے روٹیوں میں سستے اور خراب
غلہ کا آٹا ملانا شروع کر دیا جس نے کھانے والوں کے
پیٹ میں داخل ہو کر بیماریوں کی تخم ریزی کی۔ چونکہ
تمام نان فروشوں کے اتحاد عمل سے یہ بے ایمانی ظہور
میں آئی تھی۔ اس لئے لوگوں کو اس درد کا علاج
مہد علیا کے سوا کسی کے پاس نظر نہ آیا۔ فوراً ایک
وفد نے محل کا دروازہ کھٹکھٹایا +

اس واقعہ کے بعد جب ناصرالدین مہد علیا کی
قدم بوسی کے لئے حاضر ہوئے۔ اور حسب عادت آداب
بجالا کر انتظار کرنے لگے کہ اجازت پائیں تو بیٹھنے کا قصد
کریں۔ مگر آج والدہ ماجدہ کے تیور ہی کچھ اور تھے۔
بلا تمہید و دیباچہ فرمانے لگیں "میں نے تمھارے زیب
بدن کرنے کے لئے ایک خلعت طیار کیا ہے۔ اسے
پہنکر تشریف رکھنا" پھر ایک خادمہ کو بلا کر کچھ اشارہ کیا۔
وہ ایک بقچہ لائی اور پاس رکھ کر چلی گئی +

جہان خانم نے اسے کھول کر ایک پر تکلف زنانہ جوڑا
شاہ کے سامنے پیش کیا۔ باختر شیرازی فرماتی ہیں "رنگ
از رویش پرید۔ گفت من ایں چہ مے بینم؟ و مقصود آں
معظمہ ازیں فعل چیست؟"

اب نصیحت کا بہترین وقت آگیا تھا۔ دانشمند ماں
نے جواب دیا "جس بادشاہ کے عہد میں دن دہاڑے
ایسا اندھیر برپا ہو وہ اسی قابل ہے کہ زنانہ لباس پہنکر
حرم سرا میں رہنے لگے +

یہ کہکر جَو ملی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا شاہ کے ہاتھ میں
دیا۔ اور سارا ماجرا کہہ سنایا +

ناصرالدین ٹکڑا لے کر سیدھے محل اجلاس میں گئے
اور گندم نما جو فروش دوکانداروں کو عبرت انگیز سزائیں دی
ساتھ ہی حکم دیا کہ شاہی خرچ سے عمدہ غلہ کو ارزاں
فروخت کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ تاکہ گرانی کا کسی
قدر انسداد ہو سکے +

(ایک اور واقعہ) مخدرۂ محترمہ باختر شیرازی کے
کلیات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک بار انھیں قوت
و حکومت کے ہاتھوں مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں
نے شاہی خاندان کی ایک نیک طینت خاتون کے
نام منظوم فریاد نامہ لکھا۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے۔ ؎

الا شہزادہ خانم جاں فدایت
بقرباں تو وجود و سخایت

اسی خط میں آگے چل کر لکھا ہے ؎

شفیعم شو۔ بنزد مہد علیا
کہ تا برہاندم از چنگ اعدا

یہاں سمجھنے کے قابل جو بات ہے وہ یہ ہے۔ کہ غرض مند
نے خاندان شاہی کی اس رکن کو استمداد کے قابل
نہیں سمجھا۔ بلکہ صرف مہد علیا کے دربار میں سفارش
کرنے کی التجا کی ہے +

(وفات) ۱۲۹۰ھ میں جب ناصر الدین شاہ فرنگستان کی سیاحت میں مصروف تھے۔ جہان خانم نے ۴ ربیع الثانی کو پیر کے دن وفات پائی۔ اس کا کالبد خاکی "قم" میں سپرد خاک کیا گیا۔ جہاں نور چشم امام ہفتم کا زاویہ واقع ہے۔

سن ولادت معلوم نہونے سے اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ بہارستان فارس پر اس ضعیف العمر کا ابر کرم دیر تک رشحہ بار رہا۔ طوبیٰ لمن طال عمرہ۔ وحسن عملہ۔ (حدیث)

مہد علیا کی وفات نے تمام ممالک محروسہ ایران کو ماتم کدہ بنا دیا۔ اور نہایت جوش وخروش کے ساتھ اس کا سوگ منایا گیا۔ ماتمی مراسم بادشاہ کی غیر موجودگی میں اعتضاد السلطنۃ نے نہایت خوبی سے ادا کئے۔

(اخلاق وعادات) وقائع زندگی لکھنے کے بعد اب ہم اس کے عام اخلاق بیان کرتے ہیں۔

اسکی طبعی خصوصیات میں رحم۔ انصاف۔ قدردانی مردم شناسی اور فیاضی کو بہت بڑا دخل تھا۔ صاحب تذکرۃ الخواتین لکھتے ہیں "ملکے را بہ مہربانی مادر بلکہ خلقے را بہ کفالت پدر بود"۔

اس کا دربار فضلائے عصر کا مرجع وماویٰ تھا۔ جہاں ان کی قدردانی شاہی قصر سے بھی زیادہ ہوتی تھی

اس نے شاہزادہ علی قلی مرزا اعتضاد السلطنۃ کو اپنا وزیر خاص مقرر کیا تھا۔ جو فتح علی شاہ قاجار کے فرزند تھے۔ اور فراست وتبحر علمی میں دور دور مشہور تھے

اس ملکہ میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مشیروں اور مصاحبوں کے مشوروں پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنے دماغ پر زور دینا زیادہ پسند کرتی تھی۔ اور اعتماد علی النفس جو ملوکی کا سب سے بڑا جوہر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا خاص مابہ الامتیاز وصف تھا۔

(مہر ولعزیزی) سلطنت قدیمہ ایران کے باشندے اس ملکہ کو اپنی گزشتہ عظمت کا زندہ نمونہ سمجھتے تھے اور اس کا نام نہایت فخر وعزت کے ساتھ لیا جاتا تھا۔

اس کے فرامین جو تمام تر رعایت رعیت اور عطائے وظیفہ وعطیہ کا مجموعہ ہیں۔ جن خوش نصیبوں کے پاس ہیں۔ وہ اب تک انھیں خزائن معمورہ سے زیادہ احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھتے ہیں۔ اور ان کا سارا خاندان اس گراں قدر تبرک پر فخر کرتا ہے۔

(ذوق ادب) اس کی قابلیت دل ودماغ جہاں بانی ہی تک محدود نہ تھی۔ بلکہ چمنستان ادب میں بھی وہ گلاب کی طرح پھولوں کی بادشاہ تھی۔ اس کی نثر نہایت دلپذیر ہوتی تھی۔ نظم کا مذاق تو گویا اس کی فطرت ثانیہ تھا۔ ان چند اخلاقی اشعار سے اس کے رنگ سخن کا پتہ چل سکتا ہے ؎

از مرد وزن آنکہ ہوشمند است
اندر ہمہ حال سر بلند است
بیدانش اگر زن است۔ اگر مرد
باشد بہ مثل چو خار بے درد

سخن گوئی کے ساتھ ہی اس میں سخن سنجی کا مادہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ اور قدرت نے اسے ذوق سلیم ووجدان صحیح کی نعمت سیر چشمی سے عطا فرمائی تھی۔

قاآنی جس کا شمار چوٹی کے مشرقی شعراء میں ہے۔

اسی ملکہ کی فیاضانہ قدردانی کی بدولت اپنے سرفانہ خصائل کے عواقب سے بے نیاز تھا- اور ہم اس یگانہ عصر کو ملکہ جہان خانم کا درباری شاعر کہہ سکتے ہیں

ہمیں عورت ہونے کی حیثیت سے فخر آمیز مسرت ہوتی ہے جب ہم کلیات قاآنی میں کبھی مہد علیا کے لقب سے جہان خانم کی مدح سرائی پاتے ہیں +

یہ سچ ہے کہ شعرائے عجم کا کلام شاہی خاندان کے نقاب پوش ممبروں کی مدح سے خالی نہیں ہے ترکان خاتون- جہاں آرا زیب النسا وغیرہ کی مدح دنیا میں شاعروں نے جو زور قلم صرف کیا ہے- وہ ارباب ذوق سے پوشیدہ نہیں ہے- مگر کوئی شاعر اس جوش سے اپنی ممدوحہ کا نام نہیں لیتا جیسے قاآنی مہد علیا کا +

(فنون لطیفہ) جہان خانم جس طرح سلطنت کی گتھیاں سلجھانے میں چابک دست تھی جس طرح ادبی سرزمین کو لالہ زار بنانے میں ید طولیٰ رکھتی تھی- اسی طرح خوش خطی اور نقاشی کے فن میں ماہر و مشاق تھی ہم نے بڑی حیرت سے تذکرۃ الخواتین میں دیکھا ہے کہ اس کی سوئی کے نکلے ہوئے گل بوٹے ماہرین فن کو انگشت بدنداں کر دیتے تھے +

جو لوگ اعلیٰ التعلیم کو زنانہ فرائض کی ادائگی میں حارج بتا کر بدنام کرتے ہیں- وہ مہربانی کرکے ذرا جہان خانم کی طرف نظر کریں- جو ایک سیاست شناس ملکہ کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک مطیع بیوی- ایک شفیق ماں- ایک ہنرمند خانہ دار کی حیثیت سے اپنے وقت کی نہایت کامیاب عورت گزری ہے +

ز- خ- ش- آف علی گڑھ

میرے شاعر - جا! درماندہ دنیا ایک نئی بشارت شعری کی منتظر ہے- ایک نئے نغمہ کی جو اسے جمود و غفلت کی حالت سے جگائے- اور خدائے ذوالجلال اور ملاء الاعلیٰ سے قریب تر کر دے- لکھ! کیونکہ تیری قوم صداقت کی صدائے رسا کی منتظر ہے- دنیا کے نامور شاعر مرچکے ہیں- ان کی روحیں فردوس میں ہیں- اور اس غم کدۂ دنیا میں تیرے سوا کوئی ان کی جانشینی کے قابل نہیں + اپنا کام شہرت کے لئے مت کر- نہ دولت کے لئے- بلکہ محبت اور خدا کے جلال قایم کرنے کی غرض سے- نوع انسان کی محبت کے واسطے اور حسن- پاکیزگی اور تقدس الفت کے لئے + قبل اس کے کہ زمین خلق جدید کی افسردہ روشنی میں غائب ہو- روئے زمین کے انسان اُس عالم الغیب کے ایک اور رسول کی بات سن لے- جا! اپنا مدتوں کا بھولا ہوا فرض ادا کر- وہ فرض جو شاعری کے نام کے شایاں ہے- کہ دنیا بیدار ہو- اگر تجھے اوروں کی بھلائی کے لئے لکھنے کا شوق ہے- تو اس کے لئے تو جوش اور ہمت کی کمی نہ پائے گا- عالم غیب کا یہ ابدی قانون ہے- کہ خدمت خلق خداوندی موجب حیات ہے اور خود غرضی موجب ممات + جتنا تو خود بینی کو کم کرے گا- اتنی ہی زیادہ تجھے حق بینی حاصل ہوگی- خودی کو اپنے سے دور کر- پھر دیکھ خداوند پاک تجھے کیسا قرب حضوری عطا فرماتا ہے- جا دنیا میں نکل- بادشاہ بن- گو سر پر تاج نہیں- ایک نغمۂ دلنواز سناتا ہوا اور ذرا اندیشہ نہ کر- کہ ایڈیس تجھے کبھی چھوڑ بیٹھے گی- وہ ایڈیس جو روز ازل سے تجھ سے محبت رکھتی ہے +

(میری کوریلی) تاج

یادِ رفتگاں

(سر سید علیہ الرحمۃ کے خطوط مولوی سید ممتاز علی صاحب کے نام)

مجی وشفقی - آپ کا عنایت نامہ مورخہ مقام لاہور میرے
پاس پہنچا- آپ کی صحت و تندرستی سے نہایت خوشی ہوئی
خدا تعالیٰ آپ کو صحیح و تندرست رکھے- امید ہے- کہ روز بروز
صحت و تندرستی و قوت زیادہ ہوتی جائے گی- آب و ہوا
کا تبدیل کرنا نہایت مناسب ہوا- اور سیر سے اور مقامات
مشہور کے دیکھنے سے دل کو فرحت ہوتی ہوگی + معلوم
نہیں کہ اخیر روئداد کمیٹی یادگار منشی مشتاق حسین صاحب نے
آپ کے پاس بھیجی یا نہیں- غالباً نہ بھیجی ہوگی- اس لئے
اس کی ایک کاپی میں بھیجتا ہوں- اس کو پڑھ کر آپ
خوش ہوں گے- اگر عمارت مجوزہ بن جائے- تو کالج کو
نہایت مفید ہوگی- اور بہت سی مشکلات رفع ہو جاویں گی
تفسیر آہستہ آہستہ چھپتی ہے۔ السارق والسارقۃ
فاقطعوا ایدیھما کی تفسیر ذرا مشکل پیش آتی ہے
اس کے حل کی بھی بعض ضروری کتابیں دیکھنی ہیں- کونسل
میں اگرچہ کام ہے- مگر میں تفسیر کے لکھنے یا اس کے متعلق کتابوں
کے دیکھنے سے کبھی غفلت نہیں کرتا- والسلام-

خاکسار آپ کا ترقی خواہ

سید احمد ۲۳- جنوری سنہ۱۸۸۳ء کلکتہ ۲۵ تھیٹر روڈ

مجی وشفقی مولوی سید ممتاز علی صاحب- کل کی ڈاک
میں میرے پاس رسالہ محاکمہ ولادت مسیح پہنچا- اسی وقت
میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا- اور رات کو ختم ہوا- اس کے
پڑھنے سے اس وجہ سے خوشی نہیں ہوئی- کہ میری رائے
کی اس میں تائید کی گئی ہے- بلکہ اس وجہ سے خوشی ہوئی
کہ نہایت عمدگی و ترتیب و صفائی سے لکھا گیا ہے جس لیاقت
و قابلیت سے وہ رسالہ لکھا گیا ہے- اس سے بہتر نہیں لکھا
جا سکتا- کچھ مجھ سے لکھنا رہ گیا تھا- وہ اس میں پورا کر دیا
گیا ہے- ابن مریم مشہور ہونے کا سبب نہایت عمدہ بالکل صحیح
مطابق واقعہ تحریر ہوا ہے- مجھ کو یہ خیال نہ تھا- کہ یوسف
کا انتقال ہو چکا تھا- اس کے سوا اور بھی بعض عمدہ و جدید
باتیں ہیں- اگر میری تفسیر کا دوسرا اڈیشن ہو- تو آپ کے
رسالے میں سے چند باتیں اس میں اضافہ ہونی ضرور ہوں گی
ایک آدھ جگہ جناب مولوی محمد حسین صاحب کی نسبت سخت
لفظ ہیں- اگر وہ بھی نہ ہوتے- تو نہایت بہتر ہوتا- امید ہے
کہ آپ بخیر و عافیت ہیں + والسلام-

خاکسار سید احمد- علی گڈھ ۸- اپریل سنہ۱۸۸۳ء

مجی وشفقی شفیق عالم- آپ کا عنایت نامہ مقام پٹیالہ سے
پہنچا- آپ کی عنایت کا اور آپ نے جو سید
محمود کے تقرر پر مبارکباد دی ہے- اس کا دلی شکریہ
ادا کرتا ہوں- میرا ارادہ شملہ جانیکا ہے- اور صرف چار پانچ
روز وہاں رہوں گا- پنجاب یونیورسٹی بل پر جب کمیٹی

کی رپورٹ پیش ہوگی۔ اس زمانے میں جاؤں گا۔ ابھی معلوم نہیں کہ کب پیش ہوگی۔ مگر مجھے امید ہے۔ کہ تاریخ میٹنگ سے ایک ہفتہ قبل مجھ کو اطلاع مل جاتی گی۔ جس وقت تاریخ روانگی مقرر ہوگی۔ میں آپ کو اطلاع دوں گا +

خاکسار سید احمد۔ علی گڑھ ۲۰ رجون سنہ ۱۸۸۲ء

جلد دوم تفسیر لغایت آخر سورۂ مائدہ طیار ہوگئی۔ چھپ گئی۔ اس کو مرتب کرنا ہے۔ بہت جلد تقسیم ہوگی۔

مجی کرمی مشفقی۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کی صحت و تندرستی سے اس قدر خوشی ہوئی ہے۔ جس کو میرا دل جانتا ہے۔ خدا تعالیٰ تم کو ہمیشہ تندرست و صحیح مطالب پر کامیاب رکھے۔ آمین +

بقیہ اوراق جلد اول تصانیف چند روز ہوئے۔ کہ روانہ کئے ہیں۔ یاد نہیں۔ کہ کس پتے پر۔ اگر نہ پہنچے ہوں۔ تو مطلع فرمایئے کہ دوبارہ بھیج دوں گا +

تفسیر جلد دوم کاغذ زرد اور اوراق جلد سوم تا نمبر ۶۸ - آج روانہ کئے جاتے ہیں۔ اجنہ پر بحث جو مجھ کو لکھنی تھی۔ اسی سورۂ انعام میں یا معشر الجن کی تفسیر میں لکھ دی ہے۔ وہ بحث چھپ رہی ہے۔ پروف میں نے دیکھ لیا ہے۔ عنقریب چھپ جاوے گی۔ اگر زیادہ شوق ہو۔ تو اس بحث کا مسودہ بھیج دوں۔ حشر کی بحث آیندہ ہوگی +

میرا ارادہ ہے۔ ۱۰ دسمبر میں پنجاب آنے کا۔ مقصد صرف خلیفہ محمد حسن صاحب سے پٹیالہ میں ملنے کا اور گورداسپور میں سردار محمد حیات خاں سے ملنے کا اور لاہور میں آپ سے اور محمد برکت علی خاں صاحب سے ملنے کا ہے۔ غالباً ہمارے دوست محمد اسمٰعیل خاں صاحب بھی ساتھ ہوں۔ سید محمود آج علی گڑھ میں پہنچیں گے۔ جب وہ یہاں سے اپنے علاقہ ڈسٹرکٹ ججی رائے بریلی پر چلے جائیں گے۔ اور کالج کے طالب علموں کی یونیورسٹی کے امتحان کے لئے الہ آباد و کلکتہ کی روانگی کا بندوبست ہو جاوے گا۔ اس وقت میں کوئی تاریخ روانگی مقرر کروں گا۔ اور آپ کو اطلاع دوں گا۔ میں تو مناسب نہیں سمجھتا۔ کہ میرے وہاں آنے کی بابت کچھ زیادہ چرچا کیا جائے۔ میں مثل ایک معمولی آدمی کے تفریح طبع اور دوستوں سے ملنے کے لئے آتا ہوں۔ اس کی دھوم دھام کیا۔ ہاں اگر کالج کے لئے کچھ چندہ مل سکے۔ تو جو دھوم چاہو کرو۔ مگر اس کی توقع نہایت کم ہے۔ بے ہودہ دھوم دھام سے کیا فائدہ۔ آیندہ جو تمہاری خوشی ہو۔ والسلام +

خاکسار سید احمد علی گڑھ۔ ۲۱ ر ستمبر سنہ ۱۸۸۳ء

مجی و کرمی مولوی سید ممتاز علی صاحب۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ میں نے اوراق تفسیر وغیرہ اس لئے نہیں روانہ کئے تھے۔ کہ شبہ تھا کہ اس وقت آپ کہاں ہیں۔ آج روانہ کئے ہیں +

مولوی اقبال علی صاحب نے سفرنامہ پنجاب مرتب کرکے بھیجا ہے جو چھپ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ اس میں سردار دیال سنگھ بہادر کا حال اضافہ کروں۔ آپ ان کے خاندان کا مختصر حال مع ان کے زمانہ سفر ولایت وغیرہ امور کے جو قابل اندراج ہوں۔ تحریر فرما کر ارسال فرمائیں۔ اور جس امر کی تحقیق کی ضرورت ہو۔ سردار صاحب سے مل کر دریافت کر لیں۔ انہوں نے مدرسۃ العلوم پر بہت احسان کئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مرزا ارشد صاحب نے جو شعر ویلکم کے یونیورسٹی ہال کے جلسے میں پڑھے تھے۔ وہ بھی ان سے لے کر بھیج دیجئے۔ اپنی خیر و عافیت سے ہمیشہ مطلع فرماتے رہیے۔ والسلام

خاکسار سید احمد۔ علی گڑھ ۱۵ اپریل سنہ ۱۸۸۴ء

جلال الدین خوارزم شاہ

مصنفہ نامق کمال — مترجمہ سید سجاد حیدر

(سلسلہ کے لئے گزشتہ پرچہ دیکھئے)

علاءالدین - خدا کے بندوں کے حق ہیں، میرے حق نہیں۔ بغداد کے خائن کا سو مقصد تھا، میں نے چنگیز پر ابتدا نہ کی۔ مغلوں کی طرف سے غائر خاں کو جو تاجر آئے چنگیز نے جو ایلچی میرے پاس بھیجے۔ یہ سب کے سب جاسوس تھے۔ اس لئے میں نے انہیں قتل کرا دیا۔ اگر میں انہیں قتل نہ بھی کراتا۔ تو چنگیز کسی دوسرے بہانہ سے مجھ پر حملہ کرتا۔ ناصر بھی اپنے تئیں سایۂ خدا۔ یہی نہیں بلکہ خدا کی ایک شان مشخص کہکر منوانا چاہتا ہے۔ اور یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں جتنے مسلمان ہیں سب اسی عقیدہ کے ساتھ اسکی پرستش کریں۔ وہ یہ خیال کرتا ہے۔ کہ انسان اس لئے پیدا ہوتے ہیں۔ کہ غلاموں کی طرح اس کی سفاہت کے کام میں آئیں۔ نعوذ باللہ۔ اسلام اس لئے دنیا میں آیا ہے کہ ساری دنیا سے اس کی عظمت کے سامنے سجدہ کرائے میں نے اس کے ساتھ رعایت کی مگر توبہ توبہ وہ رعایت عبادت کے درجہ تک نہ تھی۔ میری ذات سے انتقام لینے کے لئے اس نے محمود بالواجی کو واسطہ قرار دیا اور چنگیز جیسے قہر الٰہی کو خلق خدا پر مسلط کر دیا۔ سمجھے؟

جلال الدین - سبحان اللہ! اگر چنگیز ناصر کی تحریک سے ہم پر حملہ آور ہوا۔ تو بھی اس سے فرار کرنا کس طرح لازم آتا ہے۔ کیا ہماری سلطنت ناصر کی مدد سے قائم تھی۔ اگر اب بھی ہم یہاں سے اٹھ کھڑے ہوں تو مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے جھنڈے کے نیچے اس قدر فوج جمع کر سکتے ہیں جو اس وسیع دنیا کو فتح کرنے کے لئے کافی ہوگی۔

علاءالدین - ہاں! ہم ایک دستہ فوج جمع کر سکیں گے۔ فرض کرو کہ تمہارا خیال صحیح ہے، ہم فوج جمع بھی کر سکے۔ تو کیا آپ کے یہ مٹھی بھر بہادر لاکھوں تاتاریوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ سوچو تو۔ ہمارے سپاہی ہمارے افسر ہمیں مرتد و مطرود خیال کرتے ہیں۔ چونکہ ناصر کو ایک ایسا معبود سمجھ لیا گیا ہے۔ جو زمین پر نازل ہو گیا ہے۔ لہٰذا خود ہماری رعایا ہمیں چنگیز سے بھی زیادہ ملعون خیال کرتی ہے اس واقعہ کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے۔ ہمارے افسروں میں سے آدھے فوج سے بھاگ کر دشمن کے جھنڈے کے نیچے چلے گئے۔ اور ان سب کا سردار کون تھا بدرالدین؟ وہ بدرالدین کہ اگر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں۔ تو اس کے اندر سے سوائے ہمارے نمک اور ہماری نعمت کے اور کچھ نہ نکلے گا۔ کتا بھی اُس آدمی سے بیوفائی نہیں کرتا جو اُسے روٹی کا ٹکڑا دیتا ہے۔ خنزیر بھی اُس درخت کو اپنے دانتوں سے نہیں اکھاڑتا جس کے سایہ کے تلے وہ آرام لیتا ہے۔ مگر یہ لوگ اپنے ہی وطن اپنے ملک پر کلہاڑی لیکر دوڑے۔ باقی جو رہے۔ انھوں نے

زخم خوردہ فوج کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اور وہ اس
طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ہر ایک کے ذہن میں ہر ایک
کے دل میں خودمختاری کے ادعا کے سوا اور کچھ نہیں +

میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں زندہ ہی ہوں اور تمہارے
بھائیوں نے میری میراث آپس میں تقسیم کر لی۔ اگر میں یہاں
سے نکل کے جاؤں۔ اور ان تک پہنچوں تو وہ مجھے اس
طرح حیرت سے دیکھیں گے۔ گویا میں قبر سے نکل کھڑا ہوا
نامرد دشمن اسلام، ممالک اسلام کے پادشاہ حسود، اولاد
اقربا حریص، امرا خائن، فوج غافل، اور رعیت عاجز،
کیا ان ہتھیاروں سے صرف تجھ کو ساتھ لیکر میں چنگیز خاں
کا مقابلہ کروں۔ جسکے پاس لاکھوں سپاہیوں سے معمور
بیسیوں مکمل فوجیں ہیں +

جلال الدین۔ واہمہ نے آپ کے ذہن و فکر
پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس لئے آپ جدھر نظر ڈالتے ہیں آپکو
مصیبت اور خیانت دکھائی دیتی ہے۔ اگر آپ چنگیز کا
مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تو کیا اس کے مقابلہ میں اپنی شایاں
شان موت بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ ایک شاہانہ مزار۔ اس
مسکن مذلت سے کیا بہتر نہیں ہے +

علاء الدین۔ شاہانہ مزار کیا۔ اگر میں لڑائی کے
لئے نکلوں تو وہ مجھے خود پکڑ کے تاتاریوں کے سپرد کر دینگے
میں بائیس برس سے۔ یہ سر دنیا کی سب سے بڑی سلطنت
کا تاج سر پر اٹھائے ہوتے ہے۔ اب چنگیز کے ٹھوکر کھانے
کے لئے نہیں ہو سکتا۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ اس تاج
کو جو اس لائق ہے کہ اپنے ہی آنسوؤں میں اپنے
ہی خون میں غرق کیا جائے۔ یہ موقع دوں کہ میرا حال
دیکھ کر خوشی کے مارے ہنستے ہنستے مر جائے +

جلال الدین۔ میں اس حکیم مطلق اور قہار منتقم کے
نام کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس نے ہماری سلطنت کو آپ کے
وجود سے ذلیل کیا ہے۔ یہ بہتر ہے کہ آپ کے سر کو چنگیز
ٹھکرائے۔ بہ نسبت اس کے کہ آپ کا سر ان لاکھوں
مومنوں کے ناحق خون کے وبال کا بوجھ اٹھائے۔ آپکو
یہ خیال تو آتا ہے کہ اگر آپ لڑائی کے میدان میں جائینگے
تو آپکو ایک شاہانہ مزار نصیب نہ ہوگا۔ آپ کی نظروں میں
یہ تصویر بھی پھر جاتی ہے۔ کہ اگر آپ چنگیز کے ہاتھوں میں
پڑ گئے تو بغداد میں بیٹھا ہوا ناصر آپ کی حالت پر قہقہے
لگائے گا۔ مگر یہ تو سوچئے کہ اگر آپ یہاں رہے تو یہاں
کی مٹی میں آپ کو ایک مزار بھی نصیب نہ ہوگا۔ اللہ کا
دست قدرت یہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ اور وہ آپکو ناصر
کی نظروں ہی میں نہیں بلکہ قیامت تک۔ شرق و غرب
میں جس قدر انسان پیدا ہوں گے۔ ان سب کی نظروں
میں ذلیل کر سکتا ہے۔ کبھی آپ کا ذہن اس طرف بھی
منتقل ہوا ہے +

علاء الدین۔ تو نے یہ گستاخی کب سے سیکھی ؟

جلال الدین۔ جس وقت سے آپ نے عہدہ پدری
چھوڑا +

علاء الدین۔ یہ کس طرح ؟

جلال الدین۔ کہیں اسے بھی باپ کہا جا سکتا ہے
جو خدا کے بندوں کو دشمن کی تلوار اور عزرائیل کے پنجہ میں
سپرد کر کے۔ خود حدود دشمن سے مہینوں کی راہ دور
بھاگ جائے۔ جو تین تین چار چار برس کے لڑکوں اور

لڑکیوں کو وہاں چھوڑ کر جہاں تاتاری جانوروں کا پنجہ سب سے پہلے انھیں پر پڑے - خود اپنی جان بچانے کے لئے لنکیا ایسے جزیرہ میں چھپ کر آبیٹھے جس پر نظر اجل بھی مشکل سے پڑے - اب آپ کا منھ اس قابل نہیں کہ کسی کو دکھائیں - چھ ہزار برس سے اس وسیع دنیا میں جس قدر ذلیل انسان پیدا ہوئے - ذلت وخواری میں آپ نے ان سب پر فوقیت حاصل کی - میں اس نامردی سے بیزار ہوں - خدا شاہد ہے کہ بیزار ہوں مجھ پر آپ کی اطاعت کیوں فرض ہو - آپ نے اپنی اولاد - اور خدا کے بندوں کے حقوق کی جو اپنی اولاد سے زیادہ آپ کو عزیز ہونا چاہئے تھے - کونسی رعایت کی کہ میں آپ کی اقتدا کروں - اور آپ کے حق پدری کا خیال کروں اگر آپ اس وقت یہاں سے اُٹھ کر دشمن کے مقابلہ کے لئے نکلیں تو آپ کا پہلا سپاہی میں ہوں گا - ایک لمحہ کے لئے آپ سے جدا نہ ہوں گا - فرض کیجئے کہ ہمارے ساتھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیں - ہم مغلوب ہو جائیں - تو بھی ہم ایک دوسرے سے علیحدہ نہوں - آپ میری پشت پناہ ہوں - میں آپ کے قدموں میں رہوں - ہم دونوں اپنی تلوار پر تکیہ کر کے شہید ہوں - پھر نہ دنیا میں اسیر ہونے کا خوف رہے اور نہ عاقبت میں ذلیل ہونے کا +

علاء الدین - کیا شاعرانہ خیال ہے!

جلال الدین - خیال نہیں! حقیقت بیان کر رہا ہوں - جو میں کہہ رہا ہوں وہ اس قدر صحیح ہے جیسی لوح محفوظ کی تحریر - اگر آپ میری باتوں پر کان نہ دھریں گے تو میں تنہا جاؤنگا لیکن اپنے باپ کے مقابلہ میں باغی ہو کر - قیامت میں - اللہ کی عدالت سے میرے لئے جو کچھ فیصلہ ہو اُس کے لئے میں راضی ہوں - لیکن دنیا میں قیامت تک ملعون ہونا میں قبول نہیں کر سکتا +

علاء الدین - (نیرہ سے) بیٹی! تم کیوں اس قدر متحیر نظروں سے دیکھ رہی ہو - میں نے جو کچھ کہا ہے - اس کا ایک ثبوت تو تمھارے سامنے موجود ہے - اگر جلال الدین کی باتوں پر اعتبار کیا جائے تو وہ میرے لئے اپنی جان قربان کرنے کے لئے طیار ہے - حالانکہ - ہوس سلطنت کو بھی قربان نہیں کر سکتا - میں مصیبت اور مغلوبیت کی حالت میں ہوں مگر زندہ ہوں - مر تو نہیں گیا - جلال میراث لینے کے لئے جانا چاہتا ہے - اور اس میراث کو حاصل کرنے کے لئے اپنے اعزا اور اقربا میں سے ایک ایک کو چُن چُن کے مار ڈالنے کی کوشش کرے گا +

جلال الدین - میں؟

علاء الدین - ہاں! تمھارا اگر مقصد حاصل ہو گیا تو اس سے کیا بہتر - اگر نہ ہوا تو تم یا قرہ قُرم کی طرف بھاگو گے - یا بغداد کی - اور دنیا پھر یا چنگیز یا ناصر کے دست تظلم کے نیچے رہے گی - ویران ہونے کے لئے تھوڑے سے مقامات اور باقی ہیں - جلال انسانی خون کے سیلاب سے انھیں بھی نیست و نابود کرنا چاہتا ہے اُس کا کیا نقصان ہے - خلقت کے نزدیک ملعون کہے جانے کے لئے کیا میں نہیں ہوں +

جلال الدین - خدا نے آپ کو کیا منحوس شکل پیدا کیا ہے - آپ کسی کی ذرہ برابر مدد نہیں کرتے - اور اس پر یہ خیال کرتے ہیں کہ جو امداد کے طالب ہیں وہ صرف آپ ہی کا منھ تکتے ہیں +

سنا ہے چنگیز کی ماں جس دن سے چنگیز کو جنی - ایک دفعہ

بھی عمر بھر ہنسی ہنستی۔ اگر وہ زندہ ہوتی۔ اور آپ کی باتیں سنتی
تو مارے ہنسی کے بیہوش ہو ہو جاتی +
علاء الدین۔ تمہیں سب کچھ کہنے کا حق ہے۔
میں اس مصیبت میں ہوں جو دنیا میں کسی پر نہیں پڑی۔
میری اس مصیبت میں۔ میرا بیٹا مجھ پر ہنس رہا ہے۔

دشمن کیوں نہ ہنسے +
جلال الدین۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں حدت
اور غصے کے مارے مر جاؤں۔ یہ آپ نے کیا بات کہی کہ
جلال آپ کے حال پر ہنستا ہے۔ آپ کی طبیعت میں ذرہ بھر
انصاف بھی نہیں رہا +

چاندنی رات میں

آسمان کی وہ نیلگوں سطح جس کی غیر منظم بزم آرائیاں اپنے
درمیان ایک وجود لطیف کو لئے ہوئے۔ زمین والوں میں ایک
شورش اور اُن کے دلوں میں ایک ہنگامہ برپا کر رہی تھیں،
میں نے دیکھا اسے سہیلی کہ وہ مجھ سے کچھ طلب کرتی ہے،
یہ ننھے ننھے تارے جن کی خواب آور لوریاں ایک دنیا کو
تھپک تھپک کر سلاتے دیتی تھیں۔ میں نے سنا کہ اپنے
اضطراب میں مجھ سے کچھ چاہتے ہیں۔ مگر تو ہی بتا میں کیسے
دے دوں۔ اپنے سینہ کی اُن نعمتوں کو جو تنہا میری مسرت کی
مالک اور میری زندگی کی عبارت ہیں۔ اِن چھوٹی چھوٹی منھ بند
کلیوں کی بے خودی اور وارفتگی میں نے دیکھی تو نہیں۔ البتہ
سنا کہ "یہ پریدہ رنگ و رمیدہ بو" ایک وسیع دامن کی متلاشی
اور کسی ایسے آغوش کی متمنی ہیں۔ جو اُن کی وابستگی کے قابل ہو
سچ بتا میں چھین لوں چمپا کے خستہ پھولوں کی نکہت اور
رنگینیٔ بو کو اپنے بالوں کے ایک ایک تار میں اور منتشر کر دوں
اُس وقت جب وہ میرے سامنے ہوں اور میں اُن کے +
اے چاندنی راتوں کے خوابیدہ منظر۔ تجھے خبر ہے کہ
کائنات کی بیداریوں میں۔ میرے سکون کا کس قدر حصہ
میرے دل کی کتنی راحتیں انتظار کے تیرہ ترین لمحوں میں
گزر جاتی ہیں۔ صرف اس امید پر کہ ان منور تاروں کی چھاؤں
اور مہتاب کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشن کرنوں میں۔ میرا دل
کسی رفتار کی پذیرائی کا متمنی نظر آتا ہے۔ اے میرے آقا
جب اُفق جنوب سے ایک سیمیں زنجیر نمودار ہوتے ہوئے
دیکھتی ہوں تو میں اپنی ساری راتیں جاگ کر کاٹ دیتی ہوں
اس لئے کہ صبح ہونے سے پہلے تو مل جائے۔ کائنات کا یہ روشن
منظر اُس کے سارے شور و ہنگامے تیرے خیر مقدم پر نعرۂ
مرحبا کے لئے سوگوار ہیں۔ اے دنیا کے تمام سمندروں پر
پھیلی ہوئی چاندنی۔ کیا ایک افسردہ و مضمحل کی رحم طلب صدا
کے لئے تیرے پاس گنجایش نہیں۔ میرا مدعائے حیات
صرف اُن سے مل رہنا ہے .... اسی الجھن میں
میں نے دیکھا کہ ....
...... وہ آتے بھی اور کچھ کہتے ہوئے چلے گئے +

جنگ بہادر لال نگم
کانپور۔

کامران حیات

وہ ایک سپاہی تھا۔ جس دن اُس نے اس خراب آباد میں آنکھ کھولی۔ اسی دن سے معرکہ کارزار گرم پایا۔ تمام اسلحہ اُس کے پاس تھے۔ اور نہ جانے کس نے اس کو بتا دیا تھا۔ کہ تو اس میدان کا سپاہی ہے۔ اور تجھے اس ہنگامہ زار میں بازو کا زور آزمانا ہوگا۔ شاید وہ اس کا گرم خون تھا۔ کہ اُس کے قوائے عمل کو سیماب صفت بیتاب کر رہا تھا۔ یا شاید اُسکی قوت متخیلہ تھی کہ دماغ کی اندھیری کوٹھری میں بیٹھی ہوئی یہ سارے فساد برپا کرنا چاہتی تھی۔ میدان سامنے تھا۔ اور ایک ناقابل اندفاع کشش تھی کہ اس کو اُس عرصۂ رستخیز کی جانب کھینچ رہی تھی بلکہ سچ تو یوں ہے کہ وہ کھنچتا تھا۔ اور کھینچنے والی طاقت کی نوعیت کو سمجھنا تو کجا۔ اس کے وجود کے ہلکے سے عکس کو بھی محسوس نہ کر سکتا تھا۔ جس طرح شیر جنگل میں اپنے معدہ کا مطالبہ پورا کرنے کے لئے ہرن کی گردن پر پنجہ مارتا ہے اور کچھ نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اور کیوں کر رہا ہے۔ جس طرح سمندر کا نہنگ بے اختیار منہ کھولتا ہے۔ اور چھوٹی مچھلیوں کو جو ابھی پانی کی وسعت میں رقص کر رہی تھیں۔ نگل جاتا ہے۔ مگر اس تقاضائے فطرت کی حاکمانہ بلکہ اوقات جابرانہ نوعیت کو محسوس نہیں کر سکتا۔ بالکل اسی طرح ایک نامعلوم سپہ سالار کی غیر محسوس طاقت اس کو آگے بڑھاتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ کہ جا! اور اپنا فرض ادا کر اس حکم کی تعمیل میں اُسکی قوت امتیازی کو کوئی دخل نہیں اور ہو کیوں کر؟ وہ نام نہاد قوت امتیازی تو خود ایک دھوکہ ہے

(۲)

وہ ایک وفادار سپاہی تھا۔ آج وہ سلاح جنگ سے آراستہ ہو کر رکاب میں پاؤں رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن باگ پر اپنی انگلیوں کی گرفت کو کمزور پاتا ہے۔ یہ کیا ہے کہ رکاب میں پاؤں کا پنجہ آسودہ نہیں۔ اور زین ایک دہکتا ہوا انگارا معلوم ہوتی ہے! اس کے اعماق روح میں کوئی چیز ہے، جو لرز رہی ہے۔ اس کے دماغ میں کوئی پھانس ہے جو بُری طرح کھٹک رہی ہے۔ اس کے دل میں ہراس اور عزیمت مردانہ کی کشمکش ناقابل برداشت ہوتی جاتی ہے

کیا میں آج بغاوت کرنا چاہتا ہوں؟ کیا میں اپنی قسمت سے سرتابی کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں؟"

وہ بار بار اپنے دل سے سوال کر رہا تھا۔ میری فوج کا سالار، میرا امیر عسکر، جس کو میں نے دیکھا نہیں لیکن جس کے احکام کی بجا آوری کا حلف میں اُٹھا چکا ہوں، کیا کہے گا جب وہ دیکھے گا (اور کیا وہ دیکھتا نہ ہوگا) کہ اس کے سپاہی کا عزم صادق آج متزلزل ہے" اس کا ضمیر اُسکی چٹکیاں لے رہا تھا۔ . . . .

. . . . . . رکاب میں پاؤں رکھ کر وہ بے اختیار گھر کے دروازہ کی جانب مڑا۔ جہاں ایک نوعمر لڑکی جو چند ہی روز ہوئے۔ دوشیزگی کی دنیائے خیال سے محبت کی کامرانیوں کے دروازہ تک پہنچی ہے، سر جھکائے کھڑی تھی۔ سر جھکا ہوا تھا۔ گویا کہ وہ نہیں دیکھ رہی ہے۔

گویا کہ اُسے خبر نہ تھی۔ کہ کس کے گھر کا سپاہی آج میدان کارزار کی جانب جا رہا ہے! آہ! محبت کی یہ خود فریبیاں! ..... اور پھر وہ سپاہی کہ ہنوز عورت کی دل فریبیوں سے اچھی طرح آشنا بھی نہ ہوا تھا۔ میدان جنگ کے خطرات کا خیال کرتا تھا۔ اور اپنے اندر ایک شکستگی ایک اضمحلال، ایک تنزلزل پاتا تھا۔ جس سے وہ کبھی پہلے واقف نہ تھا۔ آخر آج میدان جنگ میں جانا کوئی نئی بات تو نہ تھی اس کے شباب کا ایک ولولہ انگیز عہد وہ گزرا تھا۔ کہ وہ اپنے گھوڑے کی زین کو اپنا وطن سمجھتا تھا۔ تلواروں کی جھنکار اس کی روح کے لئے نغمۂ حیات تھی۔ اور وہ انسان کی مختصر زندگی میں۔ دو ہی کام کرنے کے قابل جانتا تھا جان لینا۔ اور جان دینا۔ اُس کے خیال میں جان گویا کہ دنیا کی سب سے سستی چیز تھی۔ لیکن اُس کو خبر نہ تھی کہ انسان کا نقش حیات رزم کے علاوہ بزم کا پہلو بھی رکھتا ہے۔ اور یہ کہ اس عالم فانی میں۔ عورت کائنات کا وہ جوہر لطیف ہے جس کی آمیزش کے بغیر نظام بشریت کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ آخر وہ دن آیا کہ اُس نے اس نئی دنیا میں قدم رکھا زندگی کا یہ نیا دور اس کے لئے نئی نئی دلچسپیاں لیکر آیا! کتنے ہی اسرار حیات تھے جن کی حقیقت اس کو عورت کے پہلو میں نظر آئی۔ وہ تلوار اور خون کے سوا کچھ نہ جانتا تھا۔ پر عورت نے اس کو بتایا کہ اس کے بازو تلوار ہی کے لئے وقف نہیں ہیں۔ اُن پر ایک کمزور، اور اپنی تمام کمزوری کے ساتھ تلوار سے زیادہ طاقتور عورت کے سیاہ بال بھی بکھرا کرتے ہیں! پھر اس نے بتایا کہ دنیا میں سب سے زیادہ عزیز چیز گھوڑا ہی نہیں ہے کہ اُس کے سوا کوئی عزیز نہ ہو۔ کوئی اور بھی ہے جو بڑے بڑے شہسواروں کو ان کی زین سے جدا کرتی ہے +

سپاہی کی زندگی کا یہ نیا دور کس قدر مختصر اور کس قدر سبق آموز تھا۔ ....

آج معلوم ہوتا ہے کہ جنگ اور محبت کی کشاکش میں شاید اس کے ارادے شکست کھا جائیں گے۔ وہ پاؤں جو رکاب میں رکھا جا چکا تھا۔ رکاب سے نیچے آتا ہے۔ وہ ہاتھ جو باگ پر جا چکا تھا۔ باگ سے جدا ہوتا ہے حتی کہ وہ دل جو ابھی میدان جنگ کی طرف جانے کا تقاضا کر رہا تھا۔ اب اُس کے پاؤں گھر کے دروازہ کی جانب بڑھا رہا ہے۔ آہ! اے ابلہ فریب دل۔ ترا تلون! عقل سلیم کو تو شکست دیتا ہے۔ ضمیر کو تو دھوکا دیتا ہے۔ دماغ کو تو بہکاتا ہے +

لیکن وہ بے زبان ہستی۔ وہ خاموش موسیقی۔ وہ دھیما نغمہ! وہ شعر جس میں الفاظ نہیں ہیں۔ اور معنی ہیں۔ وہ تصویر جو کاغذی پیرہن سے محروم ہے مگر روح رکھتی ہے۔ وہ پھول جو صرف اپنی مہک سے اپنے وجود کا ثبوت دیتا ہے یعنی عورت جو اُس قوی الجثہ حیوان کی کمزوری کو جسے مرد کہتے ہیں محسوس کر رہی تھی۔ اُسکی پیشانی کی ہر شکن میں وہ اس کے دل کی دھڑکن دیکھ رہی تھی۔ سپاہی کی آنکھیں اس کے لئے ایک آئینہ تھیں۔ کہ اس کو اُن آئینوں میں اپنے شہسوار کے ارادوں کی لغزش صاف نظر آ رہی تھی... .... مگر کیا وہ عورت نہ تھی۔ اور کیا وہ انسانیت کے جذبات عالیہ کی نگہبان نہ تھی۔ کیا وہ بشریت کے اعلیٰ ترین

صفات قدسیہ کی امین نہ تھی۔ کیا اس کا فرض نہ تھا کہ وہ محبت کی کمزوریوں کو انسانیت کے جوہر پر حاوی نہ ہونے دے؟

اُس نے واپس آتے ہوئے سپاہی کی طرف دیکھا اور کچھ اس طرح دیکھا کہ محبت کا دیوتا جو اس کو کھینچے ہوئے لا رہا تھا۔ بے اختیار ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اور صرف ایک ہی لمحہ کے لئے۔ شرنگین آنکھیں جو ایک نوکشیدہ محبت سے مخمور تھیں۔ اپنے تمام وقار نسوانیت کے ساتھ اس کی طرف پلٹیں۔ گویا اُس سے کہہ رہی تھیں کہ "اے میرے سپاہی۔ اے وہ کہ تو میری تمام مسرتوں کا مرکز ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرے ارادوں کی کمزوری میرے غرور نسوانیت کا خون کردے جا! جان سے زیادہ پیارے' جا! اور اپنا فرض ادا کر' گیا تو اپنے امیر سے عہد شکنی کرکے میری محبت کی توہین کرے گا"! ....

.... یہ ایک نگاہ تھی کہ اس نے گرتی ہوئی دیوا کو سنبھال لیا۔ کانپتے ہوئے دل کو طمانیت بخشی اور بھٹکے ہوئے قدموں کو سیدھے راستہ پر لگا دیا ....

یہ عورت کا معجزہ ہے۔ اور اُس کے سپاہی کی یہ پہلی فتح تھی کہ وہ ایک آخری نگاہ محبت ڈال کر لوٹا۔ اور تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر مردانہ وار اس میدان کی طرف چل دیا جہاں اُس کا امیر عسکر صفیں درست کر رہا تھا ....

میدان جنگ میں جانے سے پہلے وہ ایک سخت معرکہ سے سرخرو نکلا۔ فطرت انسانی کا جوہر شناس سوا اسکے اور کیا کہے گا۔ کہ اُس سیاہ زلفوں والی کا سپاہی میدان کارزار میں جانے سے پہلے ہی بہت بڑا معرکہ جیت چکا تھا

کہتے ہیں۔ کہ جو سپاہی عزم کامل کے ساتھ رکاب میں پاؤں رکھتا ہے۔ وہ میدان جنگ میں پہنچنے سے پہلے آدھی لڑائی جیت لیتا ہے۔ رموز فطرت کا حقیقت شناس کہتا ہے۔ کہ نہیں! جس سپاہی نے عزم صادق کے ساتھ کمر سے تلوار باندھی وہ خواہ میدان کارزار میں ہلاک ہی کیوں نہ ہو جائے تلوار کو بے نیام کرنے سے پہلے پورا فاتح اور غازی ہوتا ہے میدان جنگ کی آخری تاریخ اُس کی فاتحانہ عظمت پر کوئی اثر نہیں رکھتی اصلی لڑائی تو وہی ہے۔ جو رکاب میں پاؤں رکھنے سے پہلے خود اُس کے سینہ کے اندر لڑی جاتی ہے اسی معرکہ کی فتح وہ حقیقی سعادت ہے جو انسان کامل ہی کے لئے مخصوص ہے! ....

...... اُس کے چاروں طرف آتش جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور اُس کے دل میں محبت کا چراغ روشن تھا وہ زخم کھا رہا تھا۔ اور زخم لگا رہا تھا حیوانیت کی انتہائی طاقت اور انسانیت کے تمام قوائے عمل اُس معرکہ زار حیات میں آگ اور خون کی آمیزش پر تلے ہوتے تھے۔ یوں تو کہنے والوں نے اکثر کہا ہے۔ او صوفی منش فلسفی اب بھی یہ کہتا ہے کہ انسانیت کی یہ خون آشامیاں یہ بیمانہ جذبات اور ان کی زبردستیاں۔ کائنات لطیفہ کے دامن پر ایک شرمناک دھبہ ہیں۔ لیکن کاش فلسفی اُس کے بنانے والے سے پوچھتا کہ تو نے زمین کے خلیفہ کو بنایا ہی تھا تو ایسا کیوں بنایا جنت میں اُس نے گناہ کیا۔ دنیا میں اُس نے فساد پھیلایا۔ پھر اپنی رفعت دائمی کے بعد نہ جانے کیا کریگا خدا یہ ستم ظریفی دیکھتا کہ شہد اور دودھ کی نہروں سے خون کے پیاسے بناتے۔ اور اُن سے کہا کہ تم زمین کے خلیفہ

اور مخلوقات عالم کے سرتاج ہو! . . . .

. . . . . . لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب نظر کا دھوکا ہو یا خود ہماری کوتاہ نظری کا کرشمہ ہو۔ ہم نے سپاہی کی خوں چکاں تلوار دیکھی۔ لیکن ہم نے اُس کا دل نہیں دیکھا جس میں محبت کا پاک چشمہ اُبل رہا ہے۔ اُس آئینہ کو نہیں دیکھا جس میں اُس کی لطیف و پاکیزہ روح کا عکس صاف نظر آتا ہے یہ اجتماع ضدین۔ فطرت کی کرشمہ کاری ہے۔ جس کو فلسفی دُور سے دیکھ لے اور زمانہ چھیڑے اس ساز کے پردوں کو اُس کی عقل غلط کار نہ کبھی سمجھ سکی نہ سمجھ سکے گی۔

عین ہنگامۂ کارزار میں جب سپاہی کی تلوار اپنی پیاس سے بیتاب ہو کر خون مانگ رہی تھی۔ وہ اُس لڑکی کی آخری نظر کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بھولا تھا جس نے چلتے وقت اُس کو دروازہ پر ایک ناقابل بیان ادائے محبت کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ گویا کہ شاید یہ اُس نوبہار الفت کی آخری نظر کا ایک کرشمہ تھا۔ میدان کارزار میں بھی محبت کا دیوتا سپاہی کے رکاب پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔ اور دل کے اُس حصار عافیت کی حفاظت کر رہا ہے جو خاص اسی کی سلطنت ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ خون کے چھینٹے جو سپاہی کی آستین و دامن کو آلودہ کر رہے ہیں۔ اُس کے دارالسلطنت تک پہنچیں . . . .

———+———

آخر وہ دن آیا کہ کارزار حیات کا سورما زندگی کے ابتدائی تحریکوں میں سرخرو ہو کر محبت کے آغوش راحت کی جانب واپس آیا۔ جہاں وہ چاہتا تھا کہ محبت کے نازک ہاتھ اُس کی پیشانی کا پسینہ خشک کریں جہاں آرام گاہ الفت میں وہ اُس سکون قلب کا متلاشی تھا جس کے لئے میدان جنگ کی جدجہد حیات نے اُسے ترسا دیا تھا۔ آہ! اُسے کیا خبر تھی کہ اوائل عہد شباب میں اُسکو زندگی کی آخری لڑائی بھی لڑنی پڑے گی . . . .

———+———

مسافر کے شوق بیحد کو الفاظ کیوں کر ادا کریں جب وہ منزلوں کو طے کرتا ہوا دور سے اپنے گھر کا دروازہ دیکھتا ہے محبت کے اُس ستوائے کا مرقع الفت تصویر کے نقش و نگار میں کیوں کر سمائے۔ جو ایک جذبہ بے اختیار اشتیاق کے ساتھ گھر کے صحن میں قدم رکھتا ہے کہ اپنی ملکہ کی آنکھوں میں اپنا خیر مقدم دیکھے . . . .

کسے خبر ہے کہ اُس کے شوق شوریدہ سر نے اُس کو کس درجہ وارفتہ بنا دیا تھا۔ اُسے اپنا گھر پہنچنا یاد نہیں اُسے یاد نہیں کہ وہ کیوں کر گھوڑے سے اُترا۔ کیوں کر دروازہ کے اندر داخل ہوا۔ اُس کی نظروں نے کہاں کہاں جستجو کی۔ اور اُس عالم بیتابی میں کس نے اُس کے کان میں کہا کہ "وہ اب یہاں نہیں ہے"!

آخر اُس کو اُس کی ملکہ کے آستانہ پر لے گئے خستہ پا مسافر کو لوگ اُس آرام گاہ الفت اور خلوت خانہ محبت تک لائے جہاں اُس کی ملکہ اپنے سپاہی کے آنے کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی . . . .

اُس کی روح نے اپنا گھر دیکھ لیا قبر کے پتھر اُس کی نظر میں بلور سے زیادہ شفاف تھے۔ اُس نے کیا دیکھا؟ معلوم نہیں، اہل نظر کہاں تھے۔ جو اُس کی نظر کا ساتھ دیتے وہ جھکا اور سب یہ سمجھے کہ سنگ مزار کو بوسہ دینا چاہتا ہے

لیکن جس طرح ایک پرند شکاری کا تیر کھا کر ہوا میں بلند ہوتا ہے اور اپنے جسم سے خون کے قطرات گراتا ہوا آخر شام کو جبکہ اس جسم کا آدھا خون ہوا میں بکھر چکا ہوتا ہے۔ اپنے آشیانہ پر گرتا ہے۔ اور بازوؤں کو پھیلا کر جہاں گرتا ہے وہیں بے حس و حرکت رہ جاتا ہے

اُس زخم خوردہ الفت نے بھی اپنا سر سنگ مزار پر رکھدیا۔ اس کے بازو پھیلے ہوئے تھے گویا کہ وہ اُس مٹی کے ڈھیر میں جذب ہوا جاتا ہے۔ اُس کا ایک رخسار کچھ اس طرح لوح مزار پر رکھا ہوا تھا۔ کہ گویا وہ کان لگا کر کچھ سن رہا ہے۔ . . . .

. . . . چاروں طرف انسانوں کا ایک انبوہ تھا۔ جو دیکھ رہے تھے۔ اور سمجھتے کچھ نہ تھے۔ دیکھنے والے شام کا تماشا بھی صبح تک سب بھول جاتے ہیں پھر جو سپاہی اپنی زندگی کی آخری فتح حاصل کر کے آغوش محبت میں جا سویا۔ وہ ایک کم نظر اور المعرفت دنیا کی جوہر شناسی کا محتاج ہی کب تھا؟ وہ جب گھر سے میدان کی طرف گیا تھا۔ تب بھی فاتح تھا۔ اور جب وہاں سے واپس اپنی آخری منزل پر آیا تب بھی مظفر و منصور آیا !!

لوگ حیران و ششدر تھے کہ کیا وہ قبر پر سر رکھ کر سو گیا بیہوش ہو گیا۔ یا کہیں مر تو نہ گیا۔ آہ! اے دنیا۔ اور اے دنیا والو جہد حیات کے سرفروش یا میدان کارزار میں گھوڑے کی پیٹھ پر آخری زخم کھاتے ہیں۔ یا پھر اس سجدہ گاہ محبودیت و عشق پر اپنا آخری اور انتہائی خراج ادا کرتے ہیں۔ پھر جو خوش نصیب تھے دونوں معرکوں میں سرخرو رہے وہ جہد حیات کے سورما بھی ہیں۔ اور کامران عاشق بھی ! . . . .

. . . لوگ ابھی اُس شہید آرزو کی نبض ہی ڈھونڈھ رہے تھے اتنے میں وسط انبوہ سے ایک پیر مرد عصا ہاتھ میں لئے ہوئے نکلے۔ ان کے سپید ہونٹ ضعیف العمری کی وجہ سے یا شاید دل میں پیدا ہونے والے کسی ہیجان کے باعث کانپ رہے تھے۔ انہوں نے کہا جاؤ اپنے گھروں کو جاؤ۔ یہ منظر تمھاری آنکھوں کیلئے نہیں ہے۔ یہ سورما اپنی آخری لڑائی لڑ چکا"! (خاموش)

ترقی حیات

موجودہ زمانے میں "ترقی حیات" کے اکثر یہ معنے لئے جاتے ہیں کہ انسان کی زندگی کسی قدر نمایاں ہو۔ اور وہ ایسا درجہ حاصل کرے جسے اور لوگ معزز قابل تعظیم سمجھیں۔ اس ترقی سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ ہم محض روپیہ کمائیں بلکہ یہ کہ لوگوں کو بھی اس بات کا علم ہو۔ کہ ہم نے روپیہ پیدا کیا ہے اس سے ہمارا یہ مدعا ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی بڑے مقصد کی تکمیل کریں بلکہ یہ کہ لوگ بھی ہماری اس تکمیل کے دینے والے سمجھیں مختصراً ہمارا مطلب محض نمائش کی پرستش کو پیہ گرنا ہوتا ہے یہ تشنگی جیسے بقول اطمشن پسندیدہ ہے اور اعلیٰ حصہ لوگوں میں آخری آنچ کی طرح سمجھنا چاہئے۔ غیر تعلیم یافتہ جماعتوں کی ادنیٰ کمزوری بھی ہے۔ اور اکثر طبقہ وسطیٰ کے لئے نہایت زبردست محرک ہوتی ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس طرح قوم کی بڑی بڑی مصائب کا باعث عیش و عشرت پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح عظیم ترین مساعی کی محرک ہمیشہ خواہش شہرت ہوتی

(دیکھو) [illegible]

گھونگٹ میں

میرا دل چاہتا ہے۔ کہ میں تجھے بے نقاب دیکھوں۔ گر موہنی کی آرزو میری آرزوؤں کا خون کئے دیتی ہے۔ اور میں پیاسا منہ لے کے رہ جاتا ہوں۔

میں نے تجھے دیکھا نہیں۔ ہاں محسوس کیا ہے۔ تو محسوس ہونے میں وسیع ہے۔ تیرے پُر اسرار گھونگٹ کے سُنہری کنارے کی کرنیں جب میرے ایمن دل پر عکس ڈالتی ہیں۔ تو میں تجھے گھونگٹ ہی گھونگٹ میں جان لیتا ہوں۔ کہ تیری آنکھیں رسیلی۔ نیم باز۔ اور تبسم سے مخمور ہیں۔ تیرے لب لعل میں غنچہ کی شان پیدا ہے۔ اور تیرے حسن کی بھینی بھینی خوشبو کا سمندر دنیا کے سارے منظر میں موجیں مارتا پھرتا ہے۔ پس میں کہوں گا۔ کہ تیری گفتار ہزار نغموں کا ایک نغمہ ہے۔ یعنی جہان تیری آنکھ میں ہے۔ یا یہ کہ تو جہان کی آنکھ میں ہے۔

میں نے کئی بار چاہا۔ کہ تجھے ہر جگہ محسوس کروں۔ اور ہر شے میں تیری جلوہ نمائی دیکھوں۔ اور تیرے تبسم بھرے خمار کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں ڈال لوں۔ کیونکہ تو ہر جائی ہے۔

میں ہمیشہ مایوس اور ناکام کیوں رہتا ہوں۔ تیرا خیر مقدم کرنے کے لئے رات کی خاموشی میں پہروں کہکشاں ٹکٹکی لگائے اپنے جھروکے سے جھانکتا ہوں۔ اور تیری آمد میں اختر شماری کرتے کرتے انتظار کی ختم نہ ہونے والی گھڑیاں وقت کے پردہ پر اڑتی چلی جاتی ہیں۔ مجھے ڈر ہے۔ کہ میری ہمراز شمع سحری جو ہزاروں شہیدوں کا مزار ہے۔ کہیں سرد نہ ہو جائے تو آتا ہے۔ تو تیرے قدموں کی آہٹ پر نسیم سحر کا گمان ہوتا ہے اور جب اس گھونگٹ میں تجھ سے دوچار ہوتا ہے۔ عین اس وقت میری خوشی کی مثال ایک بھنور کی ہے جس میں میری آرزوئیں نالوں کی طرح شور کرتی ہوئی گرتی ہیں۔ اور حباب کی طرح سر اٹھاتے ہی فنا کا جام پی کر ہمیشہ کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ تیرے پُر اسرار نازوں سے ہمراز ہونا میری شان کے شایاں نہیں۔ اور دلی جذبات کا اظہار ہے جو یہ کہوں کہ میں نے تجھے دیا۔ تیری آمد ہزاروں خوشیاں اور ہزاروں آرزوئیں لاتی ہے۔ جب تو آجاتا ہے۔ تو میں ہر خواہش کو محسوس کرتا ہوں۔ مگر گویائی کی طاقت نہیں ہوتی۔

جب میں تجھ کو ہنسانے کے لئے تجھ سے تیرے ہی گھونگٹ کا ذکر کرتا ہوں۔ تو تیری چپ سے میری امیدوں کی دنیا میں تبسم کے ذخار سمندر امنڈ آتے ہیں۔ اور مضطرب موجوں کے جل ترنگ سے تیرے گھونگٹ کو کھینچنے کا خیال خواب ہو کر پاس سے گزر جاتا ہے۔ تیری محبت کے سرور کو دل کے محل میں چھپائے رکھتا ہوں۔ یہی تیرا گھر ہے۔ اور تو ہمیشہ اسے ویران رکھتا ہے۔

میں اپنی امیدوں کو ہمیشہ حسرت کے چنگل سے بچاتا ہوں کیونکہ تیرے گھونگٹ سے مجھے یقین پڑتا ہے۔ کہ اگر تجھے بے نقاب دیکھ لوں۔ تو اپنی ہستی کھو بیٹھوں۔

چغتائی

اشکِ ندامت

(۱)

۱۷۹۹ء کا ذکر ہے کہ ایک خستہ حال نوجوان دیہات سے فوج میں بھرتی ہونے کے لئے لندن آیا۔ برہنہ پائی سے اس کے پیروں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ لنگڑا لنگڑا کر چلتا تھا۔ حسرت و یاس نے اُسے زندگی سے بیزار کر دیا تھا۔ اگر دل میں کوئی تمنا تھی تو یہ کہ تیر و تفنگ کا نشانہ بن جاؤں۔ یہ محبت ناکام کا نتیجہ تھا۔ وہ ایک بلند قامت نوجوان تھا۔ اس خستہ حالی میں بھی اُس کی صورت سے غیرت برستی تھی اس کے چہرہ پر وہ نسبی شرافت تھی۔ جسے بدحالی بھی محو نہیں کر سکتی۔ چند روز قبل وہ ایک خوش نصیب انسان سمجھا جاتا تھا۔ زمانہ موافق تھا۔ وسائل معاش کافی۔ سیرت نیک گاؤں کا ہر فرد اس کا مداح تھا۔ ایک شریف خاندان اور نیک بخت حسینہ سے منگنی بھی ہو گئی تھی۔ شادی کے دن قریب تھے۔ پر اسی اثنا میں ایک ایسا حادثہ ہو گیا۔ جس نے رچرڈ کی زندگی کا نقشہ پلٹ دیا۔ ایک روز شراب کے نشہ میں اس نے حسینہ کے والدین کے روبرو کچھ ایسی بیہودہ کلامی کی۔ کہ اس نیک بخت کو اُس سے ترک مے نوشی کے لئے اصرار کرنا پڑا۔ رچرڈ نے نادم ہو کر وعدہ کیا پر ایفا نہ کر سکا۔ اتنا ہی نہیں اس کا چسکا روز بڑھنے لگا۔ بالآخر اس حسینہ نے جو دل سے اس کی محبت کرتی تھی۔ ایک روز نہایت متانت سے کہا "رچرڈ! شاید خدا کو منظور نہیں ہے کہ تم میرے شوہر ہو میں کسی دوسرے شخص سے ہرگز شادی نہ کروں گی۔ مگر اب تم پھر میری صورت نہ دیکھ سکو گے۔ میری زبان سے ایک بات بھی نہ سن سکو گے۔ جاؤ۔ خدا تمہیں معاف کرے"

ان الفاظ نے رچرڈ کا کام تمام کر دیا۔ اُس کی بہار زندگی ختم ہو گئی۔ وہ اسی مایوسی کے عالم میں فوج میں داخل ہونے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ موت کے سوا اس کی یاس کا علاج نہ تھا۔

(۲)

ہینیھم کی رجمنٹ میں رچرڈ کو جگہ ملی۔ پر تھوڑے ہی دنوں میں وہ ایک نیک منش نوجوان کے بدلے رجمنٹ کا سب سے بد وضع اور ناہموار سپاہی خیال کیا جانے لگا۔ وہ ہمیشہ بدمعاش سپاہیوں کی صحبت میں بیٹھتا جوا کھیلتا۔ بے اعتدالی کے ساتھ شراب پیتا۔ جرمانہ۔ نظر بندی اور لعن طعن جیسی سزاؤں کا اس پر مطلق اثر نہ ہوتا۔ یہ عام خیال تھا کہ اگر کچھ دنوں اس کی یہی حالت رہی۔ تو ضرب بید سے اس کی خبر لی جائے گی۔ واضح رہے کہ اُس زمانہ تک فوج میں جسمانی سزاؤں کا عام رواج تھا۔

اس رجمنٹ کا کپتان ایک نوجوان آدمی تھا۔ جو عمر میں رچرڈ سے چار پانچ سال بڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں خوبصورت اور تیز تھیں۔ کپتان کی اس تیزئ نگاہ کا رچرڈ پر ایک نہایت حیرت انگیز اثر پڑتا تھا۔ دنیا میں یہی ایک نگاہ ایسی تھی جس کے سامنے اس کا سر شرم سے جھک جاتا تھا۔ رچرڈ سزا اور بدنامی کی ذرا بھی پروا نہ کرتا۔ لیکن کپتان کی تیز نگاہ پڑتے

ہی سہما جاتا تھا۔ اثنائے راہ میں اگر کپتان ٹانٹن کہیں آتے جاتے مل جاتے۔ تو اس کی سلام کرنے کی بھی ہمت نہ پڑتی۔ وہ متوحش ہو جاتا۔ یا تو کترا کر نکل جاتا۔ یا کسی جگہ کونے میں ہو لیتا۔

ایک بار رچرڈ کو دو دن کی حوالات ہوئی۔ وہ حوالات کا ایسا عادی ہو گیا تھا۔ کہ اس سزا کو سزا ہی نہ سمجھتا تھا۔ لیکن جونہی وہ باہر نکلا۔ اُسے کپتان ٹانٹن کے بنگلے پر جانے کا حکم ملا۔ رچرڈ کی روح فنا ہو گئی۔ اُسے مطلق گمان نہ تھا کہ مجھے اس ہیبت کذائی میں کپتان کے روبرو جانا پڑے گا۔ وہ با دل ناخواستہ اُٹھا۔ اور آہستہ آہستہ کپتان کے دروازہ پر جا پہنچا۔ دستک کی آواز سن کر کپتان نے کہا" اندر چلے آؤ" رچرڈ نے ٹوپی اتار لی اور کمرہ میں قدم رکھا۔ اب وہ اُنہیں تیز نگاہوں کے روبرو تھا۔

کپتان نے کہا" رچرڈ! تمہیں معلوم ہے کہ کہاں جا رہے ہو؟"

رچرڈ نے مرعوب ہو کر کہا" جی ہاں ... جہنم کو"

کپتان" ہاں اور بہت تیزی سے ... رچرڈ۔ جب میں شاہی فوج میں داخل ہوا۔ اس وقت میری عمر صرف سترہ سال تھی۔ اُس زمانہ سے آج تک صدہا بدمعاش اور اوباش سپاہی میری نظروں سے گذرے۔ لیکن جس قدر ملال مجھے تمہاری کج روی سے ہوا۔ اتنا اور کبھی نہ ہوا تھا"

رچرڈ اس طرح ٹکٹکی لگائے فرش کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کے تمام کارناموں کا نقشہ اس پر کھنچا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اُسے کپتان کے میز کے پائے ٹیڑھے نظر آنے لگے۔ گویا وہ پانی میں ہیں۔ بہت دیر کے بعد اُس نے حسرتناک لہجہ میں کہا" میں ایک معمولی سپاہی ہوں۔ مجھ جیسے نامعقول آدمی کا فنا ہو جانا ہی اچھا ہے۔ کیونکہ اس سے کسی کا کچھ نفع یا نقصان نہ ہو گا"

کپتان نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا" تم تعلیم یافتہ آدمی ہو۔ تم نے ایک شریف خاندان میں پیدا ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔ اگر جیسا تم کہہ رہے ہو یہی تمہارا منشا بھی ہے۔ تو بلاشک جس حد تک میں نے خیال کیا ہے۔ تم اس سے کہیں زیادہ گر گئے ہو"

رچرڈ" جناب عالی مجھے امید ہے کہ میں جلد بندوق کا نشانہ بن جاؤں گا۔ اس وقت دنیا اور رجمنٹ دونوں مجھ سے پاک ہو جائیں گے"

رچرڈ کو میز کے پائے پہلے سے بھی زیادہ ٹیڑھے معلوم ہونے لگے۔ اپنی نگاہ جمانے کے لئے اس نے آنکھیں اوپر اُٹھائیں تو اس کی نگاہ کپتان کی تیز نگاہوں سے لڑ گئی۔ اُس نے ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس کے سینہ پر کا داغدار واسکٹ اس قدر پھولا گویا پھٹ جائے گا۔

کپتان نے کہا" رچرڈ اگر کوئی اس وقت میری بوڑھی ماں کے لئے مجھے پانچ ہزار اشرفیاں بھی دے دیتا۔ تو بھی مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی تمہاری شرمندگی سے ہوئی۔ کیوں کیا تمہاری ماں ابھی زندہ ہے؟"

رچرڈ" جی نہیں وہ اس عالم میں نہیں ہیں"

کپتان" اگر وہ زندہ ہوتیں تو انہیں ضرور اس بات کی تمنا ہوتی کہ وہ تمہاری تعریفیں سنیں اور فخر سے کہیں کہ رچرڈ میرا لڑکا ہے"

رچرڈ" جناب معاف فرمایئے۔ میں کس منہ سے یہ تمنا کرتا۔ اُنہیں میری ذات سے کبھی خوشی یا فخر کی امید نہ ہوئی۔ ہاں وہ مجھ پر ترس ضرور کھاتیں۔ لیکن فخر و ناز! کپتان صاحب معاف فرمایئے کبھی نہیں۔ میں اول درجہ کا شریر آدمی ہوں لیکن آپ کی مہربانی چاہتا ہوں"

+ یہ کہہ کر رچرڈ نے اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ اور دونوں
ہاتھ عاجزی کے ساتھ کپتان کی طرف بڑھا دیئے۔"

کپتان نے کہا "میرے پیارے دوست!"

رچرڈ نے سسکتے ہوئے کہا "پروردگار آپ کو خوش رکھے۔"

کپتان۔ تمہاری حالت بہت ابتر ہے۔ اگر تم نے جلد اصلاح
کی کوشش نہ کی تو اس کا نتیجہ بُرا ہوگا۔ اگر ایک مرتبہ بھی تمہیں
جسمانی سزا مل گئی۔ تو تمہارا سنبھلنا مشکل کیا بلکہ ناممکن ہو جائیگا
کوئی باحیا شخص اُس ذلت کو برداشت نہیں کرسکتا۔"

رچرڈ نے تھرائی ہوئی آواز سے کہا "جی ہاں مجھے بھی ایسا
ہی یقین ہے۔"

کپتان۔ "رچرڈ! انسان کسی حالت میں ہو۔ مناسب ہے کہ وہ
اپنے فرائض پر نگاہ رکھے۔ اسی کے ذریعہ سے وہ عزت کے
اعلےٰ مدارج پر پہنچ سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ دوسروں
پر اپنا اثر ڈال سکے یا نہیں۔ ایک معمولی سپاہی کو بھی آج یہ فخر
حاصل ہے۔ کہ وہ اپنے ساتھیوں سے اپنا ذکر کرتے ہوئے
نہ جھجکے۔ اور اس طریقہ سے کام کرے۔ کہ اس کی نیکی اور اس
کا اخلاق رجمنٹ کے تمام سپاہیوں کو اپنا مداح بنا لے۔ کیا
تمہارے لئے یہ امر غیر ممکن ہے؟ مجھے یقین ہے۔ کہ تم اب
بھی اپنے تئیں سنبھال سکتے ہو۔ کیا اس کی کوشش کرو گے؟"

رچرڈ نے جوش میں آکر کہا "انشاءاللہ ضرور کروں گا۔
صرف ایک گواہ کی ضرورت ہے۔"

کپتان۔ میں سمجھ گیا۔ مجھی کو اپنا معتمد اور قابل وثوق گواہ
سمجھو۔"

رچرڈ کپتان کے پیروں پہ گر پڑا۔ اور اُن کے ہاتھ چوم
لئے۔

(۳)

+ اہل فرانس نے مصر، اٹلی، جرمنی وغیرہ ملکوں میں ہنگامہ
برپا کر رکھا تھا۔ نپولین بوناپارٹ ہندوستان میں بھی غدر مچانے
کی کوشش کر رہا تھا۔ کپتان ٹامٹن کی فوج اس وقت ہندوستان
میں تھی۔ اس فوج میں رچرڈ سا جری اور نیک نام سردار دوسرا
نہ تھا۔

۱۸۰۵ء کا زمانہ بڑا نازک تھا۔ ٹریفلگر کی جنگ کے علاوہ
ہندوستان میں بھی ایک سخت لڑائی ہوئی۔ اسی سال ایک
سارجنٹ میجر نے نہایت اہم کام کئے۔ تن تنہا دشمن کی آہنی
دیواروں کو توڑ کر اپنی رجمنٹ کے جھنڈے کو چھین لایا۔ اس
کا کپتان مجروح ہوکر گھوڑے سے گر پڑا۔ اور قریب تھا کہ
گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل جائے۔ لیکن اس بہادر نے اس
کی بھی جان بچائی۔ یہ وہی رچرڈ تھا۔ جو ایک سپاہی کے درجہ سے
ترقی کرکے اب اتنا ممتاز اور مشہور افسر ہوگیا تھا۔

۱۸۱۲ء میں انگریزی فوجیں براجوز میں تھیں۔ کپتان ٹامٹن
کے رجمنٹ کی اتنی تعریف ہوئی کہ اس کا نام عزت کے ساتھ لیا
جانے لگا۔ اور اس کے کارہائے نمایاں کے افسانے پڑھ پڑھ
کر برٹش قوم کے ہر فرد و بشر کی آنکھیں فخر اور مسرت سے آبدیدہ
ہونے لگیں۔ اس ناموری کا سہرا علم بردار رچرڈ کے سر تھا۔
جو کپتان ٹامٹن کا داہنا بازو بنا ہوا تھا۔

لیکن براجوز میں ایک حادثہ ہوگیا۔ جس نے رچرڈ کے دل
پر ہمیشہ کے لئے ایک داغ چھوڑ دیا۔ براجوز میں ایک روز حملہ
ہونے سے پہلے ہی فرانسیسیوں نے انگریزی نوجوان پر کھائی
کھودنے کے وقت گولی برسانی شروع کی۔ ٹامٹن اور رچرڈ
فوراً مدافعت کے لئے آگے بڑھے۔ گولیاں چاروں طرف

اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ ان فرانسیسی سپاہیوں کا سردار ایک شکیل اور جانباز آدمی تھا جس کی عمر تخمیناً ۴۵ سال کی تھی۔ رچرڈ نے دیکھا کہ وہ تلوار کے اشارہ سے اپنے سپاہیوں کو جوش دلا رہا تھا۔ دفعتہً کپتان ٹامسن کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ رچرڈ نے فوراً انہیں اٹھایا اور گیلی زمین پر اپنا کوٹ بچھا کر انہیں لٹا دیا۔ جب جنگ کے بعد ٹامسن کی وردی اتاری گئی تو معلوم ہوا کہ گولی سینہ کے پار ہوگئی۔ جانبر ہونے کی اُمید نہ تھی۔ ٹامسن کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ پر زردی چھا گئی تھی اور سانس رک رک کر چل رہی تھی۔

رچرڈ نے انہیں اپنے زانو پر لٹا لیا اور بولا:

"پیارے ٹامسن" یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔

ٹامسن نے کہا "پیارے دوست میں تو چلا"۔

رچرڈ چیخ کر بولا "ٹامسن خدا کے واسطے ایسے الفاظ منہ سے نہ نکالو۔ تمہیں میرے محافظ ہو، آقا ہو، گواہ ہو، بزرگ ہو، دستگیر ہو۔۔۔ خدا کے لئے۔۔۔"

ٹامسن کی روشن اور سیاہ آنکھیں جو زرد چہرہ پر اور بھی سیاہ ہوتی تھیں مسکرائیں۔ اور وہی ہاتھ جسے رچرڈ نے تیرہ سال قبل بوسہ دیا تھا اس کے سینہ پر آیا۔ ٹامسن بولے "میری ماں کو خط لکھ دینا۔ تمہیں پھر وطن کا دیدار نصیب ہوگا۔ ماں کو یہ ضرور بتلا دینا کہ ہم دونوں میں کس طرح دوستی ہوئی۔ اسے سن کر انہیں بھی اتنی ہی تشفی ہوگی جتنی مجھے ہو رہی ہے" اس سے زیادہ وہ اور نہ بول سکے لیکن اپنے ہوا سے ہلتے ہوئے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔ رچرڈ اس کا منشا سمجھ گیا۔ اس نے ہاتھوں سے انہیں اطمینان دلایا۔ یہ دیکھ کر ٹامسن ایک بار پھر مسکرائے اور اسی سینہ پر جو انہوں نے اپنے گھر میں رکھے ہوئے جس میں انہوں نے ایک روح کو پیدا کر دیا تھا۔ دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اُس روز رچرڈ کو دیکھ کر ایسا کون تھا جس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکلے ہوں۔ اس نے اپنے پیارے دوست کو وہیں دفن کیا، اور انہیں کے ساتھ اپنی زندگی کے حصے بھی دفن کر دیئے۔ اب وہ بیکس تھا۔ اس کا کوئی یار و مددگار، ہمدم اور غمگسار نہ تھا۔ منصبی کاموں کے علاوہ اس کے دل میں اب صرف دو ارادے تھے۔ ایک تو ٹامسن کے بالوں کو بہ حفاظت اُن کی ماں کے پاس پہنچانا۔ دوسرے اس فرانسیسی افسر سے اپنے دوست کے خون کا بدلہ لینا جس کے ایما سے ٹامسن کو گولی لگی تھی۔ انگریزی فوج میں یہ عام چرچا ہونے لگا کہ جب کبھی اس فرانسیسی افسر کا مقابلہ میدان جنگ میں رچرڈ سے ہوگا تو فرانس میں کہرام مچے گا۔

(۴)

۱۸۱۴ء کے موسم گرما میں لفٹنٹ کرنل رچرڈ بیمار ہو کر وطن آئے۔ ٹامسن کے بال ان کے حرز جاں تھے۔ گو وہ کمزور تھے پر ٹامسن کی ماں کے پاس جانے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہ کی۔ وہ بیوہ تھیں اور ٹامسن اُس کا اکیلا لڑکا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ ٹامسن کی ماں اپنے باغیچہ کے سامنے والی کھڑکی پر بیٹھی ہوئی بھرائی ہوئی آواز سے انجیل پڑھ رہی تھیں۔ رچرڈ اس کھڑکی کے سامنے سے گزرا تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہی تیز اور سیاہ آنکھیں جو ایک زمانہ میں میرے لئے مشعل غیب تھیں میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ اُسے دیکھتے ہی میڈم ٹامسن سمجھ گئیں کہ وہ کون ہے۔ وہ فوراً دروازہ کی جانب آ کر اس کے گلے سے لپٹ گئیں۔

رچرڈ بولا "میں آپکے اُسی لخت جگر کا غلام ہوں وہ میرے مرشد تھے۔ انہوں نے مجھے فنا ہونے سے بچالیا۔ مجھے انسان بنادیا۔ خدا اُنہیں جنت نصیب کرے!"

میڈم ٹامٹن "مجھے یقین ہے کہ وہ جنت میں ہیں" یہ کہکر وہ رونے لگیں "اے میرے پیارے بچے! میرے پیارے لال!"

جب سے رچرڈ فوج میں داخل ہوا تھا اُس وقت سے اب تک وہ سارجنٹ، میجر، لفٹنٹ اور کرنل سب کچھ ہوگیا پھر اُس نے اپنے اصلی حالات بجز کپتان ٹامٹن کے اور کسی کو نہ بتائے تھے۔ اس نے اپنی سابقہ زندگی پر ایک مہر سی لگادی تھی۔ اُس نے گمنام رہنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ وہ اس پردہ کو نہ ہٹانا چاہتا تھا جو زمانہ نے اس کے پچھلے گناہوں پر ڈال دیا تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ لوگ میرے بعد مرگ جانیں کہ میں کون تھا، کیا کیا پاپڑ بیلے، کیا کیا مصیبتیں جھیلیں اور کس طرح اپنی کردنی پر نادم اور منفعل رہا یہی اس کی سابقہ ناشائستگیوں کا کفارہ تھا۔

لیکن اس شب کو اُسے ٹامٹن کے یہ الفاظ یاد آگئے۔ "ماں سے کہنا ہم اور تم کیوں کر دوست ہوئے۔ اسکے ان کو بھی ویسی ہی تسلی ہوگی جیسی مجھے ہو رہی ہے" اور اُس نے اپنی زندگی کے سارے واقعات اس خاتون سے من وعن بیان کردیئے۔ اُسے رفتہ رفتہ ایسا معلوم ہونے لگا گویا مجھے ماں مل گئی۔ وہ جبتک انگلستان میں رہا یہی اُس کا گھر تھا جس میں وہ چند روز قبل غمزدہ اور مایوس داخل ہوا تھا جب ایام بہار میں وہ پھر لام پر چلا تو اس کا دل ایک بیوہ عورت کی دعائے خیر سے شاد تھا۔

اپنے بوسیدہ جھنڈے کے ساتھ وہ کواٹر براس اور لگنی کی لڑائیوں میں شریک ہوا۔ واٹرلو کے میدان میں سخت بارش ہو رہی تھی۔ اس کی سپاہ کے ہزاروں آدمی زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے پر وہ اس بارود اور طوفان اور شراروں کی بارش میں بھی اپنے پھریرے کو اُڑاتا رہا۔ اس کی مشہور رجمنٹ شام تک داد شجاعت دیتی رہی۔ اس کے سپاہی کبھی آگے بڑھتے تھے، کبھی پیچھے ہٹتے تھے، معرکہ کارزار خوب گرم تھا۔ دفعتہً لفٹنٹ رچرڈ زخمی ہوکر گر پڑے مان کی سپاہ اُنہیں اسی حال میں بیچ چھوڑ کر اُن کے خون کا انتقام لینے کے لئے آگے بڑھ گئی۔ جب تاریکی نے دونوں فوجوں کے درمیان پردہ ڈال دیا تو لوگوں نے رچرڈ کو خاک خون سے اُٹھایا۔ زخم مہلک تھا۔ میدان جنگ میں اس کا کیا علاج ہوتا۔ وہ بہزار دقت و پریشانی بروسیلز پہنچائے گئے۔ زمین کیچڑ ہو رہی تھی۔ گڑھے پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ سڑکیں آمد و رفت کی کثرت اور اسلحہ کی باربرداری سے ٹوٹ پھوٹ کر کھائیوں کی طرح ہوگئی تھیں۔ چو طرفہ مجروح اور مقتول سپاہی پڑے ہوئے تھے۔ رچرڈ میں صرف رمق جان باقی تھی۔ زخموں نے انہیں اس قدر مسخ کردیا تھا کہ انہیں انسان کہنا مشکل تھا۔ لاشہ تھا نہ کہ جاندار۔

بروسیلز میں لفٹنٹ رچرڈ کا علاج ہونے لگا ہفتوں پر ہفتے گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ فصل کٹنے کے دن آگئے۔ واٹرلو میں سلطنتیں بنتی اور بگڑتی تھیں۔ فوجیں نشہ فتح میں چور ادھر سے اُدھر آتی جاتی تھیں۔ ماؤں اور باپوں، بھائیوں اور بہنوں، بیویوں اور بچوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ سب آتے اور حسب تقدیر رو یا ہنس کر چلے جاتے۔ دن میں بار بار گھنٹے بجتے عمارتوں کے سامنے رخ بدلتے، شام کو شہر چراغوں سے جگمگانے

لگتا۔ پختہ سڑکیں راہگیروں کے قدموں سے گونجتیں، راتیں آتیں۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں۔ یہ سب کچھ ہوتا تھا پر رچرڈ پتھر کی مورت کی طرح بے حس و حرکت بستر مرض پر پڑا رہتا تھا۔

آخرکار ایک طویل خواب کے بعد جو زمان و مکان اور واقعات کا ایک مجموعہ تھا جس میں فوج کے ملاقاتی ڈاکٹروں کی دھندلی تصویریں تھیں، یا شباب کے بیقرار دوستوں کی، لفٹنٹ رچرڈ دوبارہ زندہ ہوئے۔ اب انہیں پھر صبح و شام کی تمیز ہونے لگی، موسم گرما و سرما کا فرق معلوم ہونے لگا۔ پتیوں کا ہلنا، فرحت بخش ہواؤں کا چلنا، سورج کی کرنوں کا پڑنا محسوس ہونے لگا۔ چاروں طرف ایسا سکون اور ایسی فرحت تھی کہ اس نے خیال کیا میں عالم ارواح میں ہوں۔ وہ آہستہ سے بول اٹھا۔

"ٹامٹن کیا تم بھی میرے قریب ہو؟"

ٹامٹن کی ماں نے اس کے سینہ پر جھک کر کہا "ہم تمہارا علاج کرنے آتے ہیں، کئی ہفتوں سے تمہاری تیمارداری میں مصروف ہیں۔ تم عرصہ سے اس اسپتال میں ہو۔ کیا تمہیں اس کی کچھ بھی خبر نہیں؟

لفٹنٹ رچرڈ بولے "مجھے کچھ یاد نہیں آتا"۔

رحم دل خاتون نے ان کی پیشانی چومی اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

رچرڈ نے پوچھا "میری رجمنٹ کہاں ہے؟ کیا کیا ہوا؟ تم مجھے ماں کہہ کر پکارنے دو۔ کیا ہم کہا ہوا ماں؟

میڈم ٹامٹن۔ خدا کا شکر ہے ہم لوگوں کی فتح ہوئی۔ جنگ ختم ہوگئی۔ تمہاری رجمنٹ نے میدان میں خوب ناموری حاصل کی۔ ایسی دلیر رجمنٹ ساری سپاہ میں نہیں ہے"۔

رچرڈ کی آنکھیں غرور سے چمک اٹھیں، ہونٹ کانپنے لگے رخساروں پر اشک کے قطرے بہ آئے۔ مگر ہاتھ بوجہ نقاہت کے نہ اٹھ سکے۔

(۵)

لفٹنٹ رچرڈ کو جب رفتہ رفتہ بات چیت کرنے کی قوت حاصل ہوگئی تو وہ اکثر لیٹے لیٹے ٹامٹن کی ماں سے باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک روز وہ نیند سے بیدار ہوئے تو طبیعت شگفتہ تھی۔ انھوں نے ماں سے کچھ پڑھ کر سنانے کی استدعا کی۔ اس سے پہلے جب کبھی وہ بیدار ہوتے تھے تو وہ پردہ ہٹا دیتی تھیں۔ "تاکہ وہ اپنی جگہ سے دیکھتی رہیں۔ پر آج پردہ نہیں اٹھا۔ ہاں ایک عورت کے یہ الفاظ البتہ سنائی دیئے جو ان کی ماں کے الفاظ نہ تھے۔

"کیا آپ ایک ناآشنا عورت سے ملنا پسند کریں گے؟

رچرڈ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا "ناآشنا"! اس آواز میں کچھ ایسی یاد خیز صفت تھی کہ رچرڈ کے دل میں وہ یادیں تازہ ہوگئیں جبکہ وہ فوج کا معمولی سپاہی رچرڈ نہیں ہوا تھا۔

اس آواز نے کچھ ایسے دردناک لہجہ میں جواب دیا کہ رچرڈ کے رونگٹے کھڑے ہوگئے "ہاں اس وقت ناآشنا ہی ہوں" تو کسی وقت ایسی نہ تھی۔ ہائے میرے پیارے رچرڈ! اتنے دنوں تک تم مجھ سے علیحدہ اور بیخبر رہے! میرا نام ....

رچرڈ خوش ہوکر بول اٹھا۔ "میری"

میری دوڑ کر رچرڈ کے گلے سے لپٹ گئی۔ تب اس کا سر اپنے سینہ پر رکھ لیا اور بولی "رچرڈ یہ نہ خیال کرو کہ میرا قول ٹوٹ رہا ہے۔ اب میرا نام میری مارشل نہیں رہا۔ وہ تبدیل ہوگیا ہے کیا تم نے نہیں سنا؟

رچرڈ نے افسردہ ہوکر کہا "کبھی نہیں"۔

میری: "دوبارہ یاد کرو۔ کیا تمہیں یقین ہو کہ تم نے میرا نیا نام کبھی نہیں سُنا؟"

رچرڈ نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ اس پر ایک حسرتناک مسرت جھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور ہونٹوں پر خفیف سا تبسم تھا۔ یہ تبسم آنکھوں دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔

میری مارشل بولی "پیارے پریشان نہ ہو میں اپنا قصہ آپ بیان کرتی ہوں۔ میں نے ایک فیاض اور معزز آدمی سے محبت کی۔ اپنا دل اس کی نذر کیا اور سالوں اُس کے نشہ محبت میں مخمور رہی۔ میری محبت صادق اور خالص تھی۔ حالانکہ میں اس کے اعلیٰ اوصاف سے بے خبر رہی، تاہم میرا روحانی تعلق اُس کے ساتھ رہا۔ جب مجھے میڈم ٹامٹن کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ مجھے ان فتوحات میں بھی نہیں بھولے تو میری اُمیدیں تازہ ہو گئیں میں اُن کی تیمارداری کرنے یہاں آئی ہوں۔ اور یہاں پر کیا موقوف ہے۔ مجھے اس کام کے لئے دنیا کے دراز ترین حصوں میں جانے سے بھی دریغ نہ ہوتا۔ انہوں نے ایسی حالت میں مجھے پہچان لیا جبکہ وہ کسی کو نہ پہچانتے تھے۔ وہ سخت سے سخت تکلیف کے عالم میں اسی مقام پر اپنا ہاتھ رکھ کر کراہتے تھے جہاں اس وقت تمہارا سر ہے۔ دوران علاج میں ایک روز جب اُن کی حالت نازک ہو گئی تو انہوں نے مجھ سے شادی کی تاکہ مرنے سے پہلے وہ مجھے اپنی بیوی کہکر پکاریں۔ اس رات میرا جو نام پڑا وہ......"

رچرڈ نے سسکتے ہوئے کہا "ہاں مجھے یاد آگیا۔ رفتہ رفتہ خیال آتا جاتا ہے۔ اب یاد آگیا۔ شکر خدا کا کہ میرا دماغ اب صحیح ہے۔ پیاری میری! میرے دل بیقرار کو تسکین دے ورنہ میں احسان کے اس بار گراں سے دبکر مر جاؤں گا۔ آج میرے پیارے دوست ٹامٹن کے آخری الفاظ کی تصدیق ہو گئی مجھے گھر مل گیا!"

تین سال گزر گئے۔ رچرڈ کی زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔ میری اور وہ دونوں میڈم ٹامٹن کو ماں سمجھتے تھے اور وہ بھی اُن سے مادرانہ محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتیں لیکن کبر سن کے باعث ان کی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ بالآخر میڈم ٹامٹن نے تبدیل آب و ہوا کے لئے سال بھر فرانس میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے شہر آکس کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں سکونت اختیار کی۔ اس مکان کے قریب ایک اور مسکن تھا جس میں ایک فرانسیسی افسر اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا اس کے ایک کمسن خوبصورت لڑکی تھی وہ اکثر میڈم ٹامٹن کے باغیچہ میں کھیلنے آیا کرتی تھی۔ مسز ٹامٹن جب اسے پیار کرتیں اور اپنے بیٹے ٹامٹن کے حالات اس سے بیان کیا کرتیں اس داستان کو وہ لڑکی بڑی دلچسپی کے ساتھ سنتی تھی۔ اسی ذریعہ سے میڈم ٹامٹن اور اس فرانسیسی خاندان میں دوستی اور یگانگت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ یہاں تک کہ فرانسیسی افسر نے میڈم ٹامٹن کو ایک ماہ کیلئے اپنے یہاں مدعو کیا۔ اور انہوں نے اس دعوت کو بخوشی قبول کیا۔ اُن کی زبانی لفٹنٹ رچرڈ کے حالات سُن کر فرانسیسی افسر کو رچرڈ سے غائبانہ محبت ہو گئی۔ چنانچہ فرانس سے روانہ ہونے کے دو ہفتہ قبل جو خط میڈم ٹامٹن کے نام لکھا اس میں اس فرانسیسی افسر کا بھی ایک خط تھا۔ اس میں اُس نے رچرڈ سے استدعا کی تھی کہ آپ فرانس آئیں تو مجھے اپنی میزبانی کا شرف عطا کریں۔

کپتان رچرڈ نے یہ دعوت قبول کر لی اور فرانس روانہ ہوئے صلح کے تین سال بعد فرانس کی حالت کو دیکھ کر انہوں نے خدا کا شکر کیا فصل پر غیر فطری سُرخی کے بدلے سبز رنگ تھا۔ گاڑیوں پر زخمی سپاہیوں کے بدلے غلہ لاتا تھا۔ اس طرح سفر کا

روحانی لطف اٹھاتے ہوئے کپتان رچرڈ فرانسیسی مسکن کے دروازے پر جا پہنچے۔ مکان قدیم طرز کا بنا ہوا تھا۔ اور جا بجا منہدم ہو رہا تھا۔ باغیچہ ویران تھا۔ فوارے بند، دیواریں شکستہ۔ کپتان رچرڈ کو دروازہ پر کوئی دربان نہ ملا۔ اس لئے وہ سیدھے اندر چلے گئے۔ وسیع کمرے میں پہنچتے ہی وہ یکایک چونک پڑے۔ سامنے وہی فرانسیسی افسر بیٹھا ہوا تھا جس سے وہ ٹانٹن کے خون کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ اس کا چہرہ بشاش اور شگفتہ تھا۔ وہ رچرڈ کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بولا "کپتان رچرڈ! میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ معاف فرمائیے گا۔ آج میری لڑکی کی سالگرہ ہے۔ اس لئے سب خدمتگار باغ میں جمع ہو کر ہو حق مچا رہے ہیں۔ میں سخت نادم ہوں۔ کہ آدمیوں کے نہ بڑھنے سے آپ کو یہاں تک آنے میں تکلیف ہوئی"۔

اس کے انداز گفتگو میں ایسا خلوص تھا۔ کہ رچرڈ نے بے اختیار مصافحہ کے لئے ہاتھ پھیلا دیا۔ اس نے رچرڈ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "یہ ایک بہادر انگریز کا ہاتھ ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں آپ کا دوست ہوں"۔

رچرڈ نے دل میں کہا معلوم ہوتا ہے اس مبارک موقعہ پر اس شخص نے مجھے اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔ جس سے میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اسی لئے اس کا دل اتنا صاف ہے! اسے کیونکر بتاؤں کہ میں کون ہوں اور میرے دل میں کیا ارادے ہیں!

فرانسیسی افسر اپنے مہمان کو باغ میں لے گیا۔ وہاں اُس نے اپنی بیوی سے اُس کا تعارف کرایا۔ یہ ایک ہنس مکھ عورت تھی۔ جو ٹانٹن کی ماں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس افسر کی خورد سال لڑکی دوڑ کر باپ سے لپٹ گئی۔ چھوٹا لڑکا جو نارنگیوں کے درخت کے نیچے کھیل رہا تھا۔ باپ کو دیکھ کر گرتا پڑتا آیا۔ اور اُس کی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں جا چھپا۔ یہاں اور بھی کئی بچے کھیل کود رہے تھے۔ پڑوس کے کاشتکار بھی اس جشن میں شریک تھے۔ اور خوب تالیاں بجا بجا کر گا رہے تھے۔ خوب چہل پہل تھی۔ یہ معصومانہ تفریح کا ایک دلآویز منظر تھا۔ کپتان رچرڈ ایک کشمکش پیچ کی حالت میں کھڑے تھے۔ کہ یکایک فرانسیسی افسر نے پوچھا۔ آپ واٹرلو کی لڑائی میں شریک تھے؟

رچرڈ نے کہا "ہاں تھا۔ اور برا جوز میں بھی۔"

کپتان رچرڈ ایک عجیب مخمصے میں تھے۔ دل میں سوال ہو رہا تھا۔ اس وقت میرا کیا فرض ہے۔ اس کی دعوت قبول کروں یا نہیں۔ ٹانٹن کی ماں آکر ان سے گلے ملیں اور بولیں "مجھے امید ہے کہ اس شریف آدمی سے تمہاری محبت ہو جائے گی اور تا حیات قائم رہے گی۔ یہ شخص ایسا سچا، فیاض اور زندہ دل ہے کہ تم اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر وہ زندہ ہوتے۔ (آبدیدہ ہو کر انہوں نے اُس لاکٹ کو چوم لیا جس میں ٹانٹن کے بال تھے) تو اس شخص کی دل سے قدر کرتے! اور اُن دنوں کے گذر جانے پر خدا کا شکر کرتے جس کے باعث ایسا آدمی اُن کا دشمن ہو گیا تھا"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ رچرڈ ایک کھڑکی کے پاس گیا اور وہاں سے باغ کا نظارہ کرنے لگا۔ پھر دوسرے جھروکے پر گیا۔ اور انگوروں کے گچھوں کی سیر کرنے لگا۔ پھر دل ہی دل میں کہنے لگا "پیارے ٹانٹن۔ کیا تمہیں نے اپنی ماں کو بھیج کر میرے غضب ناک ہاتھوں کو روکا ہے۔ کیا تمہیں مجھ سے آہستہ آہستہ کہہ رہے ہو کہ اس افسر نے بھی اسی طرح اپنے فرض منصبی کو انجام دیا جیسا تم نے اور تمہاری تعلیم سے میں نے۔ اس کے سوا اس کی کوئی خطا نہیں!"

رچرڈ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے اور دل میں فیصلہ کر کے اُٹھے۔ کہ اس واقعہ کو ہمیشہ راز سربستہ رکھوں گا۔ کھانا کھاتے وقت جب دونوں دوست ہم ساغر ہوئے تو رچرڈ نے اپنے دل سے ہمیشہ کے لئے کدورت کا غبار نکال دیا۔

پیاری چمپا

کئی برس گذر گئے لیکن اب بھی جب وہ سماں یاد آتا ہے۔ تو ایک لمبی سانس بھرتا ہوں! اس گھڑی بھی یہ سوچتے ہوئے میرا دل دھڑکتا تھا۔ کہ کہیں یہ سب خواب ہی نہ ہو۔ مگر اب تو یہ تیری شمشاد کی سی غیر جانب داری دیکھ کر مجھے قریب قریب یقین ہو چلا ہے۔ کہ وہ صرف ایک منوہر سپنا تھا۔ آہ! کیسی میٹھی یاد ہے۔ کہ گو اُسے بیتے اک زمانہ ہو گیا ہے۔ لیکن اب بھی اس کی تڑپ مٹھاس سے خالی نہیں!

ممکن ہے کہ قبر میں جا کر میرے اس ارمان بھرے دل سے یہ ایک کرن بھی گم ہو جائے۔ مگر سخی! سچ بتانا۔ تجھے بھی وہ رات یاد ہے۔ جب گھر سے پاس باغ میں جھیل کے کنارے سبز بینچ پر ہم اور تو عشق کے مدرسے کا سبق "پہلا پیار" یاد کر رہے تھے۔ اور تو چھٹکی ہوئی چاندنی سے بھی لجا رہی تھی؟ میں بے اختیار اپنے بغل کے چاند کو تک رہا تھا۔ مگر وہ دو پیاری آنکھیں جھکی ہوئی جھیل کے کنول گنتی معلوم ہوتی تھیں +

میں تجھے یقین دلاتا ہوں۔ کہ میرے بائیں ہاتھ کی انگلیاں جن سے پہلے تیری کمر اور پھر تمام جسم لرز اٹھا تھا۔ بالکل بھولے سے کمر تک چلی گئی تھیں۔ بے شک کسی کا بس چلتا۔ تو کوئی شرم کے مارے وہیں زمین میں گڑ جاتا۔ مگر افسوس کہ وہ سبز بینچ اور اس کے نیچے کی سبز زمین دونوں ٹھوس واقع ہوئے تھے +

میری دبی ہوئی طنز آمیز مسکراہٹ جس کا سبب تو اپنے اضطراب میں اس وقت مجھ سے نہ پوچھ سکی ہرگز تجھے چھیڑنے کی غرض سے نہ تھی۔ میں تو کالی داس پڑھ رہا تھا کہ بیچارے کو ہارتی کے پاس حیا پر چند اشعار کے بدلے ساری مجہول دنیا کے حسن ظن کا شکار ہونا پڑا۔ یقیناً اگر تیری شرمیلی اداؤں پر اسے اپنی طبع آزمائی کرنی پڑتی تو خدا جانے اُس کا کیا حشر ہوتا؟

اگر اس سے بھی تو چڑتی ہے۔ تو بے شک میں مجرم ہوں۔ مگر تیرے اس عجیب انصاف پر مجھے اب تک حیرت ہے۔ کیونکہ لوگ تو مجرموں کو کسی بند جگہ میں مقید کرتے ہیں کہ کہیں بھاگ نہ جائیں۔ مگر تو یہی چاہتی تھی۔ کہ تیرا مجرم اس بینچ کے سوا دنیا میں جہاں چاہے نکل جائے +

تُو نے ہزار جتن کئے۔ پر میں نے تیرا دل دھڑکتے ہوئے دیکھ ہی لیا تھا۔ بھلا اس دھڑکن کے کیا معنی سمجھوں؟ کیا تُو اس بے مزہ آرزوؤں کے پتلے سے سہمی جاتی تھی۔ جو اپنا دل تک تیری نذر کر چکا تھا؟

مجھے خوب یاد ہے۔ جب تو اپنی شرمیلی آنکھیں آہستہ آہستہ چشمے سے اٹھا کر فوارے کی پھوار پر۔ پھر اُس سیاہ صنوبر پر پھر اس پار کے ٹیلے پر سے چاند تک لے گئی تھی۔ اُس وقت میرا بایاں بازو نہایت معصومانہ انداز سے بینچ کی چوبی پشت کو تھامے ہوئے تھا۔ اس وقت تو سمجھی۔ کہ میں نے تیری گردن کی پشت پر گدگدی کی۔ غنیمت یہ ہوا۔ کہ تیرا غصہ گدگداہٹ کے تبسم میں ڈوب گیا۔ میں نے جرأت کر کے اپنا دایاں ہاتھ تیرے نازک گالوں کے پاس سے گذارنا چاہا۔ کہ تُو یکایک کانپ اٹھی! تو سمجھی ہو گی۔ لیکن میں تو تیرے بائیں کان میں سے گرتے ہوئے جوڑا آویزے کو سنبھالنے کی فکر میں تھا +

میں تیری حیا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ اس رات جو کچھ میں نے کیا۔ مجھ سے ہو گیا تھا!

تیرا عشق افزا حسن میرے رگ و پے میں رچا ہوا تھا۔ کیا تو میری اس کانپتی ہوئی آواز سے بھی میرے دل کی کیفیت نہ سمجھ سکی؟

تو ایک بار کنکھیوں ہی سے تک لیتی۔ تو تجھے معلوم ہو جاتا کہ میری رحم طلب آنکھوں سے کتنی صداقت برس رہی تھی۔ یقین جاننا میں عمر بھر اتنا عاجز کبھی نہیں ہوا تھا۔

میں تجھے اس چاندنی رات کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ وہ کیا مصلحت تھی۔ کہ جب تو نے مجھے اپنی جانب غور سے تکتے ہوئے دیکھا۔ تو اپنا چہرہ ساڑھی کے آنچل میں چھپا لیا تھا؟ یہ ستم کوشیاں تو ستم آرا شمع بھی نہیں جانتی۔ پھر تو کیسے جان گئی؟

جب موقع پا کر میں اپنے رومال سے چمپا کا عطر نکال رہا تھا تو ضرور اپنے ہلکے آنچل میں سے تاڑ رہی ہوگی۔ ورنہ تو اتنی جلدی مقابلے پر نہ ڈٹ سکتی۔ کیا یہ ستم آرائی پہلے ہی سوچ رکھی تھی۔ یا وہیں تراشی گئی تھی؟ اب بھی جب میں سوچتا ہوں کہ کسی وقت کسی نے فیروزی آنچل کی آڑ میں اپنی دو نازک کلائیوں سے ایسا کڑا مقابلہ کیا تھا۔ تو حیرت ہو جاتا ہوں۔

کیا کہوں۔ اس کھینچا تانی میں میرے جذبات کی کیا حالت ہوئی۔ جب تو نے میرے آخری وار کے جواب میں ہار کا وہ حصہ جو تیرے ہاتھوں میں تھا۔ توڑ دیا۔ کاش تو جانتی کہ تو نے کیا کر ڈالا تھا!

تجھے کیا خبر تھی کہ اس ہار میں ایک ایک پھول کے ساتھ میری ہزاروں تمنائیں پروئی ہوئی تھیں۔

پیاری چمپا! کیا تو نے ہار اس لئے توڑا کہ میں نے تیرے ہم نام پھولوں کو چھوا تھا۔ یا تو میرے سیلاب اشتیاق کو دفعتہً رکتے دیکھ کر اپنا جی بہلا رہی تھی؟

پیاری! کیا تو نے ہار اس لئے توڑا کہ اسے میری حقیر انگلیوں نے گوندھا تھا۔ یا اس لئے کہ تیری نظروں میں میرے دو بازو سب ہاروں سے عزیز تر تھے؟

مگر خدا کے لئے سچ کہنا۔ میرا مایوس چہرہ دیکھ کر تیری کلائیاں یکایک ڈھیلی کیوں پڑ گئی تھیں؟ جب تو نے میرے کندھے پر اپنی پیشانی ٹیک کر آنکھیں میچ لی تھیں۔ تو کیا فرش پر بکھرے ہوئے پھولوں میں کہیں میرا شکستہ دل تو تجھے نظر نہیں پڑ گیا تھا؟ اور تو ڈر کر ہار مان گئی؟ یہ تیری شان خودداری تھی۔ یا میری حوصلہ افزائی کے لئے وضعی شکست کا اعتراف؟ تیری باتیں تو ہی جانے۔ لیکن واسطے کے وہ سامان دیکھ کر میں تو سچ مچ دلیر ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ میں نے تیرے سر سے ذرا سرکی ہوئی ساڑھی کی راہ پا کر وہ ٹوٹی ہوئی "پریت مالا" تیرے گلے میں ڈال دی تھی۔

چمپا! اس سے پیشتر تیری نگاہوں میں جو سرکشی تھی۔ وہ یک دم کیا ہوئی؟ پہلے تو جب میں تیرے کسی فیض کی کمی پر تقاضا کرتے ہوئے تجھ سے بگڑ بیٹھتا تھا۔ تو تو کمال شان بے پروائی ظاہر کیا کرتی تھی۔ مگر اس کے بعد تو میرے غصے کے بہانے پر بھی تو بے کل ہو جاتی تھی۔ یہ کیوں؟ کیا تو سچ مچ ہار گئی تھی؟ بے شک۔ بے شک تو تو شکار کرنے آئی تھی۔ مگر خود شکار ہو گئی! اور خود رفتگی سے کسی کا کسی کے گلے میں لپٹ جانا اس امر کا شاہد ہے۔ اب تو شرماتی ہو گی۔ مگر تب تو تجھے اپنے تن کی بھی سدھ نہ رہی تھی۔ اور تو نے باہمی اجنبیت کا حجاب پرانی اترن کی طرح یوں اتار دیا تھا۔ کہ جمیل کی کمینیوں نے اپنے چہرے

گلابی آنچلوں میں چھپائے تھے - چاند جلدی جلدی سیاہ بادلوں
کی اوٹ میں چھپ گیا تھا - اُس شریف صنوبر نے بھی ادھر
تکنا چھوڑ دیا تھا - پیچھے گول کیاری میں لاجونتی کی ڈالیاں مر
کرشتی ہو رہی تھیں - سامنے گلاب اور کنول کے پھول عرق
عرق ہوئے جاتے تھے - پھولوں کی ڈالیوں پر ناز سے جھومتی
ہوئی ہوا وہاں پہنچ کر تھم جاتی تھی - جھیل کی سطح پر تیرتی ہوئی
مچھلیاں حیا کے مارے پردے کے تہ خانوں میں چلی گئی
تھیں - اور اُس پار کے جھنڈ میں سے بلبل کے نغموں
کا مسلسل تار بھی ٹوٹ گیا تھا - تاکہ اس چپ کے عالم میں
ہمارے دونوں دل ذرا پاس سے دھڑک دھڑک کے ایک
بات کرلیں -

لیکن آہ! وہ سکھ کی گھڑی اب کیا ہوئی! وہ پس ماندہ
چمپا کی بکھری ہوئی پتّیاں جو تونے وداع ہوتے وقت
اپنی اُن لانبی لانبی انگلیوں سے جن سے اضطراب برس
رہا تھا - فرش سے چن کر جھیل میں پھینک دی تھیں -
تاکہ دن کی ناپاک نگاہ اُن پر نہ پڑ سکے - کیا وہ چند پریشان
پتّیاں بھی سپنا ہو گئیں؟ تاکہ میرے لئے اُس رین کا کوئی
دھندلا سا نشان بھی باقی نہ رہے؟

میرا جی تو یہ سوچتے ہوئے بیٹھا جاتا ہے کہ کہیں تیری
اس "چپ" سے دنیا یقین ہی نہ کرلے - کہ ہماری پریت
دنیا سے مٹ چکی ہے!

میری جان! میری دونوں جہان کی خوشی تیری اک "ہاں"
پر ہے - اور تو اسے خود اچھی طرح جانتی ہے - پھر اگر مجھ سے
بھی تو یہ لفظ نہ کہے - تو سچ بتا کب اور کس سے کہے گی؟ یا کیا
یہ ناپاک دنیا تیری اس پوتر "ہاں" کے شایاں نہیں ہے؟

رگھوناتھ شرما - گورنمنٹ کالج - لاہور

"دیوانگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے" ×

میں نے خاروں کو ہٹا کر جونہی گلاب کے پھول توڑے - چھم چھم کی آواز نے اپنی طرف متوجہ کرلیا - میں نہ سمجھا کیا تھا مگر
ایک بجلی سی نگاہوں میں کوندگئی - پھر پیچھے سے آواز آئی "تم یہیں ہو؟"

مُڑ کر دیکھا - تو چاندنی رات میں ایک چاند سا مکھڑا اپنی آب وتاب دکھا رہا تھا - میں قریب ہوا - اور وہ دُور ہوتی
گئی - وہ اسی طرح غائب ہو رہی تھی - کہ میرا ہاتھ آنچل پر پڑ گیا - ایک "اُف" کی صدا آئی - اور وہ خاموش - میں متحیّر - میں نے
کہا "سخت غلط فہمی ہوئی" جواب ملا "دیوانگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے"

وہ شرم سے پسینے پسینے تھی اور میں ساکت - میں نے گردن جھکالی - باہر نکل آیا - گھر پہنچا - بستر پر کروٹیں بدلتا رہا -
لیکن جب ایک ہلکا سا جھونکا نیند کا آیا - تو میں نے سنا "دیوانگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے"

لوسیو ریمانیر

اَدَھر مسجد

داستان گوئی کا فن اُردو سے مفقود ہوگیا - حالانکہ ایک زمانہ تھا - جب اس فن کے ماہرین اپنے حیرت انگیز انداز بیان اور اپنی دلاویز داستانوں سے وہ کام کرتے تھے - کہ شعرا تک دنگ رہ جاتے تھے + دہلی کے باکمال داستان گو میر باقر علی صاحب اس فن کی آخری یادگار ہیں - جن لوگوں نے آپ کو سُنا ہے - وہ ان کی ادبی منزلت سے بخوبی واقف ہیں - ان کی داستانیں سُن کر مخالف سے مخالف کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے - کہ اُردو نہایت وسیع زبان ہے - اور ہر قسم کے مطالب کے اظہار کی قدرت تامہ رکھتی ہے + میر صاحب موصوف بہت مدت سے اخباری دنیا میں تشریف نہ لائے تھے - یہ کہکشاں کی مسیحائی کا ایک مزید ثبوت ہے - کہ اس نے میر صاحب کو اس حیثیت سے پھر زندہ کر دیا + انشاءاللہ آیندہ پرچے میں میر صاحب موصوف کا ایک مضمون "بسنت" درج کیا جائے گا - اس میں میر صاحب نے نماوٹ کا منظر دکھانے میں کمال کر دیا ہے + فی الحال ذیل کا مضمون پڑھیئے - اور زبان کی شیرینی اور بیان کی خوبی سے لطف اٹھایئے :-

یوں تو دہلی اور آگرہ کے چپہ چپہ پر اگلے کاریگروں کی کاریگریاں اور صنعتیں نظر آتی ہیں - جنہیں دیکھ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے - لیکن ان بہت سی صنعتوں میں سے ایک صنعت ایسی نظر پڑے گی - جیسے تِل کی اوجھل پہاڑ کہنا بے جا نہ ہوگا - مگر ان خوبیوں سے وہ ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے - جو اہل نظر ہو - اور مجھ جیسا نااہل تو یہی کہہ کر رہ جاتا ہے - کہ قطب کی لاٹھ سیدھی لال پتھر کی اور ہمایوں کے مقبرہ کا برج ایک سفید پتھر کا ڈھیلا[1] سا ہے - جس کی نوک پر کلس کی شام بھی نہیں - ہاں جو آنکھ حقیقت کی نگراں ہے - وہ صورا شیا کو جذب کر کے اس کی تہ میں بیٹھ جائے گی - اور وہ ان عمارات کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھے گا کہ سبحان اللہ چتندری گُمبد تو ہزاروں دیکھے - لیکن یہ شلغمی گُمبد اتنا بڑا عالی شان ہندوستان میں ایک ہی ہے - کاریگر نے اس کے مخروط کو ایسا کھپایا[2] - کہ کلس کے قرینہ[3] تک کو جگہ نہیں دی - پھر بھی اس کی کس کے بل بوتہ پر کھڑی ہے + اور لاٹھ کے بنانے والے نے تو غضب ہی ڈھایا ہے - کیسا مرکز ثقل کا خیال رکھا ہے - اور لرز کا کہ ہزار دن قیامت خیز زلزلہ گذرنے پر بھی یہ اُسی راستی پر اپنے قدم گاڑے کھڑی ہے - اور اپنے حقیقی صانع کی تعریف میں گو زبان اس کی لال ہے، لیکن پھر بھی اپنی سراپا زبان سے اس کے شکر میں محو مطلق ہے - اور جو کچھ کہہ رہی ہے وہ نقش کا الحجر ہے + اس مضمون میں میرا فرض یہ ہے - کہ ان عمارات کی خوبیوں سے پہلے اَدَھر مسجد کا پتا دوں - اور اس کے بعد اگر ناظرین کہکشاں کی توجہ ان جہالت سے بھرے ہوئے اَن گھڑت مضامین کی طرف دیکھوں گا - تو مسجد جامع اور لال قلعہ جنتر منتر - مقبرہ ہمایوں - قطب کی لاٹھ - کمالی جمالی اور دہلی کے اندر جو جو عمارتیں قابل تعریف ہیں - ایک ایک کا حال پیش کروں گا + پہلے تو ناظرین اَدَھر مسجد کے فقرہ کو دیکھ کر محض لغو تصور فرمائیں گے - ہاں اس کا علم ہونے کے بعد ضرور لطف آئیگا اب میں اس مسجد کا وہ موقع پیش کرتا ہوں - جہاں زمین سے دو دیا ڈیڑھ گز کی بلندی پر یہ مسجد معلق ہے + اکثر ناظرین

[1] بیڈول پتھر ۱۲ [2] سمایا ۱۲ [3] کلس کے برج سے ملا ہوا حصہ [4] جو کسی پر دھری نہ ہو ۱۲

رسالہ ہذا کے آگرہ تشریف لے گئے ہوں گے۔ اور اکبری اور
شاہجہانی عمارات کو دیکھا ہوگا۔ کہ وہ سناٹے کے عالم میں اپنے
بانی اور مکینوں کی یاد میں پتھر کا کلیجہ کئے کھڑی ہیں۔ اور اپنی
ٹوٹی پھوٹی زبان سے یہ کہہ رہی ہیں۔ کہ افسوس یہ بے وفا دنیا
کیسا ستم ڈھاتی ہے۔ کہ ہمارے کھڑے کھڑے ایسا تغیر کر دیا
شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک کے فرماں روا تھے
اب ان کی ٹوٹی پھوٹی قبریں بھی دوسروں کے زیر فرمان ہیں۔
ان عمارات کا ان خیالوں سے کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ تاج کو دنیا کی
عمارات کا سرتاج کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اور دنیا نہیں تو ہندوستان
کو تو سر جھکانا ہی پڑے گا۔ اور سوائے بجا اور درست کہنے کے کوئی
چارہ نہ ہوگا۔ جو صاحب آگرہ جا کر اس مسجد کی انوکھی اداؤں
کا لطف حاصل کریں۔ ان کو مناسب ہے جس وقت تاج کے
مقبرہ کی کرسی پر زینہ طے کر کے تشریف لے جائیں۔ تو دروازہ
کا فرش اور دیوار کا نظارہ دیکھیں جس میں پودے بنے ہوئے
ہیں۔ چونکہ مقبرہ کی عمارت ہے۔ یہاں کاریگر کی نازک دماغی
نے وہ کام کیا ہے کہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دماغ انسانی اس
سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتا۔ وہ کیا ہے کہ تمام پودے خزاں
رسیدہ بنائے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مقبرہ ہے۔ اور
ہندوستان میں خزاں کے زمانہ میں کچھ اداسی ہوتی ہے۔ اس
وجہ سے تمام پتے پچھوا سے بل پائے اور مرجھائے ہوئے ہیں
علاوہ اس کے جو بیل بوٹے اور نقش و نگار ہیں وہ قلم کا
زور دکھایا ہے کہ کوئی شاخ پارشت[2] چھل پھول سے پتہ
ہو۔ قدرتی اور ڈول[3] نہ رہے اور جل کر ا ہوا نہیں۔ ان قدرتی
رازوں سے وہی دل لذت اٹھا سکتا ہے۔ جو اپنے پہلو
انصاف کے جوہر رکھتا ہو۔ ان صنعتوں کے دیکھنے کے
واسطے اس فن خاص سے دلچسپی ہو۔ اور یوں تو دیکھنے کو ان آڑی
سیدھی لکیروں میں اچھا اندھیرا کیا۔ جناب اب کے برسات
میں آپ غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ کہ جتنی بیلیں ہوں گی۔ وہ دائیں
سے بائیں کو لپٹتی ہوئی نظر آئیں گی۔ اگر جناب کسی بیل کو اس کے
خلاف بائیں سے دائیں کو لپیٹ دیں گے۔ تو وہ جب اپنا قابو
پائے گی۔ اپنا وہی قدرتی وتیرہ اختیار کرے گی۔ اس مضمون
کو میں کسی جلالی کے مقبرہ کے حال میں مفصل پیش کروں گا
غرض جناب جب تاج اور تسبیح خانہ کی دیکھ بھال سے فارغ
ہوں۔ اور تاج کی مسجد میں تشریف لائیں۔ لیکن یہ خیال رہے
کہ اس وقت سورج کچھ ڈھلنا شروع ہو گیا ہو۔ اس وقت
آپ مسجد کے صحن کے بیچ میں رو بقبلہ کھڑے ہوں۔ اور مسجد
کے اندر جہاں امام کھڑا ہوتا ہے محراب کی دیوار میں جو ایک ملگجا پتھر
کی سل لگی ہے۔ اس سل پر ملاحظہ فرمائیں۔ تو ہو بہو اس مسجد
کا چھوٹا سا نقشہ نظر آئے گا۔ اس چھوٹی سی مسجد کی نقل میں
کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن یہ مسجد آنکھوں سے دوگانہ ادا
کرنے کی جگہ ہے۔ اب لطف یہ ہے کہ آپ جس قدر اس مسجد
کے پاس جائیں گے یہ نقشہ دھندلی ہوتی جائے گی۔ یہاں تک
کہ جب جناب قریب تشریف لے جائیں گے۔ تو اس دیوار کے
پتھر کو بالکل سی رنگ اور خط کے صاف پائیں گے۔ اگر ہم یہ خیال
کریں۔ کہ کوئی پتھر مجلا اس مسجد کے محاذ میں لگا ہوا ہے تو سامنے
سوائے تاج کے کچھ نہیں۔ اگر عکس منعکس ہوتا تو تاج کا ہوتا پھر کیا سبب
ہے جو یہ ہی نظر آتی ہے۔ اس کا سبب مجھے معلوم ہے لیکن میں
اہل ملک کو اس طرف متوجہ کرتا ہوں۔ کہ اگر انہیں کوئی سبب
معلوم ہو۔ تو اس سے ملک کو آگاہ کریں۔ ورنہ انشاء اللہ یہ راز
دوسرے رسالہ میں پیش کروں گا۔

باقر علی داستان گو

[1] زمین سے طاق تک کی بلندی۔ [2] لپیٹنا رسہ کو کہتے ہیں۔ [3] اس درد بیل کے بڑھاؤ کو کہتے ہیں جو پتے کی جڑ سے نکل کر بیل کے سہارا دینے کو لپٹ جاتا ہے۔
[4] اپنی خاص صورت رکھتا ہوا۔

شامِ ہجراں

(از مرزا اعجاز حسین صاحب اعجاز۔ بی اے)

عجب آشفتہ انداز تخیل شام ہجراں تھا
تمھارا گھر مرا گھر تھا۔ میرا گھر اک بیاباں تھا

یہی گھر آج ویرانی میں جو گویا بیاباں سے ہے
جو تم تھے اس بیاباں میں یہی رشک گلستاں تھا

نہیں تم۔ تو نظر میں خار ہیں رعنائیاں گُل کی
یہیں تم تھے تو ہر کانٹا بجائے خود گلستاں تھا

یہی تارے کہ جن سے نالہ ہائے غم نکلتے ہیں
اُنھیں کا نغمۂ شیریں طرب کا ساز و ساماں تھا

خدا جانے تمھارے پاس ہونے میں تھا کیا جادو
کہ وہ "ہونا" ہی لطفِ زندگی تھا راحت جاں تھا

نہاں ہو کر وہ الطاف نمایاں اب کہاں ممکن
یہاں تھے تو عیاں ہر لحظہ لطفِ مہر پنہاں تھا

فراموشی اثر ہے شاہد خورشید کا جلوہ
ہم اے اعجاز ہوئے شب کو کیا ہیچ فراواں تھا

کہکشاں

(پیرزادہ ابو نعیم محمد عبد الحکیم خاں نشتر جالندھری)

حسن و جمال تیرا دل کش ہے دلربا ہے
پھر خدا بتا دے اے کہکشاں تو کیا ہے

ہے جوئے نور جاری افلاک کے چمن میں
مے کی رواں ہے کشتی رندوں کی انجمن میں

تصویر ہے ادا کی نقشہ ہے بانکپن کا
سایہ ہے یا کسی کے گیسوئے پُرشکن کا

ہے نور کا ترشح خمخانۂ فلک پر
یا جھولتی ہیں جھولا حوران ماہ پیکر

بکھرے ہوئے نہیں ہیں یہ آسماں پہ تارے
افشاں گری کسی کے گیسوئے عنبریں سے

اقلیم آب کی ہے یا کوئی شاہزادی
دریائے نیل میں سے غوطہ لگا کے نکلی

اک شوخ نازنیں کی انگڑائی کا ہے نقشا
یا قہقہہ کسی کی آواز نقرئی کا

ہے صید مرغ دل کو زلفوں کا دام چیدہ
یا نامراد عاشق کی آہ ہے کشیدہ

نالہ ہے ناشنیدہ یا جیب ہے دریدہ
یا عاشقوں کے چہرے کا رنگ ہے پریدہ

حورانِ سیمبر نے رُخ سے نقاب اُٹھائی
شبہائے ہجرِ عاشق کا ہے یہ اک فسانہ
جلوہ فگن فلک پر تنویرِ کہکشاں ہے
کہتے ہیں خواجہ[1] صاحب تاروں کی ہے یہ گھڑ جن
موجِ خرامِ نازِ دلدار ہے یہ شاید
نیلم کے تخت پر ہے یہ کون جلوہ فرما
جس کے حضورِ نسرِ طائر بھی پرفشاں ہے
ہے سنبلہ ادب سے مصروفِ خوشہ چینی
ہر چارسو نمایاں کیا شانِ کبریا ہے
بس روک لے عنانِ رخشِ قلم کو اے دل

رقاصۂ فلک نے یا مانگ ہے نکالی
یا شاعرِ ازل کی ہے بیتِ عاشقانہ
خنجر بدست شاید جلادِ آسماں ہے
صاحبدلوں ہی پر ہے یہ بھید خوب روشن
شاہنشہِ جہاں کا دربار ہے یہ شاید
جس کے جلو میں حاضر ہیں شاہ کیا گدا کیا
شعرائے آسماں تک اک کلبِ آستاں ہے
سرگرمِ آب پاشی ہے دلوِ آسمانی
روح الامیں پروں سے پنکھا سا جھل رہا ہے
مضمارِ مدح خوانی میں دوڑنا ہے مشکل

معراج کا ہے رستہ یہ کہکشاں نہیں ہے
الہام ہے سراسر میرا بیاں نہیں ہے

طعنِ محبت

نہ فتادگی نہ شکستگی۔ مری التجائے نیاز میں
نہ سرِ غرور نہ تمکنت۔ ترے حسن شعبدہ ساز میں
مرا اعتماد وفا غلط۔ کہ تو انہیں مرے ساز میں
تری چارہ سازیٔ دل بجا کہ خلش نہیں ترے ناز میں

+

تو ہی مضطرب ہوا بار ہا۔ مرے شورِ نالہ و آہ سے
میں ہی مطمئن رہا مدتوں ترے شوق عذر گناہ سے
ہے تو ہی فسردہ و مضمحل۔ مرے ذکر حال تباہ سے
میں ہی شادکام ہوں فتنہ گر ترے احتراز نگاہ سے

+

میں ہی لے چلا ہوں سکونِ دل تری بارگاہ جمال سے
تو ہی بیقرار ہے بزم میں مری بے کسی کے خیال سے
ہے کرم کو رابطہ سر بسر ترے خوئے لطف و نوال سے
نہیں صدق کو کوئی واسطہ مرے غم سے رنج و ملال سے

+

یہ درست ہے ترے حسن سے مرے دل میں کوئی خلش نہیں
یہ غلط کہ حالِ دلِ زبوں ترا راز دار کشش نہیں
ترا کیا قصور ہے قلب ہی مرا و قفِ رنج و تپش نہیں
تو کرے کسی کو تباہ یوں ترے لطف کی یہ روش نہیں

"قمر"

+

[1] حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہٗ

حسیاتِ بیدل

(مولانا سید حامد حسین صاحب بیدل شاہجہانپوری)

تسلی دل کو دینے دے۔ خدا کا نام لینے دے
بس اب یادِ بتِ کافر ذرا آرام لینے دے

پھرانا در بدر اچھا نہیں ہم بدنصیبوں کا
کہیں تو چین دم بھر گردشِ ایام لینے دے

مریضِ کاوشِ ذوقِ الم ہوں اے اجل دم بھر
ابھی کچھ لذتِ دردِ دلِ ناکام لینے دے

نگہِ ہم نشیں گر قصہ غم مجھ سے سنتا ہے
جگر پر ہاتھ رکھنے دے کلیجہ تھام لینے دے

تیری ہر جنبشِ لب ہے مجھے موجِ طرب ساقی
نہ دے لطفِ سخن کیفِ مئے دشنام لینے دے

الٰہی اس قدر تو شورش افزا ہو خلش دل کی
نہ فرصت صبح ہونے دے نہ مہلت شام لینے دے

خیالِ جنبشِ مژگاں نہ ہو کیوں وجہ بے خوابی
چُبھا ہو دل میں جب کانٹا تو کب آرام لینے دے

نہ کر شرحِ پیامِ یار میں اے نامہ بر جلدی
ذرا تھم تھم کے لطفِ نامہ و پیغام لینے دے

مٹے اے بیکسی سنگِ لحد سے نقشِ بدنامی
کسی کو تو مری تربت پہ میرا نام لینے دے

نہ تڑپا ہر گھڑی ہم نوا سیرانِ مصیبت کو
کوئی دم چین بھی صیاد زیرِ دام لینے دے

بسر کی زندگی حرماں زدوں نے جس توقع میں
قیامت ہے فلک مرکر۔ نہ وہ آرام لینے دے

اجل آجا کہ وہ اُٹھ کر مری بالیں سے جاتے ہیں
دمِ آخر بھی کیوں ان کو کوئی الزام لینے دے

خلافِ عقل ہے **بیدل** کسی انجان سے اُلفت
مگر کیا کیجئے دل بھی سمجھ سے کام لینے دے

خیالاتِ تپش

(جناب شیخ عبد اللطیف صاحب تپش)

مٹا ہے دل سبق آموزِ جستجو ہو کر
لُٹا ہوں قافلہ سالارِ آرزو ہو کر

فریب کھا کے تم اپنی نظر سے بگڑو گے
تمھیں بنائے گا آئینہ روبرو ہو کر

بہار آئے اگر رنگِ فہم ہو بلبل
ہر ایک غنچہ میں نغمہ سمائے بو ہو کر

دھواں نکلنے لگا خون بند ہوتے ہی
کہ داغ بن گیا ہر زخمِ دل رفو ہو کر

لیا ہے حلقۂ وحشت میں مجھ کو عالم نے
ہوا ہوں قید میں رسوائے کو بکو ہو کر

ہماری زیست ہے اندازۂ غلط شاید
کھلے گا کاتبِ قسمت سے گفتگو ہو کر

بنا دیا مجھے وحشی تمہاری باتوں نے
بگڑ گئی مری قسمت تمہاری خو ہو کر

بہارِ رنگ پریدہ ہے کاروانِ حیات
عجب نہیں کہ پریشاں ہو موت بو ہو کر

مٹایا نقشِ وفا شوخیٔ محبت نے
کھلا نوشتۂ تقدیر تم سے تو ہو کر

سرور موت کا آیا پیے جو اشکِ الم
شکستِ عہد نے تسکین دی سبو ہو کر

نگاہِ تشنہ نے میری رلا یا ساقی کو
قدح الٹ گیا سرشارِ آبرو ہو کر

ہر ایک ذرّہ مجسّم ہے دیدۂ امید
ملے جو خاک میں ہم صرفِ جستجو ہو کر

تپش تمام ہوئی سیرِ فرصتِ ہستی
ملی نظر سے نظر خنجر و گلو ہو کر

جذبات یاس

(مرزا واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی)

ہنوز زندگیٔ تلخ کا مزا نہ ملا
کمالِ صبر ملا صبر آزما نہ ملا

جواب کیا وہی آوازِ بازگشت آئی
خزاں میں نالۂ جانکاہ کا مزا نہ ملا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں تھی
مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

سمجھ میں آ گیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہگارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

بس ایک نقطۂ فرضی کا نام ہے کعبہ
کسی کو مرکزِ تحقیق کا پتا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

ہزارہا تھا سی جانب ہے منزلِ مقصود
دلیلِ راہ کا غم کیا ملا ملا نہ ملا

ہوا کے گھوڑے پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

خوشا نصیب جسے فیضِ عشق شور انگیز
بقدرِ ظرف ملا ظرف سے سوا نہ ملا

امیدوارِ رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بد نصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

نگاہِ یاس سے ثابت ہے سعی لاحاصل
خدا کا ذکر تو کیا ۔ بندۂ خدا نہ ملا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد ۲ | فہرست مضامین کہکشاں اپریل سنہ ۱۹۱۹ء | نمبر ۴

تقریب

انتخاب طبعی۔ اس عنوان سے جناب مولوی صاحب قبلہ نے جو مضمون لکھا۔ وہ اس قابل ہی کہ ہر اُردو خواں غور سے پڑھے۔ تاکہ اصول ارتقا کے مسائل ابتدائی ذہن نشین ہوجائیں۔ آج کل اُردو کے اکثر علمی مضامین ملک کے عام تعلیم یافتہ طبقے میں نہایت کم مقبول ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہی۔ کہ وہ مضامین اچھے اور دلچسپ انداز میں نہیں لکھے جاتے۔ علمی مضامین کا انداز تحریر نہایت سادہ سلیس اور مدلل ہونا چاہیئے۔ کہ معمولی پڑھے لکھے آدمی بھی انہیں پڑھکر سمجھ سکیں۔ مولوی صاحب قبلہ کا انداز تحریر نہایت سلیس و دلنشین ہی۔ اور ہمیں یقین ہی۔ کہ ان کا یہ مضمون نئے علمی مضامین لکھنے والوں کے لیے چراغ ہدایت کا کام دے گا۔

رابندرو ناتھ ٹیگور۔ یہ مضمون ناقدانہ نہیں۔ بلکہ اس سے محض ٹیگور کی زندگی کے مختصر حالات اور اس کی تصانیف کا ایک سرسری تعارف متصور ہی۔ جو حضرات اُردو کو دیگر زبانوں کے تراجم سے مالا مال کرنے کے خواہشمند ہیں۔ انہیں چاہیئے۔ کہ ٹیگور کی کتابوں میں سے کوئی ایسی کتاب چن لیں۔ جو ان کے حسب مذاق ہو۔ اور اس کا ترجمہ اُردو میں کریں۔ مگر یہ کہ دینا ضروری ہی۔ کہ ٹیگور کو سمجھنا اور ترجمہ کرنا اس قدر آسان نہیں جتنا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہی۔ اس کے ہر ہر فقرے کی تہ میں مطالب و معانی کے سمندر متموج ہوتے ہیں اور اس کی عبارت کے ترنم۔ روانی۔ سادگی۔ تازگی۔ اور روحانی اثر کو قایم رکھ کر ترجمہ کرنا ناممکن نہیں۔ تو مشکل ضرور ہی۔ اس لیے نومشقوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونا چاہیئے۔ نیاز صاحب گیتانجلی کے ترجمے میں اور گمنام صاحب حیت کے ترجمے میں کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ بہت اچھا ہو اگر ان دونوں اصحاب میں سے کسی کو اس ضرورت کا احساس ہو اور وہ ٹیگور کی دیگر تصانیف کا بھی ترجمہ کرکے اُردو ادب کو شکر گزاری کا موقع دیں۔

لیوپڈ اور سائکی۔ جناب مولوی محمد ظفر صاحب ایم۔ اے ین ایل بی نیّل تنقید ادبی کا نہایت صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ اس دفعہ انہوں نے مولانا نیاز کی مشہور تصنیف "لیوپڈ اور سائک" پر تنقید لکھی ہے اور آئندہ کہکشاں کی مستقل قلمی اعانت کا وعدہ فرمایا ہی ہم مولوی صاحب کے بے انتہا ممنون ہیں۔

بشر ایک مقدر بیشمار۔ حضرت خواجہ حسن نظامی نے حضرت شہزادہ میرزا امیر الملک سے یہ مثنوی لکھواکر بھیجی ہی۔ اور اس کی "شان نزول" میں چند فقرے خود تحریر فرمائے ہیں۔ اس نظم میں سخنورانہ صنائع اور شاعرانہ محاسن کی تلاش بے سود ہی۔ البتہ سادگی۔ روحانیت خیال کی پاکیزگی۔ اور مذہبی تقدس کا رنگ دیکھنے کے قابل ہی۔ بلحاظ نظم اس میں کوئی دلفریبی نہیں۔ لیکن میرا وجدان اس میں ایک ایسی مستور لذت پاتا ہی۔ جو نئے "فیشن" کی اچھی سی اچھی نظم میں بھی نہیں ملتا۔ اس کا تعلق اس تاثیر سے ہی جو ان پرانی محفل کے دیکھنے والے بزرگوں کے ملفوظات کو طبقہ جدید کے کلام سے ممتاز کرتی ہی۔

کلام طالب۔ جناب منشی ونایک پرشاد صاحب طالب بنارسی نے رسالہ مخزن کے دور اول میں خوب خوب داد سخنوری دی ہی۔ تعارف کی حاجت نہیں۔ ملک کا بچہ بچہ انہیں جانتا ہی۔ ہم ان کی یہ اخلاقی غزل ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اور آیندہ کوشش کریں گے کہ جناب طالب بزم کہکشاں میں ہمیشہ رونق افروز ہوا کریں۔

خیالات واقف۔ حضرت واقف بہاری زمانہ حال کے خوش فکر شاعروں میں سے ہیں۔ لطف ترکیب اور سوز و گداز ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ انہوں نے یہ غزل مومن کے رنگ میں خوب لکھی۔ ہماری یہ خواہش ہی کہ حضرت واقف غزل کے علاوہ کہکشاں کو اپنی پُرگداز نظموں سے بھی مزین فرمائیں۔

جذبات یاس۔ جناب مرزا یاس بہت عرصے کے بعد محفل کہکشاں میں تشریف لاتے ہیں۔ لیکن تو اگر ویرانہ میں آئیں مدمشر ہیں یہ دلاویز غزل اور ایک مفید مضمون عطف و اضافت پر بھیجا ہی غزل حاضر ہی مضمون آئندہ درج ہوگا۔

بزم انجم

اس سلسلے کو مشاہیر ملک نے بیحد پسند فرمایا۔ اور ہمیں داد تحسین کے خطوط لکھے + مخزن کے آنریری ایڈیٹر جناب شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے نے بھی ہماری بے لاگ اور خالص تنقید کو پسند کیا۔ لیکن مخزن کے جائنٹ ایڈیٹر تاجور صاحب نے جو شاید تاب تنقید نہیں رکھتے چند سطور اپنے رسالہ گوہر بار میں کہکشاں کے متعلق لکھ کر اپنے بے انتہا ذکی الحس ہونے کا ثبوت دیا ہم بدلے میں ویسے الفاظ استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھتے + آئندہ مخزن پر کبھی تنقید نہ ہوگی + مخزن والوں کو کہکشاں پر "تنقید" کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن گالیاں دینا شعار سوقیانہ ہے۔ اس سے محترز رہیں۔ تو انہیں کے لئے اچھا ہے جسے گالیاں دی جایئں۔ اس کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ گالیاں دینے والا ہی دنیا کی نظر میں اپنی عزت شرافت کھو بیٹھتا ہے +

معزز معاصر "صبح اُمید" بھی "بزم انجم" سے خوش نظر نہیں آتے + پنڈت برج نرائن چکبست کی وسیع النظری اگر سچی اور خالص تنقید پر اظہار ناپسندی کرے تو تعجب ہے +

معزز معاصر "نقاد" کے فاضل ایڈیٹر حضرت شاہ دلگیر اکبر آبادی نے اپنے نامہ مکرمت میں اس تنقید کو بہت پسند کیا۔ جو "نقاد" پر کی گئی تھی ہم سلیم المذاق اور منصف مزاج سے ہمیں یہی اُمید ہے +

ہم نے بارہا اس امر کی دعوت دی ہے کہ معزز معاصرین کہکشاں پر بسیط تنقیدیں لکھیں۔ اور اس کے محاسن معائب نہایت نیک نیتی سے بتایئں + اب ہم پھر یہی گذارش کرتے ہیں کہ ہم سچی تنقید پر صاحب تنقید کے بے انتہا شکر گزار ہوں گے +

نقیب

یہ ماہوار ادبی رسالہ مسٹر وحید احمد کی ادارت میں بدایوں سے جاری ہوا ہے۔ ور اب تک اس کے دو پرچے فروری اور مارچ نکل چکے ہیں۔ اور دونوں ہمارے پیش نظر ہیں +

فروری کے پہلے پرچے میں ایڈیٹر صاحب کا افتتاحی مضمون "سات سو چھیاسی" اچھا ہے۔ ایک جگہ کیا خوب لکھتے ہیں: "کاغذ کی گرانی اور چاندی کی ارزانی تاریخ عالم میں یادگار رہے گی۔ روپے روپیہ کے نوٹ اس بات کا ثبوت ہیں۔ کہ کاغذ چاندی کے بھاؤ ہے۔ چنانچہ شک کرنے کی قطعی گنجائش نہیں۔ کہ "نقیب" چاندی کے ورقوں پر شائع کیا جاتا ہے +

نقیب نے اعلان کیا ہے۔ کہ وہ ادب میں تفریح و تفنن اور علم میں سائنس کے مضامین درج کیا کرے گا + اس پرچے میں "منشی جی" صاحب کا آنریری مجسٹریٹ تفنن (Humour) کا بہترین نمونہ ہے + ملک کے مشہور ادیب جناب سلطان حیدر صاحب جوش نے "جذبہ تیز" میں معاشرت و ازدواج کے وہ متضاد رخ دکھائے ہیں۔ اور جذبات نویسی میں کمال کیا ہے + جناب محمد علی صاحب تعلقدار کا مضمون "وزیر گنج کے گزیٹر کا ایک ورق" بھی تفنن میں تعریف کے قابل ہے +

حضرت نیاز کا مضمون "ستائش" سر رابندرناتھ ٹیگور کے رنگ میں حمد و ثنائے باری تعالےٰ کے پھول بکھیرتا ہے۔ علمی مضامین میں احمد صاحب کا مضمون "راز حرکت" اچھا ہے۔ حرکت کے قوانین کو معقول مثالوں سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایڈیٹر صاحب "بجلی" پر ایک مسلسل مضمون لکھ رہے ہیں لیکن

اندازِ تحریر کچھ ایسا ہی کہ نصاب کی کتابوں کے لیئے موزوں ہو تو ہو لیکن علمی رسائل کے لئے مناسب نہیں۔ اصطلاحات کا ترجمہ پسندیدہ نہیں۔ مثلاً بیٹری کا ترجمہ مجموعہ ظروف کیمیائی بہت لمبا ہی۔ اس سے اچھا عام فہم اور مروج لفظ مورچہ موجود ہی۔ اہل بیروت نے بیٹری کو معرب کرکے بطاریہ بنالیا ہی۔ وہی کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ cell کا ترجمہ ظرف کیمیائی کی بجائے ظرف کافی تھا۔ current کا ترجمہ موج برق کی جگہ موج ہی بہتر ہوتا۔ coil کا ترجمہ حلقہ تار بھی کچھ اچھا نہیں۔ خیر یہ لفظی بحثیں ہیں۔ ان میں کوئی اہمیت کی بات نہیں۔ لیکن پانی کو آکسیجن اور نیٹروجن کا مرکب لکھا ہی۔ اور بیٹری کے تار کو بجائے ریشم کے سوت سے مڑھا ہوا لکھا ہی۔ ایسی غلطیاں علمی رسالے میں نہیں ہونی چاہئیں۔

حضرت امیر بدایونی کی نظم "فکر اثیر غالب" کے رنگ میں بہت خوب ہی۔ ایک دو غزلیں بھی ہیں۔ مگر وہ بجائے نقیب کے کسی اور رسالے میں درج ہوتیں تو اچھا تھا۔ مارچ کا پرچہ گزشتہ پرچے سے بہت بڑھا چڑھا ہوا ہی۔ سب سے پہلے حضرت خاموش اور خواجہ حسن نظامی صاحب کی طرف سے نقیب کا خیر مقدم درج ہی۔ "شیخ سمااللہ کی جھاڑ دیال" پڑھنے اور سمجھنے کے قابل مضمون ہی۔ گالی کا فلسفہ بہت فلسفیانہ اور متین ظرافت کا نمونہ ہی۔ جناب سلطان حیدر صاحب جوش نے اولاً واجد اور پر خوب مضمون لکھا۔ موصوف کا اندازِ تحریر نہایت دلفریب اور پختہ ہی۔ کہیں کہیں ظرافت کے ایسی خوش گوار چھینٹے دے جاتے ہیں کہ بے اختیار پڑھنے والے کے دل و زبان سے داد نکلتی ہی۔ مثلاً "ایک جوڑو والدین" "تعلیم کو مذہب سے وہی تعلق ہی جو ڈاکخانے کو عشقبازی کے خطوط سے" وغیرہ۔

مسٹر عبد الوالی ایڈیٹر معلومات کا مضمون "تنہائی کی گفتگو" محبت کے جذبات عالیہ کی بہترین تصویر ہی۔ بلحاظ ادب یہ تین صفحے کا مضمون رسالے کی جان ہی۔ حجاب [illegible] کا "سفر سفر" اور جناب احمد صاحب کا "ایک خط" ان دونوں مضامین میں مشرق و مغرب کو دست و گریباں کیا ہی۔ اور فی الحقیقت معاشرت و تہذیب پر بہت دلکش انداز سے بحث کی ہی۔

"ابتدائے آفرینش" سائنس کے ایک مضمون کا افتتاحی حصہ ہی۔ اس کی عبارت میں ادبیت بہت زیادہ ہی۔ اور مطلب کی بات کوئی موجود نہیں۔ خیال ہی۔ کہ آئندہ فاضل مضمون نگار کوئی کام کی بات بھی بیان کریں گے۔ ان کے اندازِ تحریر کے ہم مداح ہیں۔ اگر یہی انداز آئندہ کے پیچیدہ مباحث میں بھی نبھ گیا۔ تو یقیناً ان کے مضامین اردو کی علمی دنیا کے لئے مایہ ناز ہوں گے۔

بجلی کے مضمون میں اس دفعہ بھی بعض اصطلاحات کا ترجمہ کیا ہی۔ جو اچھا نہیں۔ مثلاً Pressure کا ترجمہ دبانے کی قوت کیا۔ صرف دباؤ اس لفظ کا صحیح قایم مقام نہیں ہو سکتا؟

بحیثیت مجموعی رسالہ نقیب اس وقت ملک کے ادبی رسائل کی صف اول میں جگہ پانے کا مستحق ہی۔ اور ہم ناظرین کہکشاں سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ نقیب کو پڑھیں۔ اور لطف اندوز ہوں۔ کاغذ کے متعلق تو آج کل شکایت کرنا فضول ہی۔ کیونکہ گرانی نے چھکے چھڑا رکھے ہیں۔ البتہ ہم یہ ضرور عرض کریں گے۔ کہ اس کی لکھائی چھپائی کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہی۔ ایسے اچھے رسالے کی کتابت و طباعت بھی اس کے حسن باطنی کے شایانِ شان ہونی چاہئے۔

یہ رسالہ ۲۰×۲۶/۸ کی تقطیع کے ۴۸ صفحوں پر شائع ہوتا ہی قیمت وہی جو کہکشاں کی ہی۔ دفتر رسالہ نقیب بدایوں سے طلب فرمایئے۔

ریویو مثنوی زہرِ عشق

مرزا شوق لکھنوی کی مشہور مثنوی زہرِ عشق کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ملک کے بچے بچے کی زبان پر ہی۔ عرصے سے یہ دقت تھی۔ کہ اس کے بازاری اڈیشن اکثر غلط سلط چھپے ہوئے ملتے تھے۔ ایف ڈی سی ایم صاحب نے یہ مثنوی صحیح کرکے چھاپ دی ہی۔ ان کا اڈیشن پہلے بازاری اڈیشنوں سے نسبتاً صحیح ہی۔ قیمت ۸ر کسی قدر زیادہ ہی۔
(ایف ڈی۔ ایم۔ ہمیر نزل ریلوے روڈ لاہور سے طلب کیجئے)

کہکشاں

جلد ۲ | لاہور۔ ماہ اپریل سنہ ۱۹۱۹ء | نمبر ۴

انتخاب طبعی

جدت طرازئ علوم حکمیہ نے زمانہ حال میں جو مذاہب جدیدہ پیدا کئے ہیں۔ ان میں ڈاروِن کے مسئلہ ارتقا نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔ شاید ہی کوئی علم ایسا ہوگا جس پر اس مسئلہ کا اثر نہ پڑا ہو۔ اور چونکہ اس مذہب کے قائلین کا یہ خیال ہے۔ کہ دنیا میں جملہ انواع ونباتات وحیوانات کی اصل بذریعہ انتخاب طبعی وجود میں آتی ہے۔ اس لئے اس قول کے مخالفین نے اس کی تردید بھی بہت زور شور سے کی ہے۔ کیونکہ یہ مذہب دنیا بھر کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ آج تک جملہ یہود و نصاریٰ اور اہل اسلام و نیز حکمائے دیگر اقوام سب اس بات پر متفق ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نوع کو جدا جدا پیدا کیا ہے۔ اور اس صورت اصلی سے دنیا میں اس کی نسل چلی۔ لیکن ڈارون کی یہ رائے ہے۔ کہ ابتدا میں مادہ کی کسی ترکیب خاص سے کوئی نباتاتی چیز پیدا ہوئی۔ اور بتدریج بذریعہ انتخاب طبعی اسی ایک چیز میں سے اس کی دوسری انواع نکلیں۔ اور ان انواع میں سے اَور انواع یہاں تک کہ نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے انسان تک یہ سلسلہ کائنات پہنچا۔ لیکن ڈارون کچھ ایسی بات کہ گیا ہے۔ کہ باوجود ایں ہمہ تردید مخالفین کوئی حکیم یا سائنس داں اس کے قول کو شکست نہیں دے سکا۔ اتنا ضرور ہوا۔ کہ وقتاً فوقتاً اس کے فروع وتفاصیل میں کچھ ترمیم یا زیادت ہوئی۔ لیکن بہر کیف اس کے اصل مسئلہ کو ذرا جنبش نہ ہوئی۔ وہ جوں کا توں رہا۔ چونکہ تقریباً ہر علم اور انسانی ترقی یا تنزل کی بحث میں آج کل ارتقا کا ذکر کسی نہ کسی پہلو سے آتا رہتا ہے۔ اس لئے میں نے مناسب جانا۔ کہ کہکشاں کے ناظرین کے لئے کچھ مختصر بیان اس مسئلہ کا کر دیا جائے۔ اور چونکہ ارتقا کے مسئلہ کی بنیاد انتخاب طبعی پر ہے۔ اس لئے اول اسی کی تشریح مناسب ہے۔ تاکہ اس کے ذہن نشین ہو جانے سے ارتقا کے مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہ رہے۔

یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ جو کسی ثبوت و دلیل کا محتاج نہیں۔ کہ عالم نباتات و حیوانات میں ہر فرد اپنے زمانۂ حیات میں جس قدر نسل پیدا کرتا ہے۔ وہ سب زندہ نہیں رہتی۔ بلکہ اس کا ایک نہایت قلیل حصہ زندہ رہتا ہے۔ باقی سب افراد تلف ہو جاتے ہیں۔ جو دانہ زمین میں بویا جاتا ہے۔ اس پر غور کرو۔ ایک ایک دانہ سے کتنے دانے نکلتے ہیں۔ اور اسی طرح پرندوں یا دوسرے جانوروں کے ایک ایک جوڑے سے اس قسم کے جانوروں کے کتنے اور جوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر دیکھو ان پیدا شدہ دانوں اور جوڑوں میں سے ایک ایک فرد سے کتنی نسل آگے چلتی ہے۔ غرض یہ نسل سلسلۂ ضربی کی رفتار سے بڑھتی ہے۔ اس حالت میں اگر اس سلسلۂ ضربی کی ترقی میں کوئی مانع نہ ہوتا۔ تو خیال کرنا چاہئے۔ کہ تھوڑے عرصے میں نباتات و حیوانات کی نسل اس انتہا کو پہنچ جاتی۔ کہ دنیا میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی ۔

قصابوں کی دکانوں میں گوشت پر بیٹھنے والی ایک خاص قسم کی مکھیاں ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک مکھی تین ہزار بچے دیتی ہے۔ اور ان بچوں کا اس سرعت سے نشو و نما ہوتا ہے۔ کہ پانچ دن کے عرصے میں وہ اپنا پورا قد و قامت حاصل کر لیتے ہیں ۔ ایک عالم حیوانات نے تخمینہ لگایا ہے۔ کہ ایسی تین مکھیاں پانچ دن میں گھوڑے کی نعش کو کھا کر اسی طرح ختم کر سکتی ہیں جس طرح ایک شیر کر سکتا ہے ۔ اسی طرح ایک دوسرے عالم نے حساب لگایا ہے۔ کہ یہی معمولی چڑیاں جو ہمارے گھروں کی چھتوں میں گھونسلے بنا کر رہتی ہیں۔ اگر دس برس تک معمولی رفتار سے بچے دیتی رہیں۔ اور ان کا ایک بچہ بھی ضائع نہ ہو۔ تو اتنی مدت میں ان کی تعداد دو کروڑ تک پہنچ جائے گی جن کے رہنے کے لئے کسی گھر میں بھی اتنی گنجائش نہیں ہو سکتی ۔

بڑے جانور جو ایک وقت میں ایک ہی بچہ دیتے ہیں۔ ان کی ترقی نسل کی مثالیں بھی بہت سی ملتی ہیں۔ کلمبس کی سوانح میں لکھا ہے۔ کہ وہ اپنے دوسرے سفر میں چند بھینسیں اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ اور انہیں سنٹ ڈومنگو کے جنگلوں میں چھوڑ آیا تھا۔ یہ جانور وہاں جنگل میں بے روک ٹوک پھرتے تھے۔ سات برس کے عرصے میں ان کی نسل میں اس قدر افزائش ہوئی۔ کہ پانچ پانچ چھ چھ ہزار کے گلے جا بجا جنگلوں میں پھرتے نظر آتے تھے ۔

یہی حیرتناک افراط نسل کی حالت عالم نباتات میں دیکھی جاتی ہے۔ اس پر بھی دنیا کا یہ حال ہے کہ آئے دن قحط رہتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صانع قدرت ہر نسل میں ایک توازن خاص قائم رکھتا ہے۔ اور عام طور پر وہ نسل ان حدود مقررہ کے اندر اندر رہتی ہے۔ اس سے تجاوز نہیں کرتی ۔ لاکھوں مخلوق کمال بلوغ حاصل کرنے سے پہلے مختلف مراحل حیات میں ہلاک ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ ہنگامۂ فنا جو دنیا میں برپا ہے۔ کس اصول پر قائم رہتا ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ ہے۔ کہ تنازع للبقا یعنی کشمکش حیات کے اصول پر۔ آسانی کے لئے اسے ایک مثال سے یوں سمجھنا چاہئے۔ کہ کسی جزیرے کے ایک محدود حصے میں ایک خاص قسم کا پودا یا جانور پایا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کے لئے اسی جگہ سے غذا حاصل کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ عرصۂ قلیل میں ان کی نسل اس قدر ترقی کر جائے گی۔ کہ اس جزیرے کی تمام پیداوار بمشکل انہیں کے لئے مکتفی ہوگی ۔ اور جب اس نسل کی اس حد سے آگے بڑھے گی۔ تو پھر اس جزیرے کی پیداوار ان سب کے لئے کافی نہ ہوگی۔ اس حالت میں کہ غذا قلیل ہے۔ اور کھانے والے کثیر۔ جملہ افراد میں اس غذا کے لینے کے لئے کشمکش شروع ہوگی۔ اور اس چھین جھپٹ میں کوئی جیتے گا کوئی ہارے گا۔ جو خوراک حاصل کر لینے میں جیتیں گے۔ وہی جیتے رہیں گے۔ باقی فاقوں سے نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اسی کشمکش کو اصطلاحی زبان میں تنازع للبقا کہتے ہیں ۔

اب یہ فرض کرو۔ کہ جزیرہ مذکور میں اتنی ہی جگہ میں دو جانور یا دو پودے ہیں۔ تو بالآخر اسی اصول پر دونوں قسموں میں وہی کشمکش یا تنازع شروع ہوگا۔ اور ان میں سے ایک فرد یا تو دوسرے کو ہلاک کر دے گا۔ یا دونوں کو ایک محل محدود میں رہنا پڑے گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ یہ امر لابدی ہے۔ کہ بہترین افراد کے لئے کمترین اپنی جان قربان کریں ۔ یہ بھی ہر شخص کو معلوم ہے۔ کہ بعض حیوانات کی خلقت ہی ایسی واقع ہوئی ہے۔ کہ وہ دوسروں کو کھا کر زندہ رہتے ہیں ایسی صورت میں اگر وہ دونوں قسم کے حیوانات ایک جگہ جمع ہوں گے۔ تو وہی کشمکش شروع ہوگی۔ ایک تو جان بچا کر بھاگنا چاہے گا۔ اور دوسرا اسے

پکڑ کر لقمہ بنانے کی کوشش کرے گا۔ بالآخر قدرت یہاں بھی اپنا وہی توازن قائم رکھے گی۔ کیونکہ ایک کی حیات دوسرے کی ممات پر موقوف ہے۔ اس کی غذا کے لئے کچھ معقول تعداد قایم رہنی چاہئے۔ اور دوسری طرف یہ تعداد ایک حد خاص سے متجاوز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے دشمن کی ترقی اسے ہلاک کرتی رہتی ہے +

اس تنازع دایم کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً تبدیل آب و ہوا بارش۔ موسم۔ برف مختلف اقسام کے طوفان کمزور پودوں اور حیوانات کو تباہ کر ڈالتے ہیں۔ اس معرکہ فنا و ہلاکت سے کوئی فرد نہیں بچ سکتا۔ یہ جبری قانون تمام کائنات پر حاوی ہے۔ ہر پودے اور ہر جانور کو اس کشمکش حیات میں سے گزرنا ضرور ہے۔ اور یہ ہی ذریعہ توازن قدرت کے قایم رکھنے کا ہے +

اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس قیامت خیز کارزار زندگی میں جہاں لاکھوں کروڑوں کا خون ہوتا ہے۔ جو چند افراد بچ رہتے ہیں۔ ان کے بچاؤ کی کیا صورت ہوتی ہے۔ یعنی وہ کیا اصول ہے۔ جو ایک نوع کو غالب و فتحیاب کرتا ہے۔ اور دوسرے کو ہلاک و خراب۔ اسی طرح جب یہ مظلوم ظالموں کے پنجہ ستم میں گرفتار ہوتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے۔ کہ کچھ تو بال بال صاف بچ نکلتے ہیں۔ مگر دوسرے ہمدم گرداب ہلاکت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ کیا یہ زندگی و موت ایک امر اتفاقی یا قسمت کا کھیل ہے کیا یہ مزاج قدرت کی ایک خوش طبعی اور محض دل لگی ہے۔ کہ بلا وجہ جسے چاہا زندگی کے لئے منتخب کر لیا۔ اور جسے چاہا موت کے حوالہ کیا یا یہ کوئی قانون ہے۔ اور یہ ہنگامہ درہم اس کی رہنمائی سے چل رہا اور غایات مقررہ کی طرف جا رہا ہے؟

ممکن ہے۔ کہ بعض صورتوں میں نتائج کے وجود میں آنے کا سبب وہی امر ہو۔ جسے عرف عام میں اتفاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن یہ یقینی ہے۔ کہ اکثر صورتوں میں کوئی نہ کوئی علۃ عاملہ ضرور موجود ہوتی ہے کارخانہ قدرت میں اتفاق کوئی شے نہیں ہے۔ ہر چیز ضابطہ و انتظام قانون میں منسلک ہوتی ہے۔ یہی علۃ وہ چیز ہے جسے ہم انتخاب طبعی کہتے ہیں۔ اور اس کے یہ معنی ہیں کہ افراد کثیر میں سے قدرت صرف ان چند افراد کو منتخب کر لیتی ہے۔ جو اس کے اغراض و غایات کے لئے سب سے زیادہ موافق و موزون ہوتے ہیں اور وہ انہی افراد کی حفاظت کرتی ہے۔ باقی اگر معرض ہلاکت میں پڑیں تو اس کی بلا سے۔ ان چند افراد کا بچ جانا ہی وہ اصول ہے جسے زمانہ حال کے اہل سائنس "بقائے اصلح" کہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں۔ کہ جو افراد اپنی شرائط حیات کو بہترین طریق سے ایفا کرتے ہیں۔ وہی باقی رہتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو افراد نگاہ قدرت میں شرف قبولیت حاصل کرتے ہیں۔ ان میں کوئی وصف ضرور ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ہم جنسوں پر فوقیت پاتے ہیں۔ درحقیقت بات یہ ہے۔ کہ ایک ہی نوع کے جملہ افراد بھی من کل الوجوہ ایک سے نہیں ہوتے۔ بلکہ خواہ ان میں بالعموم کتنی ہی مشابہت کیوں نہ ہو۔ پھر بھی ان میں کسی نہ کسی قسم کی مغائرت بھی ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً بعض قوی ہوتے ہیں بعض ضعیف بعض تیز بعض سست وقس علی ہذا۔ اب ہر شخص یہ بات بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ کہ یہی امور وجوہ ترجیح و انتخاب کی ہو جاتی ہیں۔ اگر چند حیوانات میں غذا کے لئے کشمکش ہو گی۔ تو یہ ظاہر ہے۔ کہ جن افراد کو اپنے رفقا پر کسی وصف خاص مثلاً قوت۔ سرعت۔ جسم وغیرہ میں فوقیت حاصل ہے تو انہیں کے لئے کامیابی کا غالب ترین احتمال ہے۔ مثلاً جو شکاری پرندے ہیں وہ ان میں سب سے زیادہ تیز اور قوی ہوں گے۔ وہ اپنی غذا جلد حاصل کر لینگے اور کمزور پھسڈی منہ دیکھتے رہ جائیں گے + اسی طرح پنجہ بہ پنجہ ظلم میں جو جنگجو اور تیز پرواز ہو گا۔ اسی کا بچ نکلنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ نہ کہ صلح جو اور کاہل الوجود کا + غرض قدرت کمال بلوغ تک پہنچانے اور آئندہ نسل چلانے کے لئے ان افراد کو منتخب کرتی ہے۔ جنہیں خطرات سے محفوظ رہنے کے بہترین ذرائع حاصل ہیں۔ اور ان کی نسل کو بھی اپنے والدین کے وہی اوصاف ارث کے طور پر ملیں گے۔ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ ان میں کچھ مغائرتیں بھی پیدا ہوں گی۔ یعنی سب کے سب افراد اپنے ماحول کے لئے یکساں طور پر مناسب موزون نہ ہوں گے۔ بلکہ ان کے درجہ موزونیت میں ضرور کمی بیشی ہو گی۔ ان ہی اصول کا اطلاق جملہ نباتات و دیگر حیوانات پر ہوتا ہے۔ اور ان تمام مشاہدات سے ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کارزار قدرت میں صرف وہی اصناف محفوظ اور باقی رہ سکتی ہیں۔

جو حالات گرد و پیش سے زیادہ مناسبت و موافقت رکھتی ہوں +

اس غرض کے لئے کہ انتخاب طبیعی کا فائدہ خاطر خواہ طور پر نفاذ پذیر ہو سکے۔ یہ ضرور ہے جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر بیان کیا کہ ہر نوع کی افراد میں کچھ مغائرتیں ہوں۔ اور ان مغائرتوں میں بعض ایسی ہوں جو تنازع للبقا میں مفید ہوں کیونکہ اگر مغائرتیں نہ ہوں گی۔ یا مغائرتیں تو ہوں۔ مگر غیر مفید۔ تو ظاہر ہے کہ ایسی صورتوں میں انتخاب طبعی کا کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اثر مذکور کے لئے کوئی محل ہی موجود نہیں ہے۔ لہذا یہ امر دریافت طلب ہے۔ کہ آیا ہمیشہ ایسی مغائرتیں موجود ہوتی ہیں۔ یا قدرت کبھی ترجیح بلا مرجح سے بھی کام لیتی ہے +

اس باب میں یوماً فیوماً کثرت سے شہادت جمع ہوتی جاتی ہے۔ جب تک ڈارون نے اس موضوع کی اہمیت ظاہر نہ کی تھی۔ اس وقت تک تو کوئی اس امر کی طرف مطلق خیال بھی نہ کرتا تھا کہ کسی مخلوق کا اصل شکل سے انحراف کیا معنی رکھتا ہے۔ لیکن زمانہ حال کی شہادت سے ان انحرافات کا وجود اس درجہ تک ثابت ہوا ہے۔ کہ اس کا شاید خود ڈارون کو بھی وہم و خیال نہ ہوگا۔ یہ انحرافات سب سے زیادہ ... نے حیوانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور بعض اصناف میں تو اس انحراف کی یہ شدت ہے۔ کہ تباین صنفی کی بجائے تباین نوعی یا تباین جنسی کا دھوکا ہوتا ہے ... افراد کے جسموں۔ گردنوں۔ ٹانگوں یا پاؤں اور بازوؤں میں ... انتہا اختلافات پائے جاتے ہیں۔ میرا مطلب اُن اختلافات سے نہیں جو اجسام کے تناسب سے ہوتے ہیں بلکہ میرا مطلب اختلافات غیر متناسب سے ہے۔ مثلاً چھوٹے سے ہاتھ پاؤں کے ساتھ بڑا سا جسم۔ اس قسم کے اختلاف بجائے خود ہر عضو میں دیکھے جاتے ہیں۔ ان چند در چند اختلافات دیکھنے سے ذرا بھی شبہ نہیں رہتا۔ کہ عمل انتخاب طبعی کے لئے کافی مواد موجود رہتا ہے۔ اور قدرت کے لئے ہر شخص کا فرد پیدا کرنا ممکن ہے۔ مثلاً بعض حالات خاص میں پرندوں کے لئے تیز پروازی نافع ہے۔ تو جن افراد میں لمبے بازو اور نسبتاً چھوٹے اور ہلکے اجسام ہوں گے وہ افراد منتخب کئے جائیں گے۔ اور وہی محفوظ رہیں گے۔ یا فرضاً اگر قوت ستیزہ جوئی زیادہ نافع ہے۔ تب ایسے پرندے منتخب ہوتے ہیں۔ جن کی مضبوط چونچیں سخت پنجے۔ گٹھے ہوئے جسم اور چھوٹی مضبوط ٹانگیں ہوں۔ غرض اسی طرح زندگی کے مختلف احوال اور اوضاع کا قیاس کر لینا چاہئے۔ یعنی اعلےٰ سے ادنےٰ تک میں وہی چیز قدرت کو مقبول و منظور ہوتی ہے جس میں کسی جاندار کا زیادہ نفع ہوتا ہو کسی قسم کا تغائر و تباین ہو۔ ان سب میں وصف ضروری یہ ہے کہ وہ تغائر کسی نہ کسی طریق سے تنازع للبقا کے معرکہ میں کارآمد ہو۔ یہ عمل انتخاب کس حد تک جاری رہ سکتا ہے۔ اور اس کے ذریعے ساخت اور افعال کے کیا کیا اختلافات پیدا ہونے ممکن ہیں۔ یہ ایک جدا سوال ہے۔ لیکن یہ بات بلا شک و شبہ تسلیم کر لینی چاہئے کہ اقتصادیات قدرت میں انتخاب طبعی کو بہت دخل ہے +

سید ممتاز علی

بڑے انشا پرداز بننے کے لئے ضروری اوصاف یہ ہیں۔ کہ صحیح خیالات کا پورا اظہار ہو۔ سادگی ہو مگر اس میں عامیانہ پن نہ ہو۔ بلند خیالی ہو مگر بدمذاقی نہ ہو۔ متانت ہو مگر اس کے ساتھ سختی نہ ہو۔ شگفتگی ہو مگر شوخی نہ ہو۔ خیالات کا اظہار نہ یکایک ہو نہ غیر مستحسن طور پر۔ نہ ہمیں ان کا قایل بنانے کی کوشش کی جائے نہ زبردستی تسلیم کرایا جائے۔ بلکہ اوروں کو اپنے خیالات پیش کرنے کی گنجایش دینی چاہئے۔ جو عوام الناس کے ذہنوں کو زور دار معلوم ہو۔ جو عامیوں کو اپنے اختصار اور تیزی کی کشش سے کھینچ لے۔ لیکن یاد رکھو کہ کرخت ساخت ہمیشہ زیادہ پائیدار نہیں ہوتی۔ نہ بلند ترین آواز ہمیشہ متحکمانہ ہوتی ہے +

(ایڈیسن)

جوف الارض

سائنس میں سینکڑوں ایسے اہم مسائل ہیں جن کا کوئی صحیح جواب ہم اپنی موجودہ معلومات کی بنا پر نہیں دے سکتے۔ لیکن یہاں ہم دلچسپی اور ترقی علم کا باعث ہوگا اگر ہم ان اہم سوالات کا مطالعہ کریں۔ اور اپنے موجودہ علم کی بنا پر کم از کم قیاسی دلائل کا ایک ڈھانچہ بنا کر کھڑا کریں اور کہیں کہ اصلیت اس سے مشابہ معلوم ہوتی ہے جس طرح مصور تصویر کھینچنے سے پیشتر چند نہایت موٹے موٹے اور بھدے خطوط سے اپنی تصویر کا سرسری خاکہ قایم کرتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس کی باریکیوں پر غور کر کے رنگ بھرتا ہے کسی حصے کو گہرا رنگ دیتا ہے۔ اور کسی کو ہلکا۔ یہاں تک کہ تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ اور ماہرین فن یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ تصویر نقل کا اصل ہے۔ اسی طرح سائنس داں بھی صرف اپنی موجودہ علمیت کے دائرے میں ہی قیاسات کا ایک نہایت معمولی نقش تیار کر سکتے ہیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ غور و فکر و نتائج و مشاہدات سے اس معمولی نقش کو بتدریج سنوار سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس مسئلے میں قدرت کی مخفی روش ہر شاہد کو نمایاں طور پر معلوم ہو سکے + یہ سوال کہ "زمین کے اندر کیا ہے"۔ ایسا معما ہے جس کا کوئی صریحی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن فی الحال اکثر سائنس دانوں نے صرف قیاسات اور ظن و تخمین پر اس مشکل کو حل کرنے کی ایک صورت نکالی ہے۔ اور اس نقش اولین کو آیندہ نسلوں کی اصلاح کی امید پر چھوڑ دیا ہے +

گزشتہ زمانے میں تخیل پسند انسان سائنس کے اکثر مسائل کے لئے جو نا واقفیت کی تاریک غار میں پوشیدہ ہوتے تھے عجیب و غریب توجیہات گھڑ لیا کرتا تھا۔ چنانچہ یقین کیا جاتا تھا کہ زمین کا مرکزی حصہ کھوکھلا ہے اور ایک ایسے مادے سے پر ہے + چونکہ مضطرب انسانی فطرت کو اس دنیا کا سنسان پڑا رہنا کچھ مناسب معلوم نہ ہوا۔ اس لئے ان کے تخیل نے اسے ایسے عجیب و غریب حیوانات اور نباتات سے بسانا شروع کیا۔ جو زیر زمین زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی خلاق تخیل نے دو ستارے بھی مخلوق کر دیے جن کا کام اس تاریک غار کو روشنی پہنچانا تھا۔ اور یہ بھی فرض کر لیا گیا کہ کرہ شمال میں اس اندرونی دنیا کا راستہ ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ جہاز رانوں سے درخواست کیا کرتے تھے کہ وہ کرہ شمال کی جانب سفر کریں اور اس عجیب و غریب دنیا کی کچھ خبر لائیں +

زمین کا اندرونی حصہ کس چیز سے بنا ہے۔ یا اس کی طبعی حالت کیا ہے۔ اس کا ہمیں کوئی صحیح و یقینی علم نہیں لیکن ہم بعض مشاہدات کی بنا پر ان سوالات کے متعلق چند ایسے نتائج مرتب کر سکتے ہیں جن کے صحیح ہونے کا بہت معقول امکان ہے + ظاہر ہے کہ ہم زمین کے اندرونی حصے کی نسبت صرف اس کی سطح سے اندازہ لگا سکتے ہیں جس کی ہیئات ہمارے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور جس پر ہم خاطر خواہ تجربے کر سکتے ہیں۔ سب سے پیشتر ہم اس مسئلے کے متعلق چند مشاہدات کا ذکر کریں گے۔ اور پھر بتائیں گے کہ سائنس دان ان مشاہدات سے کن نتائج پر پہنچے۔ اور ناظرین کے لئے یہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کہ کس طرح ایک مشاہدے کے نتائج دوسرے مشاہدوں کے نتائج سے مطابقت رکھتے ہیں +

۱۔ ہمارے پاس زمین کے اندرونی حصے میں کسی حد تک داخل ہونے کا ذریعہ گہری کانیں اور کنوئیں ہیں۔ ان کے ذریعے اگر ہم کسی حد تک زمین کے اندر داخل ہو کر وہاں کا درجہ حرارت معاینہ کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ سورج کی حرارت کے اثر کے علاوہ جوں جوں ہم زمین میں نیچے اترتے جاتے ہیں۔ ہر پچاس یا ساٹھ میل کے عمق پر فارن ہائیٹ تھرمامیٹر کا پارہ ایک ڈگری زیادہ درجہ حرارت ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً فرض کیا کہ جس جگہ سے ہم نیچے اترے وہاں درجہ حرارت ۵۰ تھا۔ تو جب ہم پچاس فٹ نیچے اتریں گے۔ تو درجہ حرارت ۵۱ ہو جائے گا۔ سو فٹ نیچے اترنے سے ۵۲ اور ڈیڑھ سو فٹ نیچے اترنے کے بعد ۵۳ وعلیٰ ہذا۔ اگر ہم کسی عمیق سے عمیق کان میں اتریں تو عمق اور تھرمامیٹر کے درجے

حرارت میں یہی نسبت قایم رہتی ہی +

چونکہ یہ مسلم ہی کہ جن چٹانوں سے زمین کا خول بنا ہی۔ اگر انہیں بہت زیادہ حرارت پہنچائی جائے۔ تو وہ پگھل جائیں گے اور سیال بن جائیں گے۔ اس لئے یہ فرض کر لینا معقول معلوم ہوتا ہی۔ کہ اگر زمین کے عمق میں اسی نسبت سے درجہ حرارت بڑھتا چلا جاتا ہی۔ تو ایسا مقام سطح زمین سے بہت زیادہ فاصلے پر نہ ہوگا جہاں یہ چٹانیں سیال حالت میں ہوں گی۔ اندازہ لگانے سے معلوم ہوا ہی کہ ویسا مقام سطح زمین سے بیس یا تیس میل کے عمق پر ہی۔ اور چونکہ اس کے اوپر بیس تیس میل زمین کا بوجھ پڑ رہا ہی + یہ آتشین سیال مادہ منوں عظیم کو اٹھائے ہوئے ہی +

۲۔ اس اندرونی حرارت کی شہادتیں تمام روئے زمین پر موجود ہیں۔ مثلاً آتش فشاں پہاڑ۔ زلزلے اور گرم چشمے + ہمیں علم ہی کہ آتش فشاں پہاڑ دنیا کے مختلف حصص میں موجود ہیں۔ اور ان میں سے آتشیں سیال مادہ یا لاوا گرم راکھ اور مختلف قسم کے بخارات بہت کثرت سے نکلتے رہتے ہیں۔ مشاہدے سے یہ بات بھی ثابت ہی کہ یہ ظہورات طبعی کسی ایک حصہ زمین سے مخصوص نہیں۔ بلکہ وقتاً فوقتاً دنیا کے اکثر قطاع میں ظاہر ہو چکے ہیں اس کے علاوہ مختلف مقامات اور اوقات میں زلزلے بھی دنیا کو ہلاتے رہتے ہیں۔ اور گرم چشموں سے گرم پانی کے فوارے بھی کافی قوت سے باہر نکلتے رہتے ہیں۔ یہ تمام مشاہدات بلاتردید ثابت کرتے ہیں۔ کہ زمین کے اندرونی حصے کا درجہ حرارت زیادہ ہی اور اس اندرونی مادہ پر بالائی حصہ زمین کا وزن بھی بہت زیادہ پڑ رہا ہی جس سے دب کر یہ مادہ شدید قوت کے ساتھ باہر اچھل پڑتا ہی +

۳۔ ایک تیسرا قابل غور مشاہدہ زمین کی وضع و شکل کے متعلق ہی۔ سب کو علم ہی کہ زمین کی شکل ایک کامل کرے یا گیند کی سی نہیں بلکہ وہ شمالی و جنوبی قطبین پر سے پچکی ہوئی ہی جیسی کہ شکل ملا میں ظاہر کی گئی ہی۔ اس میں ش اور ج دونوں پچکے ہوئے شمالی اور جنوبی قطب ہیں۔ اور ان کے درمیان جو نقطہ دار خط ہی۔ وہ زمین کا محور ہی جس پر زمین ایک پہیے کی مانند مشرق سے مغرب کی جانب دورہ کرتی ہی + زمین کی یہ مخصوص وضع قابل غور ہی۔ اور ظاہر کرتی ہی کہ کسی زمانے میں زمین اپنی سطح تک سیال حالت میں تھی + یہ بآسانی یوں سمجھ میں آ سکتا ہی کہ اگر ایک پتھر کو ڈوری میں باندھ کر کچھ دیر تک اپنے سر کے گرد پھرایا جائے۔ تو وہ پتھر کشش دافع المرکزی کی وجہ سے دور جانا چاہتا ہی۔ اسی طرح یہ سیال کرہ جو مندرجہ بالا شکل میں تیر کی سمت میں مغرب سے مشرق کی جانب پھر رہا تھا۔ اس کا طبعی میلان تھا کہ قوت دافع المرکزی کی وجہ سے دور خلا میں اڑ جائے۔ مگر میل مرکزی اس کو دور جانے سے روکتا تھا چنانچہ اس کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ سرد ہونے تک اس کرہ نے موجودہ وضع اختیار کر لی یعنی طرفوں پر سے باہر نکل گیا اور سروں پر سے پچک گیا تھا۔ جو صورت ایک سخت و کرخت کرہ کسی صورت اختیار نہ کر سکتا تھا +

ش

ج
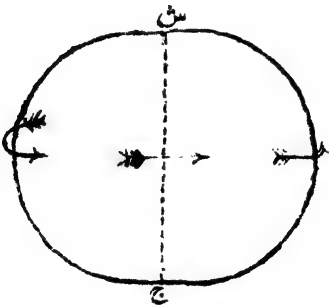
اس سے ظاہر ہوا کہ تخلیق عالم کے وقت زمین حالت سیال میں تھی۔ اور اس کا اس وقت کا درجہ حرارت موجودہ درجہ حرارت سے بہت زیادہ تھا +

مندرجہ بالا مشاہدات یعنی زمین میں اترنے سے درجہ حرارت کا ایک خاص نسبت سے بڑھنا۔ آتش فشاں پہاڑوں۔ زلزلوں اور گرم چشموں کا وجود۔ زمین کی مخصوص وضع ابتداء میں اس کی سیالی حالت اور عالی درجہ حرارت۔ یہ سب باتیں ہمیں بے اختیار اس نتیجے پر پہنچاتی ہیں کہ زمین ایک ایسے جسم کی مانند ہی جو رفتہ رفتہ سرد ہو رہا ہے۔ اور از منہ قدیم میں

پہلے پہلے اس کی بیرونی سیال سطح پر ایک پتلا سا چھلکا بنا تھا جس کا حجم رفتہ رفتہ زمین کے سرد ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اب وہ بیس یا تیس میل کے قریب ہو گیا ہی۔ اور اس کے نیچے وہی سیال آتشین روز اول کی طرح موجزن ہی۔ کسی لوہے کے کارخانہ میں جانے سے زمین کی یہ تمام تبدیلیاں بآسانی ذہن نشین ہو سکتی ہیں۔ لوہے کے کارخانوں میں لوہے کو بہت زیادہ حرارت سے پگھلایا جاتا ہی اور سیال لوہا ظروف میں جمع ہوتا ہی۔ اب اگر ایک ظرف کے نیچے سے آگ ہٹائی جائے۔ تو لوہے کی سطح پر ایک سیاہ چھلکا سا جمنا شروع ہوتا ہی۔ اور رفتہ رفتہ اس چھلکے کی موٹائی بڑھتی جاتی ہی۔ لیکن اگر ظرف کو ہلایا جائے تو ساکن سطح کے نیچے سے آتشین مادہ اپنی خوفناک موجودگی ظاہر کر دیتا ہی۔ زمین کی اندرونی کیفیات کی یہ نہایت سہل الفہم و مسلمہ توجیہہ ہی۔

اس غرض سے کہ ہمیں زمین کے خول کی ضخامت کا صحیح اندازہ معلوم ہو جائے۔ ہم اسے اس شکل سے ظاہر کرتے ہیں شکل ۲ ایک دائرہ ہی جس کے محیط کی موٹائی تو زمین کے خول کو ظاہر کرتی ہی۔ اور اندر کا تمام حصہ اندرونی سیال کو۔

مندرجہ بالا نتائج کو اگرچہ اکثر اشخاص نے تسلیم کیا لیکن بعض مشاہیر سائینس دان اس قیاسی توجیہہ سے مطمئن نہ ہوئے۔ کہ ایک اتنا بڑا عظیم الشان قطعہ کسی زمانے میں بالکل سیال صورت میں مخلوق ہوا ہو چنانچہ مسٹر پائسن نے اس مشکل کو اور طرح حل کیا۔ اس کی یہ رائے ہی۔ کہ زمین ابتدائے آفرینش میں کسی ایسے مقام سے گزری جس کا درجہ حرارت اس کے درجے حرارت سے اونچا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کا خارجی طبق گرم ہو گیا۔ اور اندر کی جانب بھی کسی دوری تک اس حرارت کا اثر پہنچا۔ اور اب پھر زمین سرد ہو رہی ہی۔ لیکن یہ خیال ایک ایسا قیاس ہی کہ اس کے ثبوت کے لئے ایک شہادت بھی موجود نہیں۔

سر ہمفری ڈیوی مشہور سائینس داں کا خیال تھا کہ مرکز زمین کی حرارت کسی عمل کیمیائی کی وجہ سے ہی۔ یہ ہر شخص جانتا ہی کہ امتزاج کیمیائی سے حرارت پیدا ہوتی ہی۔ مثلاً اگر جست پر گندھک کا تیزاب ڈالا جائے۔ تو اس امتزاج کیمیائی سے فوراً حرارت پیدا ہو گی اسی طرح آگ بھی جو ہم چولھے میں جلاتے ہیں عمل کیمیائی کا نتیجہ ہی اور یہ کچھ ناممکن نہیں کہ زمین کے اندرونی حصہ میں اسی قسم کا کوئی عمل کیمیائی جاری ہو۔ ڈیوی نے ایک تجربے سے معلوم کیا کہ اگر سوڈیم یا پوٹاشیم کا ایک ٹکڑا پانی میں ڈال دیا جائے۔ تو عمل کیمیائی پیدا ہو کر زور کی آواز پیدا ہوتی ہی۔ کیونکہ ان دونوں معدنیات کی یہ خاصیت ہے کہ وہ پانی کے جزو آکسیجن کی طرف خاص کشش رکھتی ہیں۔ یعنی اگر ان معدنیات میں سے کسی ایک کا ذرا سا ٹکڑا پانی پر ڈال دیا جائے۔ تو وہ پانی میں سے آکسیجن لینے کے لئے پانی کو اس کے اجزاء اصلیہ میں تحلیل کر کے فوراً آکسیجن گیس سے مل جاتی ہیں۔ اور پانی کا دوسرا جزو ہیڈروجن بیکار ہو جانے کی وجہ سے گیس کی صورت میں نکلنے لگتا ہی۔ ڈیوی کا خیال تھا کہ زمین کے اندرونی حصے میں بھی یہ معدنیات اور اسی قسم کی کئی اور معدنیات موجود ہیں۔ اور پہاڑوں کی آتش فشانی اور زلزلوں کی کرہ جنبانی انہیں کے آثار ہیں۔ اور زمین کے خول میں جو درزیں ہیں وہ بھی انہیں دیو آتشیں کی گزرگاہیں ہیں جن کی راہ سے سمندر کا پانی اندر گھس جاتا ہی۔ اور معدنیات کے ساتھ اس کا سرگرم ملاپ ہوتا ہی۔ اور پھر پہاڑوں کی آتش فشانی اور زلزلوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہی۔ وغیرہ وغیرہ اور اس عمل کیمیائی کی حرارت کی وجہ سے چاروں طرف کی چٹانیں پگھل جاتی ہیں۔ اور لاوا باہر نکلنے لگتا ہی۔

یہ حل اگرچہ بہت دلفریب اور دلکش تھا لیکن مشاہدات اس کے خلاف تھے۔ مثلاً اگر یہ صحیح ہوتا۔ تو سب سے اول پانی کے تجربے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ آتش فشاں پہاڑوں سے ہیڈروجن گیس نکلتا لیکن مشاہدہ صریح اس کے خلاف ہی یعنی ہائیڈروجن خارج نہیں ہوتا ہی۔ ڈیوی کو خود اس توجیہہ پر اطمینان نہ تھا۔ اور بالآخر اسے اس سے دست کش ہونا پڑا۔ لیکن اس نے اپنا یہ خیال قایم رکھا کہ مسئلہ آفرینش میں کسی کیمیائی عمل کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہی۔

چنانچہ اب میدان صرف ہمارے پہلے حل کے ہاتھ رہتا ہی۔ مگر مزید غور و فکر سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ ہمارا نقش اول ابھی بہت کچھ غیر مکمل ہی۔

اور اسے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اور یہ کہ یہ مسئلہ
نہ ایسا آسان ہے۔ اور نہ ایسی آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے +

ٹھوس خول

اندرونی سیال

شکل ۱۲ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات ضرور کھٹکتی ہے۔
کہ نسبتاً زمین کا خول بہت پتلا ہے۔ اور اس قابل معلوم نہیں ہوتا کہ
وہ اتنے آتشیں سیال کے موجزن بخارات کو روک سکے۔ اس خیال
کو اس امر سے اور بھی تقویت ملتی ہے۔ کہ یہ اتنا زیادہ سیال مادہ
صرف اپنی اندرونی کششوں ہی کے زیر اثر نہیں۔ بلکہ مختلف بیرونی
اجسام سے بھی متاثر ہوتا ہے + سب جانتے ہیں کہ سمندر کے مد وجزر
کا سبب سورج اور چاند کی کشش ہے۔ یعنی سورج اور چاند کی کشش ہمارے
کرے پر کام کر رہی ہے جس سے کرۂ زمین کا پانی اٹھتا ہے یہی اصول
اس وقت بھی کام کرے گا جب کہ مادہ سیال بجائے سطح کے اوپر
ہونے کے سطح کے اندر موجود ہو اور اس حالت میں سورج اور چاند کی
کشش کا اثر بھی بہت زیادہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سطح زمین پر سمندر
کی گہرائی صرف تین چار میل ہوتی ہے لیکن اس اندرونی آتشیں سمندر
کی گہرائی تقریباً چار ہزار میل کے قریب ہے۔ اس لئے اگر زمین اس قدر تک
ہی ٹھوس ہے جتنا کہ ہم نے اندازے سے معلوم کیا یعنی بیس یا تیس
میل۔ تو یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ نسبتاً اس قدر پتلا خول مد وجزر کی اتنی
بڑی قوتوں کو سنبھالنے میں عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے غور و
فکر سے سر ولیم ٹامسن نے جو اس مسئلہ سے بے انتہا شغف رکھتے تھے
یہ نتیجہ نکالا کہ ہم زمین کے خول کی موٹائی بہت کم سمجھ رہے ہیں۔ اور اس کا
اس قدر کم ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ بلکہ زمین کو اپنی وضع متناسبہ قائم رکھنے کے
لئے فولاد یا بلور کے کرے کی مانند سخت و کرخت ہونا چاہئے۔ ورنہ بیرونی
قوتیں اس کو تباہ و برباد کر دیں گی + سر ولیم ٹامسن ایک حساب ہندسی سے
اس نتیجے پہنچے کہ زمین میں اترتے وقت ہر پچاس فٹ کے عمق پر تھرمامیٹر
کا ایک ڈگری چڑھ جانا آئندہ اسی رفتار سے قائم نہیں رہ سکتا۔ بلکہ رفتہ
رفتہ زیادہ گہرائی پر جہاں فی الحال ہماری رسائی نہیں ہے۔ یہ بہت کم ہو جائے
گا۔ اور اس طرح انہوں نے اس مقام کو جہاں آتشیں مادہ سیال ہے
بیس تیس میل سے بہت زیادہ عمق پر قرار دیا +
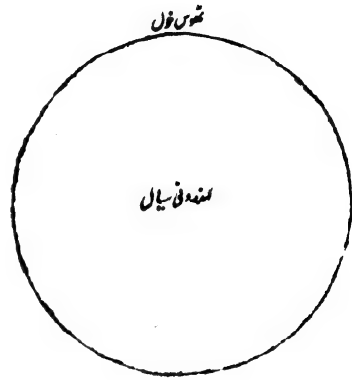
اس سیلان اندرونی کی توجیہ پر ایک اور اعتراض وارد ہوتا ہے +
زمین اگر کسی زمانے میں اپنی سطح تک سیال تھی۔ اور رفتہ رفتہ سرد ہوئی
ہے۔ تو ہم نے یہ کس بنا پر خود بخود فرض کر لیا ہے کہ پہلے اس کا بیرونی حصہ
منجمد ہوا اور پھر رفتہ رفتہ اندرونی جس طرح پانی کے انجماد کی صورت
میں پہلے اس کا باہر کا حصہ برف بنتا ہے۔ اور اس کے بعد رفتہ رفتہ
اندر کی جانب تمام پانی برف بن جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیوں
نہ سمجھیں کہ پہلے مرکز منجمد ہوا اور بعد میں رفتہ رفتہ بیرونی حصہ۔ نہ ہمارے
پاس پہلی توجیہ کی کوئی دلیل ہے۔ نہ دوسری کی۔ اس لئے ہمیں چاہئے
کہ ان دونوں شقوں پر بحث کر کے معلوم کریں کہ کونسی شق کا ہونا زیادہ
قرین قیاس ہے +

ہم سب جانتے ہیں کہ مرکز زمین پر ہر طرف سے کس قدر بے انتہا دباؤ
یا وزن پڑتا ہے۔ اور ہمیں سائنس یہ بھی بتاتا ہے کہ سیال اشیاء کے
انجماد میں دباؤ پڑنے سے درجہ حرارت میں فرق پڑ جایا کرتا ہے مثلاً
ہوا کے معمولی دباؤ میں جو ہر جگہ پانی پر ہے۔ نقطہ انجماد ۳۲ درجہ فارن
ہیٹ ہے۔ لیکن اگر پانی پر کسی قسم کا زائد دباؤ پڑے گا۔ تو ۳۲ درجہ
پر انجماد نہ ہوگا۔ بلکہ درجہ حرارت میں اندازاً ایک یا دو درجہ کی اور
کمی ضروری ہوگی۔ اس کا تجربہ یوں کر سکتے ہیں کہ اگر پچکاری کی نلکی کا
کچھ حصہ پانی سے بطور معمول بھریں۔ اور اس کا منہ بند کر لیں۔ کہ پانی
نکل نہ جائے۔ اور اسی طرح ایک دوسری پچکاری میں اتنا ہی پانی بھر کے
اس کا منہ بھی اسی طرح بند کریں۔ مگر اس پچکاری کی ڈاٹ کو زور سے

نیچے کی طرف دبائیں۔ کہ پانی پر خوب دباؤ پڑے۔ پھر اس ڈاٹ کو کسی ترکیب سے اس طرح باندھ دیں۔ کہ یہ دباؤ قایم رہے۔ اب اگر ان دونوں پچکاریوں کو دودھ کی قلفیوں کی طرح جمائیں۔ اور دیکھتے رہیں کہ تھرمامیٹر کے کس درجہ حرارت پر ان دونوں پچکاریوں کا پانی جمتا ہی تو معلوم ہوگا۔ کہ پہلی پچکاری ۳۲ درجہ پر جم جائے گی۔ مگر دوسری جس کے پانی پر دباؤ ہی ۳۲ پر نہ جمے گی۔ اس کے لئے حرارت کا کچھ اَور کم ہونا ضروری ہوگا۔ وہ شاید ۳۱ یا ۳۰ پر جمے۔ اگر دباؤ اور زیادہ کیا جائے تو ۲۹-۲۸ درجہ پر پانی جمے گا۔ اسی طرح جتنا دباؤ زیادہ ہوگا۔ جمود کے لئے اتنا ہی درجہ حرارت کم کرنا پڑے گا۔ اور بے انتہا دباؤ کی صورت میں درجات حرارت میں بھی بے انتہا کمی کی ضرورت ہوگی۔ اس قسم کے تجربات سے یہ بات ثابت کردی گئی ہی کہ اخیر درجہ حرارت بلکہ صفر درجہ حرارت پر بھی پانی سیال حالت میں رہ سکتا ہی غرض دباؤ کا اثر پانی پر یہ ہوتا ہی۔ کہ جس درجہ پر دباؤ نہ ہونے کی صورت میں پانی منجمد ہوا کرتا ہی۔ اس درجہ پر دباؤ ہونے کی صورت میں وہ سیال رہتا ہی جس کا خلاصہ یہ ہی کہ دباؤ اس کے سیلان میں مدد دیتا ہی +

اب ایک بات اَور سمجھ لو۔ وہ یہ کہ منجمد ہونے کے وقت بعض اشیاء پھیلتی ہیں۔ اور بعض سکڑتی ہیں۔ پانی ان اشیاء میں سے ہی جو منجمد ہو کر پھیلتی ہیں۔ اسی واسطے قلفیاں جمانے والے قلفیوں کو بھرنے کے وقت ذرا اوچھی رکھتے ہیں۔ مگر جم کر وہ خود بھر جاتی ہیں اگر سیال حالت میں ہی انہیں بھر دیں۔ تو جم کر وہ پھٹ جائیں۔ یا ان کے ڈھکنے خود بخود کھل جائیں۔ لیکن اس کے برخلاف بعض اشیاء ایسی ہیں جو منجمد ہونے کے وقت سکڑتی ہیں۔ مثلاً لوہا پگھلا ہوا ہو تو زیادہ جگہ گھیرتا ہی۔ اور ٹھنڈا ہو تو کم اس قسم کی اشیاء میں دباؤ سیلان کو مدد نہیں دیتا۔ بلکہ اُلٹا جمود کو مدد دیتا ہی۔ مثلاً اگر پگھلا ہوا لوہا دو ظرفوں میں ہو اور ان دونوں میں سے ایک پر دباؤ ہو۔ دوسرے پر دباؤ نہ ہو۔ تو ایسی صورتوں میں تجربوں سے ثابت ہوا ہی۔ کہ جس درجہ حرارت پر بے دباؤ سیال کا انجماد ہوگا۔ اس سے زیادہ درجہ پر دباؤ والے سیال کا انجماد ہوگا یعنی یہ اشیاء بوجہ دباؤ کے ایسے بلند درجہ حرارت پر بھی منجمد رہتی ہیں۔ کہ اگر دباؤ نہ ہوتا تو وہ اشیا اس درجہ پر ضرور سیال ہوتیں +

یہ بھی تجربوں سے ثابت ہوا ہی کہ جن اشیاء سے زمین کا خول بنا ہی۔ وہ اشیاء قسم ثانی میں داخل ہیں یعنی منجمد ہونے کے وقت سکڑنے والی ہیں۔ اس لئے ان میں درجہ حرارت کی زیادتی جمود میں مدد دیتی ہے پس اس تمام استدلال سے یہ نتیجہ نکلا۔ کہ چونکہ مرکز زمین پر بے انتہا شدید دباؤ ہی۔ اس لئے اس دباؤ کی وجہ سے وہ اس قدر زیادہ درجہ حرارت پر بھی منجمد ہی رہے گا گو اس کا بیرونی طبق یا خول رقیق و سیال رہے +

علاوہ ازیں۔ اگر کرہ زمین کے سرد ہونے پر سب سے پہلے اس کا بیرونی طبق منجمد ہوتا۔ تو ممکن نہ تھا۔ کہ کرہ مذکور کے گرد مکمل گول منجمد خول بن سکتا۔ کیونکہ جامد چٹانیں سیال مادہ سے زیادہ وزنی ہوتی ہیں۔ اس لئے جب سکڑ کر ٹوٹتیں۔ تو غڑپ سے اس آتشیں سمندر میں گرتیں اور اس کی تہ میں جا بیٹھتیں۔ اور مادہ سیال پھر اوپر آجاتا۔ اس کے بعد از سر نو ایک اور تہ منجمد ہوتی۔ اور وہ بھی سکڑ کر ٹوٹتی۔ اور بطور سابق غرق ہوتی۔ غرض اسی طرح جو حصہ منجمد ہوتا وہ مرکز کی طرف جاتا۔ یہاں تک کہ کرہ کا تمام مادہ سیال منجمد ہو کر ختم ہو جاتا +

سر ولیم طامسن نے مرکز زمین کے سیال ہونے کی نسبت جو اعتراضات کئے وہ ایسے قوی تھے۔ کہ اچھے اچھے سائنس دانوں سے ان کا جواب نہ بن پڑا۔ اور کچھ جواب دئے بھی۔ تو اتنا تو انہیں تسلیم ہی کرنا پڑا۔ کہ مرکز زمین منجمد نہیں، تو قریب الانجماد تو ضرور ہی یعنی وہ اس بات کے قایل ہیں کہ فی الحال مرکز زمین کا مادہ نہ پورا منجمد ہی۔ نہ پورا سیال۔ بلکہ غلیظ لعابی سی حالت میں ہی۔ اور اس کی غلظت اس قدر ہی کہ سورج اور چاند کی کشش اس پر کچھ اثر نہیں رکھتی + اس توجیہ سے وہ اعتراض تو کسی قدر اُٹھ گیا جو مد و جزر تعلق رکھتا تھا لیکن مرکز کا منجمد ہونا اس سے ثابت نہ ہوا۔ بلکہ آتش خیز پہاڑوں کے سیال مادہ کی نسبت بھی تاویلات باردہ کرنی پڑیں مثلاً یہ کہا گیا کہ بعض غاروں میں مقامی اسباب سے آتشی مادہ منجمد نہ ہوا بلکہ بدستور سیال رہا۔ غرض جوف زمین کی کیا کیفیت ہی اس کے متعلق سائنس نے ابھی کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا ہی۔ اور جو کچھ دیا بھی گیا ہی۔ اس میں گو بہت سے امور تجربات کی بنا پر بیان کئے گئے ہیں۔ مگر اصل استدلال میں ظن

وتخمین سے کام لیا گیا ہے۔ اور حقیقت حال کو زمین کا خالق ہی خوب جانتا ہے۔ عاجز انسان کے لئے اس کے اسرار قدرت کی گہرائی تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ حافظ شیراز نے کیا اچھا کہا ہے:-

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا

اندرون زمین کی طبعی حالت کا اس قدر ذکر کرنے کے بعد دوسرا سوال یہ ہے۔ کہ کیا ہمیں اس کی کیمیائی حالت کا بھی کچھ علم ہے۔ زمین کا خول جہاں تک ہمیں علم ہے تقریباً چھیانویں ایسی مفرد اشیاء سے بنا ہے جو عناصر بسیطہ کہلاتی ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں بہت کثیف اور وزنی ہیں۔ مثلاً معدنیات و فلزات وغیرہ۔ اور بعض بعض بہت ہلکی ہیں۔ مثلاً مختلف گیسیں جنہیں معرب کر کے غازات کہتے ہیں ہم بتا چکے ہیں کہ اندرون زمین کا مادہ سطحی مادے سے بہت زیادہ کثیف ہے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ کیا یہ محض وزن اور دباؤ کا نتیجہ ہے کہ اندرونی مادہ زیادہ کثیف ہو گیا۔ یا اندرون زمین میں وزنی معدنیات کی زیادہ مقدار موجود ہونے کو بھی اس میں دخل ہے؟ سر ہمفری ڈیوی کا خیال تھا کہ اندرون زمین میں مخلوط معدنیات کثرت سے موجود ہیں لیکن اس رائے کی تائید میں ہمارے پاس ایسے واقعات نہیں جن میں احتمال شبہ نہ ہو۔ اس لئے اس تحقیق میں ہمیں قیاس پر ہی بھروسہ کرنا پڑے گا +

ہم تاریخ آفرینش زمین کو اس گزشتہ زمانے تک لے گئے ہیں جب یہ کرہ ایک نہایت گرم سیال حالت میں تھا۔ ہم اس سے بھی آگے بڑھ سکتے ہیں یعنی اس زمانے تک جب کہ وہ فضائے آفتاب میں بخار کی مانند تھی۔ ہمیں علم ہے کہ آفتاب جہانتاب کا جسم نہایت ہی بلند درجۂ حرارت پر ہے۔ اس قدر حرارت پر کہ اس میں لوہا۔ چونا۔ مغنیسی وغیرہ معدنیات بخارات کی رقیق صورت میں ہیں۔ یہ اتنا عظیم الشان روشن اور اس قدر گرم جسم نہ معلوم کتنی صدیوں سے ہر سال حرارت کی بیشمار مقدار خارج کر رہا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ گزشتہ زمانوں میں موجودہ حالت سے بہت ہی زیادہ گرم ہوگا۔ اور چونکہ ہمیں یہ

بھی علم ہے کہ حرارت اجسام کو پھیلاتی ہے۔ اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اس زمانے میں سورج اپنی موجودہ جسامت سے کہیں بڑی جسامت رکھتا تھا۔ اور موجودہ جگہ سے بہت زیادہ جگہ کو گھیرتا تھا۔ اتنی بڑی جگہ کو کہ تمام نظام شمسی ہماری دنیا سمیت اس کی بغل میں آجاتا تھا۔ اس حالت میں نظام شمسی بخارات کے ایک بہت بڑے بادل کی مانند ہوگا۔ اور غالباً اس کی وضع ایسی ہی ہوگی جیسے آج تک آسمان پر کہکشاں کی ہے + جوں جوں فضا میں حرارت خارج ہونے سے یہ بادل سرد پڑتا گیا۔ سکڑنے کی وجہ سے اس کے حجم میں کمی آتی گئی۔ اور اس عمل کے دوران میں یہ آتشی کرہ مختلف مراحل پر پھلجھڑی کی طرح اپنے گرد بخارات کے حلقے چھوڑتا رہا۔ یہ حلقے اپنے جذب مرکزی کے اثر سے اس کے گرد پھرنے لگے۔ اور زیادہ سرد ہونے پر سیارے بن گئے۔ چونکہ ان کی جسامت آفتاب سے بہت چھوٹی تھی۔ اس لئے یہ بہت سرد ہوئے۔ اور سیال حالت سے گزر کر موجودہ جامد حالت پر پہنچ گئے۔ آفرینش زمین کے باب میں یہ مذہب "قیاس سدیمی" کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس قیاس کے مطابق تمام نظام شمسی کی آفرینش ایک ابر نما چیز سے ہوئی ہے۔ جسے سدیم کہتے ہیں +

اگرچہ یہ صرف ایک قیاس ہے لیکن اس کی تائید میں بہت سے شواہد ہیں جن سے زمین کی شکل اور اندرونی حرارت وغیرہ کی مکمل طور پر توجیہ ہو جاتی ہے۔ اس قیاس کی صداقت کو تجزیۂ نور سے اور بھی زیادہ تقویت پہنچتی ہے۔ کیونکہ اس سے ہم بآسانی یہ معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ جن عناصر بسیطہ یا اشیائے مفردہ سے زمین بنی ہے وہی اشیاء یا عناصر ساخت آفتاب میں پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ انہیں عناصر سے ستارے بنے ہیں۔ جب یہ مان لیا جائے۔ کہ زمین سورج ہی کا ایک قطعہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ سورج بھی زمین کی طرح رفتہ رفتہ سرد ہو رہا ہے۔ لیکن چونکہ وہ جسامت میں زمین سے بہت بڑا ہے۔ اس لئے یہ عمل تبرید اسی نسبت سے بہت آہستگی کے ساتھ جاری ہے۔ نیز جو کچھ اب جرم آفتاب پر گزر رہا ہے۔ اس سے ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں۔ کہ جب ہماری زمین کے عمل انجماد کی یہی حالت تھی تو اس میں بھی اسی قسم کی کیفیات

پیدا ہوئی ہوں گی ◆

تجزیۂ نور سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا ہو کہ جن اشیائے سے مرکب ہے زمین کا خول مرکب ہے، وہی اشیاء آفتاب کی ساخت میں بشکل بخار موجود ہیں۔ بلکہ اس کی امداد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہو۔ کہ جوں جوں آفتاب سرد ہوتا جاتا ہو یہ اشیا اس میں ایک ترتیب و وضع خاص اختیار کرتی جاتی ہیں۔ چنانچہ سورج کی سطح کو بہ احتیاط معائنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہو کہ اس میں کم وزن عناصر اوپر رہتے ہیں۔ اور وزنی عناصر زیادہ عمق پر ہیں۔ اور وہ مرکز کی قریب جگہ رہے ہیں۔ اگر اور بھی زیادہ احتیاط سے مشاہدہ کرنے پر یہ بات صحیح پائی جائے تو اس سے یہ ثابت یا کم از کم موجب تقویت ہوگا کہ ہماری زمین میں بھی وزنی عناصر اس قدر بالائی خول میں نہیں ہیں جس قدر مرکز کے قریب ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ محض ایک خیالی استدلال ہے۔ اور کسی صورت سے ایک یقینی دلیل متصور نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک ایسے چھپے ڈھکے معاملے میں ذرا ذرا سی معلومات بھی بے حد مفید اور غنیمت ہیں ◆

ہم نے اس تجربہ میں کرۂ زمین کا اصلی ابتدائی حال معلوم کرنے کے لئے گزشتہ دور دراز زمانے تک سُراغ لگانے کی کوشش کی ہو۔ اور بتایا ہو کہ اس نے یہ اندرونی شدید حرارت جس کے نمایاں ثبوت ہمارے پاس ہیں کہاں سے حاصل کی۔ ہم نے یہ بھی دکھا دیا ہو کہ اس کی تبرید اس درجے تک پہنچ گئی ہو کہ اب اس کا اندرونی حصہ اغلباً مرکز پر منجمد ہو چکا ہو یا اگر ابھی نہیں ہوا تو وہاں ایک نیم سیال غلیظ مادہ موجود ہو۔ اور بعض وسیع غاروں میں اب تک وہی سیال مادہ الغاروں بھرا پڑا ہو۔ جو کبھی کبھی اپنی بیرونی سطح کو توڑ پھوڑ کر باہر ابل پڑتا ہو۔ ہم نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہو کہ اندرون زمین کی ترکیب میں ایسے عناصر کا موجود ہونا ممکن ہو جو ایک دوسرے پر عمل کیمیائی کر کے حرارت مشتعل کر دیتے ہوں۔ اور مختلف مقامات پر درجہ حرارت کا بے حد بڑھ جانا یا زلازل کا آنا اسی وجہ سے ہو ◆

یہ کہا جا سکتا ہو کہ ہم نے جو تصویر کھینچی ہو۔ وہ نہایت مبہم اور غیر واضح ہو۔ اور چونکہ اس کی تکمیل کی ابھی بہت ہی کم اُمید ہو۔ اس لئے یہ محض بیکار ہو۔ لیکن نہیں ایسا نہیں۔ سر ویلیم طامسن نے حساب ہندسی سے اس زمانے کا اندازہ لگایا ہو جس سے پیشتر روئے زمین پر زندگی کا کوئی نشان نہ تھا اور سائنس کی مزید تحقیقات اغلباً اُس زمانے کا عنقریب صحیح فیصلہ کر سکے گی ◆ اس فیصلے کا اثر مسئلہ ارتقا اور اصل انواع پر نہایت صریح ہوگا۔ کیونکہ ان مسائل کے ثبوت کے لئے بھی تقریباً ایک لا محدود زمانے کی ضرورت ہو ◆ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اب سے چند سال پہلے یہ بالکل ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ اس دنیا کے لوگ کبھی یہ بھی دریافت کر سکیں گے۔ کہ چاند اور سورج کن اجزا سے مرکب ہیں لیکن اب ہم نہ صرف ان کا علم رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ فضائے سیارگان کا درجہ حرارت کیا ہو اور ہم پر ہوا کا دباؤ کتنا۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نت نئی ایجادات کے نور سے جہان سائنس روشن اور منور ہو رہا ہو۔ تو کیا عجب کہ ہم کسی روز ایک ایسا آلہ بنالیں جیسا مریضوں کا سینہ دیکھنے کا ہوتا ہو۔ اور اس آلہ مسماع الارض کو سینۂ زمین پر رکھ کر اس کے مرکز تک کی آوازیں سُن لیا کریں۔ اور اس کے عمق و اندرونی افعال کا حال معلوم کر لیا کریں ◆

سیّد امتیاز علی تاج

رگ

دور پہاڑی کے نیچے آفتاب دم توڑ رہا ہو۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ایک پُرحسرت سُرخی چھا رہی ہو۔ اور نیچے سمندر کی تمام لہریں ایک اضطراب سے بہہ رہی ہیں۔ وہ سامنے اُس مقبرے کے گنبد پر بیٹھی ہوئی چیل نوحۂ روز رفتہ چلا رہی ہو۔ اُس کی آواز مضراب بن کر میرے تارِ حیات سے ایک صدائے غم بلند کرنا چاہتی ہو۔ مگر وہ آواز میرے ہی دل کے بیقرار عمق میں ڈوب جاتی ہو اور میری یہ خواہش شدت پر آجاتی ہو۔ کہ میں تجھے پالیتا" ◆

تاج

سر رابندرو ناتھ ٹیگور

ٹیگور عہد حاضر کا وہ مطرب خوشنوا ہے جس کے گیت بحر اوقیانوس کا مادہ پرست ساحل خلیج بنگالہ کی روحانی موجوں سے سن رہا ہے جس کے لطیف و نازک نغمے کہسار ہمالہ کی سر بفلک چوٹیوں سے ٹکرا ٹکرا کر تمام جہان کو محو ترنم کر رہے ہیں۔ جس کی درد بھری آواز امواج گنگا کی موسیقی سے ہم آہنگ ہو کر ہندوستان کے مردہ جسم اور سست رگوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا رہی ہے۔ وہ آسمان ہند کا ایک ایسا روشن ستارہ ہے جس کی سہانی اور شیریں روشنی ہر ہندوستانی دل کو منور کر کے آج زیادہ تیزی سے دھڑکا رہی ہے۔ اس کی تمام تصانیف مادر وطن کی محبت کا ایک پر جوش اور سرگرم اظہار ہیں۔ اس کے گیت اس دل کے عمق سے نکلتے ہیں جو پروانہ وار شمع وطن پر قربان ہونا چاہتا ہے جس سے مادر وطن کی محبت و الفت کے چشمے ابل رہے ہیں۔ اسے ہندوستان سے عشق ہے۔ اس کی انشا پردازی میں خالص ہندوستانی رنگ اور ہندوستانی نقطۂ نگاہ مہندی کی طرح رچا ہوا ہے۔ لیکن وہ صرف زمانۂ ماضی کا قصیدہ خواں ہی نہیں بلکہ زمانۂ حال کی ترقی کی جانب سے بھی بیدار اور موجودہ تہذیب و تمدن کی ضرورتوں سے بھی واقف ہے۔ اس کی تصانیف وقتی نہیں جو رفتہ رفتہ فراموشی کی تاریکی میں پوشیدہ ہو جائیں گی۔ بلکہ وہ اس کی زندۂ جاوید یادگاریں ہیں۔ جو آیندہ نسلوں کے دل بھی مادر وطن کی الفت و عظمت سے لبریز کرتی رہیں گی۔ ٹیگور کی تصانیف صرف قومی حیثیت ہی سے قابل قدر نہیں۔ بلکہ ادبی حیثیت سے بھی وہ بے مثل و بے نظیر مانی گئی ہیں۔ اس کی انشا ایک ایسی روح کی درد بھری التجا ہے۔ جو خدا سے لو لگائے بیٹھی ہو۔ اس کی تمام تصانیف اس روحانیت سے لبریز ہیں۔ جن پر آج صرف مشرق ہی بجا فخر و ناز کر سکتا ہے اس کی تمام خوشیاں خدا کے تعلق میں مضمر ہیں۔ اور اس کے مجموعوں میں ایک نہایت عمیق غور و فکر معرفت پایا جاتا ہے۔ اس کے گیت حسن اور زندگی کی برکات کی طرف دنیا والوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کے مختصر افسانے پڑھنے والوں کو مسحور کر لیتے ہیں۔ اور تمام ادبی دلفریبیوں کی تہ میں اس کے عمیق مقاصد کی ندی رقصاں ہوتی ہے جو غیر محسوس طور پر پڑھنے والوں کے دلوں میں اپنا راستہ بنا لیتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے اس میں اس کی بے مثل خداداد قابلیت کے علاوہ ایک روحانی نور کی شرکت بھی صاف صاف نظر آتی ہے۔ رابندرو ناتھ ٹیگور نہ صرف ایک رشی بلکہ عہد حاضر کا سب سے بڑا شاعر فلسفی۔ قدامت شناس۔ موسیقی داں اور خادم مذہب ہے۔ اور درحقیقت بیسویں صدی کی ایک عظیم الشان ہستی ہے۔

مختصر حالات زندگی

سر رابندرو ناتھ ٹیگور سنہ ۱۸۶۱ء میں کلکتے میں پیدا ہوئے۔ آپ مہارشی دیبندرو ناتھ ٹیگور کے فرزند ہیں جو برہمو سماج کے قایم کرنے والوں میں سے تھے۔ اور اپنی صداقت۔ سادگی اور حب وطن کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ ٹیگور مہارشی کے سب سے چھوٹے فرزند ہیں۔ بچپن ہی سے آپ مادر فطرت کی پیاری آغوش میں پلے اور پروان چڑھے۔ ان کے تعلیمی ایام کچھ خوشگوار نہ تھے۔ کیونکہ آپ کی حساس شاعرانہ طبیعت کو موجودہ طریقہ تعلیم ونا نہ بھاتا تھا جس میں روحانیت۔ محبت۔ مسرت سب کچھ مفقود ہے۔ اور جس کو حقیقی زندگی اور مستقبل کی ضروریات سے کچھ تعلق نہیں۔

سفر ہمالہ میں آپ کے والد انہیں اپنے ہمراہ لے گئے۔ اور ان کی زندگی کا یہ عرصہ خوشی اور مسرت کا زمانہ تھا۔ ودیا پتی اور چنڈی داس کے گیتوں نے ان کی فطری قابلیت کی چنگاریوں کو بھڑکا دیا۔ اور ان کی ادبی زندگی کا زمانہ اوائل عمر ہی سے شروع ہو گیا۔ سندھیا سنگیت (غروب آفتاب کے گیت) اور پربھات سنگیت (طلوع آفتاب کے گیت) میں انہوں نے دو بے مثل عشقیہ نظمیں لکھیں۔ اور ابھی آپ کی عمر ۱۴ سال کی تھی کہ آپ نے "طلوع و الیک" جیسی نظم تصنیف کی۔ آپ مختلف رسایل خصوصاً بھارتی کے لئے جو آپ کے خاندان کا رسالہ تھا اور جس کی وہ

ایڈیٹر آپ کی ہمشیرہ شریمتی سورنا کماری دیوی ہیں مضامین لکھتے رہتے تھے + سترہ سال کی عمر میں آپ انگلستان بھیجے گئے۔ اور کچھ عرصہ یونیورسٹی کالج میں تعلیم پاتے رہے۔ ایک سال کے بعد آپ ہندوستان واپس آتے۔ اور پھر دوبارہ قانون کی تعلیم پانے کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ قانون سے آپ کی طبیعت کو مناسبت نہ ہوئی۔ اس لئے آپ پھر ہندوستان آگئے۔ اس کے بعد وہ زمانہ شروع ہوا جب آپ کی نظموں۔ افسانوں۔ ڈراموں۔ بھجنوں اور مضامین کا سلسلہ ایک ندی کی طرح چل پڑا تیس سال کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی اور شادی کے بعد مہارشی نے آپ کو جائداد کا انتظام کرنے کی غرض سے دیہات میں جانے کو کہا اگرچہ شروع میں آپ نے اس زبردستی کی تنہائی کو ناپسند کیا۔ مگر بہت جلد تنہائی کے غور و فکر اپنے دل کی محبت اور بنگال کی دیہاتی زندگی نے ان کی قابلیتوں میں چار چاند لگا دئے۔ یہاں بھی آپ نے چند ڈرامے تصنیف کئے۔ جن میں سے "چترانگدا" "وسائیاں" اور رانی کا ماجہ" قابل ذکر ہیں۔ اپنی عمر کے تنتیسویں سال آپ بنگالی زبان کے بینظیر و بے مثل شاعر بن گئے۔ دیہاتی زندگی میں آپ نے سترہ برس بسر کئے۔ اس کے بعد آپ کی اہلیہ۔ آپ کی صاحبزادی اور آپ کے چھوٹے صاحبزادے کا انتقال ہو گیا۔ ان صدمات نے آپ کی طبیعت کو اور بھی رقیق بنا دیا۔ اور آپ کی انشا میں روحانی رنگت بہت نمایاں ہو گیا۔ چنانچہ وہ یہی زمانہ تھا کہ گیتانجلی جیسی لبریز معنویت تصنیف شائع ہوئی + اس کے بعد آپ کچھ صحت کے خیال سے اور کچھ اس ارادے سے کہ اپنے فرزند کے زمانہ طالب علمی میں اس کی نگہداشت کریں۔ انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے اپنی مشہور و معروف نظموں کی کتابیں گیتانجلی۔ باغبان اور ہلال مرتب کر کے شائع کیں +

آپ نے انگلستان اور امریکہ میں متعدد لکچر دیئے۔ جن کا مجموعہ سادھانا کے نام سے شائع ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں آپ کو نوبل پرائز ملا مگر آپ نے یہ ۸۰۰۰ پونڈ کا تمام انعام اپنے بولپور اسکول کے لئے وقف کر دیا۔ سنہ ۱۹۱۳ء کے دسمبر میں کلکتہ یونیورسٹی نے آپ کو "علامہ ادب" کا خطاب دیا۔ اور آپ نائٹ بنائے گئے۔ اس کے بعد آپ جاپان اور امریکہ کے ایک عظیم الشان سفر پر روانہ ہوئے اور یہ ارادہ کیا کہ لکچروں کے ذریعے جو کچھ بھی آمدنی ہو + اسے اپنے اسکول کے لئے وقف کر دیں آپ نے ایک مدرسہ "آرٹ ہاؤس" کے نام سے جاری کیا ہے جس میں مختلف علوم و فنون اور صنعتوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور آپ کا دوسرا مدرسہ "بولپور" اسکول بنگال تو کیا ہندوستان میں نظیر نہیں رکھتا آپ کی تصانیف میں سے گیتانجلی۔ باغبان۔ تحفہ عاشق۔ ہلال۔ حجرہ تاریک کا بادشاہ۔ ڈاکخانہ۔ چترا۔ سادھانا۔ کبیر کی ایک سو نظمیں۔ بنگالی زندگی کے مناظر۔ ثمر چینی۔ بھوکے پتھر و دیگر افسانے ساتھی و دیگر افسانے۔ اور قربانی و دیگر ڈرامے انگریزی زبان میں کتاب کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں اور بہت سے مضامین نظم و نثر رسالہ ماڈرن ریویو میں شائع ہوئے ہیں جو ابھی کتاب کی صورت میں مرتب نہیں ہوئے +

شخصیت

سر رابندرناتھ ٹیگور کی شکل و صورت نہایت دل نشین ہے۔ آپ کے بال لمبے لمبے ہیں۔ آپ کی پیشانی کشادہ اور بلا شکن ہے۔ آنکھیں چمکدار سیاہ اور مقناطیسی قوت رکھتی ہیں۔ ناک پتلی اور استادہ ہے۔ آپ کی آواز شیریں ہاتھ نازک و حساس اور تبسم نہایت خوشگوار ہے + آپ اپنی خوش طبعی۔ زندہ دلی اور وسیع معلومات کی وجہ سے ایک نہایت ساحرانہ ہستی ہیں۔ آپ نہایت نرم دل اور ہمدرد طبیعت رکھتے ہیں اور جس کسی کو آپ سے حصول نیاز کا فخر حاصل ہوتا ہے۔ اس کے دل میں اپنی محبت اور الفت کے چراغ روشن کر دیتے ہیں۔ آپ کو تیرنے اور کشتی کھینے کا بہت شوق ہے لیکن آپ کی مخصوص خوشی اور دلچسپی لکھنے سے ہے۔ اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ آپ علی الصباح سے رات تک برابر لکھتے رہے۔ اور درمیان میں صرف گھنٹے آدھ گھنٹے کو کھانا کھانے کے لئے یہ سلسلہ منقطع کیا۔ فطرت و قدرت الٰہی سے آپ کا عشق آپ کی زندگی کا سب سے بڑا جذبہ ہے۔ چنانچہ یہی خصوصیت اور یہی عمیق مذہبیت ہے۔ جو آپ کی طبیعت میں رقت و حلاوت پیدا کرتی اور کشش کا عالم

میں آپکے تخیلات و تصورات کو منور بناتی ہے

آپ مالک اراضی بھی ہیں۔ اور اس حیثیت میں بھی قابل تقلید طرز عمل کا نمونہ ہیں۔ آپ کو اپنے مزارعوں سے حد درجہ کی ہمدردی ہے جب کبھی وہ لگان ادا نہیں کرسکتے تو آپ نہایت فراخ دلی سے ان کی امداد کرتے ہیں۔ اور اپنے مزارعوں کی ترقی و بہبودی کی غرض سے اپنے علاقے میں ایک زراعتی بنک بھی کھول رکھا ہے +

اپنے بولپور کے مدرسہ میں آپ طالبعلموں کے ساتھ نہایت گھل مل کر رہتے ہیں۔ بچہ بچہ آپ کا دوست ہے، اور آپ سے محبت رکھتا ہے۔ آپ نے ملک کی ترقی و بہبودی میں معتد بہ حصہ لیا ہے ۱۹۰۸ء میں آپ ہی بنگال پراونشل کانفرنس کے پریزیڈنٹ تھے +

آپ کی اخلاقی قوت اور جذبۂ قومی کا جوش اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کچھ عرصہ ہوا آپ سے درخواست کی گئی تھی کہ کنیڈا میں آکر لکچر دیں۔ مگر آپ نے صرف اس وجہ سے درخواست نامنظور کی کہ کنیڈا نے ہندوستانیوں سے نہایت نامناسب اور غیر ہمدردانہ سلوک کیا ہے +

آپ کا ہر خیال ہر لفظ اور ہر کام خدمت ملکی و حب وطنی کے جوش کا نتیجہ ہے۔ آپکے متعلق کسی نے خوب کہا کہ "وہ ایک رشی ہے۔ جو رشی ہونے کی وجہ سے ڈرتا نہیں جو دنیا کی معمولی سی معمولی اور ادنیٰ چیز میں حصہ لینے کی جرأت رکھتا ہے۔ اور وہ ایسا شاعر ہے جو عالم سفلی سے جس قدر قریب ہوتا جاتا ہے اسی قدر عالم علوی سے اس کا قرب بڑھتا جاتا ہے" +

خصوصیات

اس مختصر تحریر میں ٹیگور کے دل و دماغ اور آرٹ کے حسن علوی کا مکمل بیان ناممکن ہے بہر حال ہم اس کی طباعی کی چند نمایاں خصوصیات بیان کریں گے جن سے ان کی خداداد ذہانت کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے +

اس کا بنگالی انداز ترنم کی خوبیوں اور اختراعات اوزان کے جواہر بے بہا سے پر ہے۔ اور وہ اپنی تحریروں میں ایسی ناقابل بیان لطافتوں کے چھینٹے دے دیتا ہے۔ مگر ان کا اصلی رنگ ترجمہ کے بعد بحال رہنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے + اس نے ہندوستانی زبانوں کی وسعت اور قابلیت ادائے بیان سے دنیا کی آنکھیں خیرہ کردی ہیں۔ اور دوسری اقوام کے دلوں پر اپنی مادری زبان کے وقار و احترام کا سکہ بٹھا دیا ہے۔ اس کے انداز تحریر میں بے ساختگی۔ تازگی۔ سادگی۔ روحانی اشارات بے تکلف محاورات اور غنا کی قوت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور یہ تمام خوبیاں مل کر اسے ایک بے مثال شاعر بناتی ہیں۔ اس کی تصنیفات تصوف کی جان ہیں وہ ہر شے کے روحانی اثر کو دیکھتا ہے۔ اور اسے ہر شے میں نور خدا الفت و مسرت کی ضیا پاشی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس میں معمولی سے معمولی شے کے احساس و اظہار کی بے مثل قوت ہے۔ اس کے متعلق ایک قابل توجہ بات اس کے اپنے جذبات عالیہ ہیں۔ اگرچہ ہر شخص کے جذبات جدا ہیں لیکن ان میں ایک عنصر مشترک بھی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ شاعر ایک بہترین اور مکمل سعی اظہار میں تمام دنیا کے دلوں کا حال بیان کر جاتے ہیں۔ ٹیگور کی جذباتی شاعری اپنے حسن و شیرینی میں مختلف الانواع ہے۔ اس کا جذبۂ عشق جو "نصف فرشتہ ہے اور نصف پرند" روحانیت کے صاف آسمان پر اڑتا ہے۔ اور زمین و آسمان نیچر اور خدا۔ دنیا اور دنیا سے اس پار کا نظارۂ حسن دیکھتا ہے مسٹر بسینٹ کمار رائے لکھتے ہیں:۔

"محبت اس کے دل و دماغ سے ایک ندی کی مانند مسلسل بہتی ہے اور اپنی پیچیدہ راہوں میں مختلف صورتیں اختیار کرتی ہے۔ مثلاً مادیت سے روحانیت معلوم سے مجہول اور محدود سے غیر محدود تک + وہ محبت کو اس کی تمام مختلف صورتوں (مثلاً ماں۔ بیٹے۔ شوہر۔ زوجہ عاشق معشوق۔ محب وطن۔ محو فطرت اور دیوانگان خدا) میں بیان کرتا ہے۔ اس کی وہ نظمیں جن میں فطرت کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے فطرت کی دلفریبی اور اس کے روحانی اثر کو انسان کی روح کے ساتھ واصل کردیتی ہیں۔ حب وطن کے متعلق اس کی نظمیں ہماری روحوں کو سطح دنیا سے بلند لے جاتی ہیں اور ہمارے دل میں خدمت وطن کا تازہ جوش بھر دیتی ہیں۔ ہماری آنکھوں میں ہمدردی کے آنسو امنڈ آتے ہیں۔ اور ہمارے مغز استخواں تک ایک لرزشِ روحانی دوڑ جاتی ہے" +

شوق عبادت الٰہی کے متعلق اس کی نظمیں ہماری روحوں کو خدا کی غیر محدود محبت کے آسمان پر پہنچا دیتی ہیں۔ اس کی نظم کا رنگ اس کے

ڈراموں اور افسانوں میں بھی موجود ہی۔ اس کے ملکہ تصوف اور خداداد قوت شعری کے علاوہ اس کی سادگی اور روانی کا ہمہ گیر اثر بھی قابل توجہ ہی جیسا کہ مسٹر انڈریو کہتے ہیں۔ کہ "رابندر شیکسپیر کی طرح بہت سی مختلف راہوں سے اپنا ہمہ گیر اثر پیدا نہیں کرتا بلکہ اس امر میں وہ صرف سادگی کا ممنون ہے"۔

رابندر کی نظمیں کیا ہیں؟ نہایت سادہ انسانی جذبات بچوں اور معصوموں کے سے پاک خیالات۔ سادہ ترین معاشرتی غم و مسرت اور خدا کی طرف روح کی خالص اور سادہ ترین آرزوئیں ہیں +

اس کی انگریزی نثر بھی بیحد تعریف و ثنا کی مستحق ہی۔ اس نے دکھا دیا ہے کہ انگریزی زبان میں بھی اظہار خیالات کی بہت سی قوتیں پوشیدہ ہیں اس نے انگریزی زبان کی سختی و کرختگی میں اپنے لطیف و شیریں خیالات سے ایک لوچ پیدا کر دیا ہی۔ انگریزی نقاد اس کی نثر کو "نثر انگریزی کا پھول" کہتے ہیں اور حقیقت میں اس نے مشرقی جیتا ہوا دوپٹہ عروس مغرب کو پہنا کر اس کے حسن میں سیکڑوں دلفریبیاں پیدا کر دی ہیں +

علاوہ ازیں ٹیگور کا کلام سرتاپا قومی ہی۔ اس میں قومی جذبات اس کثرت سے ہیں کہ وہ محبان سرزمین ہند کے لئے بمنزلہ کتاب مقدس کے ہی اور ہمیشہ رہے گا +

ٹیگور کی نظمیں

آپ کی تمام مشہور و معروف نظموں میں ہلال سب سے پیشتر قابل ذکر ہی۔ ان نظموں میں آپ نے ایک جدید خوشگوار طریق سے بچے کے دل اور روح کی عقدہ کشائی کی ہی + اس کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہی کہ بچے کی فطرت کیسی علوی سادگی اور روحانی شیرینی سے لبریز ہی۔ اور قدرت کا یہ عطیہ ہمارے لئے مسرت آسمانی کا سرچشمہ ہی + اس کتاب میں بچوں کی دل کشی و معصومی۔ ان کی سادہ خوشی حسین اشیا میں ان کی عمیق دلچسپی۔ اطفال کے پرلطف تخیل کا نہایت بے تکلفانہ انداز سے اظہار کیا گیا ہی۔ یہ نظمیں ہمیں سکھاتی ہیں کہ بچوں کے ذریعے کیونکر ہماری زندگی میں خدائی عنصر زندہ رہتا ہی اور کس طرح ان کی وجہ سے عالم سفلی کا تعلق عالم علوی سے قائم ہے +

ٹیگور کی نظم "باغبان" عشق کے دیگر اقسام کے متعلق ہی اور اس میں نہایت بیمثال عشقیہ غزلیں، قابل تعریف جذبات فطرت اور بلند متصوفانہ نظمیں ہیں اس کتاب میں مناظر فطرت کا نہایت دلکش اور شاعرانہ بیان ہی۔ اور اس کی نفاست تحریر اور متصوفانہ نظموں کا صاف و شفاف تصور حیرت انگیز ہی +

ٹیگور کی دیگر بیشمار مختلف نظمیں جن کا فی الحال انگریزی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا ان ہی کمیاب خوبیوں سے لبریز ہیں۔ یہ ٹیگور اور کبیر صاحب کے دل کے تاثرات کی موافقت و یکسانیت کا نتیجہ ہی کہ ٹیگور نے ان کی ایک سو نظموں کا ترجمہ کیا +

اب ہم آخر میں گیتانجلی کا ذکر کرتے ہیں۔ جو سب سے پیشتر انگریزی زبان میں ترجمہ ہوئی۔ اور جس نے تمام دنیا کو ٹیگور کی طباعی کا قائل کر کے سب کی نظریں ہندوستان کے اس قابل فرزند کی جانب متوجہ کر دیں۔ ٹیگور کی تمام گوناگون خوبیاں اس کتاب میں شباب پر ہیں۔ یہ کتاب ایک کان ہی جو متصوفانہ نظموں کے ہیروں سے مالا مال ہی۔ اس کتاب کو ٹیگور نے خود انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہی۔ اور یہ ترجمہ ظاہر کرتا ہی کہ جو شخص ایک زبان کا ماہر اور اس میں قادر الکلام ہو۔ وہ دوسری زبان سے جذبات اور طریق اظہار لے لینے میں کیونکر تطابق رکھ سکتا ہی۔ چنانچہ زبانوں کے اختلاف کے باوجود دونوں کتابیں اظہار خیالات میں بالکل ہم آہنگ ہیں +

گیتانجلی کی خصوصیت یہ ہی کہ وہ حیات انسانی کا تعلق خدا سے یہاں تک قایم کرتی ہی کہ حیات انسانی نور الٰہی میں تبدیل ہو جاتی ہی۔ اسے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہی کہ تمام دنیا ایک روح کی صورت میں ہم سے بیحد قریب ہو گئی ہی۔ بعد جوں جوں اسے پڑھتے جاؤ دل الفت اور سکون کے ایک نئے جذبے سے لبریز ہوتا جاتا ہی۔ مسٹر ییٹس گیتانجلی کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستانی تہذیب و تمدن کی مانند ٹیگور بھی اس بات پر قانع ہی کہ معرفت روح حاصل کر کے اپنے آپ کو بطریق رضا و تسلیم اس کے سپرد کر دے" + ٹیگور کی "ترجینی" گیتانجلی کا بقیہ ہی اس میں بھی نہایت پیاری متصوفانہ نظمیں ہیں۔ اور بیمثل خصوصیت یہ ہی کہ یہ ہندوستان کے مشاہیر اور مہاتماؤں کی زندگی کے بڑے بڑے واقعات میں سے حسن و احساسات روحانی کے عظیم الشان نتائج اور جدید عناصر پیش کرتی ہی + غرضکہ ٹیگور کی تمام نظمیں عموماً اور گیتانجلی خصوصاً حقیقی حسن و پاکبازی سے معمور ہیں۔ وہ پڑھنے والے کو تخیلات و احساسات کی ایک ایسی بلند دنیا پر لے جاتی ہیں۔ جہاں موسیقی چاند کی روشنی اور احساسات سب ایک ہی چیز ہیں +

ڈرامے

جذبات فطرت کے بیان کرنے میں ٹیگور کی طباعی کی کچھ حد نہیں چنانچہ

اس کے ڈرامے پڑھنے والے کے جذبات پر نہایت گہرا اثر ڈالتے ہیں ایسے ڈرامے عام مغربی طرز کے ڈرامے نہیں جو واقعات اور پیچیدگیوں کی پوٹ ہوتے ہیں۔ بلکہ نہایت سادہ ہیں۔ اور ان میں افسانے کا عنصر محض اثرات مرتب کرنے کا ذریعہ ہی اور اس سے کوئی خاص نتیجہ مطلوب نہیں ٹیگور کے مضمون کا مقصد دنیا کی خوشیوں کی برکتیں۔ زندگی کے فرائض اور بہر خیر کار حاوی اثر بیان کرنا ہی۔ آپ کی سب سے پہلی تصنیف والمیکی پرایتبھا ہی۔ اس میں آپ بیان کرتے ہیں کہ جب والمیکی کو روحانی زندگی اور اس کی اصلاح حاصل ہوئی تو اس سے کس طرح اس کو تحریک شاعری ملی اور ملکہ ترنم حاصل ہوا۔ پراکرتی پرایتودھ میں ٹیگور علم پر عشق و محبت کی فضیلت و فوقیت ظاہر کرتا ہی +

اچالتیاں میں اس مسئلے پر بحث ہی کہ اگر تیاگ آشرموں کا تعلق بیرونی دنیا سے نہ رہی۔ تو ان کی پاکیزگی میں تنزل آجاتا ہی اور یہ بیرونی دنیا کا ہی اثر ہی جو ان کو پاک و صاف رکھتا اور ان کی اصلاح کرتا ہی +

چترا میں مہابھارت کا ایک افسانہ ہی۔ اور ٹیگور کے آرٹ کے حسن و نزاکت کا ایک روشن ثبوت ہی اس میں بتایا گیا ہی کہ عشق کی بنا خواہ حسن ظاہری ہی کی کشش ہو لیکن اس کی تعمیر و رفعت دلوں کے ارتباط اور طبائع کی یکسانیت سے ہوتی ہی۔ اور یہی اتحاد ہی جو وصال ارواح کا باعث ہوتا ہی +

کتاب "پوسٹ آفس" میں زندگی موت اور روحانی زندگی کے مباحث نہایت لطافت سے بیان کئے گئے ہیں +

"حجرۂ تاریک کا بادشاہ" میں اس نے ظاہر کیا ہی کہ انسانی روح خدا کی تلاش میں کامیاب ہو سکتی ہی "پھالگونی" میں روح کے غیر فانی ہونے کا مسئلہ نظم کے زمزمہ ساحرانہ میں ادا کیا گیا ہی

افسانے

ہندوستان زمانۂ قدیم سے دنیا کا بہترین قصہ گو ملک ہی اور ہندوستان کے افسانوں کو تہذیب و تمدن کے جھنڈے دور دراز ممالک میں پہنچا چکے ہیں اور سیکڑوں جگہ اس کے بیج پھلے پھولے ہیں + ہندوستان میں اب تک افسانہ گوئی کا فن باقی ہی۔ اور روز بروز زیادہ مکمل ہوتا ہی ٹیگور کے آرٹ میں گزشتہ خصوصیات اب پھر شگفتہ دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے افسانے حقیقی اور خیالی زندگی کے مجموعے ہیں۔ وہ دنیا کی ادنیٰ سے ادنیٰ معاشرت میں بھی اس ہستی لم یزل کے نشان کی موجودگی کا اظہار کرتے ہیں ایسے افسانے پڑھنے سے انسان محسوس کرتا ہی کہ وہ ایک سنیتی کی مانند دھا

کے ساکن و خاموش سمندر پر تیر رہا ہی۔ یا اپنے کسی ہمدرد و رفیق دل کے ساتھ ویرانۂ عالم سے گزر کر ایک پہاڑ پر چڑھ گیا ہی۔ اور اس کی دوسری جانب روحانیت کے وسیع پرستان کے مناظر کی سیر کر رہا ہی + ہندوستانی معاشرت کی نہایت سادہ اور ہمہ گیر خصوصیات اس کی تصنیفات میں منعکس ہوتی ہیں + نہایت نازک اور صحیح جذبات کا بیان اس کے افسانوں کا خصوصی حسن ہی + اس کی یہ خصوصیت اگرچہ مختصر افسانوں میں نہایت کامیاب ہوئی ہی۔ مگر بڑے ناولوں میں یہ بات پیدا نہیں ہو سکی

سادھانا

یہ کتاب ٹیگور کی نہایت عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہی۔ اور اس میں زندگی کے مسائل کے متعلق ٹیگور کے پختہ خیالات درج ہیں۔ پہلی بحث میں وہ یہ بتاتا ہی۔ کہ ہندوستان کی تہذیب میں جو ایک سکون و موسیقیت پائی جاتی ہی اس کی وجہ یہ ہی کہ یہ شہروں میں نہیں بلکہ جنگلوں میں پروان چڑھی ہی۔ دوسری بحث میں روح کی بیداری پر بحث کرتا ہی تیسری بحث برائیوں کے متعلق ہی اور چوتھی میں خود انسان کی ہستی پر بحث ہی۔ کہ انسان کا بڑے سے بڑا فرض اور عالی سے عالی احساس توحید پر مبنی ہی آخری چار بحث معرفت کے متعلق ہیں۔ ان میں علم کی معرفت فرائض کی معرفت حسن کی معرفت اور ذات غیر محدود کی معرفت پر بحثیں ہیں ٹیگور کی تعلیم کا لب لباب یہ ہی کہ انسان کی مستقل خوشی کسی چیز کے حاصل کر لینے میں نہیں بلکہ اپنے آپ کو اپنے سے بڑی اور بہتر چیز کو سونپ دینے میں ہی مثلاً انسان اپنے آپ کو ان خیالات کے سپرد کر دے جو اس کی اپنی زندگی سے بڑے ہوں۔ اس میں اپنے ملک کے خیالات بنی نوع انسان کے خیالات۔ اور اپنے خدا کے خیالات سب شامل کئے جا سکتے ہیں ٹیگور نے دیگر مختلف موضوعات مثلاً تاریخ۔ تمدن معاشرت پر بھی کثرت سے مضامین لکھے گئے ہیں۔ جو اکثر رسائل خصوصاً ماڈرن ریویو میں چھپتے رہے ہیں۔ ماڈرن ریویو کلکتہ نے ٹیگور کے خطوط کو بھی شائع کیا ہی گزشتہ سال آپ کا ایک قصہ "گھر اور گھر سے باہر" مسلسل کئی ماہ اسی رسالے میں شائع ہوتا رہا ہی +

سید امتیاز علی تاج

کیوپڈ اور سائکی

"کیوپڈ اور سائکی" ایک دل آویز مختصر رسالہ کا نام ہی جو حضرت نیاز فتحپوری کے قلم جادو طراز سے جلوہ گر ہوا ہر چند سنہ ۱۹۱۸ء میں اس کی اشاعت ہمدم پریس سے ہوئی اور اب ایک سال کے بعد اس کی تنقید بعض طبائع کو بے وقت معلوم ہو لیکن جس صنف لٹریچر پر حضرت نیاز نے قلم اُٹھایا ہی اس کی تر و تازگی پر امتداد زمانہ موثر نہیں ہو سکتا۔ یہ صنعت بھی اس لٹریچر کی پائداری و دوام کی بہترین دلیل ہی +

سرورق کے دوسرے صفحہ پر جیسا کہ ظاہر کیا گیا ہی۔ یہ رسالہ سنہ ۱۹۱۶ء میں لکھا گیا۔ سید جالب نے اس کا حق تصنیف ہمدرد کے زمانہ ادارت میں حاصل کیا۔ لیکن ہمدرد پر محتسب کے قایم ہو جانے اور بعد میں مسٹر محمد علی کے نظر بند کئے جانے سے اس رسالے کے مطبع میں پہنچنے اور شائع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ آخر جب ہمدم نکلا اور اس نے اُردو اخبار نویسی میں دور جدید کا افتتاح کیا تو یہ رسالہ ان کے مطبع سے شائع ہوا +

تنقید کہنے کو ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہی لیکن حقیقت میں یہ فن نہایت دشوار ہی۔ اخباروں میں، رسالوں میں، کتابوں پر تنقیدیں شائع ہوتی ہیں لیکن سچ پوچھو تو ان میں سے بہت کم تنقید کہلانے کی مستحق ہیں۔ مصنفین اپنی کتابیں اخباروں کو اس لئے بھیجتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ اڈیٹر صاحبان اس قدر افزائی پر کہ مصنف نے دو جلدیں اپنی تصنیف کی دفتر اخبار میں ارسال کیں ممنون ہوتے ہیں اور خواہ اس کتاب کو پڑھیں یا نہ پڑھیں اس کے متعلق چند توصیفی فقرے لکھ کے عہدہ برا ہو جاتے ہیں۔ عوام پر ان تنقیدوں کا کچھ ایسا اثر بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ انہیں اس فن کی حقیقت ہی معلوم نہیں۔ اس لاعلمی نے علم ادب کو عالت جمود میں مبتلا کر رکھا ہے کسی کتاب کے حسن و قبح ظاہر نہیں ہوتے، آئندہ کے لئے اصلاح کا دروازہ نہیں کھلتا، پبلک قدر دانی اور قدر شناسی سے عاری رہتی ہی۔ مقصود دونوں کا نقصان اُٹھاتا ہی فن تصنیف، علم ادب! علم ادب کی قدر و قیمت

حضرت نیاز نے اپنے رسالہ زیر بحث میں اس طرح تحریر کی ہی:-

"یورپ کے ایک ماہر ادب کا کیسا پیارا مقولہ ہی کہ اگر ہمارے سارے مقبوضات سلطنت ایک طرف رکھ دیئے جائیں اور شکسپیر کا لٹریچر دوسری طرف اور ہم سے کہا جائے کہ ان میں سے ایک چیز کو پسند کر لو تو ہم بلا تامل کہہ دیں گے کہ ہماری ساری سلطنت و حکومت لے جاؤ لیکن شکسپیر اور اس کے لٹریچر کو ہمارے لئے چھوڑ دو کہ ہمارے لئے اسی میں بقائے حیات ہی ...... حقیقت یہ ہی کہ اگر کوئی قوم اپنے بعد کوئی ایسی چیز چھوڑنا چاہتی ہی جو اس کی یاد کو خلعت دوام بخشے تو وہ صرف اس کا لٹریچر ہی" +

ایسی صورت میں لٹریچر کا الآن کما کان کے ورطہ میں مبتلا رہنا نہایت افسوسناک اور حسرت انگیز ہی۔ حضرت نیاز نے سلطنت اور لٹریچر کے تقابل میں کسی قدر مبالغہ سے کام لیا ہی۔ اس میں شک نہیں کہ سعدی و شکسپیر بار بار پیدا نہیں ہوتے، اور اس لئے اُن کی ملائے میں لٹریچر کا تعین ممکن نہیں اور یہ فن ہر چیز پر قابل ترجیح ہو مگر دنیا کی تاریخ مختلف قوموں کے عروج و زوال کی تصویر ہی لیکن اس سے وہ بھی انکار نہیں کریں گے کہ زمانہ نے اسلامی دنیا میں عمر و خالد، عبد الرحمن ناصر لدین اللہ، سلیمان عالیشان اور اورنگ زیب دوبارہ پیدا نہیں کئے نپولین کا ثانی پھر دنیا میں نظر نہیں آیا۔ اسی طرح دنیاوی انہماک سرگرمی کا ہر شعبہ اس دلیل کے زیر بحث آتا ہی اور ہر ایک شعبہ کا مشتاق اپنی تائید اور اپنی تعریف انتخاب عمل میں یہی دلیل پیش کرے گا +

مذہبی لٹریچر کا استخفاف حضرت نیاز کی تحریر سے نمایاں ہے حضرت نے جس مطالعہ صحیحہ کے شوق میں انہوں نے اس مقدس لٹریچر پر زہرخند کیا وہ اس کا ایک ابتدائی اصول ہی۔ دنیا کی سیاحت اور نیچر سے لطف استغراق و حالات گرد و پیش سے مغامعبرت اسی کی تعلیم ہی جس کی تعمیل میں آپ نے ایک صنف مذاق کو لیا اس میں اس قدر تو غل ضرور

اس کے ڈرامے پڑھنے والے کے جذبات پر نہایت گہرا اثر ڈالتے ہیں اس کے ڈرامے عام مغربی طرز کے ڈرامے نہیں جو واقعات اور پیچیدگیوں کی پوٹ ہوتے ہیں۔ بلکہ نہایت سادہ ہیں۔ اور ان میں افسانے کا عنصر محض اثرات مرتب کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور اس سے کوئی خاص نتیجہ مطلوب نہیں ٹیگور کے ڈراموں کا مقصد دنیا کی خوشیوں کی برکتیں۔ زندگی کے فرائض اور سرخیر کا روحانی اثر بیان کرتا ہے۔ آپ کی سب سے پہلی تصنیف والمیکی پرتیبھا ہے۔ اس میں آپ بیان کرتے ہیں کہ جب والمیکی کو روحانی زندگی اور اس کی اصلاح حاصل ہوئی تو اس سے کس طرح اس کو تحریک شاعری ملی اور ملکۂ ترنم حاصل ہوا۔ پراکرتی پرایتودھ میں ٹیگور علم پر عشق و محبت کی فضیلت و فوقیت ظاہر کرتا ہے۔

اچاقتیاں میں اس مسئلے پر بحث ہے کہ اگر تیاگ آشرموں کا تعلق بیرونی دنیا سے نہ رہے۔ تو ان کی پاکیزگی میں تنزل آجاتا ہے اور یہ بیرونی دنیا کا ہی اثر ہے جو ان کو پاک و صاف رکھتا اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔

چترا میں مہابھارت کا ایک افسانہ ہے۔ اور ٹیگور کے آرٹ کے حسنِ نزاکت کا ایک روشن ثبوت ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ عشق کی بنا خواہ حسنِ ظاہری ہی کی کشش ہو لیکن اس کی تعمیر و رفعت دلوں کے ارتباط اور طبائع کی یکسانیت سے ہوتی ہے۔ اور یہی اتحاد ہے جو وصالِ ارواح کا باعث ہوتا ہے۔

کتاب "پوسٹ آفس" میں زندگی موت اور روحانی زندگی کے مباحث نہایت لطافت سے بیان کئے گئے ہیں۔

"حجرۂ تاریک کا بادشاہ" میں یہ ظاہر کیا ہے کہ انسانی روح خدا کی تلاش میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ پھالگنی میں روح کے غوغائی ہونے کا مسئلہ نظم کے زمزمۂ ساحرانہ میں ادا کیا گیا ہے۔

افسانے

ہندوستان زمانۂ قدیم سے دنیا کا بہترین قصہ گو ملک ہے اور ہندوستان کے افسانوں کو تہذیب و تمدن کے جھونکے دور دراز ممالک میں پہنچا چکے ہیں اور سیکڑوں جگہ اس کے بیج پھلے پھولے ہیں۔ ہندوستان میں اب تک افسانہ گوئی کا فن باقی ہے۔ اور دن بدن زیادہ مکمل ہو رہا ہے ٹیگور کے آرٹ میں گزشتہ خصوصیات اب پھر شگفتہ دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے افسانے حقیقی اور خیالی زندگی کے نمونے ہیں۔ وہ دنیا کی ادنیٰ سے ادنیٰ معاشرت میں بھی اس ہستی لم یزل کے نشانہ کی موجودگی کا اظہار کرتے ہیں اس کے افسانے پڑھنے سے انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک سچی ہستی کی مانند وہا کے ساکن و خاموش سمندر پر تیر رہا ہے۔ یا اپنے کسی ہمدرد و رفیق روح کے ساتھ ویرانۂ عالم سے گزر کر ایک پہاڑ پر چڑھ گیا ہے۔ اور اس کی دوسری جانب روحانیت کے وسیع پرستان کے مناظر کی سیر کر رہا ہے۔ ہندوستانی معاشرت کی نہایت سادہ اور ہمہ گیر خصوصیات اس کی تصنیفات میں منعکس ہوتی ہیں۔ نہایت نازک اور صحیح جذبات کا بیان اس کے افسانوں کا خصوصی حسن ہے۔ اس کی یہ خصوصیت اگرچہ مختصر افسانوں میں نہایت کامیاب ہوئی ہے۔ مگر بڑے ناولوں میں یہ بات پیدا نہیں ہو سکی۔

سادھانا

یہ کتاب ٹیگور کی نہایت عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں زندگی کے مسائل کے متعلق ٹیگور کے پختہ خیالات درج ہیں۔ پہلی بحث میں یہ بتاتا ہے۔ کہ ہندوستان کی تہذیب میں جو ایک سکون و موسیقیت پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شہروں میں نہیں بلکہ جنگلوں میں پروان چڑھی ہے۔ دوسری بحث میں روح کی بیداری پر بحث کرتا ہے تیسری بحث برائیوں کے متعلق ہے اور چوتھی میں خود انسان کی ہستی پر بحث ہے۔ کہ انسان کا بڑے سے بڑا فرض اور عالی سے عالی احساس توحید پر مبنی ہے آخری چار بحث معرفت کے متعلق ہیں۔ ان میں علم کی معرفت فرائضِ انسانی کی معرفت حسن کی معرفت اور خدائے غیر محدود کی معرفت پر بحثیں ہیں۔ ٹیگور کی تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کی مستقل خوشی کسی چیز کے حاصل کر لینے میں نہیں بلکہ اپنے آپ کو اپنے سے بڑی اور بہتر چیز کو سونپ دینے میں ہے۔ مثلاً انسان اپنے آپ کو ان خیالات کے سپرد کر دے۔ جو اس کی اپنی زندگی سے بڑے ہوں۔ اس میں اپنے ملک کے خیالات بنی نوع انسان کے خیالات۔ اور اپنے خدا کے خیالات سب شامل کئے جا سکتے ہیں۔ ٹیگور نے دیگر مختلف موضوعات مثلاً تاریخ۔ تمدن معاشرت پر بھی کثرت سے مضامین لکھے گئے ہیں۔ جو اکثر رسائل خصوصاً ماڈرن ریویو میں چھپتے رہے ہیں۔ ماڈرن ریویو کلکتہ نے ٹیگور کے خطوط کو بھی شائع کیا ہے گزشتہ سال آپ کا ایک قصہ "گھر اور گھر سے باہر" مسلسل کئی ماہ تک اسی رسالے میں شائع ہوتا رہا ہے۔

سید امتیاز علی تاج

کیوپڈ اور سائکی

"کیوپڈ اور سائکی" ایک دل آویز مختصر رسالہ کا نام ہی جو حضرت نیاز فتحپوری کے قلم جادو طراز سے جلوہ گر ہوا ہرچند ۱۹۱۸ء میں اس کی اشاعت ہمدم پریس سے ہوئی اور اب ایک سال کے بعد اس کی تنقید بعض طبائع کو بے وقت معلوم ہو لیکن جس صنف لٹریچر پر حضرت نیاز نے قلم اُٹھایا ہی اس کی تر و تازگی پر امتداد زمانہ موثر نہیں ہو سکتا۔ یہ صنعت بھی اس لٹریچر کی پائداری و دوام کی بہترین دلیل ہی +

سرورق کے دوسرے صفحہ پر جیسا کہ ظاہر کیا گیا ہی۔ یہ رسالہ ۱۹۱۶ء میں لکھا گیا۔ سید جالب نے اس کا حق تصنیف ہمدرد کے زمانۂ ادارت میں حاصل کیا لیکن ہمدرد پریس کے قایم ہو جانے اور بعد میں مسٹر محمد علی کے نظربند کئے جانے سے اس رسالہ کے مطبع میں پہنچنے اور شائع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ آخر جب ہمدم نکلا اور اس نے اُردو اخبار نویسی میں دور جدید کا افتتاح کیا تو یہ رسالہ ان کے مطبع سے شائع ہوا +

تنقید کہنے کو ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہی لیکن حقیقت میں یہ فن نہایت دشوار ہی۔ اخباروں میں، رسالوں میں، کتابوں پر تنقیدیں شائع ہوتی ہیں لیکن سچ پوچھو تو ان میں سے بہت کم تنقید کہلانے کی مستحق ہیں۔ مصنفین اپنی کتابیں اخباروں کو اس لئے بھیجتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ اڈیٹر صاحبان اس قدر افزائی پر کہ مصنف نے دو جلدیں اپنی تصنیف کی دفتر اخبار میں ارسال کیں ممنون ہوتے ہیں اور خواہ اس کتاب کو پڑھیں یا نہ پڑھیں اس کے متعلق چند توصیفی فقرے لکھ کے عہدہ برا ہو جاتے ہیں۔ عوام پر ان تنقیدوں کا کچھ ایسا اثر بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ انہیں اس فن کی حقیقت ہی معلوم نہیں۔ اس لاعلمی نے علم ادب کو حالت جمود میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کسی کتاب کے حسن و قبح ظاہر نہیں ہوتے، آئندہ کے لئے اصلاح کا دروازہ نہیں کھلتا، پبلک قدردانی اور قدرشناسی سے عاری رہتی ہی۔ مصنف دو طرح کا نقصان اُٹھاتا ہی فن تصنیف، علم ادب! علم ادب کی قدر و قیمت

حضرت نیاز نے اپنے رسالہ زیر بحث میں اس طرح تحریر کیا ہی:-

"یورپ کے ایک ماہر ادب کا کیسا پیارا مقولہ ہی کہ اگر ہمارے سارے مقبوضات سلطنت ایک طرف رکھ دیئے جائیں اور شکسپیر کا لٹریچر دوسری طرف اور ہم سے کہا جائے کہ ان میں سے ایک چیز کو پسند کر لو تو ہم بلا تامل کہہ دیں گے کہ ہماری ساری سلطنت و حکومت لے جاؤ لیکن شکسپیر اور اس کے لٹریچر کو ہمارے لئے چھوڑ دو کہ ہمارے لئے اسی میں بقائے حیات ہی ...... حقیقت یہ ہی کہ اگر کوئی قوم اپنے بعد کوئی ایسی چیز چھوڑنا چاہتی ہی جو اس کی یاد کو خلعت دوام بخشے تو وہ صرف اس کا لٹریچر ہی" +

ایسی صورت میں لٹریچر کا الآن کما کان کے ورطہ میں مبتلا رہنا نہایت افسوسناک اور حسرت انگیز ہی۔ حضرت نیاز نے سلطنت اور لٹریچر کے تقابل میں کسی قدر مبالغہ سے کام لیا ہی۔ اس میں شک نہیں کہ سعدی و شکسپیر بار بار پیدا نہیں ہوتے، اور اس لئے ان کی ملنے میں لٹریچر کا تعین ممکن نہیں اور یہ فن ہر چیز پر قابل ترجیح ہو مگر دنیا کی تاریخ مختلف قوموں کے محض عروج و زوال کی تصویر ہی لیکن اس سے وہ بھی انکار نہیں کریں گے کہ زمانہ نے اسلامی دنیا میں عمر و خالد، عبدالرحمن الناصر لدین اللہ، سلیمان عالیشان اور اورنگ زیب دو دو دفعہ پیدا نہیں کئے۔ نپولین کا ثانی پھر دنیا میں نظر نہیں آیا۔ اسی طرح دنیاوی انہماک سرگرمی کا ہر شعبہ اس دلیل کے زیر بحث آتا ہی اور ہر ایک شعبہ کا مشتاق اپنی تائید اور اپنی تعریف انتخاب عمل میں یہی دلیل پیش کرے گا +

مذہبی لٹریچر کا استخفاف حضرت نیاز کی تحریر سے نمایاں ہی۔ حضرت کے جس مطالعۂ صحیحہ کے شوق میں انہوں نے اس مقدس لٹریچر پر [illegible] کیا وہ اس کا ایک ابتدائی اصول ہی۔ دنیاوی سیاحت اور نیچر سے لطف استغراق و حالات گرد و پیش سے [illegible] عبرت اسی کی تعلیم ہی جس کی تقلید میں آپ نے ایک صنف مذاق کو لیا اس میں اس قدر تو عمل ضرور

قابل نکوہش ہی جس سے اصل اصول کی مذمت آشکارا ہوتی ہو۔
ممکن ہی تمہید کے کانٹوں میں اُلجھ کے میں اپنے مطلب سے دور جا پڑوں
اس لئے صرف اسی قدر مکتفی ہی کہ جن مراحل کو وہ انتہائے عروج تصور
کئے ہوئے ہیں وہ محض سبق اولین ہی اور مدرسہ حقیقت میں طفل
سیلانی مزاج کی ابجد! ہم تو خیالات ذیل کو ایک نوگرفتار کی وارفتگی
اور بے اصول بیتابی سے زیادہ وقعت نہیں دیتے:۔

"دوسرا مذہبی لٹریچر اختیار کرتا ہی (اللہ اُسے غریق رحمت کرے)
وہ بھی ہمارے شکریہ کا مستحق ہی۔ ...... لیکن ایک اور ہی
جو ان اصناف ادب سے علیحدہ ہو کر اس لٹریچر کو رواج دینا
چاہتا ہی جو صرف ہماری رُوح کو متاثر کرتا ہی اک ایسے تاثر
کے ساتھ جس کی لذت ناقابل بیان ہی۔ ... میرے نزدیک
تو یہی اک چیز ایسی ہی جو مادیات کی عظیم ترین فتوحات کے
مقابلہ میں روحانیت کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہی۔ ایک واعظ
میرے سامنے خانہ کعبہ کے تقدس کا اظہار کیسے ہی پُر اثر
لب و لہجہ میں کیوں نہ کرے لیکن جس عظمت و تقدس کا خیال
میرے دماغ میں اس انداز بیان سے پیدا ہوتا ہی کہ ؎

در طوف حرم دیدی مغبچہ می گفت
کایں خانہ بدیں خوبی آتشکدہ بایستے

وہ ہزاروں واعظوں کے مواعظ سے بھی پیدا ہونا ممکن نہیں"
یہ مناظرہ نما تقابل اس رسالہ میں یقیناً ناموزوں اور فی الواقع بدنما
دھبہ نظر آتا ہی۔ بہر حال فاضل مصنف نے موجودہ رسالہ کی تصنیف ترمیم
کی وجہ حسب ذیل دی ہی:۔

"جس وقت سے میں نے لکھنا شروع کیا ہی (بلا لحاظ اس کے
کہ زمانہ کیا چاہتا ہی) میں نے ہمیشہ اپنے انہی حسیات کی
پابندی کی ہی اور نظم ہو یا نثر انہیں خیالات کے اظہار کو اپنا
محبوب مشغلہ خلوت قرار دے رکھا ہی۔ میں جانتا ہوں کہ میرے
بہت سے احباب نے اس کو ناپسند کیا، بعض نے عریاں و فحش
کہکر شرم دلائی بعض نے خلاف متانت و تہذیب کے الفاظ
سے میرے عزائم کو متزلزل کرنا چاہا لیکن آپ یاد رکھیے کہ میں نے
کبھی ان باتوں کو سمجھنا ہی نہیں چاہا کیونکہ میرا مقصود کسی سے
داد لینا یا دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں ہو بلکہ خود لطف
اُٹھانا ہی۔ پھر دوسروں کی وجہ سے اپنی لذت کھو بیٹھوں
ایسا خلق تام مجھ میں کہاں سے آیا .... چونکہ میرا
ذوق صریحاً یہی ہی بنا براں میرا خیال تھا کہ جب غالب کی
یہ دعا کہ خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را۔ قبول ہوتی نظر
نہیں آتی (نہ خدا کرے ہو) اور اس طرح مذہبی نقطۂ نظر سے
کوئی صورت ایسی پیش آنی ممکن نہیں کہ قوم میں پرستاران
حُسن و جمال پیدا ہو کر خود بخود اک لٹریری پرستش یا پرستلانہ
لٹریچر کی بنیاد پڑے تو کم از کم ان قوموں کے لٹریچر کا ذکر
کیا جائے جن کے مذہب کی بنیاد ہی پرستش حسن پر ہو اور
اس خیال سے یونانی علم الاصنام کے متعلق میری خواہش
تھی کہ سلسلۂ مضامین شائع کیا جائے جس سے ان کی روایات
اپنی زبان میں محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ اسی اثنا میں ایک دن
میں تصاویر متحرکہ کے تماشہ میں چلا گیا۔ اور وہاں میں نے
کیوپڈ و سائک کا فلم دیکھا۔ ہرچند سوائے حسین تصویروں
اور ان کی حرکات کے اور کوئی ایسی چیز ایسی نہ تھی جو مجھے
ان اوراق کی ترتیب میں مدد دیتی لیکن انہیں دیکھ کر
خود میرے دل میں تاثرات کا ایسا ہجوم ہوا کہ میں نے بالکل
اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ میں پہلے انگریزی یا
یونانی تصانیف کا مطالعہ کروں اور پھر تفصیل کے ساتھ
اس پر بحث کروں۔ علاوہ اس کے جہاں تک میرا خیال
ہی اس قدر شرح و بسط کے ساتھ کہیں اس کا ذکر بھی
نہیں کیا گیا ہی، بہر کیف ہو یا نہ ہو مجھے اس کا علم نہیں
جو کچھ آپ ملاحظہ فرمائیں گے وہ خود میرے تاثرات و
جذبات ہیں جن کے اظہار سے یہ مدعا نہیں کہ آپ پسند
کریں اور داد دیں"۔

کسی یونانی علم الاصنام سے ناواقف شخص کو یہ گمان ہو سکتا ہے
کہ اس رسالہ میں جو فکر ہی اس کے صحیح و مستند ہونے سے تو معذ

انکار کرتا ہی اس لئے یہ سب صرف مصنف کی خیال آرائی ہی ورنہ اصلی یونانی قصہ سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ علاوہ ازیں گو فاضل مصنف نے انگریزی کتابوں میں اس قصہ کو نہیں پڑھا اور نہ تلاش کیا لیکن اُن کا عمیق اور روشن خیال اس سے بھی مطلع ہی کہ ان میں یہ قصہ اس تفصیل سے مذکور نہیں جو اُن کے تراوش قلم کا ایک دلفریب نتیجہ ہی۔ یہ متضاد استدلال ضرور بے پیرانہ ہی۔ بایں‌ہمہ جو کچھ فاضل مصنف کے خیال نے بغیر کسی مطالعہ کے طلسم بند آئینہ بن کے زبان قلم سے اس رسالہ میں اظہار کیا وہی بلا کم و کاست یونانی علم الاصنام کی کتب میں موجود ہی۔ یہ وہ طلسم بند آئینہ ہی جو اس رسالہ کے دوسرے شکرپارہ میں دکھایا گیا ہی جس کی امداد سے وینس حسن کی دیوی سب جگہ کا حال معلوم کر لیا کرتی تھی۔ اس موقع پر حضرت نیاز کی جادو طرازی کی ضرور تعریف واجب ہی کہ ان کا خیال اس قدر مجلا ہی کہ صوفیوں کی طرح دنیا کے کل حالات اس پر منعکس ہیں ✦

کیوپڈ اور سائکی چھوٹی تقطیع کے ۲۷ صفحوں کی کتاب ہی جس کو آٹھ حصوں میں لکھا گیا ہی۔ شاہ یونان کی تین بیٹیاں انگلارس، کیوپڈس اور سائکی حسن و جمال میں شہرۂ آفاق ہیں لیکن سائکی کا حسن ماہ منخسف ہی اور اس کے آگے انگلارس و کیوپڈس ماند ہیں۔ دونوں اس کے اس بے نظیر حسن پر جلتی اور حسد کرتی تھیں، لیکن اتنی تسلی اُن کا ملول دل اُن کی کر دیا کرتا تھا کہ "ہر چند سائک زیادہ حسین سہی مگر کم از کم وہ اُن لذات سے تو ابھی آشنا نہیں ہو سکتی جن سے ہماری راتیں بہت جلد لبریز ہونے والی ہیں"۔ سائکی ۱۷ سال کی ایک شعلہ جوالہ، نازآفرین نازنین تھی، تمام دنیا اس کے عدیم النظیر حسن پر فریفتہ تھی، اس کے باپ کو اس کے شوہر کے انتخاب میں بڑی وقت پیش آ رہی تھی، کسی شہزادہ کی تصویر اُس کو دکھائی جاتی تو وہ اغماض و پندار سے نظر پھیر لیتی:—

"ہاں اُسے غرور تھا، اپنے حسن پر ناز تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس نے تصویر کی پشت پر لکھوا دیا کہ اگر یہ انسان ہی تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں۔ مگر اُسے کیا خبر تھی کہ وہ اس فقرے سے اپنی آیندہ زندگی کے لئے ایک سچی پیشینگوئی کرتی تھی ✦

اس کا احساس اُسے بھی تھا، کسی جوڑے کے نہ ملنے کی کسک اُس کے دل میں پیدا ہوتی تھی۔ اکثر وہ گلگشتِ چمن میں گھنٹوں اسی خیال میں محو رہتی ✦

یہاں تک کہ بعض دفعہ جب وہ اکیلی ہوتی تو وہ مہندی کی بھول بھلیاں میں گھس جاتی اور آپ اپنی تلاش کرنے لگتی اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائک نصف عورت تھی اور نصف انفعال و جستجو۔ دن گذر گئے، یہاں تک کہ اس کا شبابِ سرور سے شکر اور شکر سے سرشاریت کی حد تک پہنچ گیا لیکن اس وقت تک کوئی فیصلہ انتخاب شوہر کے متعلق نہیں ہو سکا

ایک رات اُس نے اسی طرح تڑپ تڑپ کے ایک سنسان کنج میں گزار دی کچھ سوئی صبح کو وہ مضمحل وخستہ اپنی خوابگاہ کو واپس ہوئی ✦

یہاں نسرین سائک کی محبوب مطربہ بربط لے کے آئی اور لے لوریاں سُنانے لگی لیکن سائکی کو اس سے اور وحشت ہوئی۔ یونان کا روز تھا دستور تھا کہ ہر سال اس کی سالگرہ کے روز دربار منعقد ہوتا۔ اُس میں یہ شریک ہوتی۔ اس میں اقطاع و جوانب سے شعرا و شہزادے سفیر و گویے جمع ہوتے۔ ہر ایک اپنے اپنے مقدور کے مطابق ہدایات پیش کرتا۔ آخر میں سائکی کو اظہار پسندیدگی و قبولیت میں اپنے چہرہ سے ایک لمحہ کے لئے نقاب اُٹھانا پڑتا تھا۔ اس آن واحد کے لئے تمام سال تمام یونان تڑپا کرتا تھا۔ وہ جب بارہ برس کی ہوئی اور دربار میں پہلی مرتبہ نقاب پہن کے آئی تو ہجوم کم ہو گیا تھا لیکن اب دستور قرار پا گیا تھا کہ وہ ان ہدایا کے پیش کئے جانے کے بعد مُنہ کھول دیا کرتی۔ سائکی غسل کر کے اور کتان کی آسمانی چادر زیب تن کر کے دربار میں گئی۔ ہدیے پیش ہوئے۔ آخر میں اس نے اپنا نقاب اُٹھایا اور گھنٹوں کے لئے سب کو بُت بنا کے چلدی۔ وینس یونانی عقاید کے مطابق حسن کی دیوی ہی۔ وینس اپنے کاشانہ بلوریں میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کا تماشۂ غسل دیکھ رہی تھی اور نہایت مسرور تھی، ایک بلوریں حوض . . . . . . میں پریاں برہنہ نہا رہی تھیں اور آپس میں کھیل رہی تھیں چونکہ وینس خود سمندر کے کف سے پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے وہ فطرتاً عریانی پسند تھی اور اس کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ

یہ بھی تھا۔" اتنے میں سیاحہ اروش شہرت کی دیوی اُس سے ملنے
آئی۔ اس دفعہ کے دربار یونان میں اروش شامل تھی۔ اس نے سائکی
کا حسن عالم سوز دیکھ کے صاف صاف وینس سے کہہ دیا کہ
"دیکھئے یونان کی چھوٹی بیٹی جس کا نام سائک ہی ایسی حسین ہے
کہ اگر اس کی خاک پاک مل جائے تو وینس کو چاہئے کہ اس کا
غازہ بنائے اور فخر کرے +

وینس جس کا دماغ یہ تھا کہ اروش سے دوران گفتگو میں کہتی تھی کہ
"تو نے کرۂ ارض کے ان ذلیل باشندوں میں جن کو اگر ہوا نہ
سنبھالے تو منہ کے بل زمین پر گر پڑیں کوئی بات ایسی
نہ پائی ہوگی جس کو سن کر وینس جلے۔ کیا تو نے اس سے
قبل وہاں کے حالات مجھ سے نہیں کہے اور کیا میں یہ
سن کر ہنستے ہنستے بیتاب نہیں ہوگئی کہ انسان اپنے جسم کو
جانوروں کی طرح ناخن سے کھجاتا ہی اور جب کھجاتا ہی تو اس کے
جسم پر مٹی کی لکیریں بن جاتی ہیں +

سائکی کا یہ رتبۂ حسن سن کے جل گئی۔ اسی وقت طلسم ہند آئینہ
منگایا۔ میز پر رکھوا دیا اور قاعدہ کے مطابق خود اس کے سامنے
آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ پندرہ منٹ کے بعد آنکھیں کھولیں اور
آئینہ میں سائکی کی تصویر دیکھی تعریف سے بڑھ کے پایا۔ سر پکڑ کے
رہ گئی۔ دو گھنٹہ کے بعد ایک تدبیر ذہن میں آئی۔ اپنے بیٹے
کیوپڈ کے پاس گئی جو ایک پر دار معصوم لڑکے کی صورت تھا اور شانے
پہ کمان اور ترکش میں تیر لئے رہتا تھا اور محبت کا دیوتا تھا۔ اس کا
منہ چوم کے بولی :-

"اے کیوپڈ میں نے سنا ہی کہ جب تو تیر کمان لے کر باہر
نکلتا ہی تو ملک کی جوان لڑکیاں تیرے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ
اے کیوپڈ جی چاہے ہمارے دلوں کو اپنے تیروں سے
چھلنی کر دے لیکن خدا کے لئے پیروں میں زنجیر محبت
نہ ڈال۔ کیا واقعی تیرے تیروں کے زخم زنجیر محبت سے
زیادہ آسان ہیں ..... کرۂ زمین میں رئیس یونان کی
چھوٹی بیٹی سائک تیری قائل نہیں، جا اور اس کو بتا کہ وینس
کا بیٹا کیسا تیر انداز و غرور شکن ہی +

کیوپڈ کے لئے اتنا کافی تھا بھڑک اٹھا اور فوراً اپنے نئے مشن پر
روانہ ہوا۔ اس دفعہ کے دربار میں بھی سائکی کا کوئی شوہر نظر نہ آیا +

دنیا سے یہ خیال اٹھتا جاتا تھا کہ سائک واقعی نوع انسان
سے ہی ..... اس کا حسن لوگوں کے دلوں میں اب اک عجیب
و غریب عظمت کی صورت اختیار کر چکا تھا اور اس سے محبت
کرنے کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہ رہ گیا تھا کہ دنیا
اس کی پرستش کرنے لگی ..... سائک کا نام لیا جائے تو
لوگ سجدوں میں گر پڑیں +

غرضیکہ اب شاہ یونان کو بھی یقین تھا کہ سائکی کی شادی کسی طرح نہیں
ہو سکتی۔ اس کے حسن نے لوگوں کے دلوں میں وہ معراج تقدس حاصل
کیا تھا کہ شوہر ملنا واقعی محال تھا۔ یہ احساس سائکی کو بے چین
کرنے والا تھا۔ ایک روز وہ محو تفریح حوض تھی اور نسرین اُسے نغمے
سنا رہی تھی۔ ایک نغمہ پر سائکی اس قدر بیتاب ہوئی کہ بے قرار
ہو کے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلنے لگی +

سیاہ ریشمی چادر جو اس کی گداز رانوں سے لپٹتی ہوئی کمر
کی نزاکت کو اور بھی نمایاں کرتی ہوئی شانہ تک پہنچ گئی تھی
ڈھلک گئی، شانے کھل گئے بیاض گردن سینہ کی عریاں
سپیدی سے مل گئی، سیاہ ریشمی بال پیٹھ پر گھوم گھوم کر
اور بھی چھلے بن گئے، ابروئیں تن گئیں مست آنکھیں
اور متوالی بن گئیں +

ٹھیک اس وقت کیوپڈ اپنا وار کرنے ایک کنج سے نکلا لیکن
اُس نے جو سائکی کا یہ حسن کاسوز دیکھا، تیر چلانا بھول گیا۔ خود
اس کے تیر نظر کا زخمی ہو کے بیہوش گر پڑا +

آہ، کاش کوئی سائک سے اس وقت جا کے کہہ دیتا کہ جس
محبت کی اس کو جستجو تھی وہ خود اس کی متلاشی ہی جس عشق
کی اُسے تمنا تھی وہ اب خود اس کی تمنائی ہی، صیاد خود
اس کا مجروح ہی عشق خود اس کا دیوانہ ہی، اور تیر آپ
اس کی نگاہ کا زخمی +

کیوپڈ ناکام واپس گیا۔ وہ باغ میں غمگین ٹہل رہا تھا اور درد پہلو کراہ رہا تھا وینس خوش خوش اُس کے پاس گئی لیکن بجائے سائکی کی تباہی سننے کے اُلٹا اپنے بیٹے کو اس کا مجروح پایا۔ فوراً سامان سفر درست کیا اور

وہ معہ اپنی کنیزوں، کنواریوں اور پریوں کے دفعتہً بادل کی طرح جو سما میں چھا گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد آفتاب کی روشنی میں تحلیل ہو کر غائب

سائکی کا باپ اگسٹس یونان کا بادشاہ جود و سخا کے لئے مشہور تھا۔ وہ اپنی دونوں بیٹیوں اگلارس و کیوڈپس کی شادیاں کر رہا تھا، رقص و سرود نے یونان کے تمام گلی کوچوں میں ایک عجیب عالم بپا کر رکھا تھا۔ بادشاہ اپنے دربار میں خوشیاں منا رہا تھا اتنے میں وینس داخل ہوئی اور کمرہ کی روشنی میں مل گئی۔ اسی وقت بادشاہ سخت درد سے بیتاب ہو کے گر پڑا۔ روز بروز درد بڑھتا جاتا تھا۔ ہر چہار طرف سے طبیب و منجم جمع ہوئے لیکن کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر سنگ مقدس سے استمداد کی گئی +

جس عہد کا یہ واقعہ ہے اس وقت یہ دستور تھا کہ جب کوئی سخت مصیبت پیش آتی تھی اور کوئی انسانی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی تو دیوتاؤں کی روحوں سے التجا کی جاتی تھی اور اس عرض و التجا کے لئے ایک خاص مقام مقرر تھا۔ یہاں ایک پتھر نصب تھا جسے سنگ مقدس کہتے تھے اس عرض کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پتھر پر ایک تحریر نظر آتی تھی جو نہ صرف اس مصیبت کی حقیقت سے آگاہ کرتی تھی بلکہ دفع بلا کی تدابیر بھی ظاہر کرتی تھی +

چنانچہ سب مراسم طے ہونے کے بعد اس پر یہ تحریر نظر آئی کہ یہ مرض کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ ایک قہر ہے جو بہشت کے مالک اور دیوتاؤں کے سردار جیوپٹر نے نازل کیا ہے۔ اگر بیناہ نہ مانگی گئی تو یونان جلد تباہ ہو جائے گا۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ سائکی کو کوہ الوند کی سب سے اونچی چوٹی پر لے جا کے شاہ بلوط کے درخت سے باندھ کے چلے آئیں۔ یہ قربانی جیوپٹر ایک عفریت کے ذریعہ قبول کرے گا۔ اگر دو دن میں یہ قربانی نہ کی گئی تو پھر ہزار سائکی بھی اس بلا کو نہیں ٹال سکتیں +

سائکی کی ماں کو اس تدبیر سے سخت صدمہ ہوا۔ وہ عجب مخمصہ میں تھی، اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، یہی حال رعایا کا تھا، نگاوں تو کوڑھی، اُگلوں تو کلنکی۔ ایسا سخی بادشاہ بھی ہاتھ سے نہ دیا جاتا تھا اور ایسی ماہ پارہ نازنین دے کے یونان بے نور تھا۔ لیکن بادشاہ کی تکلیف ہر دم بڑھ رہی تھی آخر دم توڑنے لگا۔ مجبوراً ماں نے دل کو یہ سمجھا کے کہ اور سب کی طرح سائکی بادشاہ کی مملوک ہے اور مالک پر ہر چیز نثار ہے بیٹی کو کوہ الوند پر چلنے کے لئے کہا۔ سائکی دم بخود ہو گئی آخر اُسے سب وہاں لے گئے اور شاہ بلوط سے باندھ آئے۔ سارے یونان میں کہرام مچ گیا۔ خود ماں نزع کی حالت میں تھی۔ اس حالت میں صرف سائکی کی دونوں بہنیں خوش تھیں۔ سب چلے گئے سائکی بیہوش ہو گئی۔ کیوپڈ نے زیفرنسیم کی دیوی اور مارفیس نیند کی دیوی کو بھیج کے سائکی کو درخت سے کھلوایا اور اُسے سبزہ پر سلوا دیا۔ خود وہاں پہنچا۔ اُس کے حُسن عالم آشوب کو دیکھ دیکھ کر سر دُھننے اور اُس کے تلووں سے آنکھیں ملنے لگا۔ اس وقت سینہ اور گردن کا زیادہ حصہ عُریاں تھا۔ اس بے حجابی سے اب ہی کیوپڈ نے اُسے دیکھا تھا۔ آخر اُسے اُٹھوا کے کوہ المپس کے ایک خاص قصر میں جو اُس نے اُس کے لئے بنوایا تھا لے گیا۔ اور وہاں اُسے ہوش میں لایا۔ سائکی سخت تحیر میں تھی۔ بجائے بندھے ہونے کے وہ آزاد تھی اور ویرانے کی بجائے وہ نزہت بخش محل میں تھی۔ عفریت کی جگہ ایک نقاب پوش لڑکا تھا جس کا حُسن نقاب سے پھٹا پڑتا تھا۔ اس موقع پر ان دونوں کی محبت آمیز گفتگو ہوتی ہے۔ اور لطف و اُلفت کا ہیجان ہوتا ہے لیکن کیوپڈ سائکی کی اس درخواست پر کہ وہ بے نقاب ہو جائے یہ عہد اُس سے لیتا ہے کہ وہ اس پر اصرار نہ کرے اس میں طرفین کا نقصان ہے۔ اس شغل محبت میں کیوپڈ کے مصروف ہو جانے سے دنیا میں کچھ خلقی پھیلنے لگی۔ اس لئے مجبوراً اُسے چند روز کے لئے سائکی سے رخصت ہو کے باہر جانا پڑتا اور دُنیا میں تیر افگنی کرنا پڑتی۔ ایک روز سائکی کی درخواست پر کیوپڈ نے شاہ یونان کا سا باغ و روشیں یہاں آن واحد میں بنوا دیں۔ اور ہزاروں کنیزیں ا

مہیا کردیں۔ لیکن کنیزوں سے وہ صرف اشاروں سے بات کرسکتی
کیوپڈ کی غیر حاضری میں وہ اس طرح گھبرایا کرتی کہ کوئی بولنے چالنے
والا ہی نہیں۔ اس لطف عیش و انبساط میں سائکی کو اپنی بہنوں کو
اپنا یہ آرام دکھانے کا شوق ہوا۔ گو کیوپڈ کو اس پر تامل تھا لیکن
مجبوراً مارفیس ونہ یفر کو بھیج کے اُنہیں بلا منگایا۔ یا تو ان کو خیال تھا
کہ سائکی لقمۂ اجل بن گئی ہوگی یا انہوں نے اُسے اس بہشت میں دیکھا
دل میں جل کے کباب ہوگئیں۔ آخر اُس سے باتیں کرتے کرتے اُنہوں
نے حیرت سے پوچھا کہ تیرے شوہر کا کیا نام ہے؟ اُس نے کہا معلوم
نہیں! اُنہوں نے پوچھا کہ اُس کا چہرہ کیسا ہے؟ اُس نے کہا گو خوبصورت
ہے لیکن دیکھا نہیں! ان عیار بہنوں کو یہ موقع ہاتھ آیا اور اُسے بہکایا
کہ یہ وہی عفریت ہے اسی لئے اپنا منہ نہیں دکھاتا۔ آخر ایک روز تجھے
کھالے گا۔ یہ باتیں کچھ اس طرح بار بار اُنہوں نے کیں کہ سائکی کو بھی
فکر سا ہوگیا۔ وہ اُٹھی اور کیوپڈ کی خوابگاہ میں جا پہنچی۔ وہ بیہوش پڑا
سو رہا تھا۔ اُس نے اُس کا نقاب کھولا۔ بجائے کسی عفریت کی شکل
کے اُس نے نہایت ہی پیارا چہرہ دیکھا جس نے اُس کے عشق کو کئی
مدارج بڑھا دیا۔ لیکن کیوپڈ گھبرا کے اُٹھ بیٹھا اور سائکی کی اس حرکت پر

"برہم ہوکے بولا کہ اے بیوقوف سائکی، یہ تو نے کیا کیا،
کیا تو یہ نہ جانتی تھی کہ میں ایک قوت غیر فانی ہوں اور کیا
میں نے تجھ سے یہ بات بارہا نہیں کہی تھی کہ کوئی شخص میرے
چہرہ کو دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا"

ہرچند سائکی نے اُسے روکنا چاہا لیکن وہ نکل گیا اور وہ بیہوش
ہوکے گر پڑی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو اُسی شاہ
بلوط کے درخت کے پاس لیٹے پایا وینس نے اُسے ایذائیں دینا
شروع کیں، اور اُسے مار دینا چاہا۔ آخر جیوپیٹر نے اُسے اس ارادہ
سے باز رکھا اور اس شرط پر اُس کی جان بخشی کی کہ وہ پراسرپائن کا
طلسمی صندوق لائے جس میں خزانہ حسن بند ہو۔ سائکی کانپ اُٹھی
لیکن اُسے ایک آواز سنائی دی جس کو سوائے اُس کے کسی نے نہیں
سُنا کہ "گھبرا نہیں، تیرا محافظ تیرے ساتھ ہے" آخر وہ مصیبتیں اُٹھاتی
گئی اور وہ صندوق لے آئی وینس اُس کے اس عزم و استقلال

سے بدعہدی پر آمادہ ہوگئی لیکن جیوپیٹر نے سائکی کو آزاد کرکے اُسے
شراب الوہیت پلا دی جس سے وہ بھی آسمانی مخلوق بن گئی۔ اب
کیوپڈ پھر اُس سے آملا۔ اس دفعہ وہ اُس سے بے نقاب ہوگیا۔
وہ اُسی کو ہ اولمپس پر چلے گئے اور عیش و عشرت کا جام لنڈھانے لگے
جذبات سب قابل تعریف ہیں، انہماک و توجہ سے ان کا اظہار
کیا گیا ہے، ایک ناممکن بات کو کس لطافت سے لکھا ہے۔ عزلت کی
خاموشی اور مونس کی نایابی کی مایوسی میں سائکی گا رہی ہے، اور
شکایتیں کر رہی ہے:۔

...... دنیا میں کوئی مصور ایسا نہیں جو میرے بعد میری
یادگار حسن باقی رکھے، کوئی شاعر ایسا نہیں، جو میری تمناؤں
کو لکھ سکے، اور کوئی مغنی ایسا نہیں، جس کے بربط کے
تار میری تعریف میں کانپ سکیں، پیارے آسمان کی سائیک
(چاندنی سے خطاب ہے م۔ ذ) تو ہی بتا کہ ایسا شخص جو نور
کی تصویر بنا سکے، جو سمندر کو لکھ سکے، جو نکہت کو گا سکے
کہاں ملے گا؟

سائکی کی رفتار ملاحظہ ہو:۔

چھریرا بدن اور نازک کمر، تو رفتار میں لوچ کا پیدا ہونا خود بخود ہی
ہے لیکن اگر رفتار کی لچک صرف نزاکت کمر ہی کا تخیل نہیں،
کوئی مستقل چیز بھی ہے اگر سبک خرامی کشیدہ قامتی کی صفت
لازم نہیں، بلکہ ایک جدا حسن ہے، تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ سوائے
سائیک کی رفتار کے اور کس کی چال کو سراہیں، نغمہ کا کوئی
نقش نہیں مگر ہوا اُس سے معمور ہی ہے بھیری اُڑ کر نکل گئی
مگر اُس کی لچک اور سُبک پروازی اب بھی نگاہ میں
تھرتھرا رہی ہے، سائیک کنجوں میں غائب ہوگئی لیکن اُس کی
رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے یا سائکی اپنی تنہائی
پر اس طرح نالہ کرتی ہے:۔

اگر میری پلکیں نشہ آلود اور میری آنکھیں خمار آگیں ہیں تو کیا؟
اگر یونان کی بیٹی کا شباب عروج صہبا ہے تو کیا؟ کیونکہ
اُسے خود نہیں معلوم کہ اس میں کیا لذت پنہاں ہے میری

زندگی تو اک ایسی صدا ہے، جو صحرا کی وسعت میں گم ہو جائے
آواز اگر وادیوں سے بھی نہ ٹکرائی تو کسے خبر وہ آواز تھی،
زندگی اگر کسی دوسرے کی زندگی سے وابستہ ہو کر بھی لذت
یاب نہ ہوئی تو میں تو ایسی زندگی سے بیزار ہوں۔ پھول اگر اپنی
نکہت سے آپ فائدہ اُٹھا سکتا ہے، اگر کلی اپنی رعنائی پر فریفتہ
ہو سکتی ہے تو تو ہزار نغمہ وہی گا جو ابھی گائی" +

حضرت نیاز مونس ہمدم کا مصرف کیا خوب دکھاتے ہیں:-
پھولوں کے ہار یونہی رکھے رکھے سوکھ گئے اور اس نے نہیں
پہنے، کیونکہ سمجھتی تھی کہ شاید گجروں کو کوئی اپنے لئے نہیں
پہنتا، ہار اس لئے گردن میں نہیں ہوتے کہ ان کی نکہت
کو صرف ہوا اُڑائے لئے پھرے، ان سے یہ مقصود نہیں
کہ وہ ایک افسردہ سینہ پر پڑے پڑے سوکھ جائیں بلکہ
ان سے یہ مدعا ہے کہ کوئی دوسرا بھی اُن کی نکہت سے بیقرار
ہونے والا ہو، اور ان کی جنبش ایک دھڑکتے ہوئے دل
کی جانب سے اس بیقراری کا جواب دے ورنہ یوں تو ناکام
سینہ ایک مزار ہے اور مزار پر چڑھائے ہوئے پھول کیا
.... وہ راتوں اور عشرتوں سے بیزار
ہو گئی تھی، وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھی اور
چاہتی تھی کہ کوئی مضبوط ہاتھ انہیں پکڑے اور پھر نہ چھوڑے
وہ اپنی نازک کمر، وہ ایک مٹھی میں بھر کے آ جانے والی
پتلی کمر کو چاہتی تھی کہ کوئی دکھلائے اور دکھائے جائے،
وہ خواہشمند تھی کہ اس کی نزاکت و دوشیزگی کا کوئی دشمن
مل جائے اور اسے تکلیفیں پہنچائے +

اُف! کسی مست شباب نازنین کی اس سے اچھی تصویر نہیں
ہو سکتی۔ اس سے آگے لکھتے ہیں:-
اب اُس کا وہ خود حُسن باقی نہ رہا تھا کہ شاہزادوں کی تصویریں
دیکھ کر مُنہ پھیر لیتی تھی اب تو وہ باغ میں طاؤس کو بھی مستی
کے عالم میں دم پھیلائے دیکھتی تھی تو بے اختیار اس سے
لپٹ جانا چاہتی تھی اور ہنس کو بھی گردن اُٹھائے اور
اُبھرا ہوا سینہ نکالے پانی میں دیکھتی ہوئی وہ چاہتی تھی کہ
یہی بازو کھول کر اپنی پرواز آغوش میں لے کے اور ایک ڈال
گردن پر اپنی زبردست گردن ڈال دے +

اس میں شک نہیں کہ بالعموم جنس لطیف میں حیا کا عنصر غالب ہے
اور یہ تخیلات عام نہیں۔ اسی لئے یہ تصویر اکثر پاکیزہ مذاق والے
احباب کو کھٹکے گی۔ اور خود مصنف کے لفظوں میں وہ اسے "عُریاں
فاحش" کہیں گے لیکن کسی شباب بھری عورت کا یہ طرز خیال خلاف
فطرت نہیں +

اسی سائکی کو کیوپڈ کے آغوش میں دیکھئے:-
سائکی نے اس کا نقاب نوچنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا
ہی تھا کہ کیوپڈ نے اس کی کلائیاں پکڑ لیں اور نہایت
ہی نرم اور پُر لجاجت لہجہ میں بولا کہ اے سائکی میں تیرا
ادنیٰ غلام ہوں تو مجھے جو چاہے سمجھ لیکن مجھے اس بات
کے کرنے پر مجبور نہ کر جس کو میں اگر کر ڈالوں تو پھر تجھی کو افسوس
کرنا پڑے .... اے سائکی ... میں تجھ سے
چھٹ جاؤں گا اور مر جاؤں گا +

سائکی کچھ تو اس تقریر سے متاثر ہو کر اور کچھ اس کے مردانہ
گرم ہاتھوں میں اپنی نازک کلائیوں کو پا کر ٹھٹک گئی، ٹھہر گئی
اور ایسا محسوس کرنے لگی گویا اس کے ہاتھ ڈھیلے ہیں،
اس کے بدن میں سکت نہیں ہے اور وہ بے اختیار اس
کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔ آخر کار اس نے اپنے سارے
بدن کا بوجھ کیوپڈ پر ڈال دیا، اپنے تئیں اس کی آغوش
میں سونپ دیا۔ اور اس نامعلوم لذت سے مست و
سرشار ہو کر جو اس سے قبل اسے کبھی نہیں ہوئی تھی اور
جس کے لئے وہ اک جستجوئے مبہم بنی ہوئی تھی آنکھیں
پلٹ کر کیوپڈ کی گود میں بالکل بے حس ہو کر گر پڑی +

نسائی فطرت کی تصویر بہت اچھی کھینچی ہے:-
حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شباب کے عالم میں
اگر کوئی حقیقی اور سچی حس رکھتی ہے تو وہ وہی ہے جس کا تعلق

صرف اس کے شباب سے ہے ..... اس کے سامنے اُس
کے حُسن کا ذکر کرو کچھ ایسی باتیں کرو جس سے اس کا شباب
براہ راست متاثر ہو سکے پھر یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا بھر کی
تمام مصروفیت کو چھوڑ چھاڑ کر اس طرف متوجہ نہ ہو جائے۔
یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنے حُسن و شباب کے متعلق جس قدر
دوسروں کی رطب اللسانی سے خوش ہوتی ہے اتنی وہ خود
آئینہ دیکھ کر بھی کبھی مسرور نہیں ہوتی حالانکہ وہ گھنٹوں
اس کے سامنے گیسو سنوار سنوار کر مزے لیا کرتی ہے۔ وہ
چاہتی ہے کہ اس کی جوانی میں جوانی ہی کا ذکر ہو اور اصلاحی
رنگ کی گفتگو کبھی اس کے سامنے نہ ہو وہ اپنے تئیں
شوخ و چلبلی سُن کر خوش ہو سکتی ہے مگر وہ اپنے شباب کے
متعلق حد سے بڑھے ہوئے صلاح و تقوے کی نسبت
پسند نہیں کر سکتی، کیونکہ شوخی و چلبلے پن میں تو عین
اس کے اقتضائے شباب کی خاطر ملحوظ ہے اور زہد و عبادت
ایک طرح سے اُس کے شباب کی توہین ہے"+

ایک تصویر اور نسائی فطرت کی ملاحظہ ہو:-

جس وقت تک عورت اپنی محبت میں کامیاب نہیں ہوتی
اُس وقت تک تو اس کی زندگی اک کلی کی سی خلوت آرمیدہ
زندگی ہے، نہ وہ کہیں جانا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے
بات کرنا۔ لیکن جب وہ اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتی
ہے، جب اس کی حیات معاشقہ اک علی صورت اختیار
کر لیتی ہے تو وہ پھر اگر تنہا بھی ہے تو بجائے خود اک انجمن ہے
اور خلوت سے سخت بیزار جب تک اس کی محبت کا کوئی
جواب دینے والا نہیں وہ یہی آرزو کیا کرتی ہے کہ کوئی
اُسے بتائے کہ حُسن و شباب میں کچھ لذتیں بھی ہیں یا نہیں
لیکن جب کوئی ایسا شخص اُسے مل جاتا ہے اور اس کی
جوانی کی لذتوں کو اس کے لئے قابل الفہم بنا دیتا ہے تو پھر
عورت اپنے مسرت کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی اور
اپنی ہی جنس کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے جس سے
وہ اپنی لذتوں کا بیان کرے یعنی جس طرح وہ اپنی ناکام
زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی تھی اسی طرح اپنے
مسرور و شاد کام زمانہ میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی
اس پر رشک کرے۔ اس لئے سائک ابھی وقت گھبرا
اُٹھتی تھی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم اگلاریس و کشوریہ کیوپڈ
ہی آ کے دیکھیں اور اس کی خوش قسمتی پر رشک کریں+

عورت کی زندگی کا نہایت غائر مطالعہ حضرت نیاز نے کیا ہے
اب حسن خوابیدہ کو دو جملوں میں سن لیجئے:-

کیوپڈ نے اس سے قبل جب سائک کو باغ میں دیکھا تھا
تو وہ بے نقاب ضرور تھی مگر محو خواب نہ تھی لیکن اُسے
کیا خبر تھی کہ جب حُسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے اور جب
لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک
عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے+

جب سائکی کو وہ اونڈ پر یکہ و تنہا، درخت سے باندھ کے چلے
ہیں، اور دردناک نظارہ ہے۔ اس مختصر رسالہ میں اس درد کو اختصار سے
دل آویز پیرایہ میں بیان کرنا حضرت نیاز ہی حصہ ہے۔ کیوپڈ اور
سائکی کی گھاتوں میں کیا اچھا فرق دکھایا ہے:-

وینس کو یقین تھا اور ایک وینس کیا جو بھی کیوپڈ کی
بے پناہ ناوک اندازیوں کا حال سن چکا ہے وہ یقین
کرے گا کہ ایک سائک کیا اگر ویسی ہزار ہوں تو وہ
چٹکی کی صرف ایک جنبش سے سب کے دلوں کو چھلنی کر سکتا
ہے، مگر فطرت کے پاس ایک تیر اور تھا، ایک ناوک
اور تھا، جو کیوپڈ کے تیروں کی طرح بدنام نہ تھا مگر ان سے
زیادہ کارگر تھا، اور جس وقت سائک اس عالم میں آئی
تو وہ ناوک اس کی نشیلی آنکھوں میں نگاہ بنا کر رکھ دیا گیا،
کیوپڈ کو تو جراحت پہنچانے کے لئے قصد و ارادہ کی ضرورت
تھی، اہتمام و انصرام درکار تھا کہ کمان میں تیر رکھے، پھر
چلہ کھینچ کر چٹکی ڈھیلی کرے لیکن سائک کی مست آنکھوں
کو یہ ہوش کہاں۔ نہ وہ کسی قصد کو جانتی تھی اور نہ کسی اہتمام کو

نہ کسی ارادہ سے واقف تھی اور نہ کسی انصرام سے۔ ایک بار پلک سے پلک جدا ہوئی اور تیروں کی بارش شروع ہو گئی"۔

جب کیوپڈ سائکی کے باغ میں تیر نظر سے زخمی ہوتا ہے اس کی عاجزی ظاہر ہوتی ہے:۔

اے کیوپڈ تو نے لاکھوں دلوں پر تیر چلائے ہوں گے خدا معلوم کتنے سینے تو نے مجروح کئے ہوں گے لیکن وہ تیر جو حسن کے ترکش میں نہاں ہیں وہ پیکان جنہیں صرف ایک حسن دوشیزہ ہی کی نیم باز آنکھیں چلا سکتی ہیں تیری ناوک اندازیوں سے کہیں زیادہ تباہ کن ہیں۔

جذبات کا نہایت صحیح فوٹو اس کتاب میں جگہ جگہ اُتارا گیا ہے فقروں کی بندشیں، الفاظ کی شوکت، ترکیبوں میں معنی آفرینی، سب باتیں ایسی ہیں جن کے لئے موجودہ رسالہ میں سے کوئی نمونہ پیش کرنا مضمون ہذا کو فضول طوالت دینا ہے حضرت نیاز فتحپوری کا نام نامی ان کی کافی ضمانت ہے صرف دو اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں کیا اچھا نقشہ ہے!

"ان کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے سازنے تھے جن کے تاروں سے ارتعاش کے وقت عجیب مسکر خوشبو پیدا ہوتی تھی"

"غرضکہ وہ ساعت آئی، جب سائکی بے نقاب ہوئی۔ یوں تو جبتک وہ وقت نہیں آیا تھا ہر شخص ایک مستقل اضطرار ایک نمایاں بے چینی بنا ہوا تھا، لیکن جب وہ وقت آیا اور نقیبوں نے اس ساعت کا اعلان کیا کہ ؎

رضا دہید بتاراج ہوش اے یاراں

بہ بزم یار بر آمد نقاب بکشودہ

تو اتنے بڑے مجمع میں کوئی حرکت، کوئی صدا اثر حیات کا پتہ دینے والی نہ تھی، لب باہم متصل ہو کر رہ گئے تھے اور آنکھوں نے جھپکنا ترک کر دیا تھا"

اس رسالہ میں صرف دو کیرکٹر ہیں ایک کیوپڈ دوسرا سائکی فاضل مصنف نے غلطی سے سائکی کو حسن کی دیوی قرار دیا ہے حقیقت میں حسن کی دیوی صرف وینس ہے جیسا کہ خود اپنے رسالہ کے دوسرے شکریہ میں ظاہر کرتے ہیں۔ سائکی کے اصلی معنی روح کے ہیں۔ لغوی معنی روح مجسم سائکی کا لقب اسی سے بنا۔ کیوپڈ دو قسم کی طبیعت کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ اولاً اس اصل محبت کا جو نیچر میں ہر طرف نظر آتی تھی۔ ثانیاً اس محبت کا جو خواہش حیوانی کی مترادف ہے۔ فاضل مصنف نے کیوپڈ کو آخری حلیہ میں دیکھا ہے اسی وجہ سے ہم اس کے جذبات پر کسی قسم کی تعریض نہیں کر سکتے ورنہ یہ ہمیں ضرور کھٹکا تھا کیوپڈ کی خود کیا حالت تھی، وہ سائکی کے نرم و نازک جسم کو اپنے جسم سے متصل پا کر کیا سوچ رہا تھا؟ غالباً یہ سوال جواب طلب نہیں، کبھی وہ سائکی کی آنکھیں چومتا تھا اور کبھی لب، کبھی اس کے سینے سے آنکھیں ملتا تھا اور کبھی گردن سے۔ غرضیکہ وہ بالکل دیوانہ سا تھا، مجنون تھا اور اسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیونکر وہ سائکی سے سیر و آسودہ ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس نے سائکی کے پرنم ہونٹوں پر اپنے لب رکھدیئے اور وہ بھی مست ہو کر بالکل اپنے تئیں بھول گیا اور اس کی آغوش میں بیہوش ہو کر پڑ رہا۔

چونکہ یونانی خیالی داستانیں ذہن سے قریب قریب اُتر گئی ہیں، اور ہمیں بھی کوئی انگریزی کتاب آج کل میسر نہیں آئی اس لئے کیوپڈ کے اس رویہ پر ہم کچھ اظہار رائے نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے یہ جذبہ اس کی جانب سے درست ہو کیونکہ وہ سراسر جذبہ حیوانی تھا، اور اپنی صفات کا خود ہی مظہر تھا۔

سائکی اُلفت مجسم ہے، اس کا تخیل نہایت پاکیزہ اور ولولہ انگیز ہے اس کی شخصیت نے قصہ میں جان ڈال دی ہے۔ گو بعض جگہ اس کے جوش شباب نے انتہا پسندی اختیار کی ہے لیکن یہ بھی اس کا کیرکٹر ہے اور اس پر ہمیں موجودہ تنقید کے لحاظ سے کسی رائے زنی کا حق نہیں۔

انگلارس۔ کیوپڈس اور وینس کا جو کچھ حصہ اس فسانہ میں ہے۔ قابل تعریف ہے وہ حسد کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ زیفر اور رافیس کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف موکل کا کام کرتی تھیں، جو کچھ ان سے کہا گیا انہوں نے آن واحد میں کر دیا۔

بعض بعض جگہ زبان میں لغزش بھی ہے۔ کہیں دانستہ ہے کہیں نادانستہ یہ ترکیب کسی کو خوش نہیں آسکتی کہ "اڈوش جو نہایت ہی سنجیدہ وہتین دیوی تمام دیویوں میں تھی" یا جلدی جلدی سے سے شاہ بلوط کے اس درخت سے باندھ دیا جو سب سے زیادہ نمایاں وہاں کے درختوں میں تھا۔

خاموکن۔ بجائے لفظ ہے، ترکیب بھی غلط ہے:۔

انگارس و کیوپڈ میں بھی غیر معمولی حسین تھیں اور قدرت کے پاس اک آخری اور خاتمہ کُن تصویرِ حسن و شباب سائک اگر نہ ہوتی تو اس میں کلام نہیں کہ دونوں بہنیں بھی وہ چیز تھیں کہ دنیا انہیں کے لئے ترستی انہیں کے لئے تڑپتی +

بعض جگہ عبارت آرائی یا مضمون آفرینی میں تناقض بھی پایا جاتا ہے

اس نے اروش کو رخصت کیا اور کنیزوں سے وہ طلسم بند آئینہ منگوا کر اپنے سامنے ایک بلوریں میز پر رکھوایا اور سب کو علیحدہ کر کے تنہا اس کے روبرو آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی ...... جب اس نے آنکھیں کھول کر آئینہ کو ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہوئے دیکھا، جو حقیقۃً وینس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی اس کی نگاہیں کانپ کر گر پڑیں، آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور عجیب مضطربانہ انداز سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی +

وینس کنیزوں سے آئینہ منگا کے اپنے سامنے میز پر رکھوا دیتی ہے اور خود اس کے سامنے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ آئینہ میز پر ہے وفور حیرت و استعجاب میں آئینہ ہاتھوں سے کیسے چھوٹ پڑا۔ کیا سائکی کی تصویر نے یہ کمال بھی کیا تھا کہ اس کے انعکاس سے آئینہ فوراً ہی میز سے لپک کے وینس کے ہاتھوں میں آتھا +

عبارت ذیل میں کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے۔ زور قلم میں سائکی کا انسان ہونا فراموش ہو گیا۔ رسالہ کا پہلا ہی صفحہ ہے شرالہیت س بیچاری کو صفحہ ۲۲ پر نصیب ہوتی ہے۔ پھر یہ بجلی کی سی چمک کیسی؟

لیکن جب رات کو شاہی باغ کے صحن اور اس کے کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائک باغ میں نقاب اُلٹ اُلٹ کر پھول توڑ رہی ہے +

رسالہ کا آٹھواں شکر ریزہ اتنا مختصر ہے کہ پڑھنے والا بےمزہ ہو جاتا ہے جب سائکی وینس کے سامنے عالم خستگی میں لائی گئی تو جیوپیٹر نے کیوں وینس کو اس کے مار ڈالنے سے روکا؟ پراسرپائن کون تھی؟ اس کے صندوق کے لانے میں سائکی کو جو تکالیف برداشت کرنا پڑیں اُس منزل ہفتخوان کا کچھ تو ذکر ہوتا کیونکہ کیوپڈ اس شکل میں اس کا ہمنا تھا، غیبی طور سے اس کی امداد کرتا تھا۔ نہ اس میں اس کا ذکر ہے کہ ہیڈیس میں پہنچ کے اُسے صندوق کیسے ملا؟ جب وہ واپس ہو رہی تھی اور اُس نے وفور اشتیاق میں اس کو کھول لیا تو جو خوشبو اس صندوق سے نکلی اس نے سائکی کا کیا حال کیا اور پھر کیوپڈ نے کس طرح اسے بچایا؟ اس کمی نے اس رسالہ کی خوبی کو بہت کچھ کم کر دیا ہے امید ہے دوسرے ایڈیشن میں فاضل مصنف اس کی تلافی کر دیں گے +

یہ رسالہ چکنے کاغذ پر چھپا ہے قیمت صرف چھ آنہ ہے۔ سید جالب صاحب ایڈیٹر ہمدم لکھنؤ سے ملتا ہے۔ چھاپہ کی بعض جگہ فحش غلطیاں بھی ہیں نفاست پسند مصنف کے لئے اس سے زیادہ سوہان روح کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ اس کی تصنیف میں ایسی غلطیاں پیدا ہو جائیں جو اس کی تصنیف پر ستانظر آئیں۔ عقیدہ کو عیقدہ اور باوصف کو یاوصف جیسی غلطیاں دیکھنے سے فوراً آل جاتی ہیں۔ یہ رسالہ اس لائق تھا کہ اس کا پروف بار بار پڑھا جاتا، اور کوئی غلطی املا کی رہنے دی جاتی +

اس رسالہ کی ایک کمی اور ہے کہ تصاویر نہیں لگائی گئیں۔ وینس اور کیوپڈ کی نہایت عمدہ تصاویر مل سکتی ہیں حسن خوابیدہ کو بھی اگر تصویر کے ذریعہ دکھایا جاتا تو غضب ہو جاتا۔ سائکی کی تصویر بھی جستجو سے مل سکتی ہے فاضل مصنف کی یہ پہلی کوشش ہے جب اس کا دوسرا ایڈیشن نکلے تو وہ ضرور تصاویر کا بھی خیال رکھیں۔ یہ حُسن جذبات کا چشمہ وینس کی پریوں کے جلوے بغیر زیادہ دلفریب نہیں معلوم ہوتا +

حضرت نیاز فتحپوری اس سلسلۂ مضمون کو اگر جاری رکھیں تو اردو علم ادب کو بہت بڑا فائدہ پہنچائیں۔ ان کے قلم کے لئے یہ عنوان بہت مناسب ہے، یونانی دیوتاؤں کے افسانے ان کے قلم سے نکل کے اُردو زبان میں ایک قسم کا انقلاب پیدا کر دینگے۔ اس میں شک نہیں کہ اب ان خیالی داستانوں کا زمانہ گیا قصہ گل بکاولی قصہ ممتاز، قصہ حاتم طائی، طوطا مینا، طلسم ہوش ربا، بوستان خیال، فسانۂ عجائب عشقیہ جذبات کے کچھ کم جگمگاتے آئینے نہیں۔ ابھی پڑھنے والے ان کتابوں کو پڑھتے اور عشقیہ تاثرات پیدا کرتے اور سمجھتے ہیں لیکن اب کایا پلٹ گئی۔ مذاق تبدیل ہو گئے عام طور پر یورپ نے بھی ان یونانی تصوروں کو نہیں سمجھتے بلکہ ان داستانوں کا ہماری زبان میں آ جانا بہت ہی مستحسن ہے +

محمد ظفر وکیل گڑگانوہ

بشر ایک مقدر بیشمار

کسی کا سوال تھا کہ بشر جنس و نوع میں ایک ہی تو اس کی تقدیریں تفاوت در نگا رنگی کیوں ہی + اس میں دہریت کی بو نہیں تحقیق علمی کا ذوق۔ خودشناسی کا جذبہ اور پرواز حقیقت کا دلولہ پایا جاتا تھا + جناب شہزادہ میرزا امیرالملک بہادر یادگار خاندان چنگیز و تیمور نے اس کا جواب لکھا اور خوب لکھا + شہزادہ صاحب غدر سے پہلی دہلی کی نشانی ہیں۔ شہنشاہ دہلی بہادر شاہ سے قرابت خاص ہی نہیں رکھتے بلکہ ان کی آخری محفلوں کے دیکھنے والے اور ان کے چراغ سلطنت کی خموشی پر نظر حسرت ڈالنے والے ہیں۔ ان کے زبانی بیان میں ایسا بے ساختہ درد ہی کہ سنگ دل آدمی بھی ان کے افسانے سُن کر چشم پر آب ہو جاتا ہی + حقیر تخلص ہی۔ قوالی کی فارسی غزلوں پر ان کی اُردو نظمیں از حد مقبول ہیں۔ مشائخ کی مجالس میں وہ گائی جاتی ہیں اور ان پر خوب وجد و حال لوگوں کو ہوتا ہی + وہ اس بڑھاپے میں عجب زندہ دل مہذب ظریف اور خوش باش پائے جاتے ہیں۔ عشق کے ولولے اب تک جوان ہیں + دہلی کے علما مشائخ اور طبقہ امرا و حکام سلطنت میں ان کی بہت عزت ہی۔ اور تمام خاندان تیموریہ میں بلحاظ سن سال و بلحاظ علم و کمال وہ سب سے زیادہ بزرگ محترم مانے جاتے ہیں نقشبندیہ خاندان میں بیعت ہیں کے مجاز ہیں اور عموماً ان کے ہاں طلبگاران روحانیت کے جمگھٹے رہتے ہیں + اس سوال کے جواب لکھنے میں اس جذبہ کو بڑا دخل ہی جو درویشی نے ان میں پیدا کیا ہی۔ شاعری کے اعتبار سے میں نہیں جانتا یہ نظم کیسی ہی کیونکہ خود شاعر نہیں ہوں۔ اور فہم شعر کی تمیز نہیں رکھتا! البتہ استدلال اور طرز ادا کی تعریف کرنی پڑتی ہی کہ وہ بہت موثر اور دل پسند ہی۔ اور جیسے کہ دہلی کے علما نے اس جواب کو معقول اور کافی تسلیم کیا ہی میں بھی طالب علم کی حیثیت میں علما کی ہم نوائی کرتا ہوں + گو میرا خیال ہی کہ سوال کے الفاظ درست نہیں ہیں۔ کیونکہ کسی بشر کا مقدر الگ نہیں ہی۔ وہ ایک ہی ہی۔ فرق اعمال اور نتائج کا ہی جس کو بشر مقدر کی رنگا رنگی تصور کرتا ہی۔ اُمید ہی کہ کہکشاں میں تیموری فلک کے آخری ستارہ کی نظم دلی توجہ سے پڑھی جائے گی۔ حسن نظامی

الٰہی تری حد بے حد ہی جب — تو اُس کی کوئی حد کو پائے گا کب
ہی زیبا تری ذات تجھ کو خدا — بشر کوئی بھی اس کو پائیگا کیا
وہ سمجھے جو ہو کوئی تیرا نظیر — علیم و حکیم و خبیر و قدیر
ہوا ایسا کوئی یہ تو ممکن نہیں — تو حکمت کو سمجھے ہی ممکن کہیں؟
خدا وہ ہی جب چاہے جو کچھ کرے — کوئی کچھ سمجھنے کا کیا دم بھرے
کنہ اُس کی کیا کوئی پائے یہاں — بلا نکھے کیا اور کیوں اور کہاں
بھلا اُس کے کرنے میں چون چرا — اور اُس کے لئے پھر ہو کیوں اور کیا
ہو جس میں کہ کیا اور کیوں اور کہاں — خدایا بس اُس عقل سے الاماں
مقدر میں انساں کرے گفتگو — ہی نایاب شے کی اسے جستجو
یہ رستہ ملے گا کہیں خیر ہی — قدم اس میں رکھے تو اندھیر ہی
بجا وہ ہی جو اس کی تدبیر ہی — وہ موزوں جو جس کی تقدیر ہی
کیا اُس نے جو کچھ وہی ہی بجا — سمجھ کو کسی کی یہاں دخل کیا
جہاں عقل و دانش کی چلتی نہ ہو — وہاں عقل و دانش کو جانے نہ دو
سمجھ میں نہ آئے جو کچھ اُس کی بات — تو سمجھو سمجھ کی ہو کیا کائنات
یہ "چون و چرا" تو بڑا عیب ہی — نشانی تو ایماں کی "لاریب" ہی

جو اُس نے کیا ہی وہ ہی لا کلام — جو فرمائیں شارع علیہ السلام
اسے ماننا چاہئے بے دلیل — خلاف اس کے جو ہی ہی خوار و ذلیل
ہی کار خدا میں یہ دخل بشر — ذرا سمجھ پہنچے کدھر سے کدھر
یہی ہی نہ بس کہ سوال آپکا — بشر ایک ہی کیوں مقدر جدا!
یہ ہی انتظام خدائے علیم — مگر وہ ہی سمجھے جو ہو گا فہیم
تعلق صفاتی مقدر سے ہی — ہی بہتر سے بھی اور بدتر سے ہی
کیا آپ جس طرح چاہا کیا — ہی مختار ہونے کا یہ مدعا
جسے ہو تمام و کمال اختیار — تو طاعت ہر ایک کے گلے کا ہو ہار
حکومت میں اپنی جسے ہو کمال — تو پھر اُن و آں کی کسے ہو مجال
اسی پر ہی فرمان عز و جل — کہ یہ ہیں کالانعام بلکہم اضل
وہ اچھوں کو دیتا ہی عقل سلیم — کہ ہی ذات اُس کی علیم و حکیم
جو چاہے کرے شان مختار ہی — کسی اور کا دخل ناچار ہی
تقاضائے قدرت یہی ہی ضرور — کہ سب کا ہو عنوان طرح طرح کے ظہور
اسی واسطے ہی ضرور اختلاف — سمجھ کر چلو تو یہ رستہ ہی صاف
ہر اک شی کی ہی موجب قدر ضد — کسی سے اکیلے کی ملتی ہی مدد؟

ہر اک شان کا مختلف ہے ظہور
ہر اک آن میں ہے جدا اُس کا نور

جو یکساں کرے خالق بے نظیر
نہ ہو پھر علیٰ کل شئی قدیر

یہی خالقیت کا ہے مقتضا
کہ ہر چیز ہو ہر طرح سے جُدا

دکھائی سنائی بتائی جدا
کہ دیکھو سنو اور سمجھو ذرا

کہ خالق ہوں ہر طرح ہر طور کا
اجارہ نہیں ہے کسی اور کا

نہیں خالقیت کا ہرگز کمال
کہ سب ایک ہو وہ سراسر محال

نہیں ہے یہ خالق کی قدرت کی شان
کہ پیدا کرے ایکساں سب جہان

وہ ہر طرح ہر طور مختار ہے
یہی خالقیت کا اظہار ہے

تمہاری سمجھ کو ہوا آج کیا
خدا کو بھی سمجھا ہے محتاج کیا

دکھاتی ہے یہ قدرت بے نظیر
کہ ہیں ہم علیٰ کل شئی قدیر

مقدر نہ ہوتا جو سب کا جُدا
تو دنیا میں ظاہر نہ ہوتا خدا

جو ہر چیز کا یاں نہ ہوتا بدل
عبث ہوتا سارا ہی حکم ازل

یہاں سارے گونگے ہی ہوتے اگر
تو باتیں کہاں تھیں بیاں تھا کدھر

کوئی گونگا کیوں کر کسی کو بتائے
زباں لائے کو ڈھونڈھنے کون جائے

اگر ہوتا سارا جہاں کور کر
نہ سب دیکھتا اور سنتا بشر

بچے آج اور مرنا کل ہو گیا
یہ عالم ہی سارا زٹل ہو گیا

نہ تجہیز ہے اور نہ تکفین ہے
نہ کچھ کفر ہے اور نہ کچھ دین ہے

جو سب گورے ہوتے تو کالا کہاں
ہے کالا تو گورا نہ ہوتا یہاں

جو ہوتے جہاں میں سبھی بادشاہ
تو تھا بادشاہی کا ساماں کیا

جو تکلیف دنیا میں ہوتی نہیں
تو راحت کی پھر قدر ہوتی کہیں

ہدایت ہی ہوتی جہاں میں تمام
تو دنیا میں ہوتا ضلل کس کا نام

ضلالت نہ ہوتی جو جادہ نما
تو ہوتی ہدایت کی پھر قدر کیا

زیادہ کوئی اور کوئی کم نہ ہو
تو پھر تو یہ عالم ہی عالم نہ ہو

سبب کیا تھا اس عالم اسباب کا
سبب کا ہی باقی نہ لگتا پتا

ہوئے پیدا اور ہوتے ہی مر گئے
خبر کیا ہے کیوں آئے کیا کر گئے

برا ہوتا کوئی نہ اچھا کوئی
نہ جھوٹا کوئی اور نہ سچا کوئی

اگر ایکساں سب کی تقدیر ہو
تو کیا فرق کی کیجئے تدبیر ہو

صفاتی تجلی ہے عالم تمام
ہے عنواں طرح کی یہ تقسیم عام

جو اسم صفاتی ہیں سارے جدا
جدا ہونا مظہر کا ہے مقتضا

ہے اسم خدائے تعالیٰ غفور
تو معتوب اس کے لئے ہے ضرور

کہے گر کوئی یہ کہ بدتر ہے کیوں
بدی بھی کسی کا مقدر ہے کیوں

دیا چلتی گاڑی میں روڑا اڑا
مجھے پھر دوبارہ یہ کہنا پڑا

جواب اس کا ہے پھر وہی دیکھ لو
اب آنکھوں کو پھر اپنی تم سینک لو

اگر اک صفت کو وہ ظاہر کرے
تو پھر دوسری اپنی وہ کیا کرے

تقاضائے قدرت یہی ہے ضرور
کہ ہر شئی کا عنواں طرح ہو ظہور

ضلالت کے مظہر کا شیطان نام
ہدایت کا آدم علیہ السلام

اب اسمائے بیجا اظہور صفت
تو کثرت کی جانب ہوئی احدیت

قیاس ان مثالوں پہ کر لو میاں
ہر اک بات ان ہی سے ہے درمیاں

اس عالم میں بے دخل ہو کر رہو
کہو تو موافق نبی کے کہو

نبی کون یعنی رسول کریم
نبوت کے دریا کا درِ یتیم

اُسے حق نے محبوب اپنا کیا
محب بن کے سب زور اپنا دیا

یہ قصہ بنا ہے نہ کچھ ہے عجیب
کہ ہوتا ہے نائب بجائے منیب

جو حرکت ہے طبع کی لازمی
وہ ہے لازمی ہو گی تابع کی بھی

نہ کہنا خدا کے برابر کیا
خدا سے ڈرو جی یہ کیا کہدیا

خدا پاک ہے وحدہٗ لاشریک
بشر کیا کوئی اُس کا ہوگا شریک

مگر رتبہ محبوب کو جو دیا
وہ بے انتہا ہے پر اُس کی عطا

سبھی کچھ خدا نے دیا احترام
علیہ الصلوٰۃ علیہ السلام

یہ قصے تو سارے صفاتی ہوئے
یہ سارے کے سارے براتی ہوئے

کہ وہ لاپتا تو ہے ذات والا صفات
ہے یاں با ہمہ بے ہمہ ایک بات

وہ یکتائی میں اپنی یکتا ہے آپ
وہ اُس کی کنہ خود سمجھتا ہے آپ

ہماری سمجھ کا یہاں کیا شمار
کہ ہو ایک سے جس میں دو تین چار

بشر کیا ہے اور ہی سمجھ اُس کی کیا
وہ ہے اس سمجھ سے وراء الورا

وہاں ایک ہی کفر اسلام ہے
کہ ذات احد کا یہی کام ہے

خدایا تجھے یہ ہی کہنا پڑا
وراء الوراء وراء الوراء

بس اب تم بھی خاموش اکبر رہو
سنو سب کی اور کچھ نہ اپنی کہو

تو کچھ بھی نہ کہنے کے قابل نہیں
ذرا پہلے خود تو سمجھ لے کہیں

تاثرات

الم نصیب ہوں افسردہ ہوں نزار ہوں میں
کہ اک بجھی ہوئی شمع سرِ مزار ہوں میں

سکوتِ شامِ ابد تک امیدِ عیش نہیں
نمودِ صبحِ ازل سے جو سوگوار ہوں میں

خمارِ بزمِ شبانہ ہے میری آنکھوں میں
خروشِ محفلِ دوشیں کی یادگار ہوں میں

فراق میں ہے جگر داغ داغ اے ہمدم
خزاں کے عہد میں گلزارِ نو بہار ہوں میں

عیاں ہے میری خموشی سے دردِ پنہانی
فغاں کا شور نہیں آنسوؤں کا تار ہوں میں

اگرچہ رہ نہیں سکتا مگر ہے قصدِ فغاں
اسیرِ کشمکشِ جبر و اختیار ہوں میں

بیانِ حسرت و حرماں مری کہانی ہے
شکایتِ ستم و جورِ آسمانی ہے

وفورِ غم نے کیا مائلِ فغاں مجھ کو
ستانے آئی ہے پھر یادِ رفتگاں مجھ کو

جو محفلیں ہوئیں نذرِ تظلم گردوں
میں ذکر ان کا کروں تاب ہی کہاں مجھ کو

غبارِ راہ ہوں یا نقشِ پائے راہرواں
کہ پیچھے چھوڑ گئے اہلِ کارواں مجھ کو

اجاڑ ہو گیا اپنا ہرا بھرا گلزار
پسند آئے گی کیا سیرِ گلستاں مجھ کو

چمن میں میں گلِ سرسبد تھا کبھی ایسا
کہ جانتے تھے سبھی فخرِ بوستاں مجھ کو

مگر زمانۂ حاضر میں ہوں وہ برگِ خزاں
کہ ننگِ نسل سمجھتے ہیں باغباں مجھ کو

"دریں چمن کہ کسے نشنود فغان مرا
کجاست برق کہ بردارد آشیان مرا"

"گمنام"

کلام طالب

(از جناب طالب بنارسی)

وسیلہ چاہیے اجرائے کار سے پہلے ہوا ہمیشہ چلے گی غبار سے پہلے

طلب کی راہ میں اکثر لگا کے شوق کے پر پہنچ گیا ہے سپاہی سوار سے پہلے

جہاں سنو یہی کہتی ہے آج کی دنیا جہاں میں رہتے تھے ہم کس وقار سے پہلے

جو اعتبار نہیں ہے تو زندگی ہے فضول اُٹھائیں مجھ کو مرے اعتبار سے پہلے

کڑی نگاہ رہے طفلِ دل کی چالوں پر روا ہے بچے کی تنبیہ پیار سے پہلے

یہ کارگاہِ جہاں عدل کا مقام نہیں عیاں ہے جبر یہاں اختیار سے پہلے

ہوائے نوش چلی ہے گزندِ نیش کے بعد خزاں ریاض کے سر ہے بہار سے پہلے

عبث جہاں کے لئے تھا جہان کا رونا یہ کہ رہے تھے ہم اس چشم نثار سے پہلے

کمان کشی پہ جنہیں ناز تھا وہ صید افگن شکار ہو گئے آپ ہی شکار سے پہلے

کسی کو دل بھی اگر دو تو اس طرح طالبؔ
صلاح کر لو کسی ہوشیار سے پہلے

قند پارس

(از حضرت نیاز فتحپوری)

توئی واعظ و ہوشے و کنارِ امن کوشے من و لغزشے و سیلِ نمِ چشمِ مے فروشے

نظرِ ستم پرستم چہ شود خبر نہ دارم ز نگاہِ کیف پرور اگر دہی تو نوشے

چہ زیدَ کسے بہ عہدِ نگہِ کرشمہ سازت کہ چکد ہزار بابل ز نگاہِ سحر کوشے

چو شدست حق پسندے بہ ہمیں مقالِ واعظ نہ دہی مرا خدایا سرِ گوشِ حق نیوشے

ز نیاز ہم ربودے دلِ پُرسکوں چو دیدے سحرِ بیاضِ گردن، قمرِ برہنہ دوشے

خیالاتِ واقف

(حضرت واقف بہاری بی۔اے)

بہ تتبع حضرت مومن مغفور

ہے مشقِ جفا غیر پہ، انداز تو دیکھو
اور کرتے نہیں مجھ پہ ستم ناز تو دیکھو

انجامِ محبت کی ذرا فکر نہیں ہے
افسونِ دل آویزیٔ آغاز تو دیکھو

اُف رے لبِ خاموش کی افسانہ طرازی
رنگینیٔ طرزِ سخن راز تو دیکھو

بے سود ہوا صیدِ دلِ غمزدہ اپنا
بیدادِ گلوگیریٔ آواز تو دیکھو

اس گوشۂ دامن کے لئے خاک ہوا ہے
تم حوصلۂ عاشقِ جانباز تو دیکھو

بے موت مجھے مارا ہے اس بت نے، یہ سچ ہے
لیکن بخدا جدتِ اعجاز تو دیکھو

اُلجھے ہیں پر و بال مرے تارِ قفس میں
بیچارگیٔ حسرتِ پرواز تو دیکھو

معلوم نہیں لب پہ دعا ہے کہ شکایت
یہ طرفگیٔ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو

آتے ہی خیال اس کا ہوئی جامہ دری بند
اک دشمنِ ناموس کا اعزاز تو دیکھو

میں موجدِ ترکیب ہوں واقف کہ مقلد
مومن کا غزل میں مری انداز تو دیکھو

غزل

(از چودھری محمد وزیر حسن صاحب نشتر سندیلوی)

وہ نگاہیں موت کا دلچسپ ساماں ہو گئیں
یعنی نشتر بن کے پیوستِ رگِ جاں ہو گئیں

ہائے یاد آ آ کے ظالم کو مری مجبوریاں
رخنہ اندازِ تبسم ہائے پنہاں ہو گئیں

اپنی بے بنیاد اُمیدیں یہ سب فرضی سہی
کچھ تو تسکینِ دلِ مضطر کا ساماں ہو گئیں

دلستاں ہو کر ادائیں اک تغافل کیش کی
مرنے والے کے لئے غارتگرِ جاں ہو گئیں

چار قطرے اشکِ غم کے وہ بھی یوں تھے بیخبر
ظرف ہی کیا ایسی آنکھوں کا جو گریاں ہو گئیں

اُن نگاہوں نے وہ کچھ ریشہ دوانی دل میں کی
سلسلہ جنبانِ ذوق و شوقِ پنہاں ہو گئیں

نشتر اُن شمعوں کا ہوں ممنونِ دلسوزی ضرور
جو گھڑی بھر رونقِ گورِ غریباں ہو گئیں

جذباتِ یاس

(از جناب مرزا واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی)

کھل گئے عیب و ہنر سب کاتبِ تقدیر کے
رنگ ہیں آمادۂ پرواز ہر تصویر کے

ذرے ہی پارس تھے اپنی خاکِ بے تاثیر کے
آشنا تھا کون پہلے نام سے اکسیر کے

ڈوب کر لائے تہِ دریائے فطرت کی خبر
فکر سے جوہر کھلے آئینۂ تدبیر کے

شوقِ منزل میں زمیں پر پاؤں ٹکتا نہیں
حوصلے پھر کیا بڑھیں گے خارِ دامنگیر کے

وہم باطل ہے سراسر صورت آبادِ جہاں
راز کھل سکتے نہیں اس خواب بے تعبیر کے

پھٹ پڑے دیوار و در پردہ نہ اپنا کھل سکا
رنگ بیڈھب ہو چلے ہیں آسمانِ پیر کے

لذتِ دردِ نہاں اک معنیٔ بے لفظ ہے
اضطرابِ بے سبب قابل نہیں تحریر کے

نوح کا طوفان جن کے حق میں ہو بادِ مراد
وہ کبھی قایل نہ ہوں گے گردشِ تقدیر کے

کوئی تصویرِ خزاں ہے کوئی تصویرِ بہار
دیدنی ہیں کارنامے خامۂ تقدیر کے

کارخانہ تھا ہوا پر حسنِ مشتِ خاک کا
کھل گئے آخر فریب اس بولتی تصویر کے

کوئی بندہ عشق کا ہے کوئی بندہ عقل کا
پاؤں اپنے ہی نہ تھے قابل کسی زنجیر کے

خاک میں مل جائے گی سب عزتِ ذاتی
ظلم کے ہاتھوں اگرچہ سر کٹے شمشیر کے

یاس سر سے پاؤں تک امید ہی امید تھے
فرد جب تک ہاتھ میں تھی کاتبِ تقدیر کے

نقوشِ مانی

(سید کلب احمد صاحب مانی جائسی)

عشرتِ عہدِ گزشتہ کو بس اب یاد نہ کر
اے دل! اس طرح تمنا مری برباد نہ کر

کہنے سننے سے خیالِ دلِ ناشاد نہ کر
جی میں جو ہے وہی کیوں اے ستم ایجاد کر

حشر تک کے لیے خاموش ہوا وہ قیدی
کل جسے حکم دیا تم نے کہ فریاد نہ کر

ہم قفس! ہاں گلہ جائز نہیں میں بھی چپ ہوں
تو بھی اب ذکرِ خوش اخلاقیِ صیاد نہ کر

ہائے رونا تو ہے عادت تری اے مانی
کچھ نیا شیوۂ اظہارِ غم ایجاد نہ کر

اخلاقی غزل

(مولوی سید غلام مصطفےٰ صاحب فریں حیدرآبادی)

وقتِ غضب کلام میں لطفِ بیاں نہیں
یوں چپ ہوں میں کہ منہ ہی میں گویا زباں نہیں

قانع! تجھے اگر ہوسِ این و آں نہیں
ہے سود کی امید کہ بیمِ زیاں نہیں

دیکھو جہاں عروج تو سمجھو وہیں زوال
وہ کونسی بہار ہے جس کو خزاں نہیں

نرمی اگر زباں میں نہیں تو نہیں ہے سود
سختی اگر زباں میں نہیں تو زیاں نہیں

ہے عاجزی پسند ہماری فروتنی
جھک جائے آگے تیر کے یہ وہ کماں نہیں

ٹوٹے نہ بارِ غم سے کہیں رشتۂ حیات
سمجھو اگر یہ جان نہیں تو جہاں نہیں

اس کی خوشی نہیں کہ نہیں خوفِ جنگ کا
اس کا ہمیں ہے رنج کہ گنج گراں نہیں

دشمن ہو مہرباں بھی تو سمجھو نہ اس کو دوست
ناخوش اگر ہو دوست تو نامہرباں نہیں

یہ جان لے کہ میان سے نکلی ہوئی ہے تیغ
قابو میں وقتِ غیظ جو تیری زباں نہیں

بے مہریٔ زمانہ تو اب عام ہر ذہین
کس سے امیدِ مہر ہو جب مہرباں نہیں

(ابو الفیض فیاض داز حیدرآباد دکن)

جلد ۴	فہرست مضامین کہکشاں بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء	نمبر ۴

تنبیہ:۔ جتنے مضامین کہکشاں کے اس نمبر میں درج کئے گئے ہیں۔ ان سب کے حقوق محفوظ ہیں۔

تقریب

زمین بحیثیت ایک مقناطیس کے - جناب پروفیسر ماجد صاحب نے بہت عرصہ کے بعد اپنی توجہ کہکشاں کی طرف مبذول فرمائی ہے - ہم ان کے نہایت ممنون ہیں - لیکن ہمیں ان سے نیازمندانہ شکایت بھی ہے - اور ہم یہ عرض بھی کئے بغیر نہیں رہ سکتے - کہ ایک تو وہ کہکشاں پر سلسلۂ عنایات برابر جاری رکھیں - اور دوسرے جب کبھی کچھ لکھیں - ایک ہی دفعہ مکمل مضمون بھیجدیا کریں - کسی مضمون کا ایک حصہ مارچ سنہ ۱۹۱۹ء کے پرچے میں اور دوسرا اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہونا بہت قابل اعتراض معلوم ہوتا ہے -

اصلاح - منشی پریم چند صاحب کے لکھے ہوئے افسانے جہاں فطرت انسانی کی مصوری کے بہترین نمونے ہوتے ہیں - وہاں ان کے نتائج بھی قوم کے اخلاق و معاشرت پر نہایت گہرا اور مفید اثر کرتے ہیں - چنانچہ اس افسانے میں پریم شنکر کی زندگی اور اس کی تقریر - معاشرت کے بلند ترین اصولوں کا نچوڑ ہے - اور دل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے - اگر یہی اثر عام طور پر عمل کی شکل اختیار کرلے - تو ظاہر ہے - کہ یہ دنیا نمونہ جنت ہو جائے - ملک کو ایسے بالغ نظر اور خیر خواہ قوم انشا پردازوں کی بے حد ضرورت ہے -

خیالات شفق - مولانا شفق عمادپوری ہندوستان کے خوشگو شاعروں میں سے ہیں - جہاں مہارت فن نے ان کے کلام کو نقائص شعری سے پاک کیا ہے - وہاں دلی خلوص و درد نے اس میں تاثیر بھی پیدا کی ہے - موصوف کا کلام ہندوستان کے اچھے اچھے ادبی رسالوں میں شایع ہوتا ہے - ہم اس ... غزل ... کے بہت ممنون ہیں لیکن محض غزل سے کچھ نہیں بنتا - ہندوستان کے حصہ نظم کی کمی پوری کرنے کے لئے آپ کی نیچرل اور تاریخی و اسلامی نظموں کی بے حد ضرورت ہے ... -

عرض حال

بعض حضرات نہایت مہربانی سے کہکشاں کے لئے مضامین یا نظمیں ارسال فرماتے ہیں - لیکن جب ان کے نتائج تخیل رسالے کے معیار ادارت میں پورے نہیں اترتے اور درج نہیں ہو سکتے - تو وہ بہت ناراض ہوتے ہیں - کبھی ابنائے زمانہ کی ناقدردانی کا شکوہ فرماتے ہیں کبھی اپنی بدقسمتی پر نالاں ہوتے ہیں - اور کبھی ہمیں بد مذاق کم سواد اور نافہم سمجھتے ہیں + ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں "کہ آپ نے میرا مضمون درج کرنے سے انکار کردیا بہت برا کیا - میں ڈرتا ہوں کہیں آپ کو آیندہ زمانے میں اپنی اس حرکت پر پشیمان نہ ہونا پڑے - کیونکہ میں عنقریب ہندوستان کا ایک بہت بڑا انشا پرداز بننے والا ہوں" + آپ کی یہ اولوالعزمی ہمارے سر آنکھوں پر لیکن محض یہ ادعا ہی مضمون کو قابل اندراج بنانے کے لئے کافی نہیں مضمون میں کچھ ہونا بھی چاہئے +

ایک تعلیم یافتہ اور "نقاد" مضمون نگار نے اپنے کسی دوست کی دو تین نہایت مبتذل - عامیانہ اور پرانے رنگ کی غزلیں بھیجیں - غزلوں سے شاعر کی کم مشقی کا بھی پتہ چلتا تھا - ہم نے نہایت ادب کے ساتھ ان غزلوں کے چھاپنے سے معذوری ظاہر کی - لیکن انہوں نے خلاف توقع یہ جواب لکھا کہ مجھے آپ کی رائے سے قطعی اختلاف ہے - میں نے اپنی رائے میں یہ غزلیں کہکشاں کے رتبے سے بہت بلند تصور کرکے کہکشاں کی عزت افزائی کے لئے بھیج دی تھیں "معاذاللہ کہکشاں کی اس توہین کی بھی کوئی حد ہے

> بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

بہرحال ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جو حضرات اپنے مضمون کے عدم اندراج پر اظہار ناراضی کرنا چاہتے ہیں انہیں ایڈیٹر کی مجبوریوں کا بالکل احساس نہیں ہوتا - انہیں چاہئے کہ صبر و سکون سے کام لیں - اور آیندہ بہتر لکھنے کی کوشش کریں - ممکن ہے - کسی دن وہ اس قابل ہو جائیں -

بزمِ انجم

معارف

ماہِ مارچ کے معارف میں مولانا ابوالحسنات نے "مسئلہ خلافت پر قرآن مجید اور احادیث نبوی کی تصریحات" کے عنوان سے ایک جامع اور مدلل مضمون لکھا ہے۔ اس میں خلافت کے حقوق و فرائض۔ مسئلہ مقامات مقدسہ۔ جزیرۃ العرب کے احکام۔ فلسطین و شام و عراق وغیرہ کے متعلق معلومات وہنی بہت جامعیت کے ساتھ مہیا کی گئی ہیں۔ عیسائی مذہب کی تمدنی ناکامیابیوں پر مولانا عبدالسلام نے اچھا مضمون لکھا ہے۔ مسٹر معین الدین انصاری کا ایک مضمون کیمبرج یونیورسٹی کے نظام اور طریق کار کے متعلق درج ہے۔ اس میں بہت سی ضروری معلومات موجود ہیں۔ تلخیص و تبصرہ کے کالم میں ہمیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوا۔ کہ مصر میں بعض علمائے آثار قدیمہ کو بوسیدہ چرمی کاغذات پر حضرت یوسف اور زلیخا کا قصۂ عشق لکھا ہوا دستیاب ہوا ہے۔ اس قصے کے بعض اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہ اقتباسات اس "احسن القصص" سے بہت مختلف ہیں۔ جو قرآن مجید یا توریت میں مذکور ہے۔ ممکن ہے۔ یہ یوسف زلیخا کوئی اور ہوں۔ بہرحال چاہئے تھا۔ کہ معارف تاریخی نقطۂ خیال سے اس جدید دریافت شدہ قصے پر تنقید کرتا۔

تمدن

معلوم ہوتا ہے قاری عباس حسین صاحب اب اپنی روز افزوں قومی مصروفیتوں کی وجہ سے تمدن کی ترتیب و تہذیب میں زیادہ سرگرم نہیں رہے خصوصاً ماہ اپریل کے پرچے میں تو نہایت معمولی مضامین درج ہوئے ہیں جن میں سے کوئی بھی قابل ذکر نہیں۔ ہاں حصۂ نظم میں آغا شاعر صاحب اور جناب محشر کی غزلیں اچھی ہیں ✦

اس مہینے قاری صاحب نے اعلان کیا ہے۔ کہ آئندہ تمدن کے مضامین چار حصوں پر منقسم ہوں گے جن میں سے ایک حصہ خواتین و اطفال کے لئے وقف ہوگا۔ یہ اعلان تو نہایت معقول ہے۔ لیکن اس پر عمل کرنا نہایت نازک کام ہے وہ آزاد ادبی رسالہ جس میں جذبات عشق و محبت کے مضامین۔ اور عاشقانہ غزلیں بے تکلف درج کی جائیں۔ عورتوں اور بچوں کے پڑھنے کے لئے بمشکل دیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر آپ رسالے کی ادبی پالیسی بدل دیں۔ اور اسے محض اخلاقی و تعلیمی بنیادوں پر البتہ یہ خواتین و اطفال کے لئے موزون ہو سکتا ہے۔ ورنہ عورتوں اور بچوں کے ہاتھوں میں یہ رسالہ دے کر ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے حصے کے سوا اور کوئی مضمون پڑھنے کی کوشش نہ کریں گے بالکل بعید از قیاس ہے ✦

سخن سنج

حکیم محمد سراج الحق مینیجر رسالہ دلگداز کی ایڈیٹری میں لکھنؤ سے ایک سہ ماہی ادبی رسالہ نکل رہا ہے۔ کتابی تقطیع کے ۴۸ صفحے اس کی ضخامت ہے۔ سالانہ قیمت صرف دو آنے مقرر ہے۔ اگر

صرف حصہ نظم منگائیے۔ تو سات آنے سالانہ۔ جنوری کا پرچہ ہمارے سامنے ہے۔ حصہ نثر سولہ صفحوں پر حاوی ہے۔ اور اس میں ہندوستان کے پہلے مسلمان حکمرانوں یعنی سلاطین خاندان غلاماں کے مختصر حالات لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد نظم کا حصّہ شروع ہوتا ہے۔ مولانا سید اکبر حسین الہ آبادی کا "تحفۂ درود" اور جناب شفیق عماد پوری کا "تمغائے رسالت" اچھی نظمیں ہیں۔ حصّہ غزلیات میں تقریباً ایک سو غزلیں درج ہیں۔ اور بعض بہت نومشق شعرا کی معلوم ہوتی ہیں۔ آرزو۔ ریاض۔ جلیل۔ ہنر۔ کوثر۔ عارف۔ صفدر۔ شفق۔ شہید۔ جاوید۔ ثاقب وغیرہ کی غزلیں اچھی ہیں +

حصہ نظم میں میر احدی صاحب اکبری نے اس مشہور شعر پر تضمین کی

اے بسرا پردہ یثرب بخواب
خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

ظاہر ہے۔ کہ یہ شعر "مفتعلن مفتعلن فاعلان" کے وزن پر ہے۔ لیکن میر احدی صاحب نے جو اشعار تضمین میں لکھے ہیں اُن کا وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ہے۔ دو تین شعر سنیئے

درد قومی سے ہوا اک شب یہ حال
روتے روتے لگ گئی چشم پُر آب
روضۂ سلطان دین آیا نظر
کھل گیا میرے لئے جنت کا باب
پھر خیال آیا جو کچھ اسلام کا
آگیا طبع رسا میں انقلاب

وغیرہ وغیرہ

میر احدی صاحب راجپوتانے کے مشہور شاعر ہیں اور عرصے سے شعر کہتے ہیں۔ افسوس ہے وہ عروض سے اس قدر بے خبر ہیں۔ کہ شائد طالب علم اُن سے زیادہ جانتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب سخن سنج پر بھی تعجب ہے۔ کہ انہوں نے ایسی غلط نظم "فطرت قلم جناب نثار الملک میر احدی صاحب" کے نام نامی سے کیونکر منسوب کردی +

بحیثیت مجموعی رسالہ اچھا اور سستا ہے۔ شاعری کے شوقین حضرات منگائیں اور لطف اندوز ہوں۔ دلگداز پریس گڑہ بنرن بیگ خاں۔ اس کے ملنے کا پتہ ہے۔

ثمرۂ صداقت

محترم محمد علی و شوکت علی جب قید فرنگ سے رہا ہونے کے بعد دہلی تشریف لے گئے۔ تو دہلی والوں نے ان کا بہت شاندار استقبال کیا۔ اور بہت دھوم دھام سے جلوس نکالا۔ باشندگان دہلی کے اڈریس کے علاوہ ایک ایڈریس "جمعیت عالیہ خوشنویسان ہند" کی طرف سے بھی ان کے روبرو پیش کیا گیا۔ چونکہ وہ دن دہلی میں بہت شان و شوکت کا تھا۔ ہر طرف قومیت اور جوش حب الوطنی کے نظارے دکھائی دیتے تھے۔ اور یہ ضروری تھا۔ کہ اس جوش و خروش کے حالات قلمبند کر کے محفوظ کر لئے جائیں۔ چنانچہ ملک الکلام جناب قوی امروہی نے وہ تمام حالات ایک چھوٹے سے رسالے کی شکل میں چھاپ کر شائع کر دیئے ہیں۔ اس رسالے کا نام "ثمرۂ صداقت" ہے۔ کتابی تقطیع کے ۵۶ صفحوں پر ختم ہوا ہے۔ کاغذ خاصا۔ لکھائی چھپائی نفیس۔ قیمت فی جلد آٹھ آنے۔ ہم سفارش کرتے ہیں۔ کہ جذبات قومی اور محبت رہنمایان قوم کو تازہ رکھنے کے لئے ہر شخص کو یہ کتاب پڑھنی چاہئے + عبد القدیر والاخوان تاجر کتب تاجران کتب نمبر ۹۴ چھتہ لال میاں دہلی سے طلب فرمائیے

شکل (۲) مقناطیس سے چھونے اور رگڑنے کے بعد مرکز ثقل سے لٹکنے کے باوجود ایک سرا اس نیچے کی طرف جھک جاتا ہے۔

مقناطیسی سوئی کا یہ جھکاؤ (انصباب) سطح زمین کے اوپر مختلف مقامات پر مختلف ہوتا ہے۔ شمال کی طرف جاتے ہوئے یہ جھکاؤ بڑھتا جاتا ہے۔ اور خط استوا کی طرف آتے ہوئے گھٹتا جاتا ہے۔ زمین کے شمالی قطب کے قریب جا کر ایک مقام ایسا آتا ہے کہ مقناطیسی سوئی وہاں بالکل عمودی ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کا ایک سرا زمین کی طرف جھک جاتا ہے اور دوسرا سرا اوپر کی طرف عموداً اٹھ آتا ہے علی ہذا القیاس خط استوا کے قریب مقناطیسی سوئی بالکل متوازی الافق ٹکتی ہے زمین کے جنوبی نصف کرہ میں مقناطیسی سوئی کا جھکاؤ اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی بخلاف شمالی نصف کرہ کے وہاں سوئی کا شمالی [illegible] کی طرف اٹھا رہتا ہے۔ اور جنوبی قطب نیچے کی طرف جھک جاتا [illegible]
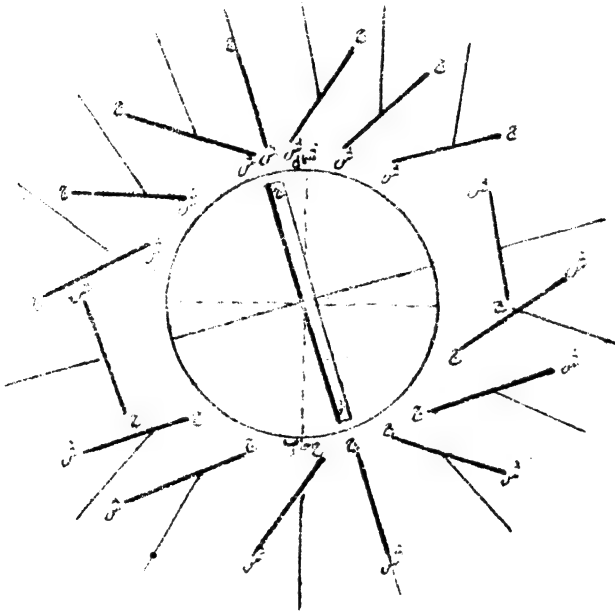
شکل (۳) زمین بحیثیت ایک مقناطیس کے

اس شکل میں زمین کے مقناطیسی قطب جغرافی قطبوں سے الگ دکھائے گئے ہیں۔ اور مقناطیسی سوئی کے جھکاؤ کو مختلف مقامات پر ظاہر کیا گیا ہے کسی مقام پر انصباب کی سمت دریافت کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ ارضی کرہ پر اس مقام کو چھوتا ہوا ایک خط مستقیم کھینچیں۔ اس شکل سے مختلف مقامات پر یہ خطوط [illegible] ان مقامات پر سوئی کا [illegible] انصباب [illegible] ہے۔ مقناطیسی [illegible] سطح زمین [illegible] خط کا نام ہے [illegible] مقامات [illegible] سوئی متوازی الافق ٹکتی ہے۔

مقناطیسی سوئی کے (ایک ہی مقام پر) ہمیشہ ایک ہی سمت میں لٹکنے کا کیا سبب ہے؟ نیز اس کے جھکاؤ کی کیا وجہ ہے؟

وہ کونسی طاقت ہے جس کے باعث مقناطیسی سوئی مرکزِ ثقل سے لٹکائے جانے کے باوجود اکثر مقامات پر متوازی الافق نہیں لٹکتی؟ گلبرٹ سے قبل ان سوالات کے متعلق جو غلط قیاسات رائج تھے۔ ان کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ گلبرٹ نے غور و خوض کے بعد معلوم کیا۔ کہ زمین ایک بڑے مقناطیس کی طرح تمام مقناطیسی اشیا پر عمل کرتی ہے۔ اس نے لوہے کا ایک ٹھوس گولا (مدور کرہ) بنایا۔ اور اسے مقناطیسی پتھر سے بار بار رگڑ کر مقناطیس بنا لیا۔ لوہے کا یہ مقناطیسی گولا "مقناطیسِ اعظم" یعنی زمین کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھا۔ اس کو آزمانے کی خاطر گلبرٹ ایک چھوٹی سی مقناطیسی سوئی آہنی کرہ کے قریب لایا۔ اس نے دیکھا۔ کہ مقناطیسی سوئی کے سرے گولے کے مقناطیسی قطبوں کی طرف رہتے ہیں۔ اور یہ کہ اس کا جھکاؤ گولے کی سطح کے قریب مختلف مقامات پر اسی طرح بدلتا ہے جس طرح سطحِ زمین کے اوپر بدلتا ہے۔ غرضکہ آہنی گولے کا اثر ہر ایک لحاظ سے زمین کے مشابہ ہے۔ اس خوبصورت تجربہ سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی کہ زمین بجائے خود ایک بڑا کروی مقناطیس ہے۔

گلبرٹ کے اس ثبوت کے بعد علم مقناطیس کے ایک نئے شعبہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس میں ارضی مقناطیسیت سے بحث کی جاتی ہے۔ اور زمین بحیثیت ایک مقناطیس عظیم کے متصور کی جاتی ہے۔

سطح زمین کے اوپر وہ دو جگہیں جہاں مقناطیسی سوئی عمود وار لٹکتی ہے۔ زمین کے مقناطیسی قطب کہلاتے ہیں۔ ان کا محلِ وقوع زمین کے جغرافی یعنی محوری قطبوں سے ممتاز ہے زمین کا شمالی مقناطیسی قطب اس کے شمالی جغرافی قطب سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ اور اسی طرح جنوبی قطب بھی الگ واقع ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مقناطیسی سوئی صحیح شمالی جنوبی سمت یعنی جغرافی سمت شمال جنوب میں نہیں ہوتی۔ اور اس کے سرے قطبین کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ قطب نما کے عام استعمال میں اس فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن علمی کاموں کے لئے اس کی صحیح پیمائش کی جاتی ہے۔ جو زاویہ کسی مقام پر صحیح شمالی جنوبی سمت اور مقناطیسی سوئی کے درمیان ہوتا ہے۔ اسے "انعطاف" یا "میلِ مقناطیسی" کہتے ہیں۔ مختلف مقامات پر مشاہدات جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقناطیسی سوئی کے جھکاؤ کی طرح اس کے انعطاف یعنی صحیح شمالی جنوبی سمت سے انحراف کی مقدار بھی جگہ بجگہ بدلتی رہتی ہے

مقناطیسی سوئی کو بطور "قطب نما" استعمال کرنے کی خاطر اس کے ساتھ ایک نقشہ لگایا جاتا ہے۔ جس میں چاروں اطراف اور چاروں کونوں کے علاوہ ان کے درمیانی حصے بھی ظاہر کئے ہوتے ہیں۔ اور کل بتیس اطراف کے جدا جدا نام مقرر کر کے نشان لگے ہوتے ہیں۔ چونکہ حسابی قاعدہ کے مطابق جملہ اطراف کو ۳۶۰ درجوں سے تعبیر کیا جاتا ہے اس لئے ملاحوں کی کمپاس میں نشانات تقریباً گیارہ گیارہ درجہ پر لگے ہوتے ہیں۔ اگر کسی مقام پر زاویۂ انعطاف معلوم ہو۔ تو ایک صحیح قطب نما کی مدد سے مختلف سمتیں بآسانی دریافت کی جا سکتی ہیں

شکل (۶) ملاحوں کے کمپاس یعنی قطب نما کی تصویر

آہنی کرہ کی وساطت سے زمین کی مقناطیسیت کا مطالعہ کرنے کے بعد گلبرٹ نے یہ دعویٰ پیش کیا۔ کہ ملاح مقناطیسی سوئی کی مدد سے کسی مقام کا عرض بلد معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ قیاس اس مفروضہ پر مبنی تھا۔ کہ مقناطیسی جھکاؤ کی مقدار بتدریج قطبین سے استوا تک کم ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے اگر ملاح وسط سمندر میں مقناطیسی سوئی کا جھکاؤ معلوم کر لیں تو انہیں اپنے عرض بلد کا پتہ چل جائیگا۔ ملاحوں کے لئے عرض بلد کا معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر وہ سطحِ سمندر پر اپنی جائے وقوع کا پتہ نہ لگا سکیں۔ تو انہیں مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ جہاز میں خوراک اور کوئلہ کا محدود ذخیرہ ہوتا ہے۔ اس لئے صحیح سمت میں جہاز رانی کرنے پر جہاز اور اہل جہاز کی حیات و ممات کا انحصار ہوتا ہے۔ جب تک کسی ساحل سے یا مقام مقصود سے جہاز کا فاصلہ معلوم نہ ہو۔ ملاح وسط سمندر میں قدرتی طور پر بہت مضطرب ہوتے ہیں۔ عرض بلد اور طول بلد دریافت کرنے کے لئے سورج اور ستاروں کے مشاہدات، صحیح وقت پیما آلات اور بحری[۱] جنتریوں کی احتیاج ہوتی ہے ؀

پس اگر ڈاکٹر گلبرٹ کا یہ قیاس جس کے متعلق اُس نے دعویٰ کیا تھا۔ کہ "سورج چاند۔ ستاروں کے مشاہدات کے بغیر عرض بلد معلوم ہو سکتا ہے" صحیح ہوتا۔ تو جہاز رانوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچتا۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہی گلبرٹ جس نے متقدمین کی اتنی غلطیوں کی اصلاح کی تھی خود ایسی غلطی کا مرتکب ہوا۔ سچ ہے غلطی انسان سے ہو ہی جاتی ہے۔ اَلْاِنْسَانُ مُرَكَّبٌ مِنَ السَّهْوِ وَالنِّسْيَانِ۔ گلبرٹ نے یہ قیاس ناکافی مشاہدات کی بنا پر قایم کیا تھا اسے معلوم نہ تھا۔ کہ مقناطیسی سوئی کا جھکاؤ جگہ بہ جگہ بدلتا

---

[۱] چونکہ بحری جنتریاں ملاحوں کے لئے بہت مفید ہوتی ہیں۔ اس لئے انہیں "ملاحوں کی انجیل" بھی کہتے ہیں ۱۲

طور پر بدلتا ہے۔ ہر ایک مقام کے لئے جھکاؤ کے دریافت کرنے
کی ضرورت ہے۔ کیونکہ دعوے کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ
اگر دو مقامات پر جھکاؤ معلوم ہے۔ تو اُن کے قریب کسی درمیانی
مقام پر جھکاؤ کس قدر ہوگا۔ مقناطیسی سوئی کے جھکاؤ کے اِس
"مکانی" بے قاعدہ اختلاف کے علاوہ "زمانی" اختلاف بھی
گلبرٹ کے دعوے کا ابطال کرتا ہے۔ دن بدن اور سال
بسال مقناطیسی سوئی کا جھکاؤ بدلتا رہتا ہے۔ ہر شبانہ روز
میں جھکاؤ ایک دفعہ اوسط مقدار سے گھٹتا بڑھتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس
مختلف موسموں میں اس کی مقدار کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔

گلبرٹ کے زمانہ تک علم مقناطیس ابتدائی حالت میں
تھا۔ اس کے پاس مختلف زمانوں کے مشاہدات جمع نہ تھے
اور نہ ہی اس کے پاس یومیہ اور سالانہ اختلافات کے
دریافت کرنے کے لئے کافی صحیح آلات موجود تھے۔ فی زمانہ
"خود نگار آلات" کی وساطت سے یہ کام مختلف ممالک میں
سرکاری خرچ پر ہو رہا ہے۔ اور ایک مسلسل مسل روزانہ اور سالانہ
مقناطیسی اختلافات کی مرتب ہوتی جاتی ہے۔ جس طرح
مقناطیسی سوئی کے جھکاؤ کے یومیہ اور سالانہ دور ہوتے ہیں
اسی طرح زاویۂ انعطاف بھی بدلتا رہتا ہے۔ یعنی ایک ہی مقام
پر مقناطیسی سوئی صحیح شمالی جنوب سمت سے کسی وقت کم اور
کسی وقت زیادہ منعطف ہوتی ہے۔ ان اختلافات کی وجہ
کیا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ کسی سبب سے زمین کی مقناطیسی
طاقت مختلف وقتوں اور موسموں میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔
لہذا اب ہمیں زمین کی مقناطیسیت کے اختلاف کی طرف
متوجہ ہونا چاہئے۔

بعض اوقات فضا میں "مقناطیسی طوفان" بپا ہوتے
ہیں جس سے تمام مقناطیسی آلات متاثر ہوتے ہیں۔ اور
مقناطیسی سوئی کے جھکاؤ اور انعطاف میں غیر معمولی تغیرات
واقع ہوتے ہیں۔ ایسے مقناطیسی طوفان کا پتہ حساس مقناطیسی
آلات کی وساطت سے لگ سکتا ہے۔ بعض علمائے سائنس کا
خیال ہے۔ کہ زمین کی مقناطیسی قوت کے دوری اختلافات
اور مقناطیسی طوفان، ہوا کے اعلیٰ طبقات میں برقی رو پیدا
ہونے سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اور ان برقی رووں کے
پیدا ہونے کا سبب سورج میں سے بے شمار ذرات برق یعنی
برقیوں کا اخراج ہے۔ بالفاظ دیگر بعض علمائے سائنس کا خیال
ہے۔ اور اس خیال کی تائید میں بہت سے علمی شواہد پیش کئے
جاسکتے ہیں کہ سطح آفتاب کے تغیرات مقناطیسی طوفان وغیرہ
کا اصلی باعث ہیں۔

ایک عجیب بات یہ دیکھی گئی ہے۔ کہ جس زمانہ میں سورج
کی سطح پر داغوں کی کثرت ہوتی ہے۔ اسی زمانہ میں مقناطیسی
طوفان بھی بکثرت آتے ہیں۔ "سورج کے داغ" ہر گیارہ سال
کے بعد بکثرت ظاہر ہوتے ہیں۔ اور چونکہ مقناطیسی طوفانوں
کا ایک دورہ اس عرصہ میں مکمل ہوتا ہے۔ اس لئے بعض علمی حلقوں
میں سورج کے داغ مقناطیسی طوفانوں اور دیگر دوری اختلافات
کی علت قرار دیئے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ جہاں تک
ہوسکتا ہے انسان عقل کے گھوڑے دوڑاتا ہے۔ یقینی چیزیں صرف
واقعات اور مشاہدات ہیں۔ ان کی تشریح ایک ذہنی امر ہے۔ [illegible]
جب تک ایک علمی قیاس (نظریہ) واقعات حاضرہ کی تشریح کے
لئے کفایت کرتا ہے۔ اسے صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر جدید واقعات اور
مشاہدات اس کے منافی ہوں تو سابقہ نظریہ میں مناسب تبدیلی
کی جاتی ہے۔ اور اس طرح خاطی انسان حقائق فطرت کی تلاش میں

زریاب

قرون سابقہ میں تاریخ نام تھا۔ بادشاہوں کی تاریخ پیدائش و وفات سنین جروب غیرہ کا۔ بہت کم خوش نصیب لوگ تھے۔ کہ جن کا ذکر نمایاں طور پر اس میں آتا ہو۔ ان ہی خوش قسمتوں میں ایک زریاب بھی ہیں۔ کہ جن کے بغیر اندلس کی تاریخ نامکمل ہے بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ اسلامی اندلس کے متعلق جو کتاب آپ اٹھا کر دیکھیے ممکن نہیں ہے۔ کہ وہ زریاب کے ذکر خیر سے خالی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر ایک فن میں کامل تھے۔ اس لیے کسی نہ کسی طرح ان کا ذکر ہر ایک کو کرنا پڑتا ہے۔ علامہ احمد المقری المغربی نے ان کے حالات صاحب المقتبس سے مقتبس کر کے لکھے ہیں اور میں ان سے اور مسٹر اسکاٹ سے اقتباس کر کے نذر ناظرین کہکشاں کرتا ہوں۔ اس امر کا بھی اعتراف کیے لیتا ہوں کہ جو کچھ میں عرض کروں گا۔ وہ مختصر اور تشنہ ہیں۔ مگر میں زیادہ زحمت یا صرہ آزاری دیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔

فی الحقیقت زریاب لقب ہے۔ نام نہیں۔ لیکن لقب کچھ اس طرح غالب ہے کہ لوگ نام ہی بھول گئے۔ زریاب حقیقت میں ایک سیاہ رنگ پرند ہوتا ہے۔ زمانۂ ابتدا میں جو بہت گاتا ہے۔ ہمارے ممدوح زریاب سانولے رنگ کے تھے۔ اور نہایت فصیح البیان اور طلیق اللسان۔ فن موسیقی میں اپنے زمانہ میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ان کے اخلاق و عادات نہایت لطیف تھے۔ اور فن شاعری میں بے مثل تھے۔ اس لیے لقب زریاب سے ملقب ہو گئے۔

اب ان کے اندلس میں وارد ہونے کا قصہ سنیے اور خدا تعالیٰ کی کارسازی ملاحظہ فرمایئے۔

زریاب اس مشہور موسیقی دان اسحق موصلی کے شاگرد تھے کہ جن کے بغیر ہارون الرشید کی مجلس سرود سونی رہتی تھی۔ اگر وہ نہ ہوتے۔ تو الف لیلہ کے اکثر قصے نامکمل رہتے۔ مگر اسحق کو اس کا علم نہ ہوا۔ ان کی قدر نہ کرتے ہوں۔ مگر شاگرد اپنی عقل و ہنر یا صورت و شکل اور خوش گلوئی میں اپنے استاد سے بھی بڑھ گئے تھے۔ ایک مرتبہ ہارون الرشید کے دربار میں نئے سے کوئی مغنی آیا اس کی تلاش پر اسحق نے اپنے شاگرد کی تعریف کی اور امیر المومنین سے اس تعارف کرانے میں در پردہ اپنی تعریف کی عرض کیا۔ کہ "امیر المومنین! یہ غلام نغمات رائقہ میں بہت فائق ہے اور میں نے اس پر بڑی محنت کی ہے۔ اکثر باتیں جو آپ اس میں دیکھیں گے۔ وہ میری اختراع ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ اس لڑکے کی بہت بڑی شان ہوگی" امیر المومنین کو زریاب کے دیکھنے کا بڑا شوق ہوا۔ چنانچہ ان کو پیش کیا گیا۔ جب حاضر آئے تو امیر المومنین ان کے حسن کو دیکھ اور گفتگو سن کر حیران رہ گئے۔ امیر المومنین نے پوچھا کہ تم گانا جانتے ہو۔ تو انھوں نے عرض کیا۔ کہ ایسا کہ کوئی مجھ سے بہتر گا نہیں سکتا۔ جو لوگ گانے کا دعوے کرتے ہیں۔ وہ میرے برابر گا نہیں سکتے۔ اگر حضور مجھے اجازت دیں۔ تو میں ایسا گانا سنا سکتا ہوں کہ اب تک کسی کان نے نہ سنا ہوگا امیر نے حکم دیا۔ کہ ان کے استاد اسحق کا عود ان کو دیا جائے مگر زریاب نے اسے لینے سے انکار کیا اور کہا

کہ میرا عود ایک شخص باہر لئے کھڑا ہے۔ اگر وہ منگوا لیا جائے
تو میں اپنا گانا سناؤں۔ اور اگر اُستاد کا عود مجھے دیا جائے گا۔
تو میں اُن ہی کا گانا سناؤں گا۔ زریاب کا عود منگوایا گیا۔ ہارون
الرشید نے دیکھا۔ تو دونوں عودوں میں کوئی فرق نہ پایا۔ زریاب
اس کو سمجھ گئے۔ اور اُنہوں نے عرض کیا۔ کہ بلاشبہ میرا اور اُستاد
کا عود ایک ہی لکڑی کا ہے۔ ایک ہی جسامت ہے۔ لیکن
میرے عود کے تار ریشم کے خاص طور پر بٹے ہوئے ہیں۔
لکڑی فلاں جنگل کی ہے۔ اس کی کھنکری اور لاب وغیرہ میں
زمین آسمان کا فرق ہے۔ غرض عود کو ملا کر زریاب نے
یہ شعر گایا ہے

یا ایہا الملک المیمون طائرہ
ہارون روح الیک الناس وابتکروا

اور اس کو کچھ اس طرح ادا کیا۔ کہ امیر المومنین وجد میں آ گئے۔
اور انہوں نے اسحق سے کہا۔ کہ اگر تم اپنے شاگرد کو اب بھی پیش
نہ کرتے تو سزا پاتے۔ میں اس کا گرویدہ ہو گیا ہوں۔ خبردار
اس کی تربیت میں کوتاہی نہ کرنا۔ اور چند روز کے بعد پھر
اس کو پیش کرو۔ میں اس کو پھر سنوں گا۔ اسحق کو یہ سن کر سخت
حسد ہوا۔ اور اُنہوں نے زریاب سے صاف کہدیا۔ کہ تم میرے
محسود ہو۔ میں نے تو یہ چاہا تھا۔ کہ تم باریاب ہو کر شہرت حاصل
کرو گے۔ اور میری عزت افزائی ہوگی۔ مگر میں دیکھتا ہوں۔ کہ
تم میری ہلاکت کے باعث ہونے والے ہو۔ اس لئے اگر تم
میرے شاگرد سعید ہو۔ تو دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم بغداد
سے نکل جاؤ۔ اور ایسی جگہ جا کر رہو کہ تمہارا ذکر تک بھی یہاں
نہ پہنچے۔ دوسرے یہ کہ یہاں رہو۔ اور میرے رقیب بنو۔ مگر
یہ یاد رکھو کہ اس صورت میں تم میرے شر سے محفوظ نہیں
رہ سکتے۔ زریاب اُسی وقت کھڑے ہو گئے۔ اور اُنہوں نے
فرار کو قرار پر ترجیح دی۔ اور فوراً اسحق پر اپنی رائے ظاہر کر
دی۔ اُنہوں نے شاگرد کو رخصت کیا۔ اور اُن کا اسباب
سفر بھی خود مہیا کیا۔

امیر المومنین نے ایک مرتبہ زریاب کو یاد کیا۔ تو اسحق نے
عرض کر دیا۔ کہ اُس لڑکے کو جنون ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ
اُس کے گانے پر جن عاشق ہیں۔ وہ اسی خبط میں کہیں نکل
گیا۔ اُس کا کچھ پتہ نہیں لگتا۔ امیر المومنین کو اُس کے روپوش
ہونے کا افسوس تو ہوا۔ مگر اس کے بعد وہ اس کو بھول گئے۔
زریاب ملک مغرب کی طرف چلے گئے۔ اور اس طرح اپنے
آپ کو گمنام کیا۔ کہ ممالک مشرقیہ میں اُن کا ذکر و فکر بھی نہ رہا۔
وہ جوہر نہیں جو نہ چمکے۔ وہ مشک نہیں جو نہ مہکے۔ چو در بندی
سراز روزن بر آرد۔ ان کے جوہر کی خبر حکم امیر اندلس کو
پہنچ گئی۔ کچھ اُدھر سے تحریک ہوئی۔ کچھ ادھر سے۔ زریاب
نے درخواست کی۔ امیر نے اُن کو فوراً طلب فرمایا۔ یہ اپنے
اہل و عیال کو لے کر روانہ ہوئے۔ مگر جب جزیرۃ الخضرا
پہنچے۔ تو اُن کو امیر کے انتقال کی خبر پہنچی۔ یہ سن کر وہ بہت
ہی بے دل ہو گئے اور واپس جانے کا ارادہ کیا۔ امیر حکم
نے اُن کے لئے اپنے مغنی خاص منصور نامی کو۔ جو یہودی
تھے بھیجا تھا۔ انہوں نے زریاب کو بہت کچھ سمجھایا۔ اور یہ
رائے دی۔ کہ اُن کے جانشین امیر عبدالرحمن ثانی ابھی نہایت
قدر دان شخص ہیں۔ آپ ان کے پاس ضرور حاضر ہوجیے
یہ ابھی لیت و لعل ہی کر رہے تھے۔ کہ امیر عبدالرحمن ثانی
کا فرمان ان کے پاس پہنچا۔ اور انہوں نے اپنے تمام عمال
کو حکم دیا۔ کہ زریاب کو نہایت عزت و حرمت کے ساتھ

قرطبہ پہنچا دیں۔ اور اپنی طرف سے بہت سے آدمی اُن کے استقبال
کے لئے بھی بھیجے۔ یہ دیکھ کر وہ چاروناچار روانہ ہوئے۔ قرطبہ
پہنچے تو اُن کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک بہت بڑا محل مع
خدم وحشم کے ان کو عطا کیا گیا۔ تیسرے روز امیر نے اُن کو طلب
کیا۔ اور دو سو دینار ماہوار اُن کے اور بیس بیس دینار ان کے
چاروں بیٹوں (عبدالرحمٰن۔ جعفر۔ عبداللہ اور یحییٰ) کی تنخواہ
مقرر کر دی۔ اس کے علاوہ تین ہزار دینا سالانہ عطیہ
مقرر کر دیا۔ اور ہر مہرجان۔ اور نوروز کو پانچ سو دینار ملتے تھے
جنس الگ رہی۔ اور چالیس ہزار دینار قیمت کے باغات
وغیرہ اس کے سوا تھے ؛

زریاب اب امیر عبدالرحمٰن ثانی کے مصاحب خاص ہو
گئے۔ مجلس طرب بغیر اُن کے مکمل نہیں ہوتی تھی۔ اور جو محفل
ان کے گانے سے محروم ہو۔ وہ محفل نہ تھی۔ امیر
اس طرح اُن کے گرویدہ ہو گئے تھے کہ اُن کے سامنے سب
لوگوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ امیر اُن کا بے انتہا اکرام و احترام
کرتے تھے۔ کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی۔ کہ اُس میں زریاب
احوال ملوک۔ سیرۃ خلفاء اور نوادر علماء نہ بیان کرتے ہوں
یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ اگر خاصہ کا وقت ہو جاتا۔ تو زریاب
کو شہزادگان والا تبار کے ساتھ دسترخوان شاہی پر کھانا کھلایا
جاتا۔ وزراء کو حکم دیا جاتا۔ کہ بعض پولیٹیکل معاملات میں اُن سے
مدد لیا کریں۔ اُن کے لئے ایک خاص دروازہ مقرر کر دیا گیا
کہ جس وقت چاہیں بلا اذن حاصل کئے باریاب امیر ہوا کریں
کہتے ہیں کہ زریاب کو گانے سے وہ شغف تھا۔ کہ اکثر
ایسا ہوتا۔ کہ کوئی نئی راگنی اُن کے خیال میں آتی۔ تو وہ
آدھی رات کو اپنی جاریہ کو جگا کر وہ راگنی یاد کرتے ؛ آپ
عود میں صرف چار تار ہوا کرتے تھے۔ زریاب نے اس پر
تار بڑھا دیا۔ جس نے عود کو نہ صرف مکمل کر دیا۔ بلکہ اُس کی آواز
میں بھی عجیب لطافت پیدا کر دی ؛

زریاب مغنی ہی نہ تھے۔ بلکہ علم ہیئت کے بہت بڑے
عالم تھے تقسیم اقالیم سبعہ۔ اختلاف طبایع و آب و ہوا۔
منابع و مخارج۔ شہروں کے حالات اُن سے بہتر جاننے والا کوئی
نہ تھا۔ موسیقی کی یہ کیفیت تھی۔ کہ دس ہزار راگ راگنیاں اُن
کو یاد تھیں۔ ادب میں وہ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ آداب
مجلسی۔ اور شیریں بیانی کی یہ کیفیت تھی۔ کہ بادشاہان اندلس
نے ہر بات میں اُن کی تقلید کی۔ کھانا ایسا اچھا پکاتے تھے
کہ مدتوں اُن کی ترکیبیں متداول رہیں۔ اندلس میں ٹیڑھی
مانگ نکالنی اُن ہی نے شروع کی۔ جو فیشن وہ رائج کرنا چاہتے
وہ سب سے پہلے اپنے بیٹوں اور اپنے گھر کی مستورات میں
شروع کراتے تھے۔ اور بہت ہی جلد لوگ اُن کی تقلید کرنے لگتے
تھے ؛ اُن کے آنے سے پہلے بادشاہان اندلس خوشبو کے مختلف
پھولوں کو سکھا کر اُن کا سفوف کر لیتے تھے۔ اور اُس کو کپڑوں
میں چھڑک لیا کرتے تھے۔ انہوں نے آکر اُن کا عطر نکالا۔ اور
عرق کھینچا۔ شیشے کے برتنوں میں خوبصورتی پیدا کی۔ چونکہ سونے
چاندی کے برتنوں کا استعمال ناجائز تھا۔ اس لئے وہی
مستعمل ہونے لگے۔ چمچوں سے کھانا اُن ہی نے سکھایا۔ فرش
میں روئی ڈالنی ان ہی کی بتائی ہوئی ہے ؛ دسترخوان اُن
ہی نے رائج کیا۔ اُن سے پہلے لکڑی کی چوکیوں پر کھانا کھایا
جاتا تھا۔ ہر موسم کے موافق کپڑوں کا رنگ بدلتے رہنا اُن
ہی کا بتلایا ہوا ہے ؛ بقول مسٹر اسکاٹ کے بڑی خوبی ان
میں یہ تھی۔ کہ پولیٹیکل معاملات سے ہمیشہ اپنا دامن بچاتے

گلستان سعدی

اور

عروضی نکات

(سلسلے کے لئے گزشتہ پرچہ دیکھو)

تا مرد سخن نگفتہ باشد　　عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ہر بیشہ گمان مبر کہ خالی است　　شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف۔ وزن مفعولُ مفاعلن مفاعیل یا فعولن

یہ وزن بھی ہندوستان میں عام طور پر رائج ہے۔ چنانچہ مثنوی گلزار نسیم اسی بحر میں ہے۔ اس وزن میں بھی تسکین اوسط کے زحاف سے ایک دوسرا وزن مفعولن فاعلن مفاعیل یا فعولن پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں کا اجتماع صحیح ہے۔ قطعہ

اے سیر ترا نان جوین خوش ننماید

معشوق من است آنکہ بنزدیک تو زشت است

حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف

از دوزخیان پرس کہ اعراف بہشت است

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف مقصور یا محذوف۔ وزن مفعول مفاعیل مفاعیل مفاعیل یا فعولن۔

اس قطعہ کے تیسرے مصرع کو (جس کا وزن مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیل ہے) جو لوگ عروض نہیں جانتے ناموزوں سمجھینگے یا کاتب کی غلطی پر محمول کریں گے۔ لیکن دراصل یہ مصرع خارج الوزن نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں بھی انہی تسکین اوسط کے زحاف سے کام لیا گیا۔ یعنی رکن دوم مفاعیلُ سے مفاعیلن ہوگیا ہے۔ تقطیع:۔

اے سیر مفعولُ۔ ترا نانِ مفاعیلُ۔ جوِیں خُش نَہ مفاعیل۔ نماید فعولن۔ معشوق مفعولُ۔ منست آنکہ مفاعیلُ۔ بنزدیک مفاعیلُ۔ تو زشت است مفاعیلُ۔ حوران مفعولُ۔ بہشتی را مفاعیلن۔ دوزخ مفعولُ۔ بود اعراف مفاعیل۔ از دوز مفعولُ۔ خیان (ن) پرس مفاعیلُ۔ کہ اعراف مفاعیلُ۔ بہشتست مفاعیل۔

اسی بحر میں حکیم ناصر خسرو علوی کا ایک قصیدہ ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

در بند مدارا کن و در بند میاں را

در بند مکن خیرہ طلب ملکت دارا

ان دونوں مصرعوں کا تو وزن صاف ہے۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن گر اسی قصیدہ کے بہتیرے اشعار ایسے ہیں۔ جو عوام کو ناموزوں معلوم ہوں گے۔ مثلاً ؎

با ہر کس منشین و مبر از ہمگاں نیز

بر راہ خرد برو نہ مگس باش نہ عنقا

اس شعر کا دوسرا مصرع تو صاف ہے۔ مگر پہلے مصرع میں وہی تسکین اوسط کا زحاف آگیا ہے۔ یعنی دوسرے رکن (مفاعیل) کی میم ساکن ہوکر ماقبل سے مل گئی۔ تو یہ وزن پیدا ہوگیا۔ مفعولن مفعولُ مفاعیلُ مفاعیل۔ تقطیع:۔

با ہر کس مفعولن۔ من شین مفعولُ۔ و مبر از ہ مفاعیلُ

دگادن) نیز مفاعیل اسی قصیدہ کا شعر ہے ؎

پر کینہ مباش از ہمگان دائم چوں خار

نہ تیز زبوں باش بہ یکبار چو خرما

اس شعر کا بھی دوسرا مصرع صاف ہے۔ مگر پہلے مصرع کا وزن مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن مفعول ہے۔

تقطیع:۔ پر کینہ مفعولُ۔ مباش ز مفاعیلُ۔ مگادن) دائم مفاعیلن۔ چوں خار مفعول۔ اس مصرع میں چوتھے رکن کی میم ساکن ہو کر ماقبل سے مل گئی۔ تو رکن سوم مفاعیلُ سے مفاعیلن ہوگیا۔ اور چوتھا رکن فاعیل باقی رہ گیا۔ جسے مفعول سے بدل دیا۔ پھر کہتا ہے ؎

چوں یار موافق نہ بود تنہا بہتر

تنہا بہ صد بار چو نادانت ہمتا

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں تسکین اوسط واقع ہوا ہے۔ پہلے مصرع کا وزن مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فعلن اور دوسرے مصرع کا وزن مفعولن مفعولُ مفاعیلن فعلن ہے۔ تقطیع:۔ چوں یار مفعولُ۔ موافق نہ مفاعیل۔ بود تنہا مفاعیلن۔ بہتر فعلن۔ تنہا بہ مفعولن۔ صد بار مفعولُ۔ چو نادانت مفاعیلن۔ ہمتا فعلن۔

جو لوگ سعدی کے اس مصرع (حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف) کو ناموزوں سمجھتے ہیں۔ وہ نہ معلوم حکیم ناصر خسرو کے ان اشعار کو کس حد تک ناموزوں سمجھیں گے۔ مگر اہل نظر ان اشعار کو دیکھنے کے بعد سمجھ سکتے ہیں۔ کہ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیل یا فعولن کے رکن دوم، سوم، چہارم، یعنی تینوں ارکان میں تسکین اوسط کا زحاف لگایا جا سکتا ہے۔ جس سے مندرجہ ذیل اوزان پیدا ہوتے ہیں اور ان سب کا باہمی اجتماع صحیح ہے ؎

(۱) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیل (۲) مفعولن مفعولُ مفاعیل مفاعیل (۳) مفعولن مفعولن۔ مفعول مفاعیل (۴) مفعولن مفعولن مفعولن مفاعیل (۵) مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیل (۶) مفعولُ مفاعیلن مفعولن مفعول (۷) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن مفعول (۸) مفعولن مفعولُ مفاعیلن مفعول

چوتھا رکن بجائے مفاعیل اگر فعولن رکھا جائے۔ تو اسی طرح مختلف اوزان پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان سب کا اجتماع صحیح ہے۔ فرد

زر بدہ مرد سپاہی را تا سر بدہد

وگرش زر نہ دہی سر نہ نہد در عالم

بحر رمل مثمن مخبون مقصور یا محذوف۔ اس بحر کا وزن جو عام طور پر مستعمل ہے۔ وہ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ہے۔ مگر اس شعر کے مصرع اول کے تیسرے رکن فعلاتن پر تسکین اوسط کا عمل ہوا ہے یعنی فعلاتن کی جگہ مفعولن آیا ہے۔ چنانچہ مصرع اول کا وزن یہ ہے۔ فاعلاتن فعلاتن مفعولن فعلن۔ تقطیع:۔

زر بدہ مر فاعلاتن۔ د سپاہی فعلاتن۔ را تا سر مفعولن۔ بدہد فعلن۔ اگرش زر فعلاتن۔ نہ دہی سر فعلاتن۔ نہ نہد در فعلاتن۔ عالم فعلن۔

اس بحر کے صدر و ابتدا میں رکن سالم و مخبون یعنی فاعلاتن اور فعلاتن کا اجتماع صحیح ہے۔ چنانچہ "زر بدہ مر" بروزن فاعلاتن اور "اگرش زر" بروزن فعلاتن آیا ہے۔ سعدی کا یہ شعر بھی عام طور پر حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ مگر یہاں

بھی اسی تسکین اوسط کا عمل ہوا ہے۔ امیر خسرو دہلوی فرماتے ہیں ؎

نہ کہ من تنہا درعہد تو بیدل ماندم
کہ دل شہرازاں نرگس پرافسوں رفت

مصرع اول کا رکن دوم بروزن مفعولن آیا ہے۔

خسرو

ہم مرا داغ کند یارب و دور تو رسد
یارب خسرو کز دست تو برگردوں رفت

یہاں دوسرے مصرع کے رکن دوم میں تسکین اوسط واقع ہوا ہے۔

انوری کہتا ہے ؎

ہم براں گو نہ کہ از بیجرۂ ابر بہ شب
رخ شرمندۂ مہ بیند مرد نظار
دلم از جائے بشد ناگہ و بخروشیدم
جامہ بدریدم و اشک از مژگاں کرد قطار

ان دونوں اشعار کے مصرعہائے ثانی کے تیسرے رکن پر تسکین اوسط سے کام لیا گیا ہے۔

نوٹ:۔ اس وزن میں اور ایک نکتہ قابل ذکر یہ ہے کہ عرفی کے اس مقطع پر

پیش عرفی مدہ از دست عناں کیں صیاد
خویش را آبلہ نمودہ است دلے ابلہ نیست

بعض لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض وارد کیا گیا تھا۔ کہ ایک جگہ "آبلہ کی" "ہ" تقطیع سے ساقط ہوتی ہے۔ اور چونکہ آبلہ میں ہائے مختفی نہیں بلکہ ہائے مظہرہ ہے۔ اس لئے اس "ہ" کا تقطیع سے ساقط ہونا سخت معیوب ہے۔ مگر یہ اعتراض محض اسی بنا پر تھا۔ کہ اس مصرع کی تقطیع فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان کے وزن پر کی گئی تھی۔ حالانکہ اس کی تقطیع فاعلاتن فاعلاتن فعلاتن فعلان کے وزن پر کرنا چاہئے

تقطیع:۔ خیش راب فاعلاتن۔ لہ نمودس فاعلاتن۔ ت دے اب۔ فعلاتن لہ نیست فعلان۔ یعنی رکن دوم بجائے فعلاتن۔ فاعلاتن قرار پائے گا۔ کیونکہ رکن مزاحف کی تقطیع رکن سالم سے کرنا صحیح کیا معنی اصح ہے۔ لہذا عرفی کے اس مقطع سے ثابت ہے کہ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان اور فاعلاتن فاعلاتن فعلاتن فعلان کا اجتماع بھی صحیح ہے۔ رکن سالم و رکن مزاحف کے اجتماع کی سندیں اس مقام پر پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ عرفی آپ اپنی سند ہے

قطعہ

نہ بہ اشتر برسوارم نہ چو اشتر زیر بارم
نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم
غم موجود و پریشانی معدوم ندارم
نفسے میزنم آسودہ و عمرے میگذارم

سعدی کے اس قطعہ کو دیکھ کر اکثر حضرات بہت چکرائیں گے ہندوستان میں عام طور پر بحر رمل مثمن سالم مقصور یا محذوف فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات یا مثمن مخبون مقصور محذوف فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن مستعمل ہے۔ مگر اس قطعہ کے پہلے دو مصرعوں کا وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن ہے۔ یعنی چاروں ارکان سالم ہیں۔ کوئی مزاحف نہیں ہے اور تیسرے مصرع کے چاروں ارکان مخبون یعنی فعلاتن ہیں

تقطیع:۔ نہ بہ اشتر فاعلاتن۔ برسوارم فاعلاتن۔ نہ چو اشتر فاعلاتن۔ زیر بارم فاعلاتن۔ نہ خداون فاعلاتن۔ د رعیت فاعلاتن۔ نہ غلامم فاعلاتن۔ شہریارم فاعلاتن۔ غم موجو فعلاتن۔ د پریشا فعلاتن۔ نِ معدو فعلاتن۔ م ندارم فعلاتن

نغمے می فعلاتن زَنَ نا سُو فعلاتن - وَہْ عرے فعلاتن - می گزارم فاعلاتن اس قطعہ سے ثابت ہوگیا - کہ بحرِ مثمن سالم میں چاروں ارکان مخبون بھی آسکتے ہیں - اور رکن سالم و مزاحف کا اجتماع بھی صحیح ثابت ہوگیا -

گوئی رگ جاں می گُسلد زخمہ ناسازش
ناخوشتر از آوازۂ مرگ پدر آوازش

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف سالم - وزن - مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلن -

واضح ہو کہ اس وزن کے ساتھ مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلُ کا اجتماع بھی صحیح ہے - وجہ یہی ہے کہ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ کے تیسرے رکن پر تسکین اوسط کا زحاف عمل کرتا ہے - تو اُس سے دوسرا وزن مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن پیدا ہوجاتا ہے - دیکھو معیار الاشعار محقق طوسی - جناب صفیؔ لکھنوی نے ایک نظم کہی تھی جس کے دو مختلف مصرعے یہ ہیں ؎

مشرق کا سر اُٹھ کر مغرب سے ملا دینگے
وقت آنے دو وقت آنے دو پھر تم کو بتا دینگے

دوسرے مصرع پر جناب آرزو لکھنوی کا اعتراض تھا کہ اس مصرع میں ایک سبب خفیف (یعنی لفظ "پھر" کے قبل جو لفظ "دو" آیا ہے) بڑھتا ہے لہذا مصرع ناموزوں ہے - جناب صفی سے دریافت کیا گیا - تو اُن کی طرف سے کاتب کی غلطی کا عذر پیش کیا گیا - کہ کاتب نے "پھر" سے پہلے "دو" کی لفظ بڑھا دی اور در اصل اُن کا مصرع یوں ہے -

وقت آنے دو وقت آنے پھر تم کو بتا دینگے

جناب صفی کا مصرع اگر یوں ہی ہے تو اُس میں زبان کا بڑا بھاری سقم پیدا ہوتا ہے - میرے خیال میں تو جناب صفی کا مصرع پہلے جیسا تھا - وہی صحیح ہے (یعنی وقت آنے دو وقت آنے دو پھر تم کو بتا دیں گے) کیونکہ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلن اور مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن کے اجتماع سے وزن میں فرق نہیں آتا - جناب صفی نے اپنے صحیح مصرع کو بھی جناب آرزو کے غلط اعتراض کی بنا پر غلط سمجھ لیا - مگر جو لوگ عروض جانتے ہیں - اور اساتذہ کے کلام پر نظر رکھتے ہیں وہ جناب صفی کے اس مصرع کو غلط نہیں کہہ سکتے - اس وزن کے صحیح ہونے کے ثبوت میں سعدی کی مذکورہ بالا مثال بہت کافی ہے - اور معیار الاشعار سے بھی ان دونوں اوزان کا باہمی اجتماع صحیح ثابت ہوتا ہے - قطعہ

دانی چہ گفت مرا آں بلبل سحری
تو خود چہ آدمی کز عشق بے خبری
اشتر بہ شعر عرب در حالت است و طرب
گر ذوق نیست ترا کژ طبع جانوری

بحر بسیط سالم و مخبون - وزن مستفعلن فعلن مستفعلن فعلن - کہ حضرات ان اشعار کی ہڈیاں پسلیاں اس طرح توڑتے ہیں کہ افسوس ہوتا ہے - ان اشعار کے متعلق مولانا قدر بلگرامی نے قواعد العروض میں ایک دلچسپ نقل تحریر کی ہے - کہ ایک صاحب ذوق سعدی کے اسی قطعہ کو بروزن مفعولُ فاعلاتن مفعولُ فاعلاتن پڑھ رہے تھے یوں - دانی چہ گفت مَرّا اِں بلبل سحرّی - گر ذوق نیست ترّا کژ طبع جانورّی - اشتر بشعر عرّب در حالت است و طرّب - تو خود چہ آدمیّی کز عشق بے خبرّی مَرّا - سحرّی - ترّا - جانورّی - عرّب - طرّب - آدمیّی - بے خبرّی - ان آٹھوں الفاظ کو زبان مبارک سے مشدد ادا

کرتے تھے - ایک صاحب صناعت نے ہرچند کہا۔ کہ ظالم
الفاظ کا گلا کیوں گھونٹتا ہے - ارے یہ قطعہ بحر بسیط میں ہے
جس کا وزن مستفعلن فعلن مستفعلن فعلن ہے۔ صحیح کیوں نہیں پڑھتا
مگر اس نے ایک نہ سنی وہ اپنی ہی دھن میں مست تھا۔ آخر بمشکل
یہ جواب دیا کہ ہاں الفاظ تو اس طرح صحیح ہو جائیں گے۔ مگر شعر
کی موزونیت میں جو جا بجا سکتہ پڑ جائے گا اس کا کیا علاج -
ہائے رے ذوق بے صناعت - صاحبان ذوق بے صناعت
صفی کے اس مصرع (وقت آنے دو وقت آنے دو پھر تم کو بتا
دیں گے) کو ناموزوں سمجھ کر اگر دھوکا کھائیں تو کوئی تعجب
کی بات نہیں - اسی ذوق بے صناعت کے باعث صفی نے
اپنے اس موزوں مصرع کو (وقت آنے دو وقت آنے پھر
تم کو بتا دیں گے) سے بدل دیا - حالانکہ "وقت آنے"
کوئی دیہاتی بھی نہیں بولتا - اس اصلاح میں اور طبل
سحر سامری - اور جادوگری میں تھوڑا ہی سا فرق ہے ؛

واضح ہو کہ ابھی گلستاں کے فقط دو باب سے میں
نے اتنے نکات پیش کئے ہیں - مضمون طولانی ہو گیا
اس لئے یہیں ختم کرتا ہوں - امید ہے کہ مولانا اطہر ہاپوڑی
اور مولانا نظم طباطبائی اس بحث پر مزید روشنی ڈالیں گے
میں نے ابھی یہ بحث انجمن خاصان ادب میں پیش نہیں
کی ہے - جو کچھ لکھا ہے اپنی ذاتی تحقیق سے لکھا ہے
اگر اور اہل قلم اس مضمون کے ساتھ دلچسپی کا اظہار فرمائیں گے
تو میں بھی اس بحث کو چھیڑوں گا ؛

راقم مرزا یاس عظیم آبادی
سکرٹری انجمن خاصان ادب لکھنؤ

اسبابِ عروج

اقوام عالم ربر کے خواص رکھتی ہیں جب کوئی ایسے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں کہ ان کی بڑھتی ہوئی روح
قومیت کو بہت زور سے دبا دیں - تو جونہی وہ اسباب کم ہوتے ہیں - قوم ایک دم ابھرتی ہے - اور بعض اوقات
اس دباؤ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کی ترقی بیسیوں برس زیادہ نزدیک ہو جاتی ہے - اس لئے جب تم دیکھو
کہ کوئی قوم بہت ستائی جا رہی ہے - اس کے حقوق غصب کئے جا رہے ہیں - اور اس کو دنیا سے نابود
کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے - تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں - بلکہ بلا تامل اس کے مستقبل پر حکم لگا دو
کہ یہ قوم قطعاً ابھرنے والی ہے - اور اس شان سے ابھرے گی کہ اس کے ستانے اور دبانے والے دنگ رہ جائیں گے
[illegible] نہیں - جتنا احساس زیاں مفید ہے [illegible] یہی احساس کا وجود کسی قوم کو عروج
کے آسمان پر چڑھا دینے کا ضامن ہو سکتا ہے - خوش قسمت ہے وہ قوم جو نقصان اٹھائے - پھر اسے نقصان
کا احساس ہو - پھر احساس سے اس میں روح عمل پیدا ہو - اور روح عمل وہ شے ہے جس پر اقوام کی تعلیمی معاشرتی
تمدنی اور سیاسی ترقیات کا انحصار ہے ؛

"گمنام"

جلال الدین خوارزم شاہ

ایک ڈراما

مصنفہ نامق کمال (سلسلے کے لئے گزشتہ پرچہ ملاحظہ ہو) مترجمہ سجاد حیدر بی۔ اے

مجلس ہفتم

اشخاص سابق قطب الدین۔ اورخان۔ غلام

جلال الدین۔ جو دنیا میں آیا ہے۔ وہ ایک روز دنیا سے جائے گا۔ ہمارے بادشاہ نے انتقال کیا (سب رونا اور فریاد کرنا شروع کرتے ہیں) تم لوگ کیوں روتے ہو۔ کیا آنسوؤں سے جنازے دفن کئے جاتے ہیں؟ ہمارے بادشاہ نے تو اپنے تئیں خود اس مزار میں دفن کر لیا تھا۔ جس وقت ان کی موت لازم تھی۔ اس وقت وہ زندہ رہے اور جس وقت ان کا جینا ضروری تھا۔ اس وقت وفات کی۔ دیکھو۔ ان کا جنازہ میرے سامنے پڑا ہوا ہے۔ اگر میت کے زبان ہوتی۔ تو وہ "انتقام انتقام" کہہ کر پکارتی۔ ایسے بدبخت بادشاہوں کے ماتم میں آنکھوں کے آنسو نہیں دشمن کے خون بہائے جاتے ہیں۔ میں مرحوم کو دفن کر کے یہاں سے نکلتا ہوں۔ اور اپنے اللہ سے عہد کرتا ہوں۔ کہ یا مملکت اسلام کو تاتاریوں کے پنجہ سے چھڑاؤں گا۔ یا شہادت مجھے اس قسم سے خلاصی دے گی۔ جو لوگ وطن اور ملت کو اپنی جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔ وہ میرے ساتھ آئیں۔ جو اپنی راحت اور سلامتی ڈھونڈتے ہیں وہ جہاں چاہیں جائیں +

اورخان۔ اے بادشاہ! حضور کے جو غلام اس دنیا میں قبر تک حضور کے والد سے جدا نہ ہوئے۔ کیا وہ میدان غزا میں یعنے دروازہ جنت میں حضور سے جدا ہوں گے +

جلال الدین۔ تم مختار ہو۔ اچھا جاؤ پانی لاؤ۔ قبر کھودو۔ اور جو لازم ہو وہ کرو۔ ہم مرحوم کے جسم کو چنگیز جیسے ناصر جیسے کتوں کی طرح گھوڑوں اور پرندوں کے لئے نہیں چھوڑ دینا چاہتے (دفن کر جاتے ہیں۔ قطب الدین سے مخاطب ہو کر) قطب الدین یہاں آؤ۔ دیکھو تمہارے دادا کس حال میں پڑے ہیں۔ دو سال پہلے دنیا میں جس قدر انسان تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو وہ ایک ایک خلعت شاہانہ دینے کا قصد رکھتے تھے۔ آج آٹھ گز کا کفن کا کپڑا دینے کے لئے بھی ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ مزار میں ان ہی بوسیدہ کپڑوں میں دفن کئے جائیں گے۔ دیکھو اور عبرت حاصل کرو +

قطب الدین۔ ابا جان اللہ اپنے بندوں کو ایسی مصیبت میں ڈالنے پر کیوں راضی ہوتا ہے +

جلال الدین۔ بیٹے تم ان باتوں پر غور مت کرو۔ آہستہ آہستہ تم سب سمجھ جاؤ گے۔ یہ سب ہمارے ہی افعال کا نتیجہ ہے (اوزبیگ کی طرف مخاطب ہو کر) ہمارے ہاتھ میں کوئی قلعہ

بھی نہیں رہا۔ ملکہ کو کہاں چھوڑیں؟

نیرہ۔ اللہ میرے جسم کے ہر ذرے کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ لیکن مجھے آپ سے جدا نہ کرے۔ میرے لئے اگر کوئی قلعہ ہے تو آپ کا وجود اور کوئی پناہ گاہ ہے تو آپ کا بازو۔ آپ سے آپ کا سایہ جدا ہو جائے۔ لیکن میں آپ سے جدا نہ ہوں گی۔ جیوں گی تو آپ کے قدموں میں جیوں گی اور مرونگی تو آپ کی آنکھوں کے آگے مروں گی؛

جلال الدین۔ اور قطب الدین کو کیا کریں؟

قطب الدین۔ ابا جان ایک دفعہ یہاں آتے وقت ہم نے ایک شیر کو دیکھا تھا۔ اماں جان آپ کو یاد ہوگا۔ پیچھے ایک چھوٹا سا بچہ تھا کہ نہیں۔ پھر قطب الدین آپ کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ کیا اب میں حیوان کے بچہ سے بھی بدتر ہوں؟

جلال الدین۔ سچ کہتے ہو۔ تم دونوں سچ کہتے ہو۔ تاتاریوں کے مقابلہ کے لئے ہم سب چلیں گے۔ موت کے مقابلہ میں عورت مرد۔ بچہ اور بڑے کا کوئی فرق نہیں ہے (علاؤالدین کے جنازے کے قریب پہنچ کر) ابا جان میرے پادشاہ ابا جان! میں اس وقت آپ کی جگہ اپنے تئیں چاہتا ہوں۔ میں آپ کے حکم کا تابع ہوں۔ یقیناً آپ کی روح میری باتیں سن رہی ہے۔ اس مزار نما جزیرہ میں دفن ہونے والے جنازہ کے حضور میں اپنے خدا کے ساتھ عہد کرتا ہوں۔ کہ اپنے اللہ کی، اپنے جنس کی، اپنی ملت کی خدمت کو اپنی جان، اپنے آرام حتے کہ آپ کے انتقام پر ترجیح دوں گا۔ آپ شہید ہیں آپ خدا سے التجا کیجئے۔ کہ یا تو جلال کو اپنے عہد کو پورا کرنے یا اس کفن کے خشک ہونے سے پہلے آخرت میں آپ کے ساتھ ملاقات کرنی نصیب کرے (سب لوگوں کو مخاطب کر کے) تم میرے عہد کو سن رہے ہو؟

اوزبیگ اور خان۔ ہاں ہم نے سنا۔ اللہ ہمارا مددگار ہو۔

جلال الدین۔ ہم اللہ کے کاموں میں دخل نہ دیں گے صرف اس کی راہ پر چلیں گے۔

(پردہ گرتا ہے)

پردہ دوم

مجلس دوم

ایوان شاہی خوارزم میں ایک نہایت مکلف اور وسیع کمرہ جس کے داہنے جانب ایک دوسرا چھوٹا کمرہ بڑے کمرے میں ارق سلطان، براق حاجب، بدرالدین، عمادالملک امیر نوشتگین، ملک نصرت۔

چھوٹے کمرے میں اوزبیگ، اورخان، نورالدین، منشی، نیرۃ الاقبال)۔

نیرہ (چھوٹے کمرے میں داخل ہو کر اوزبیگ سے کہتی ہے) تم کیا چاہتے ہو کہو۔ کیا تم ایوان شاہی میں پھر اگر مجھے سیر دکھلانا چاہتے ہو؟

اوزبیگ (نورالدین سے مخاطب ہو کر) بادشاہ سلامت سے جا کر عرض کرو۔ کہ حضرت ملکہ حضور سے ایک بڑے اہم معاملہ میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہیں۔ اور یہ درخواست کرتی ہیں کہ حضور یہاں تشریف لائیں۔ (نورالدین جاتا ہے) (ملکہ سے مخاطب ہو کر) آپ اس دروازہ کے قریب تشریف لائیے اور سنئے۔

(بڑے کمرے میں عمادالملک، آرق سلطان سے کہتا ہے) اے میرے پادشاہ! حضور کے بھائی رکن الدین مرحوم

کی شہادت کے بعد یہ غلام حضور کی خدمت کے لئے یہاں
آیا۔ حضور کے بھائی کا قیدی ہونے کے لئے نہیں آیا +

نیرہ۔ ہائیں . . .

اوزبیگ۔ اچھی طرح سنئے +

براق حاجب۔ وہ ممالک جو حضور کے زیر نگیں تھے۔ اور
اب بے حکومت پڑے ہوئے ہیں نہ معلوم جلال الدین نے انہیں
چھوڑ کر کیوں صرف کشور خوارزم کی ہوس کر رکھی ہے۔ جو حضور
کا حصہ وراثت ہے۔ مانا کہ وہ اکبر خاندان ہیں، لیکن کیا اپنا
بزرگ خاندان ہونا وہ صرف اس طرح ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ
وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کے حصوں کو حسد کی نگاہ سے
دیکھیں +

جس چنگیز نے دنیا کو فتح کر کے، دنیا کی حکمرانی حاصل کی
ہے۔ کاش جلال اُسی کے خاندان سے عبرت حاصل کریں
چنگیز نے یہ وصیت کی ہے۔ کہ میرے بعد میرے سب سے
چھوٹے بیٹے کو سلطنت ملے، اس پر بھی اُس کے بڑے بھائی
جنہوں نے آدھی دنیا کو اپنی تلوار سے فتح کیا ہے۔ چنگیز
کی حیات میں چنگیز سے زیادہ اُس چھوٹے بھائی کی حرمت
وعزت کرتے ہیں +

نیرہ۔ ملعون! چنگیز ساری دنیا سے بڑا ہے۔ تو کیا نعوذ
باللہ خدا سے بھی بڑا ہے کہ اُس کی وصیت کو شریعت کے حکم
پر ترجیح دی جائے +

براق حاجب۔ کہیں بغیر فوج کے بھی بادشاہت
قائم ہو سکتی ہے؟ اور اگر یہ سلطنت ہماری اطاعت سے قائم
ہو گئی۔ تو ہم جلال کی اطاعت کرنے والے نہیں +

نیرہ۔ آہ! کُتّے یا شیطان نے یہ شکل اختیار کر لی ہے +

ارق سلطان (براق حاجب سے) تمہاری بات درست
معلوم ہوتی ہے +

نیرہ۔ تمہیں بھی اتنا تمیز ہو گیا کہ درست اور غلط میں فرق
کر سکو +

نوشتگیں۔ اگر جلال الدین اقتضائے وقت سے واقف
ہوتا۔ تو کاہے کو ایک ایسے جزیرہ میں چھپ کر بیٹھ جاتا جس
میں ابتدائے آفرینش سے انسان کا قدم نہیں گیا، اور بجائے
ایسے قیمتی وقت کو ضائع کرنے اور ایک کونہ میں بیٹھنے کے ہر
قسم کی کوشش اور تدبیر کرتا کہ ہمارے سر پر جو بلا مسلط ہو
گئی ہے۔ اُسے دفع کرے۔ ایسے عاجز شخص کے زیر حکم ہو
کر ہمیں کیا ملے گا +

نیرہ۔ ملعون! تو بھی جہنم کی آگ سے بنا ہے +

ارزاق سلطان۔ بھائی وہ کیا کرتا۔ وہ اپنے باپ اور
اپنے پادشاہ کے حکم سے وہاں گیا تھا۔ باپ اسے وہاں لے
گیا تھا +

نیرہ۔ اب سمجھا کُتّے! دس برس کا بچہ بھی تیری باتوں پر
یقین نہیں کرتا +

عماد الملک۔ آپ کے والد کا معاملہ جدا ہے۔ اُن کا وجود دنیا کے
لئے لازم تھا، اور وہ ہماری اتفاق رائے سے وہاں گئے
تھے۔ آپ ابھی سن رشد کو نہیں پہنچے ہیں۔ اس لئے ہر معاملہ
کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے ہیں، اور اس لئے معذور ہیں۔ ورنہ
اگر کوئی اور شخص یہ بات کہتا تو وہ باغی خیال کیا جاتا۔ جلال الدین
کی طرفداری کرنے سے کیا یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ اپنے
بھائی کے خلاف ہیں +

ارزاق سلطان۔ مجھ پر کیوں ایسا اتہام لگاتے ہو۔

میرے ذہن میں ایک بات آئی وہ میں نے کہہ دی - اگر وہ
بُری تھی تو میں اپنے بھائی جان سے معافی مانگتا ہوں ؛

نیرہ - اس شہزادہ کو دیکھو - ایک کتے کے سامنے کانپ رہا ہے

امیر توشتگیں - جلال الدین کے حال و افعال کا محاکمہ کرنے
کی ضرورت نہیں - اس وقت ہم اس سلطنت کے ارکان ہیں
اور سلطنت خوارزم شاہ ہماری تلوار پر تکیہ کئے ہوئے ہے اور
اُس پر قائم ہے ؛

نیرہ - خدا اس تلوار کو تیرے کلیجہ میں گھسا دے ؛

عماد الملک - اس میں کون شبہ کی گنجائش ہے ؛

امیر توشتگیں - ایسی حالت میں، ہم جلال الدین کے حضور کیا
اوزبیگ اور اورخاں کی طرح نہ جا پڑیں گے - اوزبیگ کے
پاس تو صرف اس قدر رہتا - کہ اُس کے جسم میں ۱۸ زخم تھے؛
مگر میرے زیر حکم (۳۰) ہزار تلواریں ہیں - اورخاں نے
فوج سے آگے ہو کر اپنے سینہ پر دشمن کا تیر لیا تھا - میں فوج
کے آگے اپنے زرہ پوش سواروں کی ایک سدِ آہنیں کھڑی
کر سکتا ہوں - کہیں وہ آدمی بھی پادشاہت کے قابل ہے
جو زخم کو تلوار پر ترجیح دے - جلال الدین کی اطاعت قبول کر کے
کیا ہم اپنے شہروں کو اسپتال، اور اپنے گھروں کو قبرستان
بنا لیں ؛

خادم خاں - حقیقت میں اب مسئلہ کے اہم ترین پہلو پر
نظر ڈالی جا رہی ہے ؛

نیرہ - لو ایک افعی نے اور منہ کھولا - دیکھوں یہ کیا زہر
اُگلتا ہے ؛

خادم خاں - جلال الدین کو، ہوس ملک مبارک ہمارے لئے
تو لازم ہے - کہ ہم دیکھیں کہ ہم اس کی اطاعت قبول کر سکتے ہیں
یا نہیں - یہ فرض کر کے کہ اس ملک کو کوئی اور مستحق اور جائز
مالک نہیں مل سکتا - اور سلطنت خوارزم اسی کی ذات سے
قائم ہے، اور دنیا میں جلال الدین کے سوا کوئی دوسرا شخص
پادشاہت کے لائق باقی نہیں رہا - ہم کو کیا طرز عمل اختیار
کرنا چاہئے - اُس نے تاتاریوں کے ساتھ لڑائی کرنے کی اپنے
دل میں ٹھان لی ہے - اور اس طرح اس ملک کو اور اس
سلطنت کو جو ہمارے باپ دادوں نے اپنی تلواروں کی قوت
سے حاصل کی تھی رائگاں کرنا چاہتا ہے . . . جانتے ہو تاتاریوں
سے جنگ کرنا کیا معنی رکھتا ہے ؟ قضا سے دست گریبان ہونا
قدرت سے لڑائی لڑنا، تاتاریوں سے جنگ کرنا ہے - تاتاری
معمولی انسان نہیں ہیں - وہ ایک قوم ہے - جو ہاتھی سے
زیادہ پُرہیبت چیتے سے بڑھ کر خونریز اور چیونٹی سے زیادہ پُر
کثرت ہے - جب اُن کی فوج حرکت میں آتی ہے - تو ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے اُوپر ساری دنیا اُمڈی چلی آرہی
ہے - وہ لوگ جس وقت قطع منازل کرتے ہیں - تو اُن کے
پاؤں کے نیچے زمین فریاد کرتی ہے - اور ان کے دھاکے
سے ربع مسکوں میں ہلچل پڑ جاتی ہے - باوجود اس کثرت
کے نہ معلوم خدا نے اُنہیں دیو کی جنس سے پیدا کیا ہے - یا
اپنے غضب اور قہر سے - اُن کا ایک دستہ فوج ملکوں کے ملکوں
کو نیست و نابود کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے - اُن کی ایک عورت
ہمارے ساٹھ مردوں کو قتل کر ڈالنے پر مقتدر رہے . . .
اُن میں سے ہر ایک ایک بلائے مجسم ہر ایک، ایک قضائے
مبرم ہے . . . لڑائی شروع ہوئے ابھی کتنا زمانہ ہوا ؟ مشکل
سے چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ اس مدت میں انہوں نے
کیسے کیسے معمور ملک کیسی کیسی آباد بستیاں تباہ کر ڈالیں، اور

اس جہان آباد کو عدم آباد کر دیا جس ملک سے وہ گزرتے ہیں وہاں اُن کے پاؤں کی خاک سورج کو چھپا دیتی ہے۔ اُن کا خوف ہر چار طرف موت پھیلاتا جاتا ہے۔ اُن کے گھوڑے عزرائیل کی رسّی سے بندھے ہیں اور جن کی دُموں میں جہنم آویزاں ہے۔ کیونکہ ایک مرتبہ یہ جدھر سے گزر گئے۔ وہاں مزار اور آگ کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تاتاریوں کی پہلی یورش کا میں نے مقابلہ کیا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ اگر ہم میں سے ہر ایک کے پاس جدا جدا ایک سلطنت خوارزم شاہی ہو تو بھی ہمیں چنگیز اس بات پر مجبور کر دے گا۔ کہ ہم وحشت انگیز بیابانوں اور سنسان جزیروں میں بھوک سے مر جائیں۔ جو کوئی اپنے بچوں کو بھیڑیوں اور گدھوں کے مونہوں میں اپنی عورتوں کی گردنوں کو دشمن کی زنجیروں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ جلال الدین کا اتباع کرے۔ غائر خاں پر جو بیتی وہ میرے دل پہ نقش ہے نا نا نا میں چنگیز سے جنگ نہیں کر سکتا ۔

نیرّہ۔ آہ کیا اُس شہید کی سرگذشت اس قابل تھی۔ کہ تیرے دل پر لکھی جائے؟ تیرا دل تو خود ایک دروازۂ جہنم ہے۔ غائر خاں کو دھوکا دے کر ہمارے اوپر بلا مسلط کرنے والا ملعون دیکھو۔ اس وقت کیا باتیں بنا رہا ہے (اوزبیگ سے مخاطب ہو کر) میں اب برداشت نہیں کر سکتی۔ ان کتوں میں سے ایک ایک کی زبان جڑ سے اکھاڑ پھینکوں گی ۔

خادم خاں۔ تم لوگ کیا فکر کر رہے ہو۔ جنگ کے طلب گار ہو یا نہیں؟

اوزبیگ۔ اُن سب کی رائے لے لیں۔ تب ہم جنگ کے لئے نکل سکتے ہیں۔ کتنے مرد ایسے موجود ہیں۔ جو سلحہ سے مسلح ہیں ۔

خادم خاں۔ کسی کے چھوٹے منہ سے کچھ بات نہیں نکلتی ہم لوگ اس سکوت اور حیرت سے تو کوئی ارادہ عمل میں نہیں لا سکتے۔ جس وقت تاتاریوں کی تلوار ہمارے سینہ پر اور اُن کے گرز ہمارے سروں پر آ کر پڑیں گے۔ اُس وقت ہم بھی اس خواب غفلت سے بیدار ہوں گے ۔

امیر نوشگین۔ میں کوئی راہ اس کی نہیں دیکھتا۔ کہ ہم چنگیز کے ساتھ لڑائی کرنے سے نجات پائیں۔ اس لئے آپ سے پوچھا ۔

ارق سلطان۔ لڑائی چھڑ چکی ہے اب کیا ہو سکتا ہے ۔

خادم خاں۔ لڑائی چھڑ گئی ہے۔ لیکن خدا نے صلح کا امکان دنیا سے ناپید نہیں کر دیا ۔

بدرالدین۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ کہ چنگیز ایسی صلح پر راضی ہو جائے گا۔ جسے وہ بھی اور تم بھی اچھا سمجھو گے ۔

نیرّہ۔ جاسوس کتّا!

خادم خاں۔ (ملک نصرت سے مخاطب ہو کر) تم کچھ نہیں کہتے ۔

ملک نصرت۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ابھی تم نے جو باتیں کی ہیں۔ اُن میں سے کس کو زیادہ قابل حیرت سمجھوں۔ میرے نزدیک تو ایک سے ایک زیادہ قابل حیرت ہے۔ کیا آج کے دن جلال الدین ہمارے بادشاہ کی اولاد میں سب سے بڑا نہیں ہے ۔

عماد الملک۔ ہے۔ پھر؟

ملک نصرت۔ پھر کیا۔ شرع کے مطابق اُس کے ہر حکم کی اطاعت ہم پر کرنا فرض ہے ۔

نیرّہ۔ یہ کون ہے؟

اوزبیگ - ملک نصرت پادشاہ کا بھلا سوچنے والوں میں سب سے آگے یہ تھا اور ہے ۔

ارق سلطان - اگر وہ پادشاہ ہوگا تو پھر میں کیا کروں گا

ملک نصرت - آپ ہمارے پادشاہ کے سب سے بڑے بھائی یعنی سب سے قریبی اور سب سے عزیز غلام ہوں گے۔ اُس کے حکم کے آگے قضا اور قدر کی طرح سر جھکانا ہم سب سے زیادہ آپ کے لیئے موزوں ہوگا ۔

امیر نوشتگیں - جلال الدین کی اطاعت کرکے ہم اپنے تئیں اُس کے دروازے کے کتوں سے زیادہ ذلیل کرلیں؟

ملک نصرت - توکیا تو اپنے اعتقاد میں کتے سے زیادہ ذلیل نہیں ہے ۔

نیرہ - شاباش!

نوشتگیں - دیکھو جسارت - اگر ادب مجلس مانع نہ ہوتا۔ تو میں اس آدمی کو ایک تلوار سے دو ٹکڑے کر دیتا ۔

ملک نصرت - ایسی ہمت والا اگر کوئی ہو تو کیا کہنا یا تو دنیا سے ایک بلا اُٹھ جائے اور ایک نمک حرام کم ہو جائے ۔ یا میرا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نمک حراموں میں سے علیحدہ ہو جائے ۔

خادم خاں - (بیچ بچاؤ کرکے اور نوشتگیں سے مخاطب ہوکر) بھائی کیا یہیں تلوار چلنے لگے گی (ملک نصرت سے مخاطب ہو) کیا تم ہمیں تاتاریوں کے گھاٹ اُتارنا چاہتے ہو۔

ملک نصرت - تمہارا ارادہ کیا ہے؟ کیا دنیا میں جتنے مسلمان ہیں۔ وہ سب کے سب حکم خدا، سنت پیغمبر، شرف انسانیت، کی توہین دیکھیں اور خاموش بیٹھے رہیں؟ اپنی آزادی کو اپنے ہی پاؤں تلے روند ڈالیں، اپنے نفس اور اپنے مال کو بطیبِ خاطر تاتاری مشرکوں کے سپرد کردیں؟ اور اس خوف سے کہ تمہارے بچوں کو درندے جانور دکھوتیں کیا تم انہیں تاتاریوں کی ساقی گری کی خدمت کرانی چاہتے ہو؟ کیا اس لئے کہ اپنی عورتوں کو زنجیروں سے بندھا ہوا نہ دیکھو۔ انہیں دلہنوں کا لباس پہنا کر دشمن کے آغوش میں دینا چاہتے ہو؟ خدا سے ڈرنا خلقت سے شرمانا اگر تمہیں نہیں آتا تو اپنے نفس سے تو شرماؤ۔ جب صرف . . . .

خادم خاں - ان خیالات میں کب تک غرق رہو گے واقعات سے سبق حاصل کرو۔ چنگیز ایک قبیلے کا سردار تھا تب بھی اُس نے کسی کو اپنے سے بڑھ کر نہیں مانا۔ اور قبیلوں نے اُس کے آگے سر جھکایا۔ چین کے ملک کا خیال کرو ابتدائے آفرینش سے یہ ملک کسی غیر ملک سے مغلوب نہ ہوا تھا اسکندر سا جہانگیر دور سے ہی اُسے حسرت سے دیکھا کیا۔ خلفائے اسلام میں بھی جن کی تلواروں نے شرق سے لے کر غرب تک ناپ ڈالا تھا۔ اور جن کی شوکت سے ساری دنیا جگمگاتی تھی۔ کوئی بھی اس ملک کو نہ لے سکا۔ اس چین کا خیال کرو جو ساری دنیا سے زیادہ معمور اور جس میں ساری دنیا کی آبادی کی نصف آبادی سمائی ہوئی ہے چنگیز نے ایک حملہ میں اس ملک کے لوگوں کو ذلت و اسیری کی خاک پر گرا دیا۔ اور جہاں اُس نے پاؤں رکھا وہاں اُس نے سجدے کرالئے۔ جانتے نہیں کہ ماوراء النہر کا اُس نے کیا حال کر دیا؟ اُس نے ملک یکسر آتش، دریا یکسر خون کر دیئے۔ چنگیز زندہ، سارا ملک اُس کے زیر نگیں، فوج پُر اطمینان، اُمرائے فوج کا اتحاد درجہ کمال پر پہنچا ہوا۔ اُدھر آدھا ملک دشمن کے پاؤں کے تلے

خراب وخستہ، باقی نصف کے ہر حصہ میں ایک علیحدہ علیحدہ
چھوٹی چھوٹی حکومت قائم، ہر شخص میں خوف سے اتحاد و تو کیا
جو اس راجزا میں بھی انتشار۔ کیا اس حالت میں ہم اُس
کا مقابلہ کرینگے؟

ملک نصرت۔ تمہاری تمام مصیبتوں کا سبب تمہارا
ضعفِ اعتقاد ہے۔ انسان کی زندگی جس وقت تک موجود
ہے۔ اپنے دین اور اپنی دنیا کی حفاظت کے لئے اُس کو اور
کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم دشمن کے سامنے ثابت
قدم نہیں رہ سکتے۔ تو اُس کے مقابلہ میں جان دے دینا بھی ہمارے
اختیار میں نہیں ہے؟ غیرت تو تمہاری ختم ہو ہی چکی تھی۔ کیا
عقل بھی چلی گئی؟ تاتاریوں کے حملے تمہارے دل سے نہیں
نکلتے۔ مگر جلال الدین کی تلوار کا بھی تمہارے ذہن میں گذر
ہوتا ہے کہ نہیں؟

خادم خاں: اپنے مطلب کو چبا چبا کر کیوں کہتے ہو۔ تمہیں
جلال الدین ہی کا خوف ہے۔ مگر اس قدر تشویش کی ضرورت
نہیں۔ ہم نے سب تدبیریں مکمل کر رکھی ہیں۔ اس وقت بھی
اگر میں اپنے ہاتھوں کو نچوڑوں۔ تو اُن کے ناخنوں سے
جلال الدین کے خون کے قطرے گریں گے۔

نیرّہ۔ آہ!

ملک نصرت۔ اگر اس وقت عزرائیل تیری روح قبض
کرنے کے لئے آئے۔ تو خدا کے حضور میں وہ کیا اچھا ہدیہ
لے جائے۔ کہ اورکوذ کے اُمرا اور اعیان کی خیانت اور
نفاق کی شہرت تیرے سامنے جھوٹی شہرت ہے۔ یہاں
گوشت اور ہڈی کے کالبد میں چند ایسی خبیث رُوحیں موجود
ہیں۔ کہ اگر انسان اُن کا خیال کرتا ہے تو اُن کے مقابلہ میں

وہ ملعون بھی جنہوں نے خطوط بھیج کر التجائیں کر کر کے امام
حسینؓ کو عراق میں بلایا۔ اور پھر کربلا میں اُن کے وجود مبارک
کو شہید کیا۔ ماشاءاللہ کم شقی معلوم ہوتے ہیں۔ ان امرا کو
دیکھو۔ ہمارا دین ہماری دنیا خراب ہو رہی ہے۔ ہمارے
ملک پر اُلّو بول گیا ہے۔ ہمارے عبادت خانوں میں خدا کے
نام کے بجائے چنگیز کے نام کی پرستش کی جا رہی ہے۔ اس پر
بھی تم نے بڑی ہمت کی۔ تو اپنے ولی نعمت زادے اپنے
بادشاہ کو دنیا سے محو کرنے کی تدبیر سوچی۔ روئے زمین پر۔
اس وقت اسلامیت و انسانیت کی اگر کوئی استناد گاہ ہے
تو وہ جلال الدین کی ذات ہے۔ مگر شیطان نے تمہیں اُس
پر مسلط کر دیا ہے۔ تم لوگ اُس کے لہو کے پیاسے ہو رہے
ہو۔ اس کوشش میں ہو کہ امتِ محمدؐ بالکل یتیم و بیکس رہ
جائے۔ یا اللہ العظیم۔ ابرہہ و حجاج نے کعبہ کے ساتھ جو
کیا وہ تم سے زیادہ قابل نفرت نہیں۔

بدرالدین۔ (قہقہہ لگا کر) آپ یقین کیجئے۔ جلال الدین کی
قدر و قیمت ہم آپ سے زیادہ جانتے ہیں۔ بیشک دنیا کی استناد گاہ
اس وقت جلال الدین کے سوا اور کہیں نہیں۔ اگر کوئی اُس
کی جان کا قصد کرے۔ تو میں یہ نہ کہوں گا۔ کہ میں اپنی جان دے
دوں گا۔ کیونکہ میں دیوانہ نہیں ہوں، ہاں یہ کہتا ہوں کہ جو
کوئی اس کی جان کا قصد کرے گا، ہم اس کی جان لینے کی
جاں توڑ کوشش کرینگے۔

خادم خاں۔ بیشک۔

عماد الملک (خادم خاں سے مخاطب ہو کر) تم بھی اُسی
کی سی کہنے لگے۔

نوشتگین۔ صرف وہی نہیں میرا بھی یہی اعتقاد ہے۔

براق حاجب۔ (تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر) غرض یہ تھی کہ ہم اپنے خیالات ظاہر کردیں۔ ہم جال میں پھنس گئے +

بدرالدین۔ دُرُست، دُرُست، سانپ کا سانپ پر زہر نہیں چڑھتا +

ارق سلطان۔ کیا مطلب، ابھی جو تمہارے منہ سے باتیں نکلیں وہ کیا تھیں، کیا میری جان لیوا ہو؟

بدرالدین۔ توبہ توبہ حضور! خادم خاں، امیر نوشتگین نے آپکے غلام سے اس معاملہ میں مذاکرہ کیا تھا۔ بیشک آپکے بھائی کا وجود ہمارے لئے الزم ہے۔ بنائے سلطنت اُس کے ذریعہ سے مضبوط ہو گی، چنگیز کی قوت و شوکت ظاہر ہے۔ آپکے خاندان سے جو اُسے دشمنی ہے، وہ بھی آپ کو معلوم ہے۔ باوجود اس کے میں نے اُس کی طبیعت میں ایک بڑا پن دیکھا ہے۔ ہماری طرف سے ان کی شایان شان معاملہ نہیں ہوا۔ اگر وہ کوئی ایسا معاملہ دیکھے جس سے آپ کی دوستی مترشح ہو تو میں یقین کرتا ہوں کہ وہ راضی ہو جائیگا گو جنت مکان پادشاہ کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے اُن کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ حضور کو اپنی شاہانہ دوستی کا بہت قوی ثبوت دینا ضروری ہوگا۔ دنیا میں اس وقت جلال الدین کے سوا چنگیز کا کوئی دوسرا ایسا دشمن نہیں ہے جس کے نام سے اس کو غصہ آجاتا ہو۔ اگر حضور اُسے چنگیز کے سپرد کرسکیں۔ تو چنگیز حضور کی طرف غیر معمولی رعایت کا اظہار کرے گا۔ نیز . . .

نیرہ (دروازہ کھول کر بڑے کمرے میں جائے) ہاں ایک ایسے دیوانے کو تخت پر بٹھا کر جو پادشاہ کے خون میں اپنے ہاتھ رنگ چکا ہو، تم ایران میں، توران میں اُس کی طرف سے سلطنت کرنا چاہتے ہو نہ؟ کتے۔ تم میں اتنی جسارت کہاں سے آگئی کہ شیر کے اوپر حملہ کرنے کا ارادہ کرنے لگے؟ تم میں سے کس کا سینہ ہے۔ کہ پادشاہ کی تلوار کی سپر ہوسکے؟ تم میں سے کون ایسا سورما ہے جس کا بازو اُس کے پنجہ کا مقابلہ کرسکے؟ کیا تم خیال کرتے ہو۔ کہ جلال الدین تمہارے عرض و ناموس تمہارے دین و ایمان کی طرح بے ثبات ہے؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ادھر تم نے کہا، اُدھر اُس نے اپنے تئیں چنگیز کو تسلیم کیا؟ دیکھو کمینو کو۔ بیٹھے فیصلہ کر رہے ہیں۔ یہ سب کے سب ایسے بے غیرت ہیں کہ اگر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں۔ تو ان کے جسم میں سے جو خون نکلے گا۔ وہ سانپ کے خون کی طرح ٹھنڈا ہوگا۔ ان کے قلب میں کسی بات سے بھی تو حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ خدا انہیں جہنم واصل کرے۔ یہ اُن کتوں کی طرح ہیں۔ جو چاند کو دیکھ کر اُس پر بھونکتے ہیں۔ پادشاہ کے پیٹھ پیچھے اُس کے خلاف باتیں کرنے کی جرات کر رہے ہو۔ وہ فاحشائیں جو تمہارے نکاحوں میں ہیں تم سے ہزار درجہ زیادہ مرد ہیں +

نوشتگین۔ ہم اس حقارت کو کب تک بیٹھے بیٹھے برداشت کرینگے!

خادم خاں۔ چپ رہو۔ تمہاری آنکھیں بھی ہیں یا نہیں؟ اوزبیگ دروازے کے پیچھے کھڑا ہے۔ سارا مکان میگزین بنا ہوا ہے۔ جدھر دیکھو تلوار کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا +

نوشتگین۔ خوف، کوشش کے لئے پیغام اجل ہے۔ کام اس طرح نہیں بنتا ہمیں جو کچھ کرنا ہے۔ ہم اُسی وقت کریں گے۔ اگر ہم چنگیز کے سامنے اس سلطنت اور اس حسین اور اس فصاحت بھری ملکہ کو یکجا کر پیش کریں۔ تو یقیناً انہیں وہ جلال الدین سے زیادہ پسند کرے گا +

نیرہ

باقی آیندہ

مینہ برس رہا ہے

مینہ موسلا دھار برس رہا ہے - ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر
طرف شام کی سی تاریکی چھائی ہوئی ہے - درخت اور پودے ایک دھلی
ہوئی تصویر کی طرح اپنی سبزی میں زیادہ سبز اور اپنی پاکیزگی میں زیادہ
صاف نظر آرہے ہیں - پھول اور پرندے - نغمہ اور نکہت - رنگ
اور بو سب شاداں معلوم ہوتے ہیں - اے میری آرزوؤں کی
ملکہ میرا دل اداس ہے ؛

بارش کی چلمن میں سے کائنات ایک دنیائے موہوم دکھائی
دیتی ہے - جس کو دیکھ کر دل میں اُمنگیں اُٹھ سکتی ہیں - مگر
جہاں خواہشوں کا پورا ہونا اسی دنیا کے باشندوں کے لئے
مخصوص ہے - درخت جھومتے ہیں - میں ان کو دیکھتا ہوں - ان
کے پتے ہل ہل کے لپٹتے اور جھک جھک کے چومتے ہیں - ان کی
لرزش میں مجھے تیرا تبسم نظر آتا ہے - سبزہ لہلہاتا ہے - میں سمجھتا ہوں
تو اٹکھیلیاں کر رہی ہے - پرندے پتوں میں چھپ چھپ کے
گاتے ہیں - میرے کانوں میں تیری آواز پڑتی ہے - میں یہ سب
دیکھتا ہوں - سب کچھ سنتا ہوں - اور ترستا ہوں - یہ تو بارش کے
اس پار کی دنیا ہے ؛

بجلی چمکتی ہے - میں سمجھتا ہوں - اس دنیا سے کوئی پیغام
آیا - لیکن وہ تڑپ تڑپ کے ترساتی ہے - اور میں ترس ترس
کے تڑپتا ہوں - اس کو کہہ کہ اپنا ایک نقرئی تیر میرے
سینے تک پہنچا دے - اور اس کو میری حسرتوں میں بجھا کر
مجھ تک لے جائے - لیکن اے میری حسرتوں کی امید اکیلا تو
اپنی دنیا میں جہاں ہوائیں چل رہی ہیں - اور نالے بہہ رہے
ہیں - میری ضعیف التجائے درد کو سن سکتی ہے ؟

پرندے چہچہاتے ہیں - میں چپ بیٹھا ہوا سنتا ہوں
میرے سینے میں بھی ایک نغمہ ہے - ان کو کہہ کر وہ مجھے بھی اپنے
ساتھ گانے دیں - کہ میرے نغمے کی نکہت تیرے بالوں کی طرح
کائنات کے دل میں کھو جائے - میں اکیلا اس کی مستی کا متحمل نہیں ہو سکتا - وہ
ایک شراب ہے کہ جس میں ساقی قدرت نے ایک آبگینہ کے
ٹکڑے پھینک دیئے تھے - میرے دل میں خراش ہو رہے
ہیں - اس بادل کو بھیج دے - کہ آ کے سن جائے اور تیرے
پاس روتی ہوئی جائے ؛

اے میری مقصود انتظار! تو بارش کے اس پار آجا -
جہاں میرا دل اور میری آنکھیں تیرے لئے خواہشوں اور
آرزوؤں کی پاکیزگیاں لئے تیری راہ تک رہی ہیں - اس پار
آجا - پیشتر اس کے کہ میں اپنے ساز کو توڑ دوں - اور اپنی تمام
آرزوؤں کو ایک درد انگیز چیخ کی صورت میں اپنے سینے
سے نکال کر تیرے لئے ویسا ہی موہوم بن جاؤں -
جس طرح تو آج میرے لئے ہے ؛

"پطرس"

خاکی چھپر کھٹ

دل آرام سولہ برس کی جوان جہان لڑکی تین دن سے سکرات کے عالم میں مبتلا تھی۔ نہ ادھر ہوتی تھی نہ ادھر۔ غمزدہ ماں کی گود تھی۔ اور اس کی اکلوتی بیٹی کی نعش۔ بدن سے دم کھنچتا تھا تھا۔ ہاتھ پیر مڑے جاتے تھے۔ قبول صورت چہرہ پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ پیشانی پر بار بار پسینہ آتا تھا۔ پتلے پتلے نازک ہونٹ جن پر لاکھا جمانے کا دل آرام کو شوق تھا۔ خشک اور بے رونق ہوگئے تھے۔ سکرات کی بے چینی سے نرگسی آنکھوں میں آنسو بھرے چلے آتے تھے۔

پائینتی فتیل سوز روشن تھا۔ مگر اس کی روشنی بھی کچھ اداس اداس تھی۔ دل آرام کے پلنگ کے چاروں طرف عورتوں کا ہجوم تھا۔ جو سناٹے کے عالم میں چپ چاپ دل آرام کے دم توڑنے کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔

یکایکی دل آرام کے اوسان کچھ درست ہوئے۔ اور ہوشیاری کی شان سے ذرا آنکھ کھولی۔ آنکھ کھولتے ہی نہایت دھیمی ناتوان آواز میں لڑکھڑا لڑکھڑا کر کہا۔ مجھے اُٹھاؤ۔ ماں نے جلدی سے سینہ کا سہارا دے کر اُٹھا لیا۔ اور خود کمر کا تکیہ بن کر بیٹھ گئی۔ دل آرام اتنی سی حرکت کے سبب دیر تک غوطے میں رہی۔ اس کے بعد آنکھیں کھولیں۔ نہایت بے کسی و لاچاری سے گرد کی عورتوں کو دیکھا۔ دیکھتے دیکھتے سامنے کی الماریوں پر نگاہ جا پڑی۔ جن میں اس کے جہیز کے لئے برتن بھرے ہوئے تھے اور شیشہ کے کواڑوں سے صاف نظر آتے تھے۔

ان برتنوں کو دیکھ کر دل آرام کے چہرہ پر کچھ صدمے کا سا اثر محسوس ہوا۔ پلکیں کانپنے لگیں۔ اور ان میں آنسوؤں کی باریک باریک نمی چمکنے لگی۔ الماریوں کے پاس ہی کپڑوں کے صندوق اور چاندی کا چھپر کھٹ رکھا تھا۔ جو ابھی بنا بن کر آیا تھا۔ کیونکہ دل آرام کی شادی میں پندرہ دن کی ہی کسر تھی۔ دل آرام نے ان صندوقوں اور چھپر کھٹ کو بھی بڑی مایوسی کی نظر سے دیکھا۔ اور حسرت سے گردن کو ماں کے کندھے پر ڈال دیا۔ کچھ دیر تو خاموشی اور سناٹا رہا۔ اس کے بعد ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ لفظ کہے گئے۔ جن کو دل آرام کی ماں نے سمجھا اور وہ یہ تھے۔ میں دنیا سے یوں ہی نامراد چلی۔ اب یہ جہیز کس کو ملے گا۔

حواس باختہ ماں بجائے اس کے کہ دل آرام کو دلاسا دیتی۔ یہ باتیں سن کر بے قابو ہوگئی۔ اور "ارے میری دلہن" کی ایک چیخ مار کر بیہوش ہوگئی۔ اس کا بے ہوش ہونا اور دل آرام کا ہچکی لینا۔ لوگوں نے دونوں کو سنبھالا۔ دیکھا تو دل آرام میں کچھ بھی نہ تھا۔

تجہیز و تکفین کا سامان ہونے لگا۔ تھوڑی دیر میں سب کچھ ہوگیا۔ اور بی دلارام کو نہلا دھلا دلہن بنا براتیوں کے ساتھ وداع کر دیا۔

خاکی چھپر کھٹ دو دن پہلے سے تیار تھا۔ اس میں بھی دیر نہ لگی۔ اور پھولوں میں سونے والی دلآرام گیلی مٹی کے بچھونے پر لٹادی گئی۔

چھپر کھٹ کے پردے ڈال دیئے گئے۔ اور بوڑھا باپ

یہ کہہ کر رخصت ہوا" اب تم جاؤ اور تمہارے سسرال والے ہمارا ملنا قیامت میں ہوگا۔

قدسیہ بانو دل آرام کی خالہ زاد بہن کے دل پر اس واقعہ کا اتنا صدمہ ہوا۔ کہ رات کو بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ (در سوئی) تو اپنے تئیں دل آرام کی قبر پر دیکھا۔ کہ ابر گھرا ہوا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے۔ اور بادلوں کی کڑک سے جی سہما جاتا ہے۔ دل آرام کی قبر کا ایک رخ کھلا ہوا ہے۔ جس میں سے دل آرام کچی اینٹ کے تکیے پر سر رکھے لیٹی نظر آتی ہے۔ قدسیہ دل آرام کو کفن پہنے اور ڈراؤنی ہیئت میں لیٹے دیکھ کر کانپ گئی۔ مگر دل آرام نے آواز دی "بہن ڈرو مت۔ میں تو وہی تمہارے ساتھ کھیلنے والی دل آرام ہوں۔ ذرا میرے پاس تو آجاؤ۔ بجلی کی چمک بادل کی کڑک سے میرا دل خوف کھاتا ہے۔ دیکھو میں اکیلی ہوں۔ اماں مجھے یہاں چھوڑ کر چلی گئیں۔ اچھی آپا قدسیہ تم ہی آجاؤ۔" قدسیہ کو اگرچہ دل آرام کی [illegible] تنہائی پر ترس آیا۔ اور چاہتی تھی۔ کہ پاس چلی جا[illegible] ہی خیال آیا۔ یہ تو مر گئی ہے۔ ایسا نہ ہو اس کے پاس جانے سے مجھے کچھ ہو جائے۔

قدسیہ چپ چاپ ذرا فاصلے پر کھڑی تھی اور دل آرام اس کے بلانے کے لئے عاجزی کر رہی تھی۔ کہ یکایک ایک خوفناک آواز کے ساتھ آسمان پھٹ گیا۔ اور اس میں سے ایک ہولناک صورت کا فرشتہ اترا۔ اسکے ایک ہاتھ میں دل آرام کا جہیز تھا۔ اور دوسرے میں آگ کے شعلے دل آرام کے روبرو آکر نہایت کرخت آواز میں بولا" تو دنیا کی ہوس میں مری ہے۔ اس لئے یہ آگ تیرا حصہ ہے۔ دل آرام یہ دیکھ کر کانپنے اور چیخنے لگی۔ قدسیہ کی بھی آنکھ کھل گئی۔

حسن نظامی

بیوی

اس میں شک نہیں۔ شوہر کے لئے بیوی میں بے انتہا دلبستگیاں موجود ہیں۔ اور بیوی حیات منزلی کا ایک لازمی و لابدی جزو ہے وہ گھر کو اپنی گوناگوں دلفریبیوں سے گلزار بنائے رکھتی ہے۔ وہ بچوں کی پرورش میں آسمانی شفقت خرچ کرتی ہے۔ اسے مرد کے سب جذبات کے برانگیختہ کرنے کا پورا پورا ملکہ حاصل ہے۔ لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر کر کے میں تو ایک اور ہی امر کی قدر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ بیوی کو دیکھ کر مرد کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے۔ کہ دنیا میں ایک ایسی ہستی بھی موجود ہے۔ جس کی خوشیاں اور غم۔ موت اور زندگی۔ خوشحالی اور بربادی تمام باتیں میری ہی ذات پر منحصر ہیں۔ اور میں ہی اس ہستی کا ہر طرح ضامن کفیل۔ محافظ اور ذمہ دار ہوں۔ اس احساس سے مرد کو اپنی اس اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو اسے دنیائے حیات میں حاصل ہے۔ یہی احساس اہمیت ہے۔ جو اسے ترقی یافتہ مدارج میں دنیا کے تمام کارہائے نمایاں کے سر انجام کا موجب ہوتا ہے۔ اور یہی زندگی کی روح ہے۔

سب سے بڑی رات

میں سورابلا کے ساتھ ایک ہی گرلز سکول میں پڑھنے جایا کرتا۔ اور اس کے ساتھ شادی شادی کھیلا کرتا تھا ۔ جب میں اس کے گھر جاتا۔ تو اس کی ماں مجھے پیار کرتی ۔ اور ہم دونوں کو پاس پاس بٹھا کر کہتی "کتنا پیارا جوڑا ہے!"

اگرچہ میں اس وقت بچہ تھا۔ لیکن اس کے مطلب کو خوب سمجھتا تھا ۔ یہ خیال میرے دل میں جم گیا۔ کہ میں سورابلا پر عام لوگوں سے زیادہ ایک خاص حق رکھتا ہوں ۔ چنانچہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا۔ کہ میں مالکیت کے زعم میں اسے سزا دیتا۔ اور اسے تکلیف پہنچاتا ۔ اور وہ بھی میرے سامنے ہار جاتی ۔ اور میری سزاؤں کو بغیر شکایت جھیل لیتی ۔ سارا گاؤں اس کے حسن کی تعریف کرنے کا عادی تھا۔ لیکن وہ حسن میرے جیسے وحشی نوجوان کی آنکھوں میں کچھ وقعت نہ رکھتا تھا ۔ میں صرف یہ جانتا تھا۔ کہ وہ اپنے باپ کے گھر میں صرف میرا جوا اٹھانے کے لئے پیدا ہوئی ہے ۔ اس لئے وہ میرے تغافل کا خاص تختۂ مشق تھی ۔

میرے والد چودھریوں کے خاندان کے کارندے تھے ۔ ان کا ارادہ تھا۔ کہ جونہی میں خوشخط لکھنا سیکھ جاؤں۔ مجھے جائداد کے انتظام کا کام سکھائیں ۔ اور کہیں تحصیل لگان کے کام پر ملازم کرا دیں۔ لیکن میں اپنے دل میں اس تجویز کو پسند نہ کرتا تھا ۔ ہمارے گاؤں کا ایک آدمی نیل رتن کلکتہ بھاگ گیا تھا۔ وہاں اس نے انگریزی پڑھی ۔ اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں ناظر ہو گیا بس یہ تھا۔ میری زندگی کا منتہائے مقصد۔ میں نے خفیہ طور [illegible] تھی [illegible] مجسٹریٹ کا ناظر بن سکا

تو کم سے کم عدالت ججی کا ہیڈ کلرک تو ضرور ہو جاؤں گا ۔ میں دیکھتا تھا۔ کہ میرے والد کچہری کے ان اہلکاروں کی بے انتہا عزت کرتے ہیں ۔ مجھے بچپن ہی سے معلوم تھا۔ کہ ان لوگوں کو مچھلی۔ سبزی بلکہ روپیہ بطور نذرانہ دے کر مہربان کیا جاتا ہے۔ اسی سبب سے میں نے اپنے دل میں عدالت کے ان چھوٹے عہدہ داروں کی بلکہ پیادوں تک کی بہت بڑی عظمت قائم کر رکھی تھی ۔ یہ لوگ دیوتا ہیں ۔ ہمارے بنگال میں ان کی پوجا کی جاتی ہے ۔ یوں سمجھ لو۔ کہ یہ گروہ چھوٹے پیمانے پر ہندوؤں کے تینتیس کروڑ دیوتاؤں کا نیا "اڈیشن" ہے ۔ لوگ مادی کامیابی حاصل کرنے کے لئے ان پر اس قدر پختہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ کامرانی کے دیوتا گنیش جی پر اتنا نہیں رکھتے ۔ اس لئے جو چڑھاوا پرانے زمانے میں گنیش جی پر چڑھتا تھا۔ اب وہ ان اہلکاروں پر چڑھتا جاتا ہے ۔

نیل رتن کی مثال سے مجھ میں ایک جوش پیدا ہوا۔ اور میں بھی موقع پا کر کلکتہ کو بھاگ گیا ۔ وہاں پہلے تو میں اپنے گاؤں کے ایک شناسا کے ہاں ٹھیرا ۔ اور اس کے بعد اپنی تعلیم کے لئے والد سے کچھ روپیہ منگایا ۔ اس طرح میں نے پڑھنا لکھنا باقاعدہ جاری رکھا ۔

مزید براں میں سیاسی اور رفاہ عام کی انجمنوں میں بھی شامل ہوا۔ مجھے اس امر کے نہایت ضروری ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا کہ میں دفعتہً اپنی زندگی اپنے ملک کے لئے وقف کر دوں ۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ اس قدر سخت کام کیونکر سرانجام ہو سکتا ہے

اور مجھے کوئی رستہ بتانے والا بھی نہ تھا ؛

لیکن با ایں ہمہ میرا جوش بالکل کم نہ ہوا۔ ہم دیہاتی لڑکے کلکتہ کے چالاک چھوکروں کی طرح ہر بات پر ناک بھوں چڑھانا نہیں جانتے۔ اور اسی وجہ سے ہمارا عقیدہ بہت مضبوط ہوتا ہے ؛ ہماری انجمنوں کے لیڈر تقریریں کرتے۔ اور ہم بھوکے پیاسے دوپہر کی سخت گرمی میں دربدر چندہ مانگتے پھرتے۔ یا سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے اشتہار بانٹتے۔ یا لکچر ہال میں کرسیوں اور بنچوں کو ترتیب کے ساتھ رکھتے۔ اور اگر کوئی شخص ہمارے لیڈر کے خلاف آہستہ سے بھی ایک لفظ کہتا۔ تو ہم اس سے لڑنے پر تیار ہو جاتے تھے ؛ ان باتوں پر شہر کے لڑکے ہمیں "گنوار" کہہ کہہ کر ہماری ہنسی اڑایا کرتے تھے ؛

میں کلکتہ میں آیا تو تھا۔ ناظر یا ہیڈ کلرک بننے۔ مگر تیاری اس بات کی کرتا تھا کہ میزینی یا گریبالڈی بن جاؤں ؛

اس وقت سورابالا کے والد اور میرے والد نے ہم دونوں کی شادی کر دینے کا مشورہ کیا۔ میں پندرہ سال کی عمر میں کلکتہ آیا تھا۔ اور سورابالا اس وقت آٹھ سال کی تھی۔ اب میری عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ اور والد کے نزدیک میں شادی کی عمر سے بھی آگے گزر چکا تھا۔ لیکن چونکہ میں دل ہی دل میں عہد کر چکا تھا۔ کہ میں زندگی بھر کنوارا رہوں گا۔ اور اپنے ملک کے لئے مروں گا۔ اس لئے میں نے والد سے کہہ دیا۔ کہ جب تک میں اپنی تعلیم ختم نہ کر لوں۔ شادی نہیں کروں گا ؛

دو تین مہینے کے بعد میں نے سنا۔ کہ سورابالا کی شادی ایک وکیل رام لوچن سے ہو گئی۔ میں ان دنوں قعر ذلت میں گرے ہوئے ہندوستان کو اوج پر پہنچانے کے لئے چندہ جمع کرنے میں مصروف تھا۔ لہذا میرے خیال نے اس خبر کو قابل غور نہ سمجھا ؛

میں انٹرنس پاس کر چکا تھا۔ اور ایف۔ اے کا امتحان دینے ہی کو تھا۔ کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ میں دنیا میں تنہا نہ تھا بلکہ مجھے اپنی ماں اور دو بہنوں کا پیٹ پالنا تھا۔ ان حالات کے ماتحت میں مجبور ہو گیا۔ کہ کالج چھوڑ دوں۔ اور نوکری کی تلاش کروں ؛ بہت سی سخت کوشش کے بعد مجھے ضلع نواکھالی کے ایک قصبہ میں ہائی سکول کی سیکنڈ ماسٹری مل گئی ؛

میں نے خیال کیا۔ کہ یہاں بھی میرے لئے ایک نہایت مفید کام موجود ہے۔ اپنی صلاح و مشورے اور اپنے اثر سے میں اپنے ہر شاگرد کو ہندوستان کے مستقبل کیلئے تیار کروں گا۔ میں نے کام شروع کر دیا لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ امتحان قریب آ رہا ہے اور یہ ہندوستان کے مستقبل کی نسبت زیادہ مشکل مرحلہ ہے جب میں گرامر یا الجبرا کے سوا کسی اور معاملے کے متعلق بات چیت کرتا تو جناب ہیڈ ماسٹر صاحب ناراض ہو جاتے۔ چنانچہ چند مہینوں میں میرا جوش و خروش بھی دھیما پڑ گیا ؛

مجھے کوئی خداداد ذہانت میسر نہیں۔ یہ ممکن ہے۔ کہ میں گھر کی خاموشی میں لمبی چوڑی تجویزیں بنا لوں۔ لیکن جب میدان عمل میں داخل ہوتا ہوں۔ تو ہندوستانی بیل کی طرح ہل کا جوا اپنی گردن پر اٹھاتا ہوں۔ مالک میری دُم کو مروڑتا ہے۔ میں نہایت صبر شکر سے سر جھکائے دن بھر ڈھیلے توڑتا ہوں۔ اور شام کو اگر جگالی کرنے کا موقع ملے۔ تو مطمئن ہو جاتا ہوں ؛ ایک ایسے مخلوق میں اچھلنے کودنے کی روح نہیں ہوتی ؛

استادوں میں سے ایک آدمی سکول کی عمارت میں بود و باش رکھتا تھا۔ تاکہ آتش زدگی سے مکان کی حفاظت کرے ؛ چونکہ میں کنوارا تھا۔ اس لئے یہ کام میرے سپرد کیا گیا ؛ جس بڑے سے بنگلے میں ہمارا سکول تھا۔ اس کے پاس ہی میں ایک پھونس کے چھپر میں رہا کرتا تھا ؛

سکول کی عمارت قصبے کے آباد حصے سے کچھ فاصلے پر واقع

تھی ۔ اور اس کے پاس ایک بڑا سا تالاب تھا + اس تالاب
کے اردگرد پان ناریل اور مدار کے درخت تھے ۔ عمارت کے
نزدیک دو پرانے نیم کے درخت پاس پاس کھڑے تھے ۔ اور ان
کی چھاؤں بہت خنک اور خوشگوار تھی +

میں ایک بات کا ذکر کرنا بھول ہی گیا ۔ اور حقیقت یہ ہے
کہ میں نے اب تک اسے قابل ذکر سمجھا بھی نہ تھا ۔ مقامی وکیل بابو
رام لوچن رائے ہمارے سکول کے پاس ہی رہتا تھا ۔ مجھے یہ
بھی معلوم تھا ۔ کہ اس کی بیوی (یعنی میری بچپن کی ساتھی
سورابلا) اس کے پاس ہی رہتی ہے +

میں نے رام لوچن بابو سے شناسائی پیدا کی ۔ میں نہیں کہہ
سکتا ۔ کہ انہیں میری اور سورابلا کی بچپن کی واقفیت معلوم
تھی ۔ یا نہیں + جب میرا اُن کے ساتھ تعارف ہوا ۔ تو میں نے
اس امر کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا + در اصل مجھے اچھی طرح
یاد ہی نہ تھا ۔ کہ سورابلا کے ساتھ مجھے اپنی زندگی میں کوئی تعلق
بھی رہا ہے +

ایک دن مدرسے میں چھٹی تھی + میں رام لوچن بابو کے
ہاں گیا ۔ ہماری گفتگو کا موضوع کیا تھا ۔ اسے تو میں قریب
قریب بھول گیا ہوں ۔ غالباً ہندوستان کی موجودہ غمناک
حالت کے متعلق بات چیت ہوئی تھی + یہ بات نہیں کہ
اس کو اس موضوع سے کچھ زیادہ تعلق تھا ۔ یا وہ اس معاملے
سے متاثر تھا ۔ بلکہ موضوع ہی ایسا تھا ۔ کہ ہر شخص حقے
کے کش لگاتے ہوئے ایک یا دو گھنٹے تک اس پر اپنا دلی
رنج آزادی کے ساتھ ظاہر کر سکتا ہے +

ہم اس طرح مصروف ہی تھے ۔ کہ میں نے پاس کے کمرے
سے چوڑیوں کی نہایت نرم جھنکار ۔ پوشاک کی سرسراہٹ
اور پاؤں کی آہٹ سُنی ۔ اور میں نے یقیناً محسوس کیا ۔ کہ
کھڑکی کے چھوٹے سے سوراخ میں سے دو عجیب آنکھیں
مجھے گھور رہی ہیں +

دفعتہً میرے حافظے کے سامنے دو آنکھیں بجلی کی طرح
چمک گئیں ۔ اور وہ بڑی بڑی آنکھیں جو اعتماد ۔ سادگی ۔ اور
الفتِ دوشیزگی سے چمک رہی تھیں ۔ وہ سیاہ پتلیاں ۔ وہ
گھنی سیاہ پلکیں ۔ وہ ساکن و جامد چہرہ یاد آگیا + اچانک کسی
نادیدہ طاقت نے میرے دل کو ایک آہنی گرفت میں بھینچ دیا ۔
اور وہ انتہائی کرب سے دھڑکنے لگا +

میں اپنے گھر واپس آگیا ۔ مگر وہ غم مجھ پر غالب آیا ہوا
تھا ۔ میں پڑھتا تھا ۔ لکھتا تھا ۔ اور کام کرتا تھا ۔ مگر کسی حالت
میں اپنے دل پر سے اس بوجھ کو ہٹا نہ سکتا تھا + ایسا معلوم
ہوتا تھا ۔ کہ ایک بار گراں میرے دل کی ڈوریوں سے بندھا
ہوا گھوم رہا ہے +

شام کے وقت اپنے آپ کو ذرا سکون کی حالت
میں لا کر میں نے سوچنا شروع کیا ۔ "مجھے کیا تکلیف ہے؟"
اندر سے سوال ہوا "تمہاری سورابلا اب کہاں ہے؟" میں
نے جواب دیا ۔ "میں نے اسے اپنی مرضی سے چھوڑ دیا تھا یقیناً
میں اس سے یہ توقع نہ رکھتا تھا ۔ کہ وہ ہمیشہ کے لئے میرا
انتظار کرے" +

لیکن کوئی چیز اندر سے یہی کہتی رہی ۔ کہ "اُس وقت تو
سورابلا تمہیں محض مانگنے سے مل سکتی تھی ۔ اب خواہ تم کچھ
کرو ۔ تمہیں کوئی حق حاصل نہیں ہے ۔ کہ اس پر ایک نظر
بھی ڈالو + یہ ممکن ہے ۔ کہ وہ تمہاری لڑکپن کی سورابلا
تمہارے بالکل قریب آجائے ۔ تم اس کی چوڑیوں کی

جھنکار بھی سن لو۔ اُس ہوا میں سانس بھی لے لو۔ جسے اس
کے بالوں کی خوشبو نے معطر کر دیا ہو۔ لیکن تاہم اس کے
اور تمہارے درمیان ہمیشہ ایک دیوار حائل رہے گی!"

میں نے جواب دیا" یونہی سہی۔ سورابالا میری کیا ہوتی
ہے؟"

میرے دل نے جواب دیا "آج سورابالا تمہاری کچھ نہیں
ہوتی۔ لیکن وہ تمہاری کیا کچھ نہ ہوتی؟"

آہ۔ یہ بالکل سچ ہے۔ وہ میری کیا کچھ نہ ہوتی! وہ مجھے
تمام چیزوں سے زیادہ پیاری۔ سب دنیا والوں کی نسبت
مجھ سے بہت زیادہ نزدیک۔ اور میری زندگی کے تمام رنج
وراحت کی شریک ہوتی۔ اور آج وہ مجھ سے اتنی دور ہے۔
وہ مجھ سے اتنی اجنبی ہے۔ کہ اس پر نگاہ ڈالنا منع۔ اس کے
ساتھ بات کرنا نامناسب اور اس کا خیال کرنا گناہ ہے +

یہ رام لوچن دفعۃً کہکشاں سے آیا۔ اور چند بے بنائے
مذہبی فقرے بول کر ایک ہی جھپٹ کے ساتھ سورابالا کو باقی
نوع انسانی میں سے اڑا کر لے گیا +

میں کسی نئے ضابطۂ اخلاق کی تبلیغ نہیں کر رہا۔ نہ میں
سوسائٹی میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا
کہ گھر کے بندھن توڑ کے پھینک دیئے جائیں۔ میں تو صرف اپنے
دماغ کے صحیح خیالات ظاہر کر رہا ہوں۔ وہ خیالات معقول
نہ ہوں۔ اس کی پروا نہیں + میں اس احساس کو اپنے دماغ
سے کسی طرح نہیں نکال سکتا۔ کہ وہ سورابالا جو رام لوچن کے گھر
میں راج کر رہی ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ میری تھی +
میں نے مانا۔ کہ یہ خیال غیر معقول اور نامناسب تھا مگر خلاف
فطرت نہ تھا +

اس کے بعد میں اپنے دماغ کو کسی قسم کے کام میں مصروف
نہ کر سکا۔ دوپہر کے وقت جب میری کلاس میں لڑکے گنگنا
رہے تھے۔ جب باہر دھوپ میں فطرت سنسنا رہی تھی۔ جب
نیم کے شگوفوں کی رسیلی خوشبو نیم گرم ہوا کے جھونکوں پر سوار
کمرے میں آ رہی تھی۔ اُس وقت میں چاہتا تھا ___ مجھے
معلوم نہیں میں کیا چاہتا تھا۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں
کہ میں اپنی ساری زندگی کو ہندوستان کی ان آئندہ امیدوں
کی گریمر کی کاپیاں درست کرنے ہی میں بسر کرنا نہ چاہتا تھا!

جب سکول کا وقت ختم ہوا۔ میں اپنے بڑے سے سنسان
گھر میں رہنا برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی
اگر کوئی میری ملاقات کے لئے آتا۔ تو اس سے بھی مجھے تکلیف
ہوتی + جھٹپٹے کے وقت جب میں تالاب کے کنارے بیٹھتا۔
اور اس بے معنی ہوا کی سرسراہٹ سنتا۔ جو پان اور ناریل
کے درختوں میں سے آہیں بھرتی ہوئی گزرتی تھی۔ تو میں
سوچا کرتا تھا۔ کہ انسانی سوسائٹی غلطیوں کا ایک جال ہے
کسی شخص کو اتنی سمجھ نہیں۔ کہ کوئی مناسب کام مناسب وقت
پر کرلے۔ اور جب موقع ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ تو ہم فضول
اور بے سود آرزوؤں سے دل شکستہ ہو جاتے ہیں +

میں سورابالا سے شادی کر سکتا تھا۔ اور خوش رہ سکتا
تھا۔ لیکن میرے دماغ میں گریبالڈی بننے کا سودا سمایا ہوا
تھا۔ اور آخر کیا بنا؟ ایک دیہاتی سکول کا سکنڈ ماسٹر اور دوسری
طرف رام لوچن رائے وکیل جسے سورابالا کا شوہر ہونے کی
کوئی خاص دعوت نہ دی گئی تھی۔ جس کے نزدیک شادی
سے پہلے سورابالا دوسری سیکڑوں دوشیزہ لڑکیوں سے
کچھ بھی زیادہ ممتاز نہ تھی۔ اس نے نہایت خاموشی کے ساتھ

سورابلا سے شادی کرلی ہے۔ اور وکیل سرکار کی حیثیت میں بے شمار روپیہ کمارہا ہے۔ جب کہیں اس کا کھانا بُرا پکتا ہے۔ تو وہ سورابلا کو جھڑکیاں دیتا ہے اور جب خوش ہوتا ہے۔ تو اسے ایک چُوڑی انعام میں دے دیتا ہے۔ وہ موٹا تازہ ہے۔ بائیں درستی کے ساتھ پہنتا ہے۔ ہر قسم کی تکلیف سے آزاد ہے۔ وہ کبھی تالاب کے کنارے ستاروں پر نظریں جمانے اور آہیں بھرنے میں اپنی راتیں نہیں کاٹتا۔

رام لوچن چند روز کے لئے کسی مقدمے میں کہیں باہر بلایا گیا۔ سورابلا اپنے گھر میں اسی طرح تنہا تھی۔ جیسے میں اپنے سکول کی عمارت میں اُداس تھا۔

مجھے یاد ہے۔ سوموار کا دن تھا۔ صبح ہی سے آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ دس بجے بوندا باندی شروع ہو گئی۔ آسمان کی اس حالت کو دیکھ کر ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب نے سکول کو وقت سے پہلے ہی بند کر دیا۔ تمام دن کالے کالے بادلوں کے ٹکڑے آسمان پر اس طرح اُڑ رہے تھے۔ جیسے کسی بہت بڑی نمائش کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ دوسرے دن تیسرے پہر کے قریب زور شور سے بارش ہونے لگی۔ اس کے ساتھ طوفان بھی تھا۔ جوں جوں رات پڑتی گئی۔ باد و باراں کی غضبناکی بڑھتی گئی۔ پہلے پہل ہوا پروا تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے رُخ بدلا۔ اور دکھن اور دکھن پچھم کی طرف چلنے لگی۔

ایسی رات میں سونے کی کوشش کرنا فضول تھا۔ مجھے یاد آیا۔ کہ اس خوفناک موسم میں سورابلا اپنے گھر میں اکیلی ہو۔ ہمارا سکول اس کے بنگلے سے بہت زیادہ مضبوط بنا ہوا تھا۔ بار بار میں یہ منصوبہ باندھتا تھا۔ کہ سورابلا کو سکول کی عمارت میں بلا لوں۔ اور خود تالاب کے کنارے رات کاٹ دوں۔ لیکن میں اس امر کی جرأت نہ کر سکا۔

رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ کہ دفعتہً سمندر کی لہریں گرجتی ہوئی سنائی دیں۔ سمندر ہماری طرف چڑھا آرہا تھا! میں اپنے کمرے سے نکلا۔ اور سیدھا سورابلا کے گھر کی طرف بھاگا۔ راستے میں ہمارے تالاب کا ایک پشتہ تھا۔ اور جب میں اس کی طرف نہایت دقت سے جا رہا تھا۔ اس وقت پانی کا سیلاب میرے گھٹنوں تک پہنچ چکا تھا۔ جب میں اس پشتے پر چڑھ گیا۔ تو ایک دوسری لہر اس پر سے گزر گئی۔ اس پشتے کا سب سے اونچا حصہ میدان سے کوئی سترہ فٹ کی بلندی پر تھا۔

جب میں اس پشتے پر چڑھا۔ تو دوسری طرف سے ایک اور شخص بھی پشتے تک پہنچ گیا۔ وہ کون تھی؟ میرے جسم کی رگ رگ کو معلوم ہو گیا۔ کہ وہ کون تھی۔ اس علم کے ہوتے ہی میری روح میں لرزش پیدا ہو گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔

ایک ٹاپو جس کا رقبہ کوئی تین گز تھا۔ ہم دونوں کھڑے تھے۔ اور ارد گرد تمام پانی ہی پانی تھا۔

یہ طوفان قیامت کا نمونہ تھا۔ ستارے آسمان پر مٹ گئے تھے دنیا کی تمام روشنیاں تاریک ہو چکی تھیں۔ اس وقت اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کر لیتے تو کچھ حرج نہ تھا۔ لیکن ہم نے ایک لفظ منہ سے نکالنے کی بھی جرأت نہ کی۔ ہم میں سے کسی نے ایک دوسرے کی رسمی مزاج پرسی بھی تو نہ کی۔ ہم صرف تاریکی کو گھورتے ہوئے خاموش و جامد کھڑے رہے۔ ہمارے قدموں کے نیچے موت کا گہرا سیاہ بھیانک اور پُرخروش سیلاب موجیں مار رہا تھا!

آج سورابلا تمام دنیا کو چھوڑ کر میرے پہلو میں آکھڑی ہوئی ہے ۔ میرے سوا اس کا کوئی نہیں ۔ میرے بعید و قدیم بچپن میں یہ سورابلا کسی تاریک اور ابتدائی دنیائے اسرار سے ۔ کسی اَور گُرے میں زندگی بسر کرنے کے بعد آئی تھی ۔ اور اس روشن اور آباد زمین پر میرے پہلو میں کھڑی ہوئی تھی ۔ اور آج ایک زمانہ گزرنے کے بعد اس نے روشنی اور انسانوں سے بھری ہوئی دنیا کو چھوڑ دیا ۔ اور قدرت کے دست اجل کی ہیبت ناک اور سنسان تاریکی کے درمیان میرے پہلو میں آن کھڑی ہوئی ۔ پیدائش کی ندی نے وہ نازک کلی میرے آگے لا کے پھینک دی تھی ۔ اور موت کے سیلاب نے اسی پھول کو جس کا جوبن اب بہار پر ہے ۔ لہروں پر سوار کر کے میرے اور صرف میرے پاس پہنچا دیا ۔ ایک اور لہر آئے گی ۔ وہ ہمیں کرۂ ارض کے اس انتہائی نقطے سے بھی بہالے جائے گی ۔ ہم جس ڈالی پر الگ الگ بیٹھے ہیں ۔ اس پر سے ہم توڑ لئے جائیں گے ۔ اور مر کر ایک ہو جائیں گے ۔

خدا کرے وہ لہر کبھی نہ آئے ! خدا کرے ۔ سورابلا اپنے شوہر ۔ اپنے بچوں ۔ اپنے گھر بار اور اپنے عزیزوں سے گھری ہوئی مدت تک خوشی سے زندگی بسر کرے ۔ آج کی ایک رات میں قدرت کی اس بربادی کے کنارے کھڑے ہو کر میں نے مسرت جاودانی کا مزا چکھ لیا ۔

رات گزر گئی ۔ طوفان تھم گیا ۔ سیلاب اُتر گیا ۔ سورابلا ایک لفظ کہے بغیر اپنے گھر کو لوٹ گئی ۔ اور میں بھی بے کچھ کہے اپنے چھپر کو واپس آگیا !

میں سوچنے لگا "یہ سچ ہے ۔ کہ میں ناظر یا ہیڈ کلرک یا گریبالڈی نہ بنا ۔ میں صرف ایک ذلیل سکول کا سیکنڈ ماسٹر ہوں لیکن اس ایک رات نے اپنے مختصر عرصے میں میری ساری زندگی کے راستے کو روشن کر دیا ۔

میری مدت عمر کے تمام دنوں اور ساری راتوں میں سے یہی ایک رات ہی جو میری عاجز ہستی کے لئے اعلیٰ ترین عظمت و جلال کا باعث ہو گزری ہے ۔

(ٹیگور) "گمنام"

سنسان رات

سنسان اندھیری رات ہے اور دریا کا کنارہ ۔ کالی کالی گھٹائیں جھکی پڑتی ہیں ۔ ہوا زور سے فراٹے بھر رہی ہے ۔ میں حیران کنارے پر کھڑی ہوں ۔ تو دریا کے پار رہتا ہے ۔ لہریں اونچی اونچی ہو کر کناروں سے ٹکراتی ہیں ۔ لیکن کوئی لہر ایسی نہیں آتی ۔ جو مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کر تجھ تک پہنچا دے ۔ آہ ! میں تجھے کیونکر پاؤں ۔ ظالم ۔ تو مجھے دھوکا دے گیا ۔ تیری بانسری کی آواز دریا کے پار سے ہوا کی موجوں پر سوار ہو کر میرے کانوں تک پہنچ رہی ہے ۔ اور میں اس کو سن کر گھلی جاتی ہوں ۔ تو مجھے اپنے پاس نہیں بلاتا ۔ نہ بلا کوئی لہر مجھے تیرے قدموں میں نہیں لے جاتی ۔ نہ لے جائے ۔ لیکن او بانسری بجانے والے ۔ خدا کے لئے کنارے سے دور نہ ہٹ جانا کیونکہ جہاں تیری بانسری کی لے میرے کانوں سے دور ہوگئی ۔ تو یاد رکھنا ۔ میں اس اندھیری پرشور رات میں اپنے آپ کو دریا کی بے درد موجوں کی نذر کر دوں گی ۔ اور پھر تجھے اس کے ناپیدا کنار سمندر تک میرا سراغ نہ مل سکے گا ۔

گمنام

سکونِ محبّت

کیا الفاظ اُن جذبات کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ جو میرے خلوت خانۂ دل میں نہاں ہیں۔ یا ساحرانہ ہنرمندی سے ان خیالات کو عیاں کر سکتے ہیں؟ نہیں دل ظاہر کرنے سے قاصر ہے؟ کیا الفاظ میرے جذبات کی وسعت اور عمق کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یا ان کے پیچ و پیچ راستہ کا نقشہ کھینچ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ ان کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور انتہا کیا ہوگی؟ کیا الفاظ میری خواہشوں، آرزوؤں اور اُمیدوں کی تہ کو پہنچ سکتے ہیں۔ کیا الفاظ میں بجلی کی چمک اور آگ کی حدت ہے۔ تاکہ میں جو اب تک خاموش رہا ہوں بولوں؟ نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ دل کی اصل آوازیں خاموشی، بے خودی اور ضبط ہیں۔

میں کیا چاہتا ہوں۔ مجھے کس کی جستجو ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو مجھے اپنے فرائض کی ادائگی میں منہمک رکھتی ہے۔ وہ کیا خوشی ہے۔ جو میرے درد پر غالب آتی ہے۔ وہ کونسی امید ہے جو میرے دل کو تسلی دیتی ہے؟ کیا ان سب کا جواب یہی ہے کہ میں تمہاری درخشاں آنکھوں میں محبت کا اعتراف دیکھونگا اور تم سے یہ سنوں گا۔ کہ میری زندگی کا انعام مجھے مل جائیگا میری مراد بر آئے گی۔ یعنی تم مجھے اپنا دل دو گے۔ یہ غلط ہے۔ میں دل دیکر لینا نہیں چاہتا۔ میرا سودا کم ظرف تاجروں کا سا نہ سمجھو۔ میں معاوضہ کا مدعی نہیں۔ حقیقی محبت وہی ہے جو بے مدعا ہو۔ محبت خارجی امداد کی محتاج نہیں۔ وہ تو خود اپنا [illegible] کنار [illegible] رہتی ہے۔

جس طرح خواہش پر صرف خواہش اور آگ پر صرف آگ غالب آتی ہے۔ اسی طرح محبت پر صرف محبت ہی قابو پا سکتی ہے۔ گرم دل کے شعلے ہی اس کی خواہشوں کی آگ کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ اور اس کی نوزائیدہ طاقت ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو یاس کے محیط طوفان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ کوئی قانون۔ کسی فرض کی پابندی۔ کسی ولی کی نصیحت پرکارِ محبت کو درست نہیں رکھ سکتی۔ قضا و قدر کی طاقت سے بے پروا محبت اپنا انتخاب آپ کرتی ہے۔ اور صرف محبت کی اطاعت پر آمادہ ہوتی ہے۔ اسی کی طاقت اس کو پاکیزہ بنا سکتی ہے۔ اور اس کے اضطرار کو کم کر سکتی ہے۔ محبت ہی کے درد میں دائمی مسرت کا راز ہے۔ اے محبت۔ میرے دل میں آ۔ اور مجھے اپنے متعلق تمام ملوث خیالوں سے پاک کر دے۔

اگر محبوب کا وصال محبت کا انجام ہے۔ تو ہمیں حاصل نہ ہو سکنے والی ہستی سے محبت کرنی چاہیئے۔ محبت وہی اچھی جو گھنٹوں اور ہفتوں کی قید سے آزاد۔ غروب ہونے والے سورج اور گھٹنے والے چاند کے اثر سے محفوظ ہو۔ وہ کیا محبت نہیں جس کی بنا ممکن مسرت کے خوش آیند خوابوں اور حسن کے زوال پذیر جادو پر ہو۔ چاہیئے کہ محبت شہباز تخیل کی رفعت پرواز سے بھی بلند اور موت کی یاس انگیز آواز سے بھی بعید ہو۔ اور ان تمام پابندیوں سے آزاد ہو کر متعلقے سرمایۂ عشق [illegible] پرانا [illegible] والے اس سے [illegible] ایک نئی دنیا پیدا ہو جائیگی [illegible] جو ابدی [illegible] دائمی ہے۔

فلسفۂ حیات

ذیل کے چند اشعار علامہ اقبال مدظلہٗ نے امسال انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں ارشاد فرمائے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

سکوت شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی

کشاکش زم و گرما تپ و تراش و خراش
ز خاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی

مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید
میان قطرۂ نیسان و آتش عنبی

اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

تمنا زار بستر

تخمیس بر غزل حضرت غالب مغفور

وفور درد ہے، میں ہوں، تمنا زار بستر ہے
خلش پرداز حسرت، دامن پر خار بستر ہے
بہت تڑپا ہوں اے دل! اب سکوں درکار بستر ہے
تپش سے میری وقف کشمکش ہر تار بستر ہے
مرا سر رنج بالیں ہے، مرا تن بار بستر ہے

محبت جس کی تابع ہے وہ کیا ہے؟ اُن کی چیتون ہے
وفا کا جوش کیا ہے؟ خانہ زاد عشق پرفن ہے
جنون مضطرب کے تخت دل کا نام شیون ہے
سرشک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے
دل بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

ہے اُن ایام پر حسرت جو صحبت میں گنوائے ہیں
معاذ اللہ! کیا کیا اُن دنوں صدمے اٹھائے ہیں!

زہے قسمت کہ اب خوں گشتہ ارماں رنگ لائے ہیں
خوشا اقبالِ رنجوری، عیادت کو وہ آئے ہیں
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

اجل ہے اصطلاحِ عاشقی میں نامِ تنہائی
نہیں ممکن کہ جانبر ہو سکے ناکامِ تنہائی
بیاں کس سے ہو رازِ حسرتِ انجامِ تنہائی
بہ طوفاں گاہِ موجِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ہے، اور باقی رہے گی یادِ ان لمحاتِ زریں کی
ادا دیکھی تھی جب تزئینِ حسن و حسنِ تزئیں کی
نظر میں ہے ابھی شوخی نگاہِ سحر آگیں کی
ابھی آتی ہے بو بالش سے اُن کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

پریشانی ہے فکرِ مالیِ بیمار میں غالب
عجب تکلیف ہے بیچارہ پڑا زار میں غالب
نہایت جاں گزا ہے دردِ قلبِ زار میں غالب
کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

مانی - جائسی

ہم اور وُہ

وہ کارزارِ دہر میں سختِ کوششِ عشق
ہم جور کو ہنوز سمجھتے ہیں نازِ یار
اغیار کا تو دامنِ امید ہے دراز
ہم کر رہے ہیں اپنی تمنا کا اختصار
اک وہ ہیں اور قوتِ بازو پہ اعتماد
اک ہم ہیں اور لطیفۂ غیبی کا انتظار
تدبیر سے انہیں تو میسر ہے عیشِ نقد
ہم ہیں کہ کھائے بیٹھے ہیں تقدیر پر اُدھار

قومے بہ جد و جہد گرفتند وصلِ یار
قومے دگر حوالۂ تقدیر می کنند

"گمنام"

کلام یاس

(جناب مرزا واجد حسین صاحب یاس)

مشاعرہ کیننگ کالج لکھنؤ، مارچ ۱۹۲۰ء

تماشا ہے مری تصویر کا بیکار ہو جانا
قلم کے زخم کھا کر پیکر خونبار ہو جانا

زہے مقصد جہادِ نفس کو تیار ہو جانا
خوشا ہمت خود اپنے درپئے آزار ہو جانا

بہت میں نے ٹٹولا جادۂ شیخ و برہمن کو
کوئی آساں ہے ناہموار کا ہموار ہو جانا

قیامت تک یہ دانے کوس روشن ہو نہیں سکتے
عبث ہے ہمرکاب کافر و دیندار ہو جانا

عجب کیا ہی ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے
زمانہ کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا

زہے دیوانگی چشم ہوس کے پھیر میں پڑنا
ہجوم شوق میں گم گشتۂ بازار ہو جانا

تصور سے کبھی خواب اجل کے کانپ اٹھنا
کبھی تعبیر سنکر جان سے بیزار ہو جانا

دوا کا اور دعا کا امتحان منظور تھا دل کو
بھلے چنگے گوارا تھا کسے بیمار ہو جانا

لہو کا گھونٹ بھی فصل خزاں میں مل نہیں سکتا
قیامت ہے گلوں کا ہمزبانِ خار ہو جانا

عجب کیا بھول جائے طائر خواب آشیاں اپنا
شب غم دور کیا ہے راہ کا دشوار ہو جانا

تلاطم نے اچھالا تھا بھنور نے گھیر کر مارا
خیال خام تھا بحر فنا سے پار ہو جانا

کوئی طوفان آیا یا ہمارے کان بجتے ہیں
ذرا اے بندگانِ ناخدا ہشیار ہو جانا

مبارک بوالہوس کو یاس آنکھیں مانگتے پھرنا
کسی کی دیکھا دیکھی تشنۂ دیدار ہو جانا

کلام شفق

(از حضرت شفق رضوی عمادپوری)

جا کے گھر کیوں آپ بھولے وعدۂ دیدار صبح
شام تک سن لیجیے گا کیا ہوا بیمار صبح

روز اٹھتی ہے یہ کس کے روئے روشن سے نقاب؟
کون ہے ایسا جو کھولے پردۂ اسرار صبح؟

جلوہ گر ہے آسماں پر کون سا یوسف جمال؟
کس کے دم سے روز ہے یہ گرمیِ بازارِ صبح؟

زلفِ مشکیں ہے کسی کی، پردۂ اسرارِ شب
روئے روشن ہے کسی کا، مطلعِ انوارِ صبح

ہے چراغِ شامِ ہجراں، نالۂ سوزانِ شب
شعلِ روزِ جدائی، آہ آتش بارِ صبح

رنگ لایا انقلابِ گنبدِ چرخِ بریں
گرتے ہی تعمیرِ شب، اُٹھنے لگی دیوارِ صبح

وصل کی شب اور اتنی مختصر اے آسماں!
شام ہی سے کچھ دکھائی دیتے ہیں آثارِ صبح

کیا مجھے پھر سامنا ہوگا شبِ غم کا فلک؟
کیا نہ ہوگا اُن سے پورا شام تک اقرارِ صبح؟

رات دن یکساں مریضِ غم کو ہیں اے چارہ گر!
شام کی تکلیف سے کچھ کم نہیں آزارِ صبح

وصل کے وعدے پہ ہے اُن سے لڑائی رات دن
صبح کو تکرارِ شب ہے، شب کو ہے تکرارِ صبح

چہرۂ گلرنگ سے اُٹھنے کو ہے رنگیں نقاب
جاگ اُٹھے وہ، دیکھیے اب رونقِ گلزارِ صبح

دن سے اچھی رات ہوگی شام تک آجایئے
آپ اچھے اور اچھا آپ کا اقرارِ صبح

ہے اک آفت شام کے وعدے کا شب بھر انتظار
اک قیامت اور اُس پر وعدۂ دیدارِ صبح

رات دن اُس کا تلوّن رنگ لاتا ہے شفق
صبح کو انکارِ شب ہے، شب کو ہے انکارِ صبح

حیاتِ شوق

(از جناب راجہ غضنفر علی خاں صاحب شوق بی۔ اے)

جامِ شکستہ درخورِ محفل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

تخصیصِ حسن عشق کا معراج ہے مگر
میں تو تری جفا کے بھی قابل نہیں رہا

افسردگی و یاس نے گھیرا ہے اس قدر
اب شوقِ رہ نوردیِ منزل نہیں رہا

تھا قیس سے ہی پردہ کہ جب قیس اُٹھ گیا
اب دیکھ لو کہ پردۂ محمل نہیں رہا

خوگر ہوا ہوں جب سے سکوتِ قفس کا میں
مشتاق نغمہائے عنادل نہیں رہا

اگلا سا اضطراب نہ خودداریاں ہیں اب
وہ اختلاطِ موجہ و ساحل نہیں رہا

ہے انتہائے شوق کی وارفتگی کہ اب
کچھ امتیازِ خلوت و محفل نہیں رہا

یونین ورسل پریس لاہور میں باہتمام بابو غلام قادر مسیحی پرنٹر چھپا - اور مولوی سید ممتاز علی صاحب مالک و منیجر نے لاہور سے شائع کیا ٭

آسمانِ ادب

کی

جوئے نور

یعنی

ماہوار رسالہ

کہکشاں

مرتبہ

سید امتیاز علی تاج

مقام اشاعت

دارالاشاعت پنجاب

لاہور

DESIGNED BY MUHD ABDUR RAHMAN CHUGHTAI

BLOCKS BY THE HALF TONE PHOTO CO LAHORE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد۲ | فہرستِ مضامین کہکشاں ماہ جنوری ۱۹۱۹ء | نمبر۱

تنبیہ۔ جتنے مضامین کہکشاں کے اس نمبر میں درج کئے گئے ہیں۔ ان سب کے حقوق محفوظ ہیں :-

تقریب

حکمائے یونان اور اُن کے خیالات جناب "پطرس" نے حکمائے یونان اور اُن کے خیالات و مقالات پر مفید مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ آجکل دنیائے علم میں فلسفہ جدید کی دھوم دھام ہے۔ ایسے زمانے میں اُن پیغمبران فلسفہ و حکمت کے خیالات کا دُہرانا بہت مفید ہوگا۔ ہم جناب "پطرس" کے بے انتہا ممنون ہیں کہ اُنہوں نے کہکشاں کی قلمی اعانت فرمائی اور آیندہ مستقل امداد دینے کا وعدہ فرمایا +

زحاف۔ حضرت علامۃ العصر نواب حیدر یار جنگ بہادر ہندوستان کے اُن فاضل و نامور بزرگوں میں سے ہیں جن کے دم سے فنِ سخن زندہ ہے۔ علمی تحقیق میں مبدءُ فیاض نے جیسا بے نظیر ملکہ آپ کو عطا فرمایا ہے اُسکی نظیر الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے۔ مولانا موصوف نے ہماری استدعا پر "زحاف" کی تحقیق میں یہ مختصر مگر بے انتہا مفید مضمون عنایت فرمایا ہے اور آیندہ ایسے ہی محققانہ مضامین سے کہکشاں کو رونق بخشنے کا وعدہ کیا ہے۔ فی الحقیقت اس ہنگامۂ شعر و شاعری میں جب کہ فن سخن کی قیود کا لحاظ معدودے چند حضرات ہی کرتے ہیں۔ ایسے مضامین چراغ ہدایت کا کام دینگے +

کیفی صاحب کی ایک نظم۔ راقم مضمون جناب "ادب آموز" نے اپنے گرامی نامے میں تحریر فرمایا ہے کہ ان کے اس مضمون پر "تقریب" نہ لکھی جائے۔ لہذا "الامر فوق الادب" کی تعمیل میں ہم اس پر کچھ نہیں لکھ سکتے +

بیدل۔ ناظرینِ کہکشاں "قمر" کی ادبی نور پاشیاں تو نومبر نمبر میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب آسمان تنقید پر ان کی ضوفشانی ہدیۂ احباب ہے۔ بیدل کا اَوجِ تخیل۔ عارفانہ مذاق مشکل پسندی حُسنِ ترکیب۔ قادر الکلامی سوز و گداز ضرب المثل ہے اور ہم متعجب تھے کہ تنقید نگاروں نے اس خلاق المعانی کے کلام کی طرف سے ابتک کیوں غفلت برتی۔ اس مضمون میں "قمر" کی طبع وقاد نے حق نقادی خوب ادا کیا ہے اور بیدل کے کلام کی خصوصیات خوب نمایاں کی ہیں۔ ہمیں بے انتہا مسرت ہوگی اگر حسب وعدہ مرزا بیدل کی نثر پر بھی تنقید لکھی جائے +

جامعیّت۔ اس مضمون کے راقم ملک کے مشہور انشا پرداز ہیں۔ خدا جانے اس مضمون کے متعلق انہوں نے اپنا اصلی نام پوشیدہ رکھنے میں کیا مصلحت سمجھی۔ حالانکہ علی گڈھ کالج کے دَورِ متوسط کے تعلیم یافتہ حضرات اور ادبی رسائل کے اکثر ناظرین "جان بُل" کے نام سے ناآشنا نہیں۔ صاحب موصوف کے انداز تحریر میں پختگی اور متانت آمیز ظرافت ایک ایسی خصوصیت ہے جو بہت کم انشا پردازوں کو نصیب ہوتی ہے۔ "جامعیّت" اپنے انداز میں نرالا مضمون ہے اور بے حد قابلِ داد۔ ہم جناب "جان بُل" صاحب بہادر کے ممنون ہیں اور اتنی گزارش کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر جناب اپنے اصلی نام سے بزم کہکشاں میں تشریف لائیں تو رسالے کی بہت عزت افزائی ہوگی۔ یہ "گاے بیل" کے الفاظ تو کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے +

جہاں پھول کھلتے ہیں۔ مُحتری جناب سید سجاد حیدر بی اے کا شکریہ ادا کرنا ہمارے لئے چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ فی الحقیقت کہکشاں کے لئے یہ امر بے انتہا

فخر کا باعث ہے کہ سید صاحب موصوف اس کی قلمی سرپرستی فرماتے ہیں۔ جو بے شمار خصوصیتیں کہکشاں کو دیگر رسائل ادبی سے ممتاز کرتی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ یہ مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن ادب لطیف کا بے نظیر نمونہ اور نثر شاعری کی معجزانہ مثال ہے۔

اپنے چاند سے۔ جناب مولانا نیاز کا یہ مضمون ہماری تعریف سے مستغنی ہے۔ سبحان اللہ کس قدر پُر کیف اور موثر لکھا ہے کہ ایک ایک فقرہ راقم کی گلخن طبع کا شرارہ معلوم ہوتا ہے۔ نیاز جادو طراز نے اس مضمون میں بہت سی خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔ جذبات کتنے صحیح لکھے ہیں۔ نیچرل منظر کتنا پُر لطف دکھایا ہے۔ ادبیت کس قدر زبردست ہے۔ عورت کی طرف سے جذباتِ اُلفت کا اظہار کس قدر قیامت خیز ہے اور اس پر زبان کی سلاست اور روانی اَور بھی قیامت ڈھا رہی ہے۔ جو لوگ اپنی ادب نافہمی سے مولانا موصوف کی تحریروں کو غیر موثر خیال کرتے ہیں وہ یہ مضمون پڑھیں اور شرمندہ ہوں ✤

انکشافاتِ محبت۔ اس مضمون میں مانی رنگین نگار کے مُوقلم نے صفو کہکشاں پر نہایت نظر فریب گلکاریاں دکھائی ہیں۔ ایک جذبے کو اتنے حُسن سے لکھ جانا اور اپنے مخصوص رنگ کو ہاتھ سے نہ دینا مانی صاحب ہی کا حصہ ہے ✤

بزمِ آخر۔ مصورِ غم مولانا راشد الخیری دہلوی کہکشاں کے ممتاز سرپرستوں میں سے ہیں۔ یہ مضمون اُن کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف کا ایک ٹکڑا ہے۔ مولانا کا انداز تحریر قبولیت عام حاصل کر چکا ہے اس لئے ہماری تعریف کا محتاج نہیں ✤

میرا آنسو۔ چودھری محمد اکبر صاحب منیر بی اے منشی فاضل کی ایک دلاویز نظم "حیات جاوید" ماہ گزشتہ میں ہدیہ ناظرین ہو چکی ہے۔ یہ اُن کی دوسری نظم ہے۔ تخیل کی بلندی اور انداز سخن کی دلاویزی بے حد قابل تعریف ہے خصوصاً نظم کا آخری بند نہایت برجستہ اور پُرجوش واقع ہُوا ہے۔ اُمید ہے کہ چودھری صاحب موصوف ہمیشہ "کہکشاں" کے لئے ایسی درخشاں نظمیں لکھ کر ہمیں تشکر و امتنان کا موقع دینگے ✤

کلامِ اکبر۔ لسان العصر خان بہادر مولانا سید اکبر حسین صاحب قبلہ الہ آبادی بزمِ آخر کی شمع سحری ہیں۔ خدا تعالیٰ اُن کے وجود سے محفلِ ملت کو دیر تک منور رکھے۔ وہ حقیقی شاعر ہیں اور اُن کا کلام جہاں ظرافت کے پھول بکھیرتا ہے وہاں حقائق رُوحانیہ کو اپنے سوز و گداز سے موثر بنا کر افراد قوم کے دلوں میں شرارے بھی دوڑا دیتا ہے۔ مولانا موصوف نے ہماری استدعا پر اپنے چند اشعار عنایت فرمائے ہیں۔ "اکبر" کا کلام ہماری تعریف کا محتاج نہیں۔ پڑھئے اور سر دُھنئے ✤

قندِ پارس۔ یہ فارسی غزل مولانا نیاز کے رشحات تخیل سے ہے۔ ہر شعر جذبات عالیہ اور سلاست زبان کے اعتبار سے قابلِ داد ہے۔ اس زمانے میں کہ فارسی شعر و سخن کا مذاق دن بدن اُٹھتا جاتا ہے۔ ایسے کہنے والے بسا غنیمت ہیں ✤

بزم انجم

اس پرچے میں اور آیندہ بھی اسی عنوان کے تحت میں ہم معزز معاصرین پر تنقید کیا کرینگے۔ اُمید ہے کہ ناظرین و معاصرین اس سلسلے کو پسند کرینگے۔ فی الحال مخزن۔ زمانہ۔ صبح اُمید اور خطیب کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرینگے:-

مخزن

ادبی رسالوں میں اس معزز پرچے کو اوّلیت کا فخر حاصل ہے۔ اس پر تین مختلف دَور گزر چکے ہیں۔ پہلے دَور میں جناب شیخ عبدالقادر صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا کے زیر ادارت نکلتا تھا شیخ صاحب موصوف کی قابلیت اور رسوخ سے اس میں اتنی دلفریبیاں پیدا ہوئیں کہ اس کی اشاعت چار پانچ ہزار تک بڑھ گئی جو ہندوستان کے کسی اُردو رسالے کے لئے بمنزلہ معراج ہے۔ اس رسالے نے ایسے ایسے لائق انشا پرداز اور شاعر مہیا کئے جن پر آج ہندوستان بھر کو ناز ہے۔ انشا پردازوں میں سید سجاد حیدر بی اے اور مولانا راشد الخیری دہلوی اور شاعروں میں اقبال۔ نیرنگ۔ ناظر۔ سرور وغیرہم جیسے بینظیر ادیبوں کے مضامین نظم و نثر سب سے پہلے اسی رسالے میں نکلے اور یہی رسالہ اُن کی شہرت کا باعث ہُوا۔

دُوسرا دَور نہایت پستی و ادبار کا تھا۔ اس میں شیخ صاحب نے مخزن کو چھوڑ دیا۔ اس دَور کے پہلے دنوں میں تو ایک دو تعلیم یافتہ حضرات کی ادارت سے اس کی شان کسی حد تک برقرار رہی۔ لیکن بعد میں نااہل لوگوں کے ہاتھوں اسکی نفاست و شہرت کا ایسا افسوسناک خاتمہ ہُوا کہ بامذاق حضرات اسے پڑھنا عار سمجھتے تھے۔

تیسرا دَور اب سے دو سال پہلے شروع ہُوا اور اس میں ہمارے مکرم مولوی احسان اللہ خاں صاحب تاجور نجیب آبادی نے اس کی اڈیٹری کے فرائض اپنے ذمے لئے۔ اس دَور میں مخزن کی حالت نہایت اُمید افزا ہے اگرچہ وہ بات تو پیدا نہ ہُوئی جو پہلے دَور میں تھی۔ لیکن اب اس کا پیدا ہونا ہمارے نزدیک ناممکن سا ہے۔ زمانے کے حالات بدل گئے۔ افرادِ قوم کا مذاق بدل گیا اس میں اڈیٹر صاحب معذور ہیں۔ بہرحال اب مخزن کی حالت دُوسرے دَور کی نسبت اچھی ہے اور ہم مولانا کو اس کے لئے مبارکباد دیتے ہیں۔

اس وقت مخزن کے دو نمبر دسمبر ۱۸ء جنوری ۱۹ء ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ انہی کے متعلق ہم اپنی رائے لکھیں گے دسمبر کے "تبصرہ" میں مولانا نے سید افضل علی صاحب ایم اے اور مولانا نیاز فتحپوری میں مقابلہ کرکے سید صاحب کو ان پر ترجیح دی ہے۔ ممکن ہے یہ درست ہو۔ لیکن یہ تقابل کا شیوہ ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ نومبر کے رسالے میں بھی خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم اے کے کلام کی تعریف کرتے ہُوئے مولانا نے لکھا تھا۔ کہ "اقبال" کے بعد پنجاب بھر میں خلیفہ صاحب سے بہتر کوئی شاعر نہیں" معقول پسند لوگ ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہے کہ کل کو پنجاب کے کسی اَور شاعر کی نظم دفتر مخزن میں موصول ہو اور وہ خلیفہ صاحب کی نظم سے اچھی ہو۔ تو اس کی تعریف کرنے اور اُس کو کوئی درجہ عطا کرنے میں آپ کو بے حد مشکل پیش آئیگی کیونکہ اس سے پہلے خلیفہ صاحب کو قطعی ایک درجہ عطا فرما چکے ہیں۔ ہمارا

دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ مولانا آئندہ مضمون نگار کی تعریف ضرور کیا کریں لیکن کسی تیسرے شخص کا نام نہ لیا کریں ٭

اس نمبر میں مرزا احسان احمد صاحب بی اے علیگ کا تاریخی مضمون رینائیسنس بہت قابلِ تعریف ہے اور بہت محنت سے لکھا گیا ہے۔ مولانا راشد الخیری کا ایک قصہ آفتاب دمشق بھی شروع کیا گیا ہے جو حسب تحریر ایڈیٹر صاحب ڈیڑھ سال تک درج ہوتا رہیگا۔ سید فضل علی صاحب ایم اے کا "انقلاب" نہایت عمدہ ادبی مضمون ہے۔ سید صاحب موصوف کا انداز تحریر بہت دل آویز اور اچھوتا ہے۔ اُردو میں تو اس انداز پر آج تک کسی نے نہیں لکھا۔ البتہ انگریزی میں گولڈ اسمتھ کے انداز سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اُردو زبان کے متعلق مولانا اکبر شاہ خاں صاحب کا مضمون بھی پڑھنے کے قابل ہے لیکن اس سے پہلے نومبر کے نمبر میں "شیر پنجاب" کا مضمون "اُردو اور اہل زبان" پڑھنا چاہیئے۔ مولانا نے اسی کے جواب میں لکھا ہے۔ مخزن میں جو یہ بحث چھڑی ہے کہ اُردو پنجابیوں کی زبان ہے اور دہلی لکھنؤ والوں نے کچھ نہیں کیا ہم اس بحث کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کسی مفید تحقیق و تدقیق کی صورت میں نکلنا تو معلوم۔ البتہ اہلِ زبان اور پنجاب کے باشندوں میں مغائرت و منافرت کی خلیج زیادہ وسیع ہو جائیگی۔ اگر شیر پنجاب نے چند پنجابی اشعار یا الفاظ اُردو شعرا کے دواوین سے نکال کر لکھ دئے تو اس میں کونسی بات نکل آئی۔ مولانا تاجور اس سلسلے کو بند کردیں۔ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) نے "ہستی میں بہنے والی آب جو" کے عنوان سے ایک ادبی ٹکڑا بہت اچھا لکھا ہے۔ حضرت مولانا اکبر الہ آبادی کے نتائج افکار بہت دلاویز ہیں۔ مولوی تاجور صاحب کا ہندوستانی بچوں کا گیت خوب ہے ٭

جنوری کے نمبر میں ایک چھوٹا سا مضمون بعنوان تاریخ فلسفہ قدیم مولوی حمید اللہ خاں صاحب پروفیسر اجمیر کے قلم سے نکلا ہے مضمون تو اچھا خاصا ہے۔ لیکن اس عنوان کو دیکھ کر جو توقعات پیدا ہوئی تھیں وہ مضمون پڑھنے سے مجروح ہوگئیں۔ غالباً یہ مضمون بالاقساط شایع ہوگا اور یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی یا اس مضمون کا دیباچہ ہے۔ خدا کرے ہمارا خیال درست ہو۔ "گنج شائگاں" ایک مسلسل مضمون پچھلے نمبروں سے چلا آرہا ہے اس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ بعض ہندی الفاظ کو فارسی ثابت کیا جائے۔ چنانچہ ایک ایک لفظ لکھ کر اس کی سند اساتذہ فارسی کے کلام سے دی ہے۔ یہ سلسلہ بہت دلچسپ ہے مرزا احسان احمد صاحب کے قابل قدر مضمون رینائسنس کا دوسرا حصہ اس نمبر میں موجود ہے اور ابھی باقی ہے جو آئندہ درج ہوگا ٭

اس نمبر میں ایک انگریزی ناول کا ترجمہ چھپنا شروع ہوا ہے "شریفہ و اذان کی کہانی" یہ قصہ بھی شاید دو سال تک ختم نہ ہو۔ ہمارے نزدیک یہ طریقہ اچھا نہیں کہ ایک مضمون تپ دق کی طرح رسالے کو ایسا لاحق ہو کہ سالہا سال تک پیچھا نہ چھوڑے۔ مضمون زیادہ سے زیادہ دو نمبروں میں ختم ہو جانا چاہیئے۔ اگر بہت لمبا ہو اور اس کا درج کرنا بہت ضروری سمجھا جائے تو اس کے ابواب اس ترتیب سے مقرر کئے جائیں کہ ناظرین انہیں پڑھ کر آخر میں بدمزہ نہ ہوں کیونکہ مضمون کو اسلئے مسلسل رکھنا کہ لوگ آئندہ پرچے کو شوق سے خریدیں محض بے اصول تجارت ہے۔ آج کل رسالہ مخزن میں تاریخ فلسفہ قدیم (غالباً) گنج شائگاں۔ رینائسنس۔ آفتاب دمشق۔ شریفہ و اذان کی کہانی۔ اُردو اور اہلِ زبان چھ مضمون مسلسل درج

ہو رہے ہیں۔ رسالے میں کوئی چیزِ مستقل دلچسپی کی بھی
ہونی چاہیئے۔ صرف صفحے بھرنا قابلِ تعریف نہیں۔ مسٹر
اظہر علی آزاد کی فارسی غزل ہمیں بہت پسند آئی لیکن
حاشیے پر ان سادہ اشعار کی شرح لکھنا اس کا مطلب
سمجھ میں نہ آیا۔ یہ کیوں فرض کر لیا گیا کہ ناظرین مخزن
کچھ نہیں جانتے اور شعر نہیں سمجھ سکتے۔ اڈیٹر صاحب کو
چاہیئے تھا کہ یہ شرح کاٹ دیتے۔ اس کے درج کرنے
میں ناظرین کی توہین نکلتی ہے۔ اگر کوئی ادق اشعار
ہوتے تو خیر ایک بات بھی تھی۔ مگر یہ طرزِ عمل تو ہمیں
بُرا معلوم ہُوا ٭

اس رسالے میں میاں بشیر احمد صاحب بی اے
کا "الوداعی نظارہ" بہت خوب اور رنگین صفحہ ہے۔
سید افضل علی صاحب کا مضمون "اختلاط" بھی بہت
دلکش ہے ٭

"انجمن اربابِ علم" لاہور کا قیام مولانا تاجور کی بہت
قابلِ تعریف کوشش ہے اور ہم دل سے چاہتے ہیں کہ موصوف
اس میں کامیاب ہوں۔ صفحہ ۶۵ پر واقعات حاضرہ کے
عنوان سے مولوی محمد شفیع صاحب ایم اے کے عربی پروفیسر
ہونے کی خبر لکھی ہے لیکن اس میں بھی ہمارے مکرم اپنی
عادت کو نہ چھوڑ سکے۔ ڈاکٹر عظیم الدین صاحب پی ایچ
ڈی کو عربی سے نابلد بتا دیا۔ کیا آپ کسی دُوسرے آدمی کی
مذمت و توہین کئے بغیر کسی شخص کی تعریف نہیں کر
سکتے ؟

مخزن کا کاغذ اچھا۔ لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔
اپنی پُرانی تقطیع کے ۶۴ صفحوں نکلتا ہے۔ درجہ
اول کی قیمت للعہ۔ درجہ دوم کی ۸/ عہ فی پرچہ
چار آنے۔ دفترِ مخزن بھاٹی دروازہ لاہور سے
مل سکتا ہے ٭

زمانہ

یہ رسالہ اجرائے مخزن کے بعد نکلا تھا اور اب تک
کامیابی سے جاری ہے۔ درمیان میں اس کی حالت بھی
کچھ مائل بہ پستی ہو گئی تھی لیکن لائق اڈیٹر کی قابلیت سے
پھر سنبھل گئی۔ اس وقت دسمبر اور جنوری کے دو نمبر
ہمارے سامنے ہیں۔ دسمبر کے پرچے میں آنریبل پنڈت
مدن موہن مالوی اور ہندو یونیورسٹی کے بنیادی پتھر کی
تصویریں دی گئی ہیں۔ مسٹر ع۔ بزآسیوتی کا سیاسی
مضمون "پبلک سروس یا ملازمت عامہ" بہت محنت
سے لکھا گیا ہے۔ اگرچہ موضوع خشک ہے لیکن ملک
کو اس قسم کے مضامین کی ضرورت ہے اس میں اعداد
وشمار سے ثابت کیا ہے کہ ہندوستانیوں کو ۴۵ سال
کی طویل مدت میں پبلک سروس کے درمیانی درجے
میں صرف گیارہ فیصدی ترقی کرنے کا موقع دیا گیا ہے
اور یہ رفتار ترقی نہایت سُست ہے۔ پنڈت مدن
موہن مالوی کے حالات اور "رفتار زمانہ" کے عنوان
سے ماڈریٹ کانفرنس کی کارروائی اڈیٹر صاحب کے
قلم سے نکلی ہے۔ اس پرچے میں ادبی حصہ بالکل
برائے نام ہے اور کوئی مضمون ایسا نہیں جو رسالے
کی شان کے لائق ہو۔ اس نمبر کو دیکھ کر زمانہ کو ادبی
رسالہ نہیں کہا جا سکتا البتہ سیاسی ضرور کہا جا سکتا ہے
اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں سیاست کی بہت
ضرورت ہے۔ لیکن اس کے خشک مباحث کے لئے اخبار
کافی موجود ہیں۔ ادبی رسالے میں ادبی مضامین چھپنے چاہئیں
اُن کا موضوع اخلاقی ہو یا مذہبی۔ تمدنی ہو یا سیاسی۔
لیکن ادبی انداز ضرور برقرار رہنا چاہیئے۔ اس پرچے
میں نظم کوئی نہیں ہے اور یہ بہت بڑا نقص ہے ٭

جنوری کا پرچہ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے نے

کتابت۔ طباعت۔ کاغذ اور مضامین کے لحاظ سے ایک بہت لمبی زقند بھری ہے۔ اس رسالے میں پریزیڈنٹ ولسن مسٹر لائڈ جارج۔ سرایس پی سنہا اور مہاراجہ صاحب بیکانیر کی تصویریں ہیں "حکیم کنفوشس اور فلسفہ حکومت" مولانا عبدالماجد بی اے کا نہایت مفید و قابل قدر مضمون ہے "جدید صنعتی دور" پروفیسر اقبال بہادر سکسینہ ایم اے بھی اچھا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ صنعتی ترقی کے لئے کیا چیزیں ضروری ہیں اور زمانہ حال میں صنعت و حرفت کو ترقی کیونکر دی جا سکتی ہے۔ لکھنؤ کے زندہ دل اور قابل بیرسٹر اور شاعر حامد علی خاں مرحوم کے حالات منشی نوبت رائے صاحب نظر نے بہت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل لکھے۔ حامد علی خاں مرحوم علاوہ شاعری کے بہت بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ اور اُن کے انتقال سے ہندوستان کی معقول سوسائٹی کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ مولانا نیاز کا "مطربۂ فلک" نہایت دلچسپ اور ادبی شان کا مضمون ہے۔ مولانا کی نازک خیالیاں اور رنگیں بیانیاں تعریف سے مستغنی ہیں۔ اس کے بعد یادُو نگار پریم چند کا قصہ "قربانی" نہایت اعلے درجے کا مضمون ہے۔ دیہاتی زندگی کے مناظر اور دیہاتیوں کے جذبات کا نقشہ اتنا اچھا کھینچا ہے کہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ یہ قصہ رسالے کی جان ہے ؞

حضرت مولانا اکبر کا کلام بھی درج ہے "ڈاکٹر اقبال کے وہ چند اشعار بھی درج کئے گئے ہیں جو اُنہوں نے "مشاعرہ فتح لاہور" میں پڑھے اور "حق" میں چھپ چکے ہیں۔ لیکن نقل کا حوالہ نہیں دیا۔ منشی تلوک چند محروم اور جناب ارشد تھانوی کی نظمیں خوب ہیں۔ اس کے بعد رفتار زمانہ کے عنوان سے پارلیمنٹ کے انتخاب اور کانگریس ولیگ کے جلسوں کے حالات اڈیٹر صاحب کے قلم سے نکلے ہیں ؞

غرض کہ اب رسالہ زمانہ معقول ترقی کر رہا ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی کے اعتبار سے بھی اچھا ہے۔ اور ۲۰ × ۲۶ کے ۴۸ صفحوں پر چھپتا ہے۔ قیمت سالانہ للعہ "دفتر زمانہ کانپور" ملنے کا پتہ ہے ؞

صُبح امید

یہ رسالہ لکھنؤ سے پنڈت برج نرائن صاحب چکبست کی زیر ادارت اکتوبر ۱۹۱۸ء سے نکل رہا ہے۔ اس کا مقصد اجراء اُردو دان پبلک میں سیاسی مذاق پھیلانا ہے۔ اس کے دوسرے نمبر میں ایک نہایت اچھا مضمون "عورتیں اور ہوم رول" کے عنوان سے چھپا ہے۔ اسے پڑھ کر یہ کبھی یقین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ رسالہ چکبست جیسے قابل زبان دان و انشاء پرداز کا ممنون ادارت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضمون کسی انگریزی خط کا ترجمہ ہے۔ اور ترجمہ اس بدسلیقگی سے کیا گیا ہے کہ خدا کی پناہ اکثر فقروں میں صاف انگریزی طرز بیان کی جھلک نظر آتی ہے۔ گویا یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ہم اردو میں ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کی قدرت نہیں ہے۔ پنڈت صاحب ممدوح کو اس طرف زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ دسمبر نمبر میں "رفتار قوم" کے عنوان سے سیاسی مطالب کے جو چند نوٹ فاضل اڈیٹر کے قلم سے نکلے ہیں بہت قابل تعریف اور ادبی رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ نواب ذو القدر جنگ صاحب ایم اے کا مضمون "سرسالار جنگ کے یادگار اصلاحات" بہت دلچسپ و نتیجہ خیز مضمون ہے۔ آئینی اصطلاحات ہندپر پنڈت تکشن پرشاد کول نے خوب لکھا ہے۔ "ہمارے معاصرین" کے عنوان سے چند ادبی رسائل پر تنقید کی گئی ہے لیکن خدا جانے غریب "کہکشاں" سے اس قدر بخل کیوں کیا گیا کہ تین سطریں لکھ کر پیچھا چھڑا لیا۔ ہمیں پنڈت صاحب سے امید

معاملے میں بہت بڑی شکایت ہے انہیں چاہئے تھا کہ وہ صحیح معنوں میں تنقید کرتے رسالے کی خوبیاں بھی دکھاتے اور نقائص بھی ظاہر کرتے ہم تو ایسی تنقید کے لئے ہمیشہ چشم براہ رہتے ہیں اور اسے اپنے لئے موجب اصلاح و رہنمائی سمجھتے ہیں ۔

بہار سخن کے عنوان سے ایک غزل مولانا حسرت کی اور ایک نظم چکبست صاحب کی درج ہے ۔ اس کے بعد عطر سخن کے عنوان سے غالب و آتش کے کلام کا انتخاب دیا ہے ۔

جنوری نمبر میں بھی حسب معمول "رفتار قوم" کے عنوان سے اڈیٹر صاحب نے نہایت دلچسپ اور معقول نوٹ لکھے ہیں اس کے بعد "سفیر صلح" کا مضمون انجمن بین الاقوام بھی پڑھنے کے قابل ہے ۔ سالار جنگ کے یادگار واقعات اور اصلاحات مبنہ کے دونو مضامین کی اقساط اس نمبر میں بھی موجود ہیں ۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کا مضمون "شہزادے کی جاروب کشی" نہایت موثر اور دردانگیز مضمون ہے ۔ اس کے بعد "ہمارے معاصرین" اور ریویو کے صفحات ہیں بہار سخن کے تحت میں جناب شوق کے چار شعر "محبت" پر اور چکبست کی کسی غزل کے چھ شعر درج ہیں پھر حسب معمول آتش کے کلام کا انتخاب ہے ۔

پہلے نمبروں کو دیکھ کر تو یہی خیال ہوا کہ یہ رسالہ سیاست و ادب کا عجب معجون مرکب ہے لیکن اس کے طرز عمل سے ثابت ہوا ہے کہ سیاست، تنقید اور شاعری اس کے مقاصد ہیں ۔ بہر حال رسالہ اپنے رنگ میں اچھا ہے اور ہم اس کی کامیابی چاہتے ہیں ۔

کاغذ لکھائی چھپائی سب کچھ عمدہ ۔ خصوصاً سرورق کا کاغذ بہت نفیس ہے ۔ لیکن سرورق کے اوپر جو ہندوستان کی شمالی حدود پر پہاڑ اور ایک طرف طلوع آفتاب کا نظارہ دکھایا ہے ۔ وہ اچھا نہیں ۔ لکھنؤ میں اچھے اچھے مصور و نقاش موجود ہیں کوئی اچھا ڈیزائن بنوا کر چھاپا جائے تو زیادہ خوبصورت معلوم ہو ۔ حالت موجودہ میں تو اس کے پہاڑ کنکھجورے سے معلوم ہوتے ہیں ۔ قیمت سالانہ چار روپے ۔ فی پرچہ ۶؍ "دفتر صبح امید ہندوستانی پریس نظیر آباد لکھنؤ" اس کا پتہ ہے ۔

خطیب

یہ ادبی ۔ مذہبی اور سیاسی رسالہ ملا محمد الواحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ کے زیر ادارت کوچہ چیلاں دہلی سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے ہم اس رسالے کے اسلوب کو بے انتہا پسند کرتے ہیں ۔ اگر ایسے متعدد رسالے شائع ہوں تو اردو و علم ادب تھوڑے عرصے میں مالا مال ہو جائے ۔ ابتدائی صفحوں میں واقعات حاضرہ پر مفصل اور متین نوٹ لکھے جاتے ہیں اور ہر معاملے پر نہایت آزادی اور نیک نیتی سے بحث کی جاتی ہے اس کے بعد لیڈر کسی مذہبی یا سیاسی موضوع پر نہایت قابلیت کے ساتھ لکھا جاتا ہے ۔ اس کے بعد علمی و ادبی مضامین شروع ہوتے ہیں ۔ اس حصے میں دہلی کے دو مشہور انشا پرداز جناب مولانا راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ دونو حضرات اس رسالے میں اکثر لکھتے ہیں ۔ نظم کا کالم بھی اچھا ہوتا ہے ۔ اس کی اشاعت پچھلے دنوں اڈیٹر صاحب کی علالت کی وجہ سے بے قاعدہ ہو گئی تھی مگر اب باقاعدہ ہے ۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ۔ کاغذ معمولی ۔ سرورق رنگین قیمت تین روپے سالانہ جو نہایت واجبی بلکہ رسالے کی حیثیت اور موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کم ہے ۔ ۱۸×۲۲ ۱/۸ کے سولہ صفحوں پر شائع ہوتا ہے ۔ "دفتر خطیب کوچہ چیلاں دہلی" ملنے کا پتہ ہے ۔

کہکشاں

نمبر۱	ماہ جنوری سنہ ۱۹۱۹ء	جلد۲

قدیم یونانی حکماء اور اُن کے خیالات

(۱)

مصنّفین فلسفے کی تاریخ کو عام طور پر حکما کے اس گروہ سے شروع کرتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے کنارے یونانیوں کے بسائے ہوئے شہر میلاطیس میں آباد تھا۔ یہ حکما مسئلۂ تغیر کے متعلق بہت کچھ سوچتے رہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ دُنیا عالمِ کون و فساد ہے۔ اشیاء بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ تعمیر کے ساتھ تخریب اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے مگر باوجود اسکے کوئی چیز بھی عدمِ مطلق سے وجود میں نہیں آتی اور نہ وجود سے عدمِ مطلق ہی میں چلی جاتی ہے۔ دُنیا کی کوئی چیز بالکل ازسرِ نو شروع نہیں ہوتی اور نہ کبھی دائمی اختتام ہی پر پہنچتی ہے۔ ہر ایک چیز تغیر کے لاانتہا ہی سلسلہ کی ایک کڑی [illegible] تغیر کسی چیز کا ہے۔ وہ ایک چیز کیا ہے جو مختلف ہیئتوں میں آ آکر مختلف اشیا اور اجسام بن جاتی ہے۔ وہ کونسا ایک مادۂ بنیادی ہے جو متغیر ہو ہو کر مختلف شکلیں اختیار کرلیتا ہے۔ یہ ایک معمّہ تھا جس کو حل کرنے پر قدیم یونانی حکما نے اپنی کمرِ ہمت باندھی۔ سب سے پہلے تھیلس نے پانی کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ اس کے بعد این اکیسی منیڈر آیا اور اُس نے کہا کہ یہ مادہ بنیادی ایک غیر محدود مادّہ ہے جس میں سے مختلف اجسام بنتے ہیں۔ این اکیسی مینیز نے اس کو ابخرات سمجھا جو رقیق حالت میں حرارت پاکر آگ بن جاتے ہیں یا منجمد حالت میں ٹھنڈے ہوکر پانی کی صورت اختیار کرلیتے ہیں ؛

مسیح سے ۴۹۴ سال پہلے ایرانیوں نے حملہ آور ہوکر

میلاطیس کو تاراج کر دیا اور حکما کے اس گروہ کا اپنے مرز
و بوم میں ہی خاتمہ ہو گیا مگر انہی ایام میں میلاطیس سے کچھ
فاصلے پر شہر افیس میں ایک فلاسفر ہرقلاطیس نامی رہتا
تھا جو میلاطیس کے فلسفیوں کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ ہرقلاطیس
کو دُنیا کی سب باتیں قابل تاسف وافسوس معلوم ہوتی
تھیں۔ اسی لئے بعد میں وہ "حکیم باکی" کے نام سے مشہور
ہو گیا جس طرح سے کہ ذیمقراطیس کو لوگ "حکیم ضاحک"
کے نام سے پکارتے تھے۔ کیونکہ اس کے لئے زندگی کی
سب باتیں ذریعہ فرحت وانبساط تھیں ÷

ہرقلاطیس کے نزدیک کائنات کا مادّہ بنیادی آگ تھا۔
وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ ہماری قوت فکر بھی اس ابدی
آگ کا ایک حصّہ ہے جس سرعت سے شعلہ متغیر ہوتا رہتا ہے
وہ کسی طرح بھی خیال کی سرعت سے کم نہیں اور شعلے کا آخر الامر
دھواں بن جانا خیال کی اس بے ترتیبی اور بے نظمی کو ظاہر
کرتا ہے جو شراب کے نشے کی حالت میں واقع ہوتی ہے +

مگر تاریخ فلسفہ میں ہرقلاطیس کی اہمیت اس وجہ سے
نہیں کہ اُس نے بھی اور حکما کی طرح کسی چیز کو کائنات کا مادّہ
بنیادی قرار دیا بلکہ اس مسئلہ پر اس نے بہت زور دیا ہے وہ خود
مسئلہ تغیر ہے۔ تمام دُنیا ایک بہتی ہوئی ندی کی طرح ہے جو ہر وقت
اپنے آب رواں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہے
وہ کہتا تھا کہ ہم ایک ہی دریا میں دو دفعہ داخل نہیں ہو سکتے
کیونکہ جس پانی میں ہم نے ایک دفعہ پاؤں ڈالا۔ دوسری دفعہ
پاؤں ڈالتے وقت وہ کہیں کا کہیں بہ جاتا ہے۔ اس مسئلے کو
مان لینے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے تمام
علوم بے سُود ہیں؟ جب اشیا کی حالت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے
تو جو بات ہم کسی چیز کے متعلق اس وقت بیان کرتے ہیں۔ وہ
ہمارے مُنہ سے نکلتے ہی غلط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ چیز بذات
خود اس وقت تک بدل کر کچھ اَور ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے
کہ ہرقلاطیس کے بعض معتقدوں نے اسی لئے کلام کرنا ترک کر دیا
تھا۔ اس کے بجائے وہ اشاروں سے باتیں کرتے تھے۔ کیونکہ
جتنے وقت میں ایک جملہ تکمیل کو پہنچتا ہے اتنے وقت میں اس
جملے کا مقصود غلط ہو جاتا ہے۔ بعض معتقد تو یہاں تک کہتے
تھے کہ ہرقلاطیس کا یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم کسی دریا میں دو دفعہ
پاؤں نہیں ڈال سکتے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہم کسی دریا میں
ایک دفعہ بھی داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ ایک لمحے کے لئے
بھی کوئی دریا سکون کی حالت میں نہیں ہوتا اور ہمارے
پاؤں ڈالتے ڈالتے وہ بظاہر ایک دریا ہر آن ایک نیا
دریا بن کر ہمارے سامنے سے گزر جاتا ہے ÷

ہرقلاطیس کے مسئلہ تغیر کے مندرجہ بالا نتائج کو قرطالیس
نامی ایک فلاسفر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ قرطالیس ہرقلاطیس
سے سَو سال بعد میں ہُوا ہے اور افلاطون اپنے بچپن کے زمانے
میں اسی قرطالیس کا شاگرد تھا۔ افلاطون کی پیدائش مسیح سے
۴۲۷ سال پیشتر ہوئی۔ اس نے اوائل عمر میں جو کچھ اپنے
اُستاد سے اس ہمہ گیر تغیر کے متعلق سُنا اُس نے اسے اس بات کی
ترغیب دلائی کہ وہ کوئی ایسی چیز ڈھونڈھے جو اس گردش سے
بالاتر ہو۔ جو ازل میں جیسی تھی ابد تک ویسی ہی رہے اور
جس کی نسبت اگر انسان کوئی واقفیت حاصل کرے تو وہ
واقفیت اور وہ علم بھی ہمیشہ کے لئے درست اور کارآمد ہو۔

یہاں ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہرقلاطیس
اور اُس کے پیرو مسئلہ تغیر کا اطلاق محض محسوسات پر کرتے تھے
کیونکہ محسوسات کے علاوہ وہ اَور کسی قسم کی حقیقت یا وجود
کے قائل ہی نہ تھے۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ان معنوں
میں قائلین مادّیات تھے جن معنوں میں کہ آج کل مادّیات کا
لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اُنھوں نے
محسوسات اور غیر محسوسات کے درمیان خطِ تفریق کبھی کھینچا
ہی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوتِ خیال بھی اسی طرح جگہ گھیر سکتی
ہے جس طرح مادّہ اور مادّہ بھی اپنے اندر قوتِ خیال رکھتا
ہے۔ افلاطون عرصے تک کسی غیر متغیر و غیر محسوس حقیقت کی

تلاش میں سرگردان رہا۔ اور آخر میں اس نے منزل پر پہنچنے
کے لئے وہ راہ اختیار کی جو ایتھنز کے نامور حکیم سقراط نے
اس کو بتائی ۔

دُنیا میں بہت سی شاندار ہستیاں ایسی ہوئی ہیں ۔
جنہوں نے اخلاف کے لئے ورثے میں اپنی کوئی تحریر یا مکتوب
یا تصنیف نہیں چھوڑی۔ ان کا حال ان کے ہمعصروں کی
روائتوں ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ سقراط بھی ایسی ہستیوں
میں سے ایک تھا۔ اس کے حالات زیادہ تر یا تو ارسطوفانیس
نامی شاعر کے ایک ڈرامے سے ملتے ہیں جس میں سقراط کا
مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ اور جب سقراط پچاس برس کی عمر کا تھا
تو پہلی دفعہ وہ ڈرامہ سٹیج پر کھیلا گیا۔ یا اس کے کچھ حالات
نامور جرنیل زینوفون کی اس تصنیف سے بھی کچھ ملتے ہیں جو
سقراط کی موت کے بعد لکھی گئی اور یا افلاطون کے مشہور و
معروف "مکالمات" سے کچھ پتہ چلتا ہے۔ ارسطوفانیس۔ زینوفون
اور سقراط کی طرح افلاطون بھی ایتھنز کا باشندہ تھا۔ جوانی کی
عمر ہی میں وہ سقراط کا شاگرد ہو گیا۔ بعد میں جب اُس نے
وہ "مکالمات" لکھے جن کے اندر ڈرامے کی شکل میں اُسکے
اپنے اُستاد سقراط اور سقراط کے معترضین کے مباحثے مندرج
ہیں تو اُس نے سقراط کے ذاتی خیالات کے علاوہ وہ نتائج
بھی اُسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دئے جن پر وہ سقراط
کے بتائے ہُوئے راستوں پر چل کر خود پہنچا تھا ۔

ارسطوفانیس نے اپنے ڈرامے میں قدامت پسند اہل
ایتھنز کا نمایندہ بن کر سقراط کے نئے نئے عقیدوں کی
ہنسی اُڑائی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ نئے نئے خیالات
اور یہ منطق کی بحثیں مذہب اور اخلاق کے لئے از حد مضرت
رساں ہیں۔ برخلاف اس کے زینوفون سقراط کو ایک کامل
رہنما۔ رُوحانی مددگار۔ پرہیزگاری اور نفس کشی کا ایک سچا
نمونہ اور اُن تمام لغو اور بیہودہ خیالات کا جو قوم کی اور
گھرانوں کی اصلاح کا باعث نہیں ہو سکتے۔ دشمن بیان کرتا
ہے۔ افلاطون نے اپنے اُستاد کی جو تصویر کھینچی ہے اُس کے
مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کن کن مختلف زاویہ ہائے
خیال سے ایک ہی شخصیت کو اُن دو طریقوں میں دیکھا جا
سکتا ہے۔ اس دماغی ترقی کے زمانے میں اس زبردست
ہستی کے اندر ایک ایسی رُوحانی تڑپ تھی جو اُس کے
ہم صحبتوں کے دلوں میں برقی رَو کی طرح سرایت کر جاتی
تھی۔ اس کی شکل و صورت اگرچہ حسین نہ تھی لیکن اس میں
وہ مقناطیسی کشش تھی جو شکل و صورت کی محتاج نہیں۔ وہ
ایتھنز کے نوجوانوں کے دلوں کو اُس کی طرف کھینچ کر لے
آتی تھی۔ جن کو اُس کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع حاصل ہُوا
وہ جانتے تھے کہ سقراط کی گفتگو محض منطقی ڈھکوسلے ہیں۔
سقراط منطقی یاوہ گو نہ تھا۔ اُس کے دل میں یہ خیال جاگزین
تھا کہ اُس کو الہام ہوتا ہے اور خدا نے اُس کو ہدایت بنی
نوع انسان کے اہم کام پر مقرر کیا ہے۔ یہ خیال اُس کے
دماغ کو ایک نئی قوت اور اُس کی زبان کو ایک انوکھی
بلاغت بخشتا تھا۔ اُس کی آزاد زندگی اُن تمام بندشوں سے
رہا تھی جن کی وجہ سے ایک دُنیادار پا بہ زنجیر ہوتا ہے۔ اس
کی روش میں غضب کی سادگی اور اُس کی عادات میں اعلیٰ
درجے کا ضبط تھا۔ ارسطوفانیس جو سقراط اور اُس کے رفقاء
کو ایتھنز کے نوجوانوں کے لئے مخرب اخلاق سمجھتا تھا اپنے
ڈرامے میں سقراط کی زندگی کا وہ درخشاں پہلوے حیات ہرگز
نہیں بتا سکتا تھا جس پہلوے حیات نے افلاطون اور افلاطون
کی طرح اور سیکڑوں کو سقراط کا گرویدہ کر رکھا تھا ۔

۳۹۹ قبل مسیح میں جب سقراط کی عمر ۷۰ سال سے کچھ
زیادہ تھی۔ اہلِ حکومت نے اس پر دو الزام لگائے۔ اول
یہ کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کر دینے کا باعث ہُوا
ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے اپنے ملک کے دیوتاؤں کو
ماننے سے انکار کیا ہے۔ حکم دیا گیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں
سے زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لئے اپنی غیر مفید ہستی کو

مٹا دے۔ سقراط اگر چاہتا تو جیسا کہ قانون اُس کو اجازت
دیتا تھا اپنے جرم کے کچھ حصے کا اعتراف کر کے اپنی سزا میں
تخفیف کرا سکتا تھا۔ اگرچہ خود نادار تھا مگر اُس کے پیرووں
میں سے اکثر اتنے متمول تھے جو اُس کے لئے بڑے سے
بڑا جرمانہ ادا کر سکتے تھے اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ اگر وہ
چاہتا تو اُس کی ایک جنبشِ ابرو کی تعمیل میں اُس کے
بیشمار دوست اُس کو قید سے نکال لے جاتے اور وہ
اپنی باقیماندہ عمر اپنے وطن سے باہر آرام و آسایش میں
کاٹتا۔ مگر مرتے دم تک اُس کو اپنی بیگناہی کا یقین رہا۔
قانون کی خلاف ورزی کو وہ گناہ سمجھتا تھا اور قید سے
بھاگ جانے کا اُس کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہ آیا۔
جو الزام اُس پر لگائے گئے اُن میں سچائی صرف اتنی
ہے کہ سقراط کا بعض ایسے گروہوں سے میل جول تھا۔
جنھوں نے مذہب میں نئی نئی رسمیں اور بدعتیں پیدا کیں
اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اُس نے بذاتِ خود مذہب
کی علانیہ مخالفت کی ہو۔ اگرچہ اس کا کبھی کبھی الہام وغیرہ
کے متعلق ذکر کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے
عقیدوں کا چنداں قائل نہ تھا۔ سقراط کی تعلیم کا نوجوانوں
پر یہ اثر ہوا کہ ان میں راست روی اور ضبطِ نفس کا مادہ
پیدا ہو گیا۔ مطلق العنان زندگی کی بد اخلاقیوں اور بد
عنوانیوں سے کنارہ کش ہو کر وہ اپنے اُستاد کے نقشِ قدم
پر چلنے لگے اور پاکیزگی اور نیکوکاری کو اپنی زندگی کا مقصدِ
اعظم سمجھ کر اُسے ہمیشہ اپنے مدِنظر رکھنے لگے۔ تخریبِ اخلاق
کا شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ایامِ جوانی میں سقراط
کی دوستی چند ایسے اشخاص سے تھی جو بعد میں اپنی باغیانہ
حرکتوں کے لئے بدنام ہو گئے۔ سقراط اپنی حکومت کی کمزوریوں
سے پوری طرح آگاہ تھا پھر بھی مرتے دم تک قانون کا پابند
رہا۔ اس کے مشہور جانبداروں میں سے افلاطون تو
سپارٹا کی حکومت کو ایتھنز پر ترجیح دیتا تھا اور زینوفون
ایتھنز کو چھوڑ کر سپارٹا کی فوج میں داخل ہو گیا۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ہرقلاطیس کے عقیدۂ تغیر کی
وجہ سے افلاطون کا دل تذبذب کی حالت میں تھا وہ سوچتا
تھا کہ اگر ہر ایک چیز ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے تو علم کے کیا معنے
ہو سکتے ہیں۔ اشیا کے تغیر کی وجہ سے اُن کا علم بھی ہر لحظہ
متغیر ہونا چاہئے اور متغیر علم کا حاصل کرنا بے سود ہے۔ ان
خیالات سے اُس کے دل میں کسی ایسی چیز کی جستجو پیدا ہوئی
جس کی حالت ابدی ہو اور جس کا علم ہمیشہ کے لئے درست
ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح سے وہ سقراط کے بتائے
ہوئے راستوں پر چل کر اس علمِ صحیح پر پہنچا۔

سقراط ایتھنز میں فرقۂ سوفسطائی کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔
اُن دنوں میں "سوفسطائی" محض دانا یا حکیم کے معنوں
میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دُنیا سقراط کو "سوفسطائی"
سمجھتی تھی۔ مگر سقراط کے پیرو اس کو ان لوگوں کا دشمن
خیال کرتے تھے جن کو "سوفسطائی" کے نام سے پکارا جاتا
تھا۔ یہ لوگ اپنی تعلیم سے اس بات کی اشاعت کرتے تھے
کہ نیکی اور بدی میں تمیز قدرت کی مقرر کردہ اور ابدی نہیں
ہے۔ اس تمیز کا انحصار محض رسم و رواج پر ہے جس فعل کو
ایک حالت میں "نیکی" کہا جاتا ہے وُہی فعل بعض اَور حالتوں
کے ماتحت "بدی" بن جاتا ہے جس پُرخطر زمانے میں
ایسے بیہودہ خیالات سے راست رُو زندگیوں کے عقیدے
متزلزل ہونے کو تھے اور اخلاقِ انسانی ایسی کج بحثیوں
سے معرضِ خطر میں تھا اُس وقت سقراط آگے بڑھا اور اُس
نے اپنی نیک نیتی اور صحیح الدماغی سے لوگوں کی رہنمائی
کی۔ اس نے کہا "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک کام جو ایک
حالت میں ٹھیک ہوتا ہے کسی اَور حالت میں بُرا ہو۔
اور اس صورت میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ فعل
"نیک" یا "بد" ہے مگر ہمارے ان فقروں سے کم از کم
یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیک و بد کچھ معنے اور حقیقت ضرور رکھتے

ہیں۔ مثلاً جب تم کسی شخص کی دیانتداری کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ
ہم کو اس کی نیت کا حال معلوم نہ ہو یا ہم حالات سے پُوری
طرح واقف نہ ہوں اور ہماری رائے اُس کی دیانتداری
کے متعلق غلط ہو۔ ہم کہیں گے "میرا خیال تھا کہ وہ دیانتدار
ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں"۔ مگر ہم یہ بھی نہ
کہیں گے کہ "ہم جانتے ہی نہ تھے کہ دیانتداری کیا چیز ہے"
کیونکہ ہم اگر دیانتداری ہی سے ناواقف تھے تو غلط یا
صحیح رائے کس طرح قائم کر سکتے تھے۔ اس لئے سب سے
مقدم یہ ہے کہ ان الفاظ سے جن کو منطق میں موضوعات
کہا جاتا ہے پُوری طرح واقف ہوں۔ مثلاً سچا، منصف
بہادر وغیرہ اور ہر ایک کی تعریف کر کے اس کے معنوں
کی توضیح کریں"۔

سقراط کے ان خیالات نے کہ انصاف۔ بہادری وغیرہ
وغیرہ حقائق ابدی ہیں اور اُن کے معنوں کی تحلیل اُن کی
تعریفوں سے ہو سکتی ہے۔ افلاطون کو اندھیرے میں شمع
ہدایت دکھائی۔ ہرقلاطیس کے عقیدوں نے علم صحیح کے رُخ
تاباں کے آگے شک و گمان کی ایک دھندلی سی نقاب ڈال
رکھی تھی جس کو سقراط نے اپنے انوار ادراک سے تار تار کر
دیا۔ کیونکہ یہ حقایق محسوسات کے زمرے سے باہر ہیں۔ جن
اشیا کا احساس ہمیں اپنے حواس خمسہ کے ذریعے ہوتا ہے
ان میں سے ہر ایک ان موضوعات میں سے کسی نہ کسی کی
محمول ہوتی ہے مگر اس موضوع کو بذات خود ادراک سے
تعلق ہے نہ کہ حواس سے۔ سقراط ان باتوں سے اس نتیجے
پر پہنچا کہ عالم محسوسات کے علاوہ جس میں اشیاء ہمیشہ
انتقال و تغیر کی حالت میں رہتی ہیں۔ اور جہاں کسی چیز کا
علم کوئی حقیقت نہیں رکھتا ایک اَور دُنیا حقایق ابدی کی
بھی ہے۔ اور ان حقایق کا علم بھی اُن ہی کی طرح ابدی ہے
عالم متغیر کی ہر ایک چیز کے ساتھ ایک حقیقت ابدی ملحق ہے
اور جو رائے ہم عالم متغیر کی کسی چیز کی نسبت دیتے ہیں اس
میں اس حقیقت ابدی کا علم صحیح مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً جب
ہم کہتے ہیں کہ "فلاں شخص دیانتدار ہے"۔ تو اس فقرے
میں اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ ہمیں دیانتداری کی
حقیقت کا علم ہے +

سقراط نے اس بارے میں اپنے خیالات اخلاقیات کے
زُمرے تک ہی محدود رکھے مگر افلاطون بہ آسانی اس
سے بہت آگے چلا گیا اور اس نے ان متغیر اور ابدی حقایق
کا اطلاق ہر ایک چیز پر کیا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خط اب خط
ج د کے مساوی ہے۔ مساوات کے علم کو تسلیم کرنا
ہے تو مساوات گویا ایک ایسی حقیقت ابدی ہے جس کا
احساس حواس خمسہ سے نہیں بلکہ ادراک سے ہو سکتا
ہے۔ "مساوات" بذات خود جو کل تھی وہ آج بھی ہے
اور کل بھی رہیگی۔ گو کل ہمیں معلوم ہو جائے کہ خط اب
اور خط ج د درحقیقت آپس میں برابر نہیں +

یہ مسئلہ حقائق ابدی افلاطون کی تعمیر فلسفہ کا سنگ
بنیاد ہے۔ افلاطون ان حقائق کو اپنی زبان میں
(Ideas) کہا کرتا تھا۔ یہ لفظ اب تک
انگریزی زبان میں موجود ہے مگر اس کے معنے اب ان
معنوں سے بہت مختلف ہیں۔ جن معنوں میں افلاطون
نے اس کو استعمال کیا +

"پطرس"

بیس برس گزرتے ہیں تب بچہ جوان ہوتا ہے، پھر دس برس اَور گزرتے ہیں تو وہ پورا آدمی بنتا ہے ..... مگر اُس کی ساخت کو
سمجھنے میں تیس صدیاں گزر گئیں اور ابھی تک اس مشین کے بہت سے پرزے سمجھ میں نہیں آئے ..... اُسکی رُوح سے قدرے واقف
ہونے کے لئے نہ جانے کئی ہزار صدیاں انتظار کرنا ہوگا ——— مگر اس کھلونے کا توڑ دینا ایک لمحہ کا کام ہے! (خاموش)

زحاف

میرے ایک مہربان کیفی حیدرآبادی جو اس وقت دارالترجمہ کے مصحح ہیں ایک روز کچھ عروض میں مجھ سے بحث کرنے لگے اور خاتمہ اُس بحث کا اس پر ہُوا کہ اُنہوں نے ایک عنایت نامہ مجھے لکھا جس میں زحاف کے متعلق میرے قول کو اُنہوں نے تمام عروضیوں کے خلاف قرار دیا میں نے اُس کا جو کچھ جواب لکھا ہے کہکشاں میں درج کرنے کے لئے بھیجے دیتا ہوں ✦

شفیقی مکرمی۔ دارالترجمہ میں ذکر یہ ہوا تھا کہ زحاف کیا چیز ہے آپ نے کہا کہ ہر تغیر کو زحاف کہیں گے۔ میں نے گزارش کی کہ فارسی کے عروضیوں نے دھوکا کھایا ہے کہ وہ ہر تغیر کو زحاف کہتے ہیں۔ ورنہ زمخشری و ابن عبدربہ و سکاکی وغیرہ جو اساطین فن ہیں ہر تغیر کو زحاف نہیں کہتے۔ آپ نے جبر اذالہ و خرم کو بھی زحاف میں شمار کیا ہے لیکن جو لوگ عرب کے عروض کو سمجھے ہوئے ہیں وہ اذالہ و خرم کو زحاف نہیں کہینگے بلکہ علل میں شمار کرینگے ✦

اذالہ کا علل میں ہونا تو ظاہر ہے کہ اذالہ ضرب و عروض کے سوا کسی رُکن میں نہیں ہوتا اور ضرب و عروض ایسے دو رکن ہیں جن پر بیت کی بنا قائم ہوتی ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ اذالہ اُن تغیرات میں ہے جن پر بیت مبتنی ہوتی ہے۔ سکاکی نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ بیت جس تغیر پر مبتنی ہے وہ علت ہے زحاف نہیں ہے ✦

قول سکاکی:- مِنْهَا مَا یَنْبَنِی عَلَیْهِ الْبَیت فیَلْزِمُ یُسَمّٰی عِلّةً سواءٌ کانَ بالزیادۃِ او بالنقصان . . .

اس فقرہ سے ظاہر ہے کہ اصطلاحِ عرب میں اذالہ علت ہے اُسے زحاف نہیں کہیں گے ✦

اور خرم تو کچھ اَور ہی شے ہے اُس کو علل و زحافات میں شمار کرنا عروضیوں کی اتنی بڑی غلطی ہے جو قابلِ عفو نہیں میں اس پر ایک مفصل مضمون لکھ چکا ہوں جس سے ثابت ہے کہ خرم کیا چیز ہے اسے اہلِ عروض نہیں سمجھے ✦

خیر اذالہ و خرم کو جو آپ نے زحافات میں شمار کیا یہ اُنہیں عروضیوں کی تقلید سے تھا جنہوں نے عروضِ عرب کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اُن لوگوں کی غلطیوں کی میں نے دو ایک مثالیں بھی آپ سے بیان کی تھیں کہ یہ مصرع :- اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ✦ کسی عرب کے سامنے جو عروض سے واقف ہو پڑھ کر دیکھئے وہ یہی کہیگا کہ بحر وافر ہے اور فارسی والے اسے بحر ہزج میں شمار کرتے ہیں یعنی بھیرو بن کو گوڑی سمجھتے ہیں اور یہ مصرع :-

بنفشہ رستہ از زمیں بطرف جوئبار ہا

عرب کا شاعر سُن کر کہے گا کہ بحر رجز میں ہے اور فارسی والے اسے ہزج و رجز دونوں میں شمار کرتے ہیں ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اوزانِ عرب کا صحیح مذاق فارسی کے عروضیوں میں نہ تھا۔ اِن عروضیوں نے لفظ زحاف کے معنی میں جیسا خلط کیا ہے وہ معیار الاشعار کی اس عبارت سے ظاہر ہے (فصل ششم در تغیرات ارکان)

"بعضے بجائے تغیر زحاف گویند

بعضے زحاف تغیرے را گویند کہ در بنا جائز بود و شعر بے آن تغیر نیکو تر بود

بعضے زحاف اسقاط ساکن سبب خفیف را گویند و بس"

پہلے معنے زحاف کے عموماً مشہور ہیں ✦

دوسرے معنے وہ ہیں جو عوام الناس میں اُن کے موزون الطبع ہونے کے سبب سے پیدا ہو گئے ہیں، مثلاً۔ ناسخ قول ہے بجا حضرت میر درد کا ✦ اس مصرع کو سُن کر لوگ کہتے ہیں کہ اس میں زحاف ہے یا جیسے :- حُوران بہشتی را دوزخ بود اعراف۔ اس مصرع کو سُن کر کہہ دیتے ہیں کہ لوٹتا ہے ✦

یہ دونو معنی زحاف کے خلاف اصطلاح خلیل بن احمد ہیں۔ تیسرے معنے وہ ہیں جو اصطلاحِ عرب میں مقرر ہیں بعض سبب خفیف کی تخصیص نہیں کرتے مطلق سبب کہتے ہیں عقد الفرید کی تیسری جلد باب الزحاف صفحہ ۱۳۴ میں ابن عبدربہ کہتے ہیں :-

اعلم ان الزحاف زحافان فزحاف یُسقط ثانی السبب الخفیف و زحاف یسکن ثانی السبب الثقیل و ربما اسقط و لا یدخل الزحاف فی شیءٍ من الاوتاد و انما یدخل فی الاسباب خاصة ✦ زمخشری کا رسالہ کیا ہے چھپا نہیں ہے۔ شاید قسطاس رسالہ کا نام ہے میں اُسے دیکھ چکا ہوں اُس میں بھی ایسی تصریح ہے جس سے نکلتا ہے کہ زحاف ہر تغیر رکن کو نہیں کہتے یہ فارسی کے عروضیوں کا ایجاد ہے اور اُردو میں تو بہت شایع ہے ✦

علی حیدر طباطبائی

کیفی صاحب کی ایک نظم

مشکلے دارم ز دانش مندِ مجلس باز پُرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

دسمبر ۱۹۱۸ء کے کہکشاں میں پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی نے حضرت مولانا طباطبائی کی دو نظموں پر بعض اعتراضات کئے ہیں اور بزعم خویش اپنے کامل الفن ہونے کا اظہار کیا ہے۔ ہمیں بھی جناب کیفی صاحب ہی کی طرح اس بات پر تعجب ہے کہ جو لوگ فن کے قواعد و ضوابط پر بہت زور دیتے ہیں وہ خود کیوں ان پر عمل نہیں کرتے۔ کیفی صاحب نے مولانا طباطبائی کی نظموں پر جو اعتراضات کئے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قیود فن کی پابندیوں میں حد سے زیادہ محتاط ہیں اور عیب خفی بھی اُن کے نزدیک جلی اور قابلِ اعتراض ہے۔ لیکن اگر موصوف کے کلام بلاغت نظام کو بھی اسی معیار پر کسا جائے تو افسوس ہے۔ کہ نتیجہ خلاف اُمید نکلتا ہے :۔

معزز رسالہ مخزن ماہ جنوری ۱۹۱۹ء میں کیفی صاحب کی ایک نظم "طلوع سحر" چھپی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ نظم نہایت کمزور، پھُسپھُسی اور طفلانہ ہے اور اس میں بہت کم اشعار نشست کے لحاظ سے اچھے کہے جا سکتے ہیں۔ پہلا بند فرماتے ہیں :۔

تھا دُور ایک منزل ابھی لشکرِ سحر
سرہنگِ شب نے بھانپ کے دی ارض کو خبر
شبنم کے قاصد آئے غباروں میں بیٹھ کر
ان سے صبا نے سُن کے کیا تار مشتہر
سرگوشیاں تھیں غنچوں میں ہے کس کا انتظار
جو رایتِ شفق ہوا مشرق میں آشکار

پہلے مصرعے میں "ابھی" کا الف نہایت بُری طرح دبتا ہے۔ عروض کے قواعد سے اس کا جواز تو جھٹ آپ نکال کے رکھ دینگے۔ لیکن اس کے غیر فصیح ہونے میں آپ کو بھی کلام نہیں ہو سکتا چنانچہ مولانا طباطبائی کی نظم آہ سرد پر اعتراض کرتے ہُوئے آپ نے لکھا ہے کہ "مولانا بڑے جابر ادیب ہیں۔ جہاں الف نے سرکشی کی کہ آپ نے گوشمالی فرمائی"۔ آپ بھی کچھ کم جابر نہیں ہیں بلکہ نظم "طلوع سحر" تو اعلان کر رہی ہے کہ صرف الف ہی نہیں بلکہ سب حروف آپ کے دست ستم سے نالاں ہیں :۔

اسی بند کے تیسرے مصرعے میں "آئے" کا الف گرا دیا۔ پانچویں مصرعے میں "غنچوں" کو "غنچ" کر دیا۔ چھٹے مصرعے میں "ہُوا" کا الف کھا گئے +

دُوسرے مصرعے میں "ارض" کا لفظ تنہا استعمال کیا ہے اسے فصحا بالکل جائز نہیں رکھتے۔ اگر عطف یا اضافت کے ساتھ آئے۔ تو مضائقہ نہیں +

"اُن سے صبا نے سُن کے کیا تار مشتہر" یہ تار کیا تھا؟ ریوٹر کا تھا یا ایسوسی ایٹڈ پریس کا؟ بہتر ہے کہ یہ بھی کھُلا کہ تار کا مضمون کیا تھا۔ غالباً سنسر کی قطع برید کی نذر ہُوا ہوگا +

دُوسرے بند میں ایک مصرع ہے :۔

بلبل کی جانب اُس نے جو ناگہ نگاہ کی

"اُس" کا الف قابل ملاحظہ ہے اور "ناگہ" کے تو کیا کہنے۔ تعجب ہے کہ پنڈت برجموہن کو یہ "ناگہ" کیونکر پسند آیا۔ حالانکہ یہ بے دریغ فصاحت کا خون کر رہا ہے +

ایک مصرع فرماتے ہیں کہ :۔

دھویا ہُوا تھا آبِ رُخِ حور سے جہاں

یہ "آبِ رُخ" کی ترکیب ہماری سمجھ میں تو آئی نہیں۔ یا تو آب کا لفظ "آب و تاب" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے

یا "عرق" کے معنوں میں لیکن سلیم المذاق حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دونو استعمال غلط اور کس قدر غلط ہیں ۔

ایک مصرع فرمایا ہے :-

انجم کا آسمان سے ٹھٹکا تھا کارواں

خدا جانے یہ ٹھٹکا کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ٹھٹکا کے معنی رکنا۔ توقف کرنا۔ ٹھیر جانا ہیں۔ لیکن اس مصرع سے اور سیاق نظم سے یہ معنی مفہوم نہیں ہوتے۔ غالباً کھسکنا کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن اس استعمال کی لغویت ظاہر ہے اس فعل سے پہلے "سے" لکھنا بھی خلافِ محاورہ ہے "پر" یا "پہ" لکھنا چاہئے تھا۔ اس عیب کے علاوہ اس مصرع میں تعقید کتنی ناگوار واقع ہوئی ہے ۔

ایک مصرع فرماتے ہیں :-

حاضر پئے سلام ہوئے افسرانِ صبح

کیوں صاحب یہ "افسر" کس زبان کا لفظ ہے۔ فارسی میں تو اس کے معنی تاج کے ہیں۔ اگر جناب نے اسے انگریزی سے حاصل فرمایا تو فارسی قاعدے سے اس کی جمع بنا کر فارسی ترکیب میں منسلک کرنے کا اختیار آپ کو کب سے ملا۔ آپ کی طرح اگر کوئی شخص ڈپٹی کمشنرانِ صبح۔ گورنرانِ صبح۔ ڈائرکٹرانِ صبح لکھ دے تو کیا یہ گنگا جمنی ترکیبیں جائز ہونگی؟

ایک شعر ملاحظہ ہو :-

فوجِ شعاع کی ہوئی آمد کی جب کہ دھوم

تو ہو گیا فلک سے ہوا لشکرِ نجوم

"فوجِ شعاع کی ہوئی آمد کی" فصاحت بلاغت دونو بہنیں کیفی صاحب کے اس لاڈلے مصرعے کی چٹ چٹ بلائیں لے رہی ہیں۔ ایک تو اس قدر طفلانہ تعقید دوسرے "جبکہ" کی شستگی نے تو مار ہی ڈالا مصرع ہے یا نقائص کی پوٹ۔ کیا "کہ" کے بغیر گزارہ نہ ہو سکتا تھا یا اہل زبانوں کو زبان خراب کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے؟

اس شعر کے مصرع کے شروع میں "تو" حرف جزا کا اس طرح بروزن فع آنا نہایت غیر فصیح ہے۔ فصاحت اس امر کی مقتضی ہے کہ "تو" حرف تا سے مفہوم کی صورت میں نظم کیا جائے لیکن پنڈت کیفی صاحب کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت صاحب نے فصاحت کی مخالفت پر خوب کس کے کمر باندھی ہے :-

(۱) تو ہر کلی کی آنکھ وہیں چٹ سے کھل گئی

(۲) تو ہو گیا فلک سے ہوا لشکر نجوم

(۳) تو دوڑ کر لیا وہیں اُن کو اُفق نے چوم

شعر میں حرفِ علت یعنی الف۔ واو اور یے کا تقطیع سے گرنا ہر حالت میں غیر فصیح ہے۔ اگرچہ ہندی الفاظ کے معاملے میں اس قاعدے کی پابندی فنِ سخن کے رُو سے اتنی سخت نہیں لیکن فارسی اور عربی الفاظ کے آخری حروف علت کا گرانا قطعاً ناجائز ہے اور اس غلطی کا واقع ہونا شاعر کے عجزِ طبع پر دلالت کرتا ہے کیفی صاحب کی نظم میں ہندی اور فارسی الفاظ میں اس نقص کے وارد ہونے کی مثالیں ملاحظہ ہوں :-

(۱) سرگوشیاں تھیں غنچوں میں ہے کس کا انتظار (اردو)

(۲) جو رایتِ شفق ہوا مشرق میں آشکار "

(۳) شبنم کے چھینٹے دے کے چمن کو جگا دیا "

(۴) شبنم کے موتی سبزۂ خوابیدہ پر پڑے "

(۵) نکلا جو خیمے سے شہِ گیتی ستانِ صبح "

(۶) اک دم میں شب کی تیرگی کافور ہو گئی (فارسی)

ہم نے اس نظم پر محض زبان اور فن کے اعتبار سے نظر ڈالی ہے اگر مضمون کے تسلسل تخیل کے لحاظ سے اس نظم پر تنقید لکھی جائے تو ہمارا خیال ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں سب سے زیادہ بے معنی اور اُلجھی ہوئی نظم "طلوعِ سحر" ہی قرار پائے گی ۔

ہمیں تو اس نظم کے عنوان میں بھی شبہ ہے "طلوعِ سحر" کی ترکیب ہی غلط ہے عربی میں بھی اور فارسی اُردو میں بھی "طلوع" آفتاب کے لئے آتا ہے سحر کے لئے نہیں لکھا جاتا اگر اسی طرح کوئی غروبِ شام بھی لکھ دے تو کس قدر مضحکہ ہو گا۔

ہمارے دل میں جناب پنڈت برجموہن صاحب کیفی دہلوی کا بیحد ادب و احترام ہے اور یقین کرنے کو ہمارا جی نہیں چاہتا کہ "طلوعِ سحر" کیفی صاحب جیسے

بیدل

میرزا عبدالقادر بیدل دورِ آخر کے اُن فارسی شعرا میں سے ہیں، جنہوں نے بجائے مقلد ہونے کے مخترع ہونے کا فخر حاصل کیا، اور اپنی جدت تخیل، اپنے نزاکت خیال سے اپنے کلام اور رنگ کلام کو متقدمین سے اس قدر علیحدہ کر لیا کہ ان کا اسلوب بیان بجائے خود اک اختراع مستقل ہو گیا اور ان کا طرز انشا، اک بدعت حسنہ، اُنہوں نے اپنی سحر طراز طبیعت سے ایسی نکتہ نوازیاں اور وہ وہ مضمون آرائیاں کی ہیں کہ مصنف شمع انجمن کو بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے :-

"کلامش شراب میخانہ ہوشیاران است وطلائش دستمائیہ کامل عیاران"

ان کی دقت پسندی اور اُن کے انداز بیان کی پختگی و متانت تقلید کے لئے ایک ایسی سنگلاخ راہ تھی کہ اُن کے بعد کسی اَور کو اُن کے ہم آہنگ ہونے کی جسارت نہ ہو سکی، اور اگر کسی نے کوئی سعی لاحاصل کی بھی تو پایاں کار اسے کہنا پڑا ؎

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

البتہ بعض لوگوں نے ان کے کلام کو ناپسند کیا، اور اس کی اتنی قدر نہ ہو سکی جتنی کہ ہونی چاہئے تھی، لیکن اُس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ اُنہوں نے معمولی معمولی مضامین میں اس قدر بلندی پیدا کی کہ فہم وہاں تک پہنچنے سے قاصر رہ گئی، یا ایک عامۃ الورود خیال کو اس قدر باریک کر دکھایا کہ لوگ اس کو نہ سمجھ سکے، بلکہ تھوڑی سی غلطی خود اُن لوگوں کی بھی ہے، جنہوں نے غور کرنے سے پہلے اس کے مہمل ہونے کا حکم لگا دیا، اور وہ بھی صرف اس خیال سے کہ اُن کا کلام عام پسند نہیں، تنہا اس جرم پر کہ اُنہوں نے اپنے خیالات میں رفعت، اپنے جذبات میں لطافت، اپنے الفاظ میں نزاکت کے بہترین نمونے پیش کئے، اُن کی خوبیوں کو بھی پس پشت ڈال دیا، مولانا شبلی مرحوم بھی اُن سے خوش نہ تھے، کیونکہ شعرالعجم میں اُنہوں نے جس جگہ بیدل کا تذکرہ کیا ہے وہاں تخیل کی بے اعتدالی کا مُرقّع پیش فرمایا ہے اور کہیں اُن کے شعر کی کوئی خصوصیت اُن کے بیان کی کوئی جدت اُن کی ترکیب کی کسی ندرت کا اظہار نہیں کیا، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ مولوی شبلی صاحب مرحوم نے اعتراض کیوں کیا تھا۔ سقائم و معائب سے خالی کسی کی شاعری نہیں، اور اگر تلاش کرنے کی محنت گوارا کی جائے تو کوئی شاعر (جن میں مولوی شبلیؒ بھی داخل ہیں) اس سے بری نہیں ہو سکتا۔ لیکن صرف عیب کو دکھا کر ہنر سے چشم پوشی کر جانا اور بقول اُنہیں کے زندگی کا صرف ایک پہلو تصویر کا ایک رُخ دکھانا ظلم ہے، اور ہمیں افسوس ہے کہ اُن کی اس کھُلی ہوئی غلطی کو ہم کبھی نہیں بھُول سکتے، کاش بیدل کی خصوصیات شاعری بھی مصنف شعرالعجم کے قلم کا جولانگاہ بنتی اور وہ بجائے بیدل کی تخفیف کے، خود اپنے صحت مذاق کو ٹھیس نہ پہنچاتے۔

حضرت نیاز فتحپوری مصنف جذبات بھاشا کی سلیم المذاقی کے اوج و عروج اور صحت ذوق کے اندازے کے لئے اُن کی گراں قدر خدماتِ ملکی کافی ہیں جو ملک کے مختلف اخبار و رسائل کے ذریعے سے پبلک کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہیں لیکن اُنہوں نے بھی عرض نغمہ (گیتانجلی) کے مقدمے میں صرف ایک جگہ بیدل کی شاعری پر مختصر ریویو کیا ہے، اور ہمیں معلوم نہیں کس جذبہ سے مغلوب ہو کر اُن کے قلم سے ایک صفحہ رنگین ہو گیا، لیکن یہ بہت ناکافی ہے، اور ضرورت ہے کہ اُن کی تفصیلی رائے ملک کے سامنے آئے کس قدر

افسوس ہے کہ بھاشا کی شاعری کی توضیح و تشریح کے لئے تو اُن کا دل ایسا سخی تھا کہ ایک کتاب کی تصنیف کر دی اور فارسی کے لئے اس قدر بخیل کہ ایک مضمون بھی نہ لکھ سکا۔

ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ نیاز صاحب نے بھاشا کے جذبات کو کیوں اس قدر دریا دلی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کیا، لیکن حیرت اس پر ہے کہ فارسی کے تاثرات کیوں اُنہیں متاثر نہیں کر سکے۔ یقیناً بھاشا کا حق فارسی سے پہلے تھا اور اُن کی یہ تصنیف قابل صد ہزار تحسین و ستائش ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ اب بھی فارسی کے اشعار اُن کی نظر لطف سے محروم رہیں۔

بیدل کے اشعار پر ریویو، عرفی کے قصائد پر تبصرہ، نظامی کی مثنوی پر تنقید، نظیری کی غزلوں پر ریمارک یہ سب اہل ملک و اہل وطن کے لئے اُن کی قابلیت و باریک بینی اُن کی نازک خیالی و ندرت آفرینی کی محتاج ہیں اور زیادہ تر اس لئے کہ زمانہ جس شد و مد کے ساتھ دُوسری زبانوں کو اپنی مادری زبان میں منتقل ہو جانے کی عجلت چاہتا ہے اُسی قدر اہل زمانہ دُوسری زبانوں سے اجنبی اور بیگانے ہوتے جاتے ہیں، ورنہ اس کے بقا و قیام کے لئے اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ دوسری صورتوں میں زینت طبع حاصل کریں، جب اُن کی قدر کی جائے یوں ہی اور اس حالت میں وہ قدر شناسوں کے لئے کیا کم ہے۔

خیر یہ تو ایک گفتگو تھی، جو ہجوم جذبات و تراکم تاثرات کی بنا پر نکل گئی، اصل مبحث بیدل کی شاعری ہے، اور اس کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ وہ بالکل تصوّف تھی، اور فن شعر کے اس صنف کو اختیار کرنے میں اُنہوں نے کوئی اعجوبہ پسندی نہیں کی، لیکن اُس کو نظم کرنے میں جس خوبی و خوش اسلوبی سے کام لیا ہے وہ یقیناً نادر و عجیب ہے مولانا روم، سنائی، عراقی، اوحدی، سحابی سب ہی اپنے متصوفانہ خیالات کو پُر اثر لہجہ اور دلکش و سادہ الفاظ میں نظم کرتے تھے، اور اس میں شک نہیں کہ اس کو کامیاب بنانے میں سب کی مساعی مشکور ہوئیں، اور سب کی کوششوں کو لوگوں نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا، حافظ و سعدی نے بھی شاعری کی اس قسم کو اختیار کیا اور اُنہوں نے بھی اپنے کلام کے لئے ایک عام مقبولیت حاصل کی، لیکن ان سب باتوں کے باوجود بیدل کے اشعار کو اگر صرف اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ اُن کی پرواز کتنی بلند ہے صرف اس لحاظ سے ملاحظہ فرمایا جائے کہ اُن کا خیال کتنا نازک ہے، تو کہ دینا پڑیگا کہ یہ باتیں بیدل کو سب سے ممتاز قرار دے دینے کے لئے کافی ہیں۔

اساتذہ قدیم نے اپنی شاعری کے متعلق عام فہم ترکیبوں کی نمایش سے داد سخن لی لیکن بیدل نے اُس میں ایک خصوصیت پیدا کی، اسلوب بیان میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ ترکیب کی چُست بندشوں کو بھی نمایاں کیا، اور اس طرح اپنے کو ان لوگوں سے علنحدہ کر کے اپنے طرز کے تنہا مالک رہے اور زمانہ کوئی دُوسری مثال بیدل کی پیش نہ کر سکا۔ دیگر اساتذہ نے اپنے مطالب کا اظہار سادے فقرے اور سلیس عبارت میں کیا، مگر بیدل نے اُسی مقصد کے لئے ادق جملے اور پیچیدہ الفاظ تلاش کئے، اور اس جذبہ میں جس کا وہ اظہار چاہتے تھے اس قدر شکوہ اور اتنی بلندی پیدا کی کہ ہم چاہیں تو کہ سکتے ہیں کہ چاندنی راتوں میں وسیع فضائے آسمان پر ایک تیرنے والا چکور ہے جو اپنے نغمہائے خوش تو سُناتا جاتا ہے مگر اپنی رفتار کی حد اور پرواز کا علو نہیں دیکھنے دیتا۔

متقدمین نے اپنے کلام کے لئے جس میدان کو اختیار کیا وہ ہموار، صاف اور سیدھا تھا، لیکن بیدل نے اس عرصۂ دشوار کو تلاش کیا، جسے بحر سخن کا شناور ہی طے کر سکتا تھا، اور اس میں بھی ایسے ایسے باریک رموز اور دقیق نکات دریافت کئے، جس کو سمجھنے کے لئے فکر کی بلندی اور عمق بھی نالاں تھی وہ

ایک نایاب موتی حاصل کرتے تھے، اور اُس کی حقیقت کو لوگوں
کے سامنے ظاہر کر کے دادِ جستجو چاہتے تھے، لوگ اُن کے رفتارِ
خیال کا تعاقب کرتے اور عاجز رہ جاتے تھے، اُن کی رسائی
فکر کا اندازہ کرتے اور خاموش ہو جاتے تھے، غرض ہماری
سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم انہیں کیا سمجھیں، میر آزاد نے اُن کو
جو کچھ سمجھا وہ یہ ہے:-

رسانید پایۂ معنی بآسماں نہم　　بلند طبع شناسد کلام بیدل را

اور خود بیدل اپنے عروج فطرت کے متعلق لکھتے ہیں:-

ز حسد نمے رسی اے دنی بعروج فطرت بیدلی
تو معلم ملکوت شو کہ شوی حریف کلام او

اُن ہی کا ایک مصرعہ یہ بھی ہے:-

سحر مشکل کہ بہ کیفیت اعجاز رسد

اس مضمون میں نہ ہم یہ کہتے ہیں اور نہ اس سے ہمارا یہ
مقصد ہے کہ بیدل کے مقابلے میں تمام متقدمین شعراء کی
توہین کریں، لیکن ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ بیدل کے مرتبے کو
دوسرے شاعروں سے کم کر دیں، ظاہر ہے کہ وہی چیز قابل
قدر ہوتی ہے، جسے لوگ اُس کی حقیقت و ماہیت کا پتہ لگا
کر دریافت کریں اور اُس کو اچھی طرح سمجھ سکیں لیکن اس کے
لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر ایک چیز مشکل سے سمجھ میں آئے یا
اُسے ہر معمولی قابلیت کا آدمی نہ سمجھ سکے تو وہ لغو اور لاطائل
ہو جائے، اگر یہ سچ ہے اور ایسا ہی ہو تو وہ خصوصیات جو اہل
علم کی دستارِ فضیلت کا طرّۂ امتیاز ہوتی ہیں بالکل بیکار ہو کر
رہ جائیں اور اُن کی وہ ساری قابلیت بے سود ہو جو ایک
فرش پر عالم و جاہل کے لئے کوئی حد فاصل نہ رکھتی ہو +

میں اُن کے کلام کے مقابلے میں کسی دوسرے شاعر
کی بلند سنجیوں کو پیش نہیں کرتا، میں اُن کے اشعار کا ذکر
کر کے کسی کی تنقیص نہیں چاہتا، میں تو صرف اُن کے جذبات
کا علو، اُن کے خیالات کی پاکیزگی، اُن کے الفاظ کی نزاکت،
اُن کے فکر کی بلندی کو پیش کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بیدل
بھی ایک ایسا شاعر تھا جس کی خصوصیات بے نظیر و بے
عدیل ہیں +

اب ہم کہیں کہیں سے بغیر کسی کاوش انتخاب کے بیدل
کا کلام پیش کرتے ہیں اور اُس کی شاعری پر ایک عمومی تبصرہ
کی کوشش کرینگے و ما توفیقی الا باللہ العظیم +

کلیات بیدل جو عام طور سے دستیاب ہوتا ہے نکات،
چہار عناصر، دیوان و رقعات پر منقسم ہے۔ سب سے پہلے ہم اس کے
نکات ہی کو لیتے ہیں، ہمارے نزدیک بیدل کا سارا کلام صرف
حمد ہے جس میں وہ خدا اور اُس کے مظاہر و آثار، اپنی کم مائگی و
بے بسی کو مختلف طریقوں سے بیان کرتا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجا ست
چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجا ست
دیر از یں غصہ در آتش کہ چہ رنگ است صنم
کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجا ست

یعنی دریا اس جستجو میں بیتاب ہے کہ وہ نایاب موتی مل جائے،
آسمان اس لئے پریشان ہے کہ وہ سورج جس نے عالم ہستی
کو منور کر رکھا ہے پا جائے، دیر اس غصے سے آگ ہو گیا کہ
اُسے آج تک یہ بھی نہیں معلوم صنم کا رنگ کیا ہے، کعبہ اس
وجہ سے رنجیدہ ہو کر سیہ پوش ہو گیا ہے کہ اسے اس کا مسجود
نہیں ملتا، غرض ہر چیز اسی لئے بیچین ہے کہ اُس کو ڈھونڈ
لے جو اُس کے اندر موجود ہے مگر نہیں ملتی، موتی دریا میں
رہتا ہے، دریا کو نہیں ملتا، سورج آسمان پر موجود ہے مگر
آسمان کو دکھائی نہیں دیتا، صنم دیر ہی کے اندر ہے
لیکن دیر کو یہ بھی خبر نہیں کہ اُس کی رنگت کیسی ہے، محراب
کعبے میں ہے مگر کعبہ اُس کو تلاش کرتا ہے، بالکل اسی طرح
جس طرح پر تو ذات باری ہمارے اندر موجود ہے، لیکن ہماری
بصارت اُس کے دیکھنے سے عاجز ہے +

بیان کی خوبصورتی، ادا کا حسن، فکر کی بلندی، اور پھر
اس قدر سریع الفہم انداز میں کہ ہر شخص نہایت آسانی سے

سمجھ سکتا ہے کہ شاعر کا مقصد کیا ہے، اسی لئے وہ ایسی مثالیں پیش کرتا ہے جو ہمارے گرد و پیش اور نظر کے سامنے ہیں، اگر بجائے بحر و چرخ، دیر و کعبہ کے وہ کسی ایسی چیز کا ذکر کرتا جو ہمارے لئے بالکل اجنبی ہوتیں تو یقیناً نہ ہمیں کسی کی بیتابی و سرگشتگی کا یقین آتا نہ غصہ و رنج کا اور نہ اس شعر سے ایسا لطف حاصل کر سکتے، لیکن بیدل نے انہی چیزوں کے ذکر سے ہم کو ارتقائے روحانیت کے مفہوم اصلی یعنی تصوف کے نقطہ نظر سے یہ سمجھا دیا کہ ہم جس چیز کی جستجو میں اپنی کوششوں کو صرف کر رہے ہیں وہ باوجود اس کے کہ ہمارے پاس ہے مگر پھر بھی ہمیں میسر نہیں آ سکتی، اس لئے اس کے حاصل کرنے کی تمام مساعی بیکار ہیں۔ اس کا ثبوت اور اس معمے کا حل وہ اس شعر میں بتاتا ہے:۔

اے سمندر بہ ہوس داغ فروش آتش کو
ماہیان تشنہ بمیرید دم آب کجا ست

سمندر جو ایک کیڑا ہے اور آگ ہی میں پیدا ہوتا ہے اُس سے کہتا ہے:۔

"تو آگ کے لئے بے تاب ہے، لیکن آگ کہاں ہے"

اور پھر مچھلیوں کو مخاطب کر کے اُن کو ہدایت کرتا ہے:۔

"تم پیاسی ہی مر جاؤ، تمہیں پانی نہ ملیگا"۔

حقیقت یہ ہے کہ اسی مفہوم کو اگر وہ کسی دوسرے لفظ میں ظاہر کرتا تو اس میں اس قدر دلکشی و دلچسپی اور ایسا تاثر نہ ہوتا کہ شعر پڑھنے کے بعد ہی اپنی مجبوری و کمزوری، اپنی عجز و ناتوانی کا احساس کر لیتے، اور فوراً سمجھ میں آجاتا کہ اس قادر مطلق کے سامنے ہماری ہستی کیا وقعت رکھتی ہے۔

ان ہی اشعار کو اگر مذہبی بیان میں داخل کر لیا جائے تو وہ راز بھی ظاہر ہو جاتا ہے جو اسلام کی فضیلت کے متعلق ہے کیونکہ وہ اپنے استعارہ میں پہلے بحر و چرخ کا ذکر تمہید کلام کے طور پر کرتا ہے، جس کو سُن کر ہرگز ایک شخص یہ یقین نہیں کر سکتا کہ یہ کوئی مذہبی بات بتانے والا ہے، لیکن تیسرے اور چوتھے مصرعے میں دیر و کعبہ کا تذکرہ کر کے فوراً ذہن سامع کو اسی جانب منتقل کر جاتا ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ بیدل نے پہلے بحر کی بیتابی جو اُس کے تموج سے ظاہر ہے، چرخ کی سرگشتگی جو اُس کی گردش سے نمایاں ہے، بتایا اور ظاہر کیا کہ یہ دونو اپنے مقصود و مطلوب کی جستجو میں بیتاب و سرگشتہ ہیں اور پھر اسی سلسلے میں دیر کو غصے سے "در آتش" اور کعبہ کو رنج میں "سیہ پوش" بتا کر یہ ثابت کیا کہ دیر ایک باطل چیز ہے، مگر چونکہ اُس کو اپنے بطلان کا یقین نہیں ہے اس لئے وہ صنم کے نہ ملنے پر غصے ہوتا ہے، اگر دیر کے نزدیک صنم کوئی قابل احترام چیز ہوتا، کوئی وقعت و عزت رکھتا تو اُسے بجائے غصہ کرنے کے رنجیدہ و ملول ہونا چاہئے تھا، لیکن اُس نے صنم کی قوت کے سامنے اپنے ضعف کو تسلیم نہیں کیا، اس وجہ سے اُس کو غصہ آگیا، کعبہ چونکہ اپنی عجز و کمزوری کا معترف ہے، اسے اپنے مسجود کی حرمت معلوم ہے اس لئے وہ اُس کے نہ ملنے پر غمگین ہو جاتا ہے اور اُس غم کو صرف اپنی کیفیت و حالت سے نہیں بلکہ وضع و لباس سے بھی ظاہر کرتا ہے۔

یہ ہے بیان کا وہ طریقۂ نادر جو بیدل کا مملوک ہے، اور جس نے اس کی شاعری کو حقیقی معنے میں وہ درجہ دیا ہے جس کا بیدل مستحق تھا، اب بالکل ضرورت نہیں کہ اس کی اور تصریح و توضیح کر کے اُن کے اشتیاق و اضطراب کو زیادہ نمایاں کیا جائے۔ خود اشعار کا خمار ایسا ہے جو سرشار بنا دینے کے لئے کافی ہے اور اس میں وہ تمام کیفیت موجود ہے جو اپنے طاری ہو جانے کے بعد ایک عرصہ تک مدہوش بنائے رکھتی ہے۔

مناجات میں ایک موقع پر اپنی بے بسی کا ان الفاظ میں مرقع پیش کرتے ہیں:۔

من و حمد تو ہیہات این چہ حرف ست

شکست دل بچندیں نالہ حرف است

سپندم نالہ در بنیاد دارم

بزیر داغ دل فریاد دارم

اے خدا! میں نے یہ کیا کہ دیا کہ میں تیری حمد بیان کرونگا کیونکہ میرے پاس تو اتنے ناموں کے ساتھ صرف میری شکست دل ہے اس سلئے ظاہر ہے کہ میں عاجز ہوں اور اپنے عجز کا معترف پھر ایسی حالت میں مجھ سے کیونکر ممکن ہے کہ میں تیری ثنا کرسکوں، میں تو سپند نالہ بنیاد ہوں؟ اگر تیری مدح سرائی کے لئے میری زبان میں کوئی جنبش پیدا ہوگی تو اُس کا نتیجہ وہی ایک نالہ ہوگا جس پر میری ہستی کی بنا قائم ہے، اور اُس کے بعد میری وہی حالت ہوجائیگی جو سپند کی ہوا کرتی ہے کہ اُس میں کسی آواز کا پیدا ہونا ہی اُس کے پاش پاش اور فنا ہوجانے کی دلیل ہے۔

بیدل کا مطلب یہ ہے کہ اگر تیری حمد کسی سے کی جاسکتی ہے اور کوئی شخص اس سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے تو اُس کی صورت یہی ہے کہ اپنے آپ کو اسی حسرت میں مٹا دے اور پھر بھی اس کی یہ خواہش کہ وہ تیرے بالا اور برتر ذات کی تعریف کرسکے پُوری نہ ہوگی۔

اس کے بعد وہ اپنی خطاؤں کی بخشش اپنے قصوروں کی معافی، اپنی لغزشوں سے درگزر کی استدعا کرتے ہوئے اپنی شرم و خجالت کا ذکر کرتے ہیں:-

سراپا صفحۂ خجلت نگارم

بھر رنگے کہ ہستم شرمسارم

بکوہم گر رساند سر کشیدن

ہماں چوں نالہ پنہانم ز دیدن

حبابم محو طوفانِ خم و پیچ

کہ یک دریا بنالم تا شوم ہیچ

برنگے گر رسم گلشن فروشم

نمے گر نقش بندم بحر جوشم

سر سے پیر تک میں ایک صفحۂ خجالت نگار یعنی اپنے انفعال اور اپنی پشیمانی کا خود ہی مظہر ہوں، اور جس رنگ میں بھی ہوں شرمسار، پھر اس کی وجہ بتاتے ہیں کہ اگر میں سرکشی کر کے کسی بلندی تک پہنچ جاتا ہوں تو بھی اس نالہ کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا جو غیر مرئی ہے اس لئے اگر میں ایسی کوشش بھی کروں تو اول تو وہ بے سود ہے اور دوسرے اُس کا نتیجہ ہی کیا نکل سکتا ہے، اسی کو اور واضح کرنے کے لئے وہ ایک مثال دیتے ہیں کہ میں تو طوفان کے خم و پیچ میں ایک حباب ہوں جو دیکھنے میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا دریا اُسی کے نم چشم کا کرشمہ ہے لیکن خود ہی دریا یعنی اُسی کا اثر سرشک اُس کو فنا کر دیتا ہے، پھر اس بےکسی کی حالت میں بھی اگر مجھے تیری ثنا گستری کا کوئی حصہ مل جائے اور میں کوئی نم اس دریا کا حاصل کرلوں تو اُس پر گلشن کے گلشن نثار کرکے اُس میں ایسا حقیقی رنگ پیدا کروں کہ دریا کی طرح میری ہستی بھی طوفان مسرت سے لبریز ہوجائے۔

اس کے بعد وہ اپنے خدا سے انصاف چاہتے ہیں:-

بداد این بہستی متہم رس ۔ نوائے ہستی بفریاد عدم رس

اے میرے مالک لوگ مجھے وجود کی تہمت لگاتے ہیں حالانکہ میں عدم ہوں ہستی تو تو ہے اس لئے عدم کی یعنی میری فریاد کو پہنچ اور انصاف کر، اپنے کو وجود سے متہم بنانا خدا کو ہستی سے تعبیر کرنا اور پھر خود کو عدم کہ کر وجود سے داد چاہنا بیدل کا خاص انداز بیان ہے اور یہ اس جذبۂ شیفتگی و محبت کو ظاہر کرتا ہے جو خدا کے ساتھ اُنہیں ہے، اس کے بعد وہ اس حیرت کو ظاہر کرتے ہیں کہ تو تو میری آغوش میں ہے لیکن جدائی کا داغ میرے سینے سے جدا نہیں ہوتا اس لئے اگر تو اس پردے کو بھی اُٹھا دے تو کیا ہو:-

تو در آغوش و من داغ جدائی۔

چہ باشد گر بروں زیں پردہ آئی

اور اسی کے بعد وہ اس پردے کا ذکر کرتے ہوئے جو خود

اُن کی ذات ہے :-

زجیب من بروں آ لیک بے من
زمن تا چند پنہاں باشی اے من

یعنی تو مجھ سے باہر آ۔لیکن اس طرح کہ میں تیرے ساتھ نہ ہوں، گویا میں خود تیرا پردہ ہوں اور تو مجھ میں ہی چھپا ہے اس لئے مجھ سے علیحدہ ہو کر آئے میں آجا کیونکہ تو مجھ میں کب تک چھپا رہیگا ؎

"آئے میں" وہ لفظ ہے جس سے بیدل نے خدا کو مخاطب کیا ہے اور ممکن ہے کہ اس سے ظاہر بین نگاہیں کچھ اور سمجھیں لیکن وہ لوگ جن کی نظروں میں حقیقت جلوہ گر ہے سمجھ سکتے ہیں کہ اس شعر کے لکھتے وقت ان پر کس کیفیت کا غلبہ اور کون سا جوش محبت تھا جو اپنے کو خدا سے جدا کوئی دوسری چیز نہیں سمجھتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اُن تاثرات کی تشریح قلم اور زبان سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے سمجھنے کو تو وہی لوگ چاہئیں جو حقیقت کو صرف حقیقت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اسی مسئلہ کو غالب نے بھی لکھا ہے :-

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

لیکن اس میں اس قدر تعمیم ہے کہ تخصیص نفس انسانی جو اصل مقصود ہے گم ہو گئی، غالب کہتے ہیں کہ تو محرم نہیں ہے، ہر چند محرم نہ ہونے کی علت یہی ہے کہ اُس کا وجود ایک حجاب ہے لیکن شعر کو سننے کے بعد ذہن بجائے اپنے نفس کی طرف رجوع ہونے کے دوسری چیزوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کو انہوں نے اس مصرعہ میں بیان کیا ہے :-

"یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا"

مگر بیدل نے براہ راست اپنے نفس اور حجابات نفس کا ذکر کر کے وہ تعلق بھی جو ایک صوفی کے نقطہ نظر سے مابین خالق و مخلوق قائم ہے ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایک انسان ان حجابات کو کیونکر دور کر سکتا ہے۔ غالب کا شعر اس باب میں بالکل ساکت ہے ؎

اب اگر شاعرانہ نصب العین کے لحاظ سے غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس نظم کا ایک ایک نقطہ ایک مناسب نگینہ ہے جو جڑ دیا گیا ہے اور جس کو اُس کی جگہ سے ہٹانا ایک کھلی ہوئی بدنمائی پیدا کر دیتا ہے۔ مناجات میں اصل چیز جو سامع کو متاثر کر سکتی ہے زبان کی روانی اور بیان کی سلاست ہے اور اسی کو اظہار تاثرات کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے، چنانچہ اس مناجات میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے، دل کو داغ تعبیر کر کے فریاد مجسم قرار دینا، اُس کے لئے کوئی تشبیہ کوئی طریقہ بیان کوئی استعارہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا کہ اُس کو سپند نالہ بنیاد کہہ دیا جائے۔ لفظ بنیاد سے جیسا صحیح مفہوم سپند کی ہستی اور اُس کے صرف کا ادا ہوتا ہے دوسرے لفظ سے ناممکن ہے۔ خاص لفظ اس شعر میں زیر ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے کبھی سپند کو آگ میں ڈال کر بیقرار کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جس وقت وہ چٹختا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز ایسی اندر سے نکلی جس نے سپند کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

حبابم محو طوفان خم و پیچ کہ یک دریا بنالم تا شوم ہیچ

یہ شعر اس نظم کے نازک ترین اشعار میں سے ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ عبرت کا ایک بڑا ذخیرہ اس کے اندر پنہاں ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں دریا جو حباب ہی کے آنسوؤں کا نتیجہ ہے خود اپنے اندر اس قدر خم و پیچ رکھتا ہے کہ اسکا ایک طوفان حباب کی ہستی کو فنا کر دیتا ہے، اس میں صرف تخیل کی نزاکت نہیں ہے بلکہ یہ ایک درس ہے کہ انسان جس کا وجود حباب سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا، دُنیا میں مختلف چیزیں پیدا کرتا ہے۔ اپنے راحت و آرام، اطمینان و مسرت کے لئے وہ ہزاروں اسباب فراہم کرتا ہے، اور کائنات جو اُسی کی کوشش و محنت سے ظہور پذیر ہوئی اپنے واقعات و حوادث میں مبتلا کر کے اُسے

فنا کر دیتی ہے، اس مسئلہ میں اگر وسعت پیدا کر کے طوالت دی جائے تو صفحے کے صفحے بھی اس مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر رہینگے جس کو بیدل نے سمیٹ کر اس قدر مختصر کر دیا ہے کہ وہ ایک شعر میں ادا ہو گیا ہے +

یہ ہے بیدل کی قادر الکلامی اور وسعت نظر کہ اپنے طویل سے طویل مقصود کو چند الفاظ میں بیان کر کے اس سے زیادہ لطف پیدا کرتے ہیں جو ایک طویل عبارت میں ہوتا ہے

پھر اس مسئلہ کو کہ ہم ذات باری کے وجود کی کنہ حقیقت دریافت کرنے کی ایک سعی نامشکور کرتے ہیں۔ ان پاکیزہ الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

بیدل آں گوہر نایاب سراغ
بہ محیطے ست کہ پرسیدن نیست

اے بیدل تم جس کی ماہیت و اصلیت کو دریافت کرنا چاہتے ہو وہ ایسے بحر ناپیدا کنار ایسے محیط میں ہے جس کی تہ تک تمہارا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا، اس لئے تمہاری یہ کوشش کہ اس کا پتہ پالو بیکار اور فضول ہے۔ اسی کو مثال کے ذریعے سے واضح کر کے ناکامی کا یقین دلا دیتے ہیں کہ:-

عکس افتادہ در آئینہ ہوش
گل تو ان گفت و لے چیدن نیست

یعنی وہ تو ایک عکس ہے جو آئینہ ہوش میں نمایاں ہوتا ہے لیکن اگر تم یہ چاہو کہ اس کو توڑ لو تو ناممکن ہے، ظاہر ہے کہ کسی آئینہ میں اگر پھول کا عکس پڑے تو ہماری بصارت صرف اسے محسوس کر سکتی ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اسے توڑ بھی لیں اس لئے کوئی ایسی سعی کرنا جس کے نامشکور ہونے کا یقین ہے بالکل حرمان کی مرادف ہے، غلطی ہے، ہم کو تو مجبور و معذور سمجھ کر اس کوشش سے جس کا مآل ناکامی ہے دست بردار ہو جانا چاہئے، پھر کہتے ہیں:-

نسخہا در بغل و فہم محال
جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست

اس کی صورت بھی یونہی ہے یعنی مظاہر و آثار پر اپنے قیاسات کو ہم کام میں لاکر یہ خیال تو کر سکتے ہیں کہ وہ ہمارے پاس اور ہماری بغل میں ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا ہمارے پاس ہونا، اس کے جلووں کا نظروں میں رہنا ہمارے لئے کچھ مفید نہیں ہے، اس لئے کہ نہ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں +

اس موقع پر انسان کی وہ تمام مجبوریاں پیش نظر ہو جاتی ہیں جو اس کو خالق کے مقابلے میں ہیں۔ اور وہ یقین کر سکتا ہے کہ وہ اس قدر عاجز و ناچار ہے کہ ایک چیز کو دیکھتا ہے لیکن چھو نہیں سکتا، ایک چیز اس کے پاس ہے، لیکن سمجھ نہیں سکتا۔ پھر یہ کیسی بیکسی و بےبسی ہے۔ کیونکہ اگر ہم صبر کر سکتے ہیں تو کسی ایسی ہی چیز کے حصول پر جس کو ہم سمجھیں کہ مل ہی نہیں سکتی۔ مگر وہ چیز جس کو ہم دیکھ لیتے ہیں اور پھر خیال کرتے ہیں کہ یہ ملے گی نہیں تو اس وقت ہمارا کیا حال ہوتا ہے +

بیدل جس طرح غزل، نظم، مثنوی، مناجات، وغیرہ میں اپنی جدت طرازیوں کی سحرکاریاں رمز شناسان شعر و سخن کے سامنے پیش کرتے ہیں اسی طرح واقعات کو جب منظوم کرتے ہیں تو اپنی ندرت ترکیب، انداز بیان، سلاست زبان، چستی بندش نزاکت تخیل کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے چنانچہ ایک حکایت کہتے ہیں:-

دید پروانۂ شرر وطنے — شعلہ جوشے بسیر انجمنے
داد برباد نسخۂ پرواز — بردہ چوں اشک سر تحبیب گداز
جائے آتش بفرق خاک فگن — کردہ شمعے بہ سامنے روشن
یک قدم حیرت و ہزار روش — داشت یک بال و صد ہزار تپش
ہر طپش صد جنوں چراغانش — ہر نفس صد ہزار طوفانش
نیمہ و داغ نیمہ خاکستر — آتش نا شکستہ رنگ اثر

یہاں تک تو پروانہ کی صرف اس کیفیت کا اظہار ہے جو شمع کے سامنے اس پر طاری تھی، لیکن غور طلب یہ امر ہے

کہ بیدل نے اس حالت کو کن الفاظ میں بتایا ہے۔ سب سے پہلے شرر وطن کا لفظ دیکھئے جو بہ لحاظ ندرت ترکیب و شدت شوق اُن کے اختراعات فائقہ میں شمار کیا جاتا ہے پھر پروانہ کے گدازکا حال سنئے کہ وہ کس درجہ منہمک ہے۔ اور اس انہماک کو سنر عجیب گداز کی ترکیب نے کس درجہ سخت و پُر اثر بنا دیا ہے۔ اس وقت اُس کا لُطف آور دوبالا ہو جائیگا۔ جب اس خیال کے ساتھ مشبہ بہ یعنی اشک کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور پھر پروانہ کی حالت پر نگاہ کی جائے کہ اپنے گداز کے لحاظ سے وہ ایک آنسو تھا جو ٹپک پڑا جسکی تشریح وہ دُوسرے مصرعہ میں ان لفظوں کے ساتھ کرتا ہے، کہ اپنی ہستی کو جو صرف ایک پرواز تھی خاک میں ملا دیا، ذکر گداز کے بعد سوز و نتیجہ سوز کی کیفیت بتلاتا ہے کہ اُس کے پر نہیں تھے بلکہ وہ تو ایک دامن تھا جس کے اندر شمع روشن تھی ایسی شمع جس کے نور کا انعکاس پروانہ کی خاک سے ہوتا تھا پھر بیدل نے اس کی بے بضاعتی کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ صرف ایک پر رکھتا تھا مگر اُس کی تپش کا یہ عالم تھا کہ اُس میں صد ہزار بیتابیاں ظاہر ہوتی تھیں، وہ حیرت کا صرف ایک قدم رکھتا تھا لیکن اُس میں ایک دُنیائے رفتار مستور تھی اور اسی کے ساتھ دُوسرا شعر "ہر نفس صد ہزار طوفانش ✦ ہر تپش صد جنوں چراغانش" لکھ کر اُس کی بیتابیوں اور بےچینیوں کا وہ مرقع پیش کیا ہے جس میں پروانہ کا شوق، اُس کا اضطراب اور ہر وہ حالت جو شمع کے سامنے اُس پر گزر جاتی ہے صاف صاف معلوم ہوتی ہے، اور اُس کے ساتھ ہی اس کی جانبازی اور جنون ادائی کا وہ نقشہ بھی پیش ہو جاتا ہے جس کو دیکھ کر پروانہ کا کیف گداز، اُس کی کیفیت طپش، اُس کے حالات عجز اسی طرح نمایاں ہو جاتے ہیں جیسے واقعی سامنے ایک شمع روشن ہے اور اُس کے گرد پروانہ ہجوم جذبات سے یکسر اضطراب بن کر اپنی فداکاری کا ثبوت دے رہا ہے اور وہ لوگ جو اس کی اس حالت کا بہ نظر تعمق مطالعہ کر رہے ہیں اپنے اندر بھی وُہی خلش اور وُہی درد پاتے ہیں، خاص کر آخر میں الفاظ کہ وہ ایک آگ تھا ایسی آگ جس نے ہنوز اپنے رنگ اثر کو نہ چھوڑا تھا اور اس نہ چھوڑنے کو "نیمہ و داغ نیمہ خاکستر" کہ کر ثابت کرنا بیدل کے کمال خصوصی کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کے اعتراف کے لئے مجبور کرتا ہے کہ اُنہوں نے اس کیفیت تاثر سے اس وقت اثر حاصل کیا ہے جب پروانہ شمع کے سامنے اُس کے ایک رنگ جلوہ پر اپنی جان کو تصدق کر رہا تھا، وہ اس اثر کو جو ان پر طاری تھا اپنی حکایت کے دیکھنے اور سننے والوں میں منتقل نہ کر سکتے، یہ ہے تکمیل شاعری اور تخیل کا علو کہ شاعر نے جس چیز کا ذکر کیا ہے اُس کی ساری حالت و کیفیت بھی پیش نظر ہو گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ واقعی شمع کے سامنے ایک پروانہ کی یہی حالت ہوتی ہے اُس کے آگے لکھتے ہیں:۔

گفت اے آشیاں طراز فنا ✦ یک پر افشاند از تو با عنقا
چہ فزدن دمید ز اندازت ✦ کہ طپش می چکد ز پروازت
چہ تحیر گرفت دامانت ✦ کہ نگہ ریخت رنگ مژگانت

پہلے شعر میں "آشیاں طراز فنا" کی ترکیب بیدل کی خصوصیت ہے اور اس انداز سے ایسے پیرایہ میں سوال کرنا بھی اُنہی کا حصہ ہے ✦

تیرے انداز میں ایسی کون سی فسردگی ظاہر ہوئی، جس نے ہر پروانہ کو ایک طپش بنا دیا؟ کس حیرت نے تیرا دامن پکڑ لیا کہ تیری آنکھیں رنگ مژگاں ٹپکانے لگیں؟ وُہی سوال کا جواب پروانہ دیتا ہے۔ لیکن پروانہ کے جواب دینے کو اس لئے ظاہر کیا کہ:۔

عجز طاقت نداشت سود کفے ✦ داد خاکستر سراغ تفے

پروانہ کے جواب دینے کو اس لئے ظاہر کرتا کہ خاکستر نے یہ سراغ تف دیا۔ بیدل کا حصہ ہے۔ اس کے آگے اس جواب کی تفصیل ہے:۔

کہ ازیں شعلہ تا بہ ہیچ مپرس ✦ ہمہ داغم ز داغ ہیچ مپرس

بہ فتون ہوس گداختہ ام — نقد فرصت زدست باختہ ام
دو شم از اقتضاے بیتابی — سوختن نو صلاے بیتابی
شب چو آئنہ تماشا بود — در نیرنگ امتحاں وا بود
جوش پروانہ داشت بے ذہال — بشرر چشمک ازفشاندن بال
من بحکم جنوں ادائیہا — کردم انداز خود نمائیہا
گفتم آب رُخ برم زگداز — خاک کردم بجہد تامل باز
داغہا گل کنم بہ آں ناموس — کہ زپروانہ واکشم طاؤس
بہ ہوس شعلہ عشق سر گیرم — بال از موج شعلہ بر گیرم
[illegible] بفرصت سر کش — ما ببال گیر ز نم آتش
باہماں بال سوخت پروازم — بر ہماں رشتہ ختم شد سازم
حکم طاقت دگر نبردم پیش — داغ گشتم ز خامکاری خویش
آں فضولے بگردنم پیچید — بال دیگر وبال من گردید
بعد ازیں تا رہستیم رمق است — پرفشانی چکیدن عرق ست
نہ زشمع و نہ از لگن داغم — بعذاب نسوختن داغم
آتشم مردہ است و من بخیال — دامنے میزنم بایں تمثال
از طپش روز بر جنوں آرم — شاید آتش زخود بروں آرم

میں تو سراپا شعلہ ہوں، میرے پیچ و تاب سے سوال کرنا فضول ہے اس لئے کہ یہ تو اُس کی فطرت ہے، اس کے بعد وہ ارتقاے فنا کے دوسرے درجے کا اظہار کرتے ہیں کہ میں تو بالکل داغ ہوں، اور داغ کا دیکھنے والا، داغ پیدا کرنے والے کی حقیقت معلوم کر سکتا ہے، میں کیا بتاؤں اس کے بعد پروانہ نے اپنے ہوس و شوق کا اظہار اور شمع محفل کی جلوہ آرائیوں کا جس نے اُس کو خاک ہو جانے پر مجبور کیا ذکر کیا ہے لیکن اس تذکرہ میں بھی اپنے محبوب کی رعایت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، بلکہ اُس کو خود نمائی سے تعبیر کر کے یہ کہا کہ میں تو یہ چاہتا تھا کہ شمع سے کوئی داغ حاصل کر کے طاؤس بن جاؤں مگر یہ آرزو پوری نہ ہوئی، اور نتیجہ یہ نکلا کہ میں جل کر خاک ہو گیا، یہاں بھی پروانہ نے یہ نہ چاہا کہ اُس کے معشوق کا دامن کسی ایسی نامردی کے داغ سے ملوث ہو جس سے اُس کے جذبات کو ٹھیس لگے اس لئے اُس کا سبب بھی یہی بتایا کہ میری خامکاری اسی کی مقتضی تھی، چنانچہ دیکھ لو کہ میرا عرق انفعال کچھ نہیں ہے مگر میری پرفشانی اور اب مجھ کو سراپا داغ بنا دینے والی نہ شمع ہے نہ لگن، بلکہ خود میرا یہ احساس ہے کہ میں تو اچھی طرح جل بھی نہیں سکا۔ اس لئے میں ہوں اور جنون کی تپش زائیاں وہ بھی اس امید پر کہ شاید خود اپنے اندر سے کوئی آگ ایسی پیدا کر سکوں جو مجھ کو جلا کر خاک کر دے اس کے بعد تین شعر بصورت نتیجہ ہیں:—

کس چو پروانہ دردناک نسوخت — کہ بہ آتش رسید و پاک نسوخت
ہر کجا مدعاے عشق فناست — غیر تعجیل ہرچہ ہست خطاست
نقد جنسے کہ ما و من دارد — ہمہ یکبار سوختن دارد

اس وقت تک تو بیدل کے ان اشعار کا ذکر کیا گیا ہے جو حمد و مناجات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب اُن کے رقت قلب، پاکیزگی جذبات اور گداز طبیعت پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ بیدل نے جس رنگ میں بھی اپنی رسائی طبع اور زور فکر سے کام لیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، عشق عاشقی کے حالات بہت قلمبند کئے گئے ہیں لیکن اُن کے بیان میں جو جامعیت ہے اور جس طرح وہ تمام کیفیات پر حاوی ہے، وہ خوب اور بہت خوب ہے۔ لکھتے ہیں:—

عاشقی چیست داغ محرومی — گل خودروے باغ محرومی
یا ستقلم زنگ لیک باختنی — سر بسر بر ولے گداختنی
پنجۂ نا اُمید گیرائی — پیکر فرش ناتوانائی
لب عرضے کہ مژدہ گفتارش — پاے شوقیکہ رفتہ رفتارش
ہمہ پرواز لیک ریختہ پر — مشعلہ اما تمام خاکستر
بہ ہدش اندازہ نارسائی و بس — شورش آہنگ بینوائی و بس
ناامیدی و یک جہاں امید — ناتوانی و کوشش جاوید
ساز موہوم نغمہ زار خیال — کلک تصویر آرزوے محال

دامِ خمیازہ صید دستِ ہوس — صبحِ تہمت شکار کردِ نفس
جوشِ خونے کہ ہیچ رنگش نیست — موجِ آبے کہ نم بہ چنگش نیست
آہ اگر بست ہم بدل افسرد — اشک اگر بود بے چکیدن مرد
قصۂ کوتاہ عاشقی این ست — وائے آنکس کہ عشقش آئین است

اس نظم کے پڑھنے کے بعد دل جن اثرات سے متاثر ہوتا ہے، اُس کو تو وُہی خوب جان سکتے ہیں جنہیں کبھی جذبات اور محبت کے سامنے اپنی جبین نیاز کے جُھکا دینے کا موقع ملا ہے۔ یا جو کسی پیکرِ خلوص کا کوئی درد پرستش اپنے دل میں رکھتے ہیں، لیکن ان کے علاوہ وُہ لوگ بھی جو اُلفت و محبت کی نزاکت کو سمجھتے ہیں، دیکھیں گے کہ پہلے ہی شعر میں عشق کو خود روکہ کر بیدل نے کس قدر فصاحت اور دلکشی پیدا کر کے جذبۂ محبت کے اپنے اندر خود بخود پیدا ہو جانے کے مفہوم کو ادا کیا ہے، پھر یہ کہنا کہ عاشقی ایک رنگ تو ہے، لیکن بافتنی، برتو ہے مگر گداختنی بیدل کا خاص اندازِ فکر ہے، اس کے علاوہ خود اسے ناتوانائی نہ بتانا بلکہ پیکر ناتوانائی لکھنا اس لحاظ سے کہ عشق اپنا ایک وجود ہی الگ اور مستقل رکھتا ہے، ایسا بلند خیال ہے کہ اس حد تک پہنچنا ہر شخص کا کام نہیں۔ غرض اسی طرح اس نظم میں جس قدر اشعار بھی ہیں۔ وہ سب اپنے اندر ایسی جاذبیت رکھتے ہیں کہ خواہ مخواہ دل ان نقوش کو منقش کرنے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے مثلاً عشق کو پرواز کہنا لیکن ریختہ پر، شعلہ لکھنا مگر خاکستر، صنعت تضاد کی وہ بہترین مثال ہے، جسے بظاہر ممکن ہے کہ ایسا اجتماعِ ضدین ناممکن خیال کر لیا جائے، لیکن جن لوگوں کی نگاہوں میں عشق کا صحیح مفہوم ہے وہ وقتِ واحد میں پرواز اور ریختہ پری، شعلہ زائی اور خاکستر اثری کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ایک حالت تو بہ اعتبار شوق کے ہے اور دوسری بلحاظ نتیجۂ شوق۔ بہرصورت بیدل نے عشق کو جن جن ناموں سے موسوم کیا ہے وہ سب اپنے وندر واقعیت و اصلیت رکھتے ہیں، کبھی اُس کی جدکا [illegible] کہیں اُس کی صداؤں کو آہنگ بے [illegible] یک لخت ناامیدی کہ کر ایکبارگی جہان امید کہ دیا وہ سحر طرازی ہے جو عشق کو زندہ رکھنے کی ضامن ہو سکتی ہے۔

اس سے ناظرین کو اندازہ ہو سکے گا کہ بیدل کا حقیقی رنگ کیا ہے اور اُس کی شاعری کا مطمحِ نظر کیا؟ یہ ہم پہلے ہی ظاہر کر چکے ہیں کہ جو کچھ وہ لکھتا ہے یکسر تصوّف ہے اور اُس کا مخاطب صرف ذاتِ باری جس کے جلووں سے بیدل کی ساری ہستی لبریز نظر آتی ہے لیکن کہیں کہیں اس رنگ سے جدا ہو کر جب وہ تغزل کے عاشقانہ رنگ کو اختیار کرتے ہیں تو بھی اُن کے علوِ خیال کا یہی عالم نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً ایک غزل اپنی ارتقائی حالت میں کیا ہے اور صحیح معیارِ تغزل کا کیا ہونا چاہئے انشاء اللہ ہم دوسری قسط میں اِن کی غزلیات پر تبصرہ کرینگے اور بہ حیثیت نثّار ہونے کے بھی بیدل کا جو مرتبہ ہے ظاہر کرینگے۔

بچّے کا تبسّم

موسمِ سرما کی شاندار سہانی دُھوپ کی مانند۔ نئے چاند کی لطیف شعاعوں کی طرح میرے بچے کے چہرے پر خوشی کا کیسا نازک سا طوفان اُٹھا ہے۔

"کائنات اس کی بشاشت اور بے فکری کو مستعار مانگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے" اس کو دیکھنا ایک سکون و اطمینان کے خواب کو دیکھنا ہے۔ بےچینی۔ تفکّرات اور رنج و غم سب یوں رخصت ہو جاتے ہیں جیسے غیر محسوس طور پر سورج کی روشنی رات کی تاریکی پر مسلّط ہو جاتی ہے۔

اگرچہ طوفان اُٹھ رہے ہوں۔ مگر جب زندگی کی لہروں پر اس قوس و قزح کا عکس منعکس ہو تو کیا تردّد ہے؟

تاج

انکشافاتِ محبت

اُن کے دیدار سے آنکھوں کو منوّر، اور اُن کی باتوں سے دل کو مسرور کرنا تو اَور بات ہے، مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی دوسری نگاہ ایک سانحہ کو بھی غازۂ رُوے زیبا بن سکے یا غبارِ جلوۂ گریزپا ــــ مگر میں یہ کیا جانتی تھی کہ میری سہیلی جو مجھے بار بار لکھتی ہے کہ "انہیں کبھی کبھی میری طرف بھی بھیج دیا کرو"، تو اس درخواست کے نتیجہ تعمیل میں بھی میرے لئے کوئی تلخ کامی چھپی ہوئی ہے یا الم نصیبی۔

میں نے اُن سے کہ دیا، اور فراخ دلی سے کہ دیا کہ "میری سہیلی کی آرزو پوری کرو" کیونکہ میں حقیقت میں اُسے آرزو نہیں، بلکہ ایک احسان سمجھتی تھی، میں یہی سمجھتی تھی کہ اُس کے پیام میں میری دلجوئی شامل ہے اور اُس کی محبت کا ثبوت۔

ہاں! تو ایک صبح میں نے اُن سے کہ دیا کہ "میری سہیلی کی آرزو پوری کرو" اور دوسری صبح میں نے پوچھا "گئے تھے اُدھر؟" وہ بولے "نہیں" میں نے پھر تاکید سے کہا کہ "ضرور جاؤ اور ہر دوسرے تیسرے روز جایا کرو"۔ تیسری صبح پھر میں نے پوچھا اور پھر اُنہوں نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے ذرا برہمی سے کہا "کیوں نہیں جاتے وہ! وہ میری محبت سے تمہیں بُلاتی ہیں اور تم ناز کرتے ہو میرا کہنا بھی نہیں سُنتے۔ یہ دیکھو تین دن کی مدت میں میری سہیلی مجھے چار خط بھیج چکی ہیں، یہ سب تمہاری طلب میں ہیں، آج ضرور جانا اور چھ بجے شام کو جانا، آج والے خط میں یہی وقت اُنہوں نے مقرر کر دیا ہے، سُنا"! ــــ "اچھا میں جاؤں گا"۔ اُنہوں نے کہا "مگر تم سے بھولتا نہیں کہ میں تمہارے اصرار سے اُن کے یہاں جانے پر آمادہ ہوتا ہوں"۔ ہاں! بھولنا نہیں۔ اچھا! ــــ

اِس کا کیا مطلب ہے، اس کا کیا محل، یاد رکھنے کی اس میں کیا بات ہے، نہ بھولنے کی اِس پہ کیا ضرورت ــــ ان خیالات پر میں، میں اُن کی بات سننے والی ایک سادہ دل لڑکی، ہنسنے لگی، اور خوب ہنسی ــــ "ہنسو نہیں کہیں تمہارے نازک دل کو اس ہنسی کا خمیازہ نہ اُٹھانا پڑے، میں ڈرتا ہوں"۔

اُن کی اس بات پر بھی اعتبارِ محبت اور یقینِ دلجوئی نے جو میں اپنی سہیلی کی طرف سے رکھتی تھی، مجھے کوئی اعتنا نہ کرنے دی ــــ اُن کا وہاں جانا قرار پایا گیا، اور وہ میرے پاس سے چلے گئے ــــ میں بیمار داریٔ دل میں مصروف ہو گئی اور اُن کی تصویرِ خیالی کی پرستش میں۔ یہ پوجا میں ہمیشہ، جب وہ میرے سامنے نہیں ہوتے، تو اپنے دل کے لئے، اپنے بیمار دل کی تسکین کے لئے کرتی ہوں، اور نہیں کہ سکتی کہ دل کو اس سے سکون ہوتا ہے یا اضطراب، مگر تقاضا رہتا ہے اُس کا بھی یہی کہ رہوں میں اسی عبادت میں مصروف، اور میرے لئے بھی آخر کوئی اَور شغل ہے تو کیا۔

چھ بجے شام سے کچھ دیر پہلے میرا دل خود بخود دھڑکنے لگا، گھبرانے لگا، میری آنکھوں میں اک سماں تھا، میں دیکھ رہی تھی کہ میری سہیلی اُن کے سامنے اِک دھڑکتا ہُوا دل لئے موجود ہے اور کچھ باتوں میں بھی مشغول، اور اُن کے ہونٹ بھی کبھی کبھی کھُل جاتے ہیں اور دامن فضا کو پھُولوں سے بھر دیتے ہیں، اُف!

جیسے جیسے یہ نقشہ میری آنکھوں میں اُترتا جاتا تھا، ویسے ویسے میرے سینے میں طوفانِ اضطراب چڑھتا جاتا تھا ــــ اختلاجِ قلب، دل کی بیماری، لگ سکتے ہیں

بہت موذی ہے، ہاں! سیماب خود ہی مضطرب ہے۔ لیکن جب اختلاج کی بنیاد سوزِ عشق پر ہو اُس کی اذیت کی بھی کوئی حد ہے۔ کیا پارہ آگ کا متحمل ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا، پارہ اُڑ گیا اور دُنیا نے جان لیا کہ آتش بنیادی اُس کی فنا انجامی ہے — آہ! مگر میرے دل کی تپش بھی کسی نے دیکھی، دیکھی نہیں تو سنی، کاش اُسے دُنیا سُن ہی سکتی اور پھر تو میں دیکھتی کہ سنگدلی بھی عالم میں کوئی لفظِ بامعنی ہے یا مہمل، بے رحمی کا جہان میں وجود بھی ہے یا فقط نام۔ مگر سنے کوئی تو کیسے اور سنائے کوئی تو کون؟ دل! اسے میرا دل تو بے زبان ہے +

مجھے اس عالم میں انتظار تھا، موت کا بھی اور اُن کا بھی۔ کبھی موت سے پہلے اُنہیں دیکھنا چاہتی تھی، اور کبھی اُن سے پہلے موت کا خیر مقدم کرنا چاہتی تھی۔ مگر نہ موت میرے بس کی تھی، نہ اُن پر قابو، قابو کا کیا ذکر ہے وہ تو مجھے دل پر بھی نہیں، آہ اپنے دل پر بھی نہیں +

اب وہ آئے، آئے تو کچھ اس وجہ سے نہیں کہ میرے قابو میں ہیں، اپنی خوشی سے آئے۔ سامنا ہوا اور وہ لمحہ آیا جس سے پہلے کی کشمکشِ توہمات حرفِ غلط ہو گئی — میں گُم تھی، چپ تھی، زبان خاموش، ہونٹ بند، وہ خود ہی بولے "میں تمہاری سہیلی کے یہاں سے آرہا ہوں، وہ تو بہت اچھی ہیں، میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئیں، میرے سامنے بھی آئیں، اور باتیں بھی کیں" +

میری نظر جو یوں بھی کم جرأت کرتی تھی کہ اُٹھے، اور اُن کے چہرے کی بلائیں لے، اب بالکل جھک گئی، میرا سر چکرانے لگا، دل بہت تیزی کے ساتھ زور سے دھڑکنے لگا، اور چند قیقوں کے بعد آنکھوں نے دل کی ترجمانی کی، وہ زیادہ ٹھیر نہ سکتے تھے۔ کچھ فقرے، جن سے میری تسکین مقصود تھی، کہے اور چلے گئے۔ مجھے روتے روتے کیا ہو گیا، یہ میں بھی نہیں جانتی لیکن جب میں نے آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ اُنہیں مجھ سے رخصت ہوئے تین گھنٹے کامل گزر چکے ہیں، اور ابھی دس گھنٹے پڑے ہیں جن کے بسر کر لے جانے پر منحصر ہے اُن کی دید +

داستانِ درد ہے، افسانۂ الم، وہ ماجرا جو رات بھر میں پیش آیا، خیر! آفتاب طلوع ہوا، اور میرا آفتاب بھی میرے سیہ خانہ میں چمکا +

بہار و خزانِ دل کے کارفرما نے اس وقت نیا گُل کھلایا، کچھ باتیں کیں اور میں پھر رونے لگی۔ مگر ایک تسکین بخش رونا جس کے ساتھ ہی ایک غیر معمولی فرحت مجھے ہوئی کیوں؟ یہ میں نہیں جانتی کیوں +

اب وہ چلے گئے تو میں نے اس دَورِ عروج و زوالِ دل کی تاریخ کو دُہرانا شروع کیا جب اُن کے اِس فقرے پر پہنچی کہ "مُنسو نہیں، کہیں تمہارے نازک دل کو اس ہنسی کا خمیازہ نہ اُٹھانا پڑے، میں ڈرتا ہوں"۔ تو میں اُن کے ملہم دل ہونے پر ایمان لائی پھر آگے چلی تو رفتہ رفتہ وہ بات سامنے آئی جو انہوں نے میری سہیلی کے یہاں سے واپس آکے کہی تھی، اور جس کا اثر میں بیان کر چکی ہوں۔ اِس وقت مجھے معلوم ہوا کہ کانوں سے دل تک بھی ایسا ہی اک برقی راستہ ہے جیسا آنکھوں سے دل تک۔

دیکھوں جو یہ اکتشافات آیندہ کاروبارِ محبت میں کچھ کام کے نکلیں +

مانی جائسی

میں قیودِ معاشرت کی پابزنجیر زندگی سے اُکتا گیا اور قول و فعل کے تقنع نے مجھے عاجز کر دیا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں تہذیبِ معاشری و تمدنی کا سایہ تک نہ پڑا ہو؟ یقیناً وہی گوشہ سب سے زیادہ مہذب کہلانے کا مستحق ہے۔ اس جھوٹی اور بناوٹی دُنیا میں میرا جی نہیں لگتا۔ مجھے وہاں لے چلو جہاں راستی، خلوص اور محبت کی حکومت ہے +

"گمنام"

کلامِ اکبر

بہارِ بے بقا پر ناز کیسا اور خوشی کیسی　　بجا ہے حیرتِ نرگس کہ گُل کی یہ ہنسی کیسی
خلافِ بیخودی کیوں ہے یہ وعظِ حضرتِ واعظ　　خودی ہی کو نہیں سمجھا میں اب تک بیخودی کیسی
خُدا کے ساتھ ہونے کا یقیں مشکل سے آتا ہے　　وگرنہ جب خدا ہی ساتھ ہو پھر بیکسی کیسی
کبھی خوانِ فلک سے کوئی نعمت میں نے چکھی تھی　　مگر یہ بھی نہیں یاد اب کہ لذت اُسکی تھی کیسی
تماشا جہاں اے بے خبر تجھ کو مبارک ہو　　یہاں دل داغِ حسرت سے بھرا ہے دل لگی کیسی

صدائے سروش

صدا آئی سروشِ غیب کی کل گوشِ مُسلم میں　　کہ اے پابندِ زنجیرِ طلسمِ ہیچ مقداری
اسیرِ قیدِ ظلمت خانۂ حرص و ہوا کیوں ہے　　تجھے لازم ہے مثلِ شمعِ محفل شانِ خودداری
تری واماندگی پر آبلہ پائی بھی روتی ہے　　غبارِ کاروان ہے تیری شانِ گرم رفتاری
چراغِ نورِ ارشاد و ہدایت ٹمٹماتا ہے　　مبادا اُس کو گُل کر دے ہوائے چرخِ زنگاری
مسلّط ہے فضائے دہر پر تاریکیِ باطل　　تو نورِ حق ہے کر اطرافِ عالم میں ضیا باری
عیاں آثارِ بیداری ہیں چشمِ اہلِ عالم میں　　تجھے لازم نہیں بالین و بستر کی پرستاری
تزلزل ڈال دے ایوانِ استبداد میں ایسا　　کہ اسکے کام حُریت ہو اس گھر کی نگونساری
تجھے اُمیدِ غمخواری نہ رکھنی چاہئے ان سے　　سکھاتے جن کا مشرب فتنہ پردازی ستمگاری
تجھے احساس بربادئے خرمن ہو تو کیونکر ہو　　کہ احبابِ کرم گستر ہیں سرگرمِ شرر باری
مگر یہ یاد رکھنا چاہئے اُن بدنصیبوں کو　　کہ رُسوائی و خواری ہے مالِ مُسلم آزاری

خدا کو جب کسی کا خاتمہ منظور ہوتا ہے
جہاں میں دشمنِ اسلام وہ مشہور ہوتا ہے

کبھی جانِ چمن تھیں زمزمہ پیرائیاں تیری — قفس میں ہے خموشی آج کل مُہرِ دہاں تیری
تو اس محفل میں وہ ساغر کشِ صہبائے حسرت ہے — کہ ٹپکی خون بن بن کر شرابِ ارغواں تیری
گئے وہ دن کہ تو سرسبز تھا گلزارِ عالم میں — چمن پیرائے ہستی تھی بہارِ بے خزاں تیری
گیا وہ وقت جب تو مہرِ انوارِ حقیقت تھا — جہاں میں تھیں شعاعیں چار سُو پرتو فشاں تیری
کہاں ہے وہ مثالِ برقِ مضطر تلملا جانا — کہاں ہے غیرتِ سیماب وہ بے تابیاں تیری
ہُوا ہے کیوں مثالِ چشمۂ آئینہ بے جنبش — محیطِ بحرِ ہستی تھیں کبھی پہنائیاں تیری
جہاں کو ہند سے ہسپانیہ تک روند ڈالا تھا — سُنے غرناطہ و دہلی سے کوئی داستاں تیری
کہاں تک عظمتِ پیشیں کے افسانوں کو دُہرائیں — کہ تفسیرِ کتابِ غم ہے شرحِ داستاں تیری

عبث ہے ستم زدو ز چرخ لب ریز شکایت ہا
کہ ہست ایں قصہ پارین نمک پاشِ جراحت ہا

الا اے مسلمِ خوابیدہ تا کے ایں تن آسانی — کہ ایامِ کمالِ عیش و عشرت شُد بہ نادانی
میسر اب تجھے کاشانۂ کہنہ نہیں ہوتا — ترے اسلاف تھے زینت طرازِ کاخِ سلطانی
تو ہے شیرازہ بندِ دہر لیکن خود پریشاں ہے — چو کفر از کعبہ برخیزد کُجا ماند مسلمانی
پشیمانی بھی تنہا فائدہ کچھ دے نہیں سکتی — چرا کارے کُند عاقل کہ باز آید پشیمانی
مثالِ ذرّہ کیوں پامال ہوتا ہے بیاباں میں — درخشاں ہو کے حاصل کر وہی خورشید سامانی
اسی میں راز ہے مرموز تیری کامرانی کا — کہ تُو ہو جائے دل سے عاملِ احکامِ یزدانی
خریدار اتنے پیدا کر متاعِ سوزِ الفت کے — کہ جنسِ درد کی بازارِ عالم میں ہو ارزانی
سکونِ خوابِ غفلت دیکھ کر تیرے شبستاں میں — سُناتے ہیں "لسان الغیب" یہ پیغامِ روحانی

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم (حافظؒ)

سُن اے مسلم فغانِ بلبلِ درد آشنا ہو جا — چمن میں غنچۂ گل کے چٹکنے کی صدا ہو جا
گرفتارِ طلسماتِ مجازی کیوں ہے عالم میں — خدا سے مل - فراموشِ خیالِ ماسوا ہو جا
ولائے سرورِ عالم ہے رازِ ہستیِ مسلم — غبارِ راہِ یثرب ہو - نثارِ مصطفےٰ ہو جا
تو قطرہ ہے مگر تجھ میں خواصِ بحر پنہاں ہیں — جہاں میں صورتِ ہنگامۂ طوفاں بپا ہو جا
جہاں میں گر خزاں نا آشنا رہنے کا خواہاں ہے — چمن میں بے تعلق صورتِ بادِ صبا ہو جا
ارے ناداں - تو گلگونۂ رخسارِ ہستی ہے — محبت گل رُخوں کی چھوڑ کر خود دلربا ہو جا
ریاضِ دہر عنابی ہُوا ہے خونِ گلچیں سے — گریباں چاک کیوں کرتا ہے اب رنگیں قبا ہو جا
نہ خوفِ باغباں ہے اب نہ ہے صیاد کا کھٹکا — نشیمن شاخِ گل پہ باندھ کر نغمہ سرا ہو جا
گئے وہ دن کہ ترکِ آرزو بھی جزوِ مذہب تھا — بقا کا ہے اگر خواہاں ہمہ تن مدعا ہو جا

اگر فہمی قیامِ دہر تحریکاتِ دوراں را
حیاتِ تازہ بخشی قالبِ اجسامِ بیجاں را

"گمنام"

میرا آنسو

پانی برس کے دھوتا ہے جب عرصۂ زمیں — پھٹتا ہے آسمان پہ پردہ سحاب کا
اُس پردے سے نکلتا ہے مہرِ جہاں فروز — نقشہ دکھاتا ہے صدف و دُرِّ ناب کا
قطرے فضا میں چند معلق ہیں آب کے — پڑتا ہے اُن میں عکس رُخِ آفتاب کا
قوسِ قزح کی چادرِ رنگیں کو اوڑھ کر — پیرِ فلک دکھاتا ہے عالم شباب کا
فرطِ طرب سے محفلِ قدرت ہے جھُومتی — چھاتا ہے کائنات پہ نشّہ شراب کا
سب مست ہو کے گرتے ہیں آغوشِ خواب میں
کرتے ہیں یعنی شکر خُدا کی جناب میں

پہلو سے اُٹھے دردِ محبت کی جب گھٹا — ہوتا ہے حال غیر دلِ داغدار کا
بادل اُمنڈ اُمنڈ کے برستے ہیں آنکھ سے — دُھلتا ہے چہرہ سینۂ ہنگامہ زار کا
رہتا ہے ایک قطرہ معلّق جو آنکھ میں — پڑتا ہے اُس میں عکس کسی شہسوار کا
آتا ہے حُسنِ قوسِ قزح جھُوم جھُوم کر — بندھتا ہے چرخِ دل پہ سماں لالہ زار کا
آئینہ وار سینہ چمکتا ہے نُور سے — جلوہ دکھاتا ہے فلکِ زرنگار کا
کرتی ہیں دل میں رقص تمنّا کی شوخیاں
ہوتی ہیں آشکار محبّت کی خوبیاں

اے طفلِ اشک! اے مری اُلفت کی آبرو — اے وہ کہ تجھ سے پایہ ہے برتر مجاز کا
مدّت سے بزمِ عشق ہے ویراں پڑی ہُوئی — شعلہ بجھا ہے مشعلِ سوز و گداز کا
وقفِ خزاں ہُوا چمنستانِ آرزو — نغمہ نہیں وہ بلبلِ ہنگامہ ساز کا
وہ دل کہ جس میں جذبے تڑپتے تھے رات دن — ہر تار اب شکستہ ہے اُس دل کے ساز کا
ظلمت سرا بنی ہے تمنّا کی انجمن — جلوہ نہیں جو دل میں مرے دلنواز کا
آباد آ کے کر مری چشمِ خیال کو
میں تجھ سے دیکھتا ہوں کسی کے جمال کو

محمد اکبر منیر بی اے

قند پارس

(مولانا نیاز فتح پوری)

دلم را با تو چشمِ دوست آخر آشنا کردم
فسونت را بدانستم و بازش مبتلا کردم
ز حالِ دل ہمہ رفت است از یادم کنوں جز ایں
کہ چیزے بود و آں را صرفِ شوقِ مُدعا کردم
چہ پُرسی از ہجومِ آرزو ہاے منِ بے کس
سوئے من ہر نگاہت را، کہ نامہ، مدعا کردم
چساں دل محو سازد یادِ آں یک شب کہ در خلوت
نگاہش با من و من با نگاہش ماجرا کردم
فزوں شد التجا چندانکہ تو بگریختی از من
ز من بگریختی چندانکہ عرضِ التجا کردم
مرا کردی ہلاکِ بے نیازی ہم روا کردی
منِ مجبور گر بگریستم ہم ناروا کردم
لبش جنبید از جوشِ تبسم وقتِ ذبحِ من
تپش را من چرا وقفِ خیال مرحبا کردم
عزیزاں حیلہ می جویند ترکِ چارہ سازی را
چہا کردم کہ من اظہارِ حُسنش برملا کردم
نیاز اینجا دلم شد محوِ یاس و وقفِ محرومی
سنم باشد اگر گوئی کہ ترکِ مدعا کردم

نقوشِ مانی

(سید کلب احمد صاحب مانی جائسی)

آج تو ظالم کی آنکھوں میں مروّت ہی نہ تھی
مجھ میں اور اُس میں کبھی جیسے محبت ہی نہ تھی
مرنے والے پر یہ تہمت ہے کہ الفت ہی نہ تھی
کشتۂ اُس کی زیست بھر کیا تھی مَنیت ہی نہ تھی
آپ کو اس ترکِ عادت کی ضرورت ہی نہ تھی
خُوگرِ غم کو جفاؤں کی شکایت ہی نہ تھی
وہ جو روٹھیں، میں نے سر قدموں پہ رکھ کر جان دی
اَور تو کوئی منا لینے کی صورت ہی نہ تھی
اب بھی اے واعظ وہی تخویفِ دار و گیرِ حشر
آپ کے نزدیک چال اُن کی قیامت ہی نہ تھی
چارہ سازی کی احبا نے، چلو اچھا کیا
ورنہ سچ یہ ہے کہ اس کی تو ضرورت ہی نہ تھی
اُن کی پلکیں تک نہ بھیگیں سُن کے افسانہ مرا
یعنی گویا وہ محبّت کی حکایت ہی نہ تھی
آ کہ اب درسِ امیدِ حشر دوں اے شوقِ دید
زندگی میں تو غمِ حرماں سے فرصت ہی نہ تھی
نام لوں کس کس کا اے مانی کہ عہدِ ہجر میں
اور دُشمن بھی بہت تھے ایک فرقت ہی نہ تھی

غزل

(جناب نشتر جالندھری)

چلے عدم کو حوادث کی چوٹ کھائے ہوئے
فلک کے مارے ہوئے، دہر کے ستائے ہوئے
چمن میں پھول، فلک پر کواکب و مہ و مہر
یہ ہیں کسی گُلِ رعنا کے گُل کھلائے ہوئے
ہلال جُھک کے یہ گردن کشوں سے کہتا ہے
جو سرفراز ہیں رہتے ہیں سر جُھکائے ہوئے
خجل ہیں بارِ گنہ سے گنہگار ترے
کفن میں اس لئے جاتے ہیں منہ چھُپائے ہوئے
عجب ہوائے فنا چل رہی ہے عالم میں
کہ سب چراغِ کواکب ہیں جھلملائے ہوئے
صدا الست کی آتی ہے کان میں اب تک
زمانہ ہو گیا لطفِ سخن اُٹھائے ہوئے
دمِ اخیر بھی نکلی نہ حسرتِ دیدار
وہ آئے بھی سرِ بالیں تو منہ چھپائے ہوئے
پرائے بھی ہوئے اپنے خوشی میں اے نشتر
مصیبت آئی تو اپنے جو تھے پرائے ہوئے

کہکشاں کا پیارا سرورق

اگرچہ رسالہ کہکشاں کی پیدائش علم و فضل کے گھرانے
میں ہُوئی۔ اگرچہ اس کی تربیت میں وہ ہاتھ شامل ہیں جو دُنیائے
ادب کے مایۂ ناز سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ کہکشاں کا اُٹھان
قیامت خیز ہے لیکن اس کے دلکش اور دل آویز سرورق
نے اس کی ظاہری خوبصورتی میں کچھ اَور بھی اضافہ کردیا ہے
کسی نوخیز دُلھن کی اُٹھتی ہُوئی جوانی۔ خوبصورت پیارے اُونچے
ماتھے اور گھنگھریالے سیاہ بالوں پر موتیوں کی لڑیاں اور آب
رواں کے دوپٹے کی لہراتی ہُوئی شکنیں کس قدر رُوح پرور
ہوتی ہیں۔ بس بالکل اسی طرح اس سرورق نے کہکشاں کے
حُسن دل افروز کو دوبالا کردیا ہے جس طرح عموماً شب تاریک
میں بہت سی کمزور ہستیاں یعنی ننھے ننھے ستارے مل کر ایک
نُورانی راستہ پیدا کردیتے ہیں اور دیکھنے والے کو آسمان پر
پہلے وُہی سُہانی جُوئے نُور دکھائی دیتی ہے۔ پھر دُوسرے
ستاروں پر نظر پڑتی ہے اور آخر کار اُفق پر پھیلی ہُوئی گہرائیوں
میں ڈُوب جاتی ہے۔ اسی طرح ضروری تھا کہ اس بے نظیر
رسالے کا سرورق بھی ایسا شاندار ہو کہ سیاہ کھلی آسمانی
زمین میں مختلف چمکتے ہُوئے پُر اسرار ستاروں کی حالت
سے آگاہ ہونے سے پہلے یعنی کہکشاں کے اندرونی
مضامین کو پڑھنے سے پیشتر ہی اس کا سرورق بتادے
کہ اس کے اندر کون سے جوہر کیسے طلسماتی شعبدے
اور کیا کیا حیرت انگیز منظر بھرے پڑے ہیں۔ سرورق کے
ڈیزائن میں بھی یہی خُوبی رکھی گئی ہے کہ دیکھنے والے
کی آنکھ کو سب سے پہلے کہکشاں پھر چاند ستارے الفاظ
وغیرہ نظر آئیں اور اس کے بعد وہ خوشنما پھولوں اور بیل
کی لہراتی ہُوئی شاخوں کی اُلجھنوں میں ڈُوب جائے +
اس سرورق کا ڈیزائن پنجاب کے مایۂ ناز صنّاع
(آرٹسٹ) محمد عبدالرحمن صاحب چغتائی نے تجویز کیا ہے
یہ صاحب پنجاب میں نئے انڈین آرٹ کے اصولوں پر کام
کرنے والے پہلے اور یکتا مصوّر ہیں۔ اس میں اُنہوں نے
کنول کی ہوا باندھی ہے یعنی کنول کو مصوّری کے
اصولوں پر آسان اور خوشنما صورت میں تبدیل کیا ہے
کنول کے پھُول کو عموماً زندگی سے تشبیہ دی جاتی ہے
چنانچہ ایسے ادبی رسالے کے لئے جس میں انسانی زندگی
کے اسرار اور جذبات فطرت کی مصوّری کی جاتی ہو یہی
زیادہ موزون بھی تھا۔ آج تک جتنے مصوّر کتابوں کے
سرورق کا ڈیزائن کرتے رہے وہ عموماً پھُول پتّوں
کے باہر اور اندر خطوط سے حد بندی کرتے رہے۔ پہلے
بیرونی خط کھینچ کر پھر لکھائی کی جگہ چھوڑ اندرونی خلا کو
بھی خطوں سے ظاہر کردیا اور جدول کے اندر چھوٹے
چھوٹے پھُول پتّے بنادئے۔ لیکن اس ڈیزائن میں
کوئی حد بندی نہیں کی گئی۔ کوئی خطوط نہیں کھینچے گئے
لیکن پھر بھی جدول و حاشیہ کی راستی و خُوبصورتی میں
کوئی فرق نہیں پڑا اور جو جگہ نام وغیرہ لکھنے کے لئے
چھوڑ دی گئی ہے اُس کی شکل بھی نہایت پیاری اور
دیدۂ زیب ہو رہی ہے۔ نیچے کے حصے میں بڑے پھُول
بنائے گئے ہیں۔ شاخیں بھی زیادہ ہیں اور اُوپر کی طرف
جاتے ہُوئے آہستہ آہستہ اُن کا وزن کم ہوتا گیا ہے۔
اُوپر درمیان میں ہلال کے نیچے جُگنی کی طرز کا پھُول
بنا کر سارے وزن کو پُورا تول دیا ہے۔ ہلال کے نیچے
ایک محراب جو کلیوں سے بنائی گئی ہے۔ نہایت
خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر جہاں
اس کے درمیان میں تین کلیوں سے اس کو مکمل کیا

گیا ہے۔ اس کو دیکھنے سے مذاق سلیم رکھنے والا شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس کا ڈیزائن بنانے والا کس قدر نازک دماغ رکھتا ہے +

ہلال کو عموماً مصوّر لوگ یا تو بالکل الگ بنا دیتے ہیں یا اس غریب کو ایسی جگہ دیتے ہیں۔ کہ اس کا تعلق باقی ڈیزاین سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اس ڈیزاین میں ہلال کو نہایت خوبصورتی سے بنایا اور سجایا گیا ہے۔ ہلال کی کلیوں کا تناسب اور سمیل پن صنّاعوں سے دادِ تحسین طلب کر رہا ہے۔ کہکشاں بالکل نئی اور اچھوتی طرز میں ظاہر کی گئی ہے۔ چونکہ کہکشاں کا وزن تاروں بھری زمین (معاف فرمائیے گا میں نے تاروں بھرے آسمان کی جگہ تاروں بھری زمین لکھ دی) میں زیادہ ہو جاتا تھا اس لئے ہلال کے اُوپر ستارا بنا دیا ہے تاکہ سمیل پن قائم رہے۔ پھُولوں اور شاخوں کے خطوط بھی نقاشی کا بہترین نمونہ ہیں۔ کہیں سے ان کا سلسلہ ٹُوٹا ہُوا معلوم نہیں ہوتا۔ پھُولوں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے کسی شادی کے موقع پر تمام عزیز ایک دُوسرے سے مل مل کر خوش ہو رہے ہوں باتیں کر رہے ہوں۔ ایک دُوسرے کا مُنہ چُوم کر فرطِ مسرّت سے اُچھل رہے ہوں۔ شاخوں کو نہایت خوشنما طریقے سے شاخوں ہی سے باندھ دیا گیا ہے۔ غور سے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھُولوں اور شاخوں میں بہت زیادہ محبّت ہے۔ ایک دُوسرے سے گلے مل رہے ہیں +

نیچے کے حصے میں درمیان میں جو کلی ہے۔ وہ حلکانہ انداز میں کھڑی ہُوئی ایک نوخیز نازنین معلوم ہوتی ہے۔ اور شاخیں اُس کی طرف اُلجھ اُلجھ کر جُھکی پڑتی ہیں۔ غرضیکہ اس ڈیزائن کا ہر ایک خط اپنے اندر غور سے دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے سمجھنے والے دماغ کے لئے رازوں اور جذبات کا خزانہ رکھتا ہے۔ جس طرح ادیب اور شاعر اپنے چھوٹے چھوٹے فقروں اور شعروں میں خوشی محبت اور درد کے جذبات کُوٹ کُوٹ کر بھر دیتے ہیں۔ اسی طرح مصوّر بھی خصوصاً جو ہندوستانی اُصُول پر کاربند ہوں۔ اپنے چھوٹے چھوٹے خطوط ہی کے کُوزے میں اسرار و غوامضِ فن کا دریا بند کر دیتے ہیں +

اس ڈیزاین کا بلاک میاں عطاء الرحمن صاحب بی اے مینجر ہاف ٹون فوٹو کمپنی لاہور نے تیار کیا ہے یہ پنجاب میں ہاف ٹون کی پہلی اور اکیلی فرم ہے۔ عموماً ایسے بلاک میں خطوط کے کنارے صاف نہیں رہتے مگر اس بلاک کو نہایت اچھی طرح اور محنت سے بنایا گیا ہے اور یہ اپنے صناع کی چابکدستی کا خود ہی اعلان کر رہا ہے +

خوش قسمت کہکشاں۔ خوبصورت کہکشاں اس پر جتنا ناز کرے بجا ہے۔ کیونکہ اس کے تمام مددگار و معاون اپنے اپنے فن میں یکتا اور نہایت قابل ہیں +

"ساندوی"

شذرات

ہمارے پاس اپنے معزز کرمفرما جناب محمد عبدالرحمن صاحب چغتائی آرٹسٹ لاہور کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ فی الحقیقت اُنہوں نے کہکشاں کے سرورق کا ڈیزائن تیار کرکے ہم پر اتنا عظیم الشان احسان فرمایا ہے کہ ہم اُس کی شکرگزاری سے کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ چغتائی صاحب ہندوستان کے اُن نامور صناعوں میں سے ہیں جن پر ہمارا ملک جس قدر ناز کرے بجا ہے۔ آپ کی تیار کی ہُوئی تصویریں ماڈرن ریویو کلکتہ جیسے معزز رسالے میں اکثر حضرات نے ملاحظہ فرمائی ہونگی۔ وہ ہندوستانی فن مصوری کے زبردست ماہر ہیں اور اُن کی تصاویر میں عموماً عمیق جذبات انسانی اور مشہور شعرا کے دقیق اشعار کی مصوری ہوتی ہے۔ اُنہوں نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ کہکشاں کو تصویر دار رسالے بنانے میں امکان بھر ہماری مدد کرینگے اور اپنے مُوقلم کی قلمکاریوں سے وقتاً فوقتاً ناظرین کہکشاں کی باصرہ نوازی فرماتے رہیں گے +

ان کے علاوہ میاں عطاء الرحمن صاحب بی اے منیجر ہاف ٹون کمپنی لاہور بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے نہایت تندہی اور محنت سے بلاک تیار کیا۔ ہم مسٹر سانددی کے بھی شکرگزار ہیں۔ جنھوں نے اپنے مضمون "کہکشاں کا پیارا سورق" میں ڈیزائین کے محاسن آرٹ کی رُو سے ظاہر کئے اور ناظرین کو ڈیزائن سے پُورا پُورا لطف اُٹھانے کا موقع دیا +

"ماہ عجم" جس پریس میں چھپنے کے لئے دی گئی تھی۔ اُس کے منیجر صاحب نے اُس کو چھاپنے سے انکار کردیا اور کہا کہ جب تک سنسر سے پاس نہ کرالی جائے اُس وقت تک نہ چھاپُوں گا۔ ہم نے وہ کتاب سنسر کے دفتر میں بھیج دی۔ کوئی دس پندرہ دن کے بعد وہاں سے واپس ملی ہے۔ بس اب امروز فردا میں تیار ہونے والی ہے۔ اور ہمیں اُمید واثق ہے کہ ہم فروری کے رسالے کے ساتھ اسے معزز ناظرین کی خدمت میں پیش کرسکیں گے +

ہمارے پاس مندرجہ ذیل کتابیں ریویو کے لئے موصول ہُوئی ہیں۔ انشاءاللہ آیندہ اشاعت کہکشاں میں ان پر تنقید کی جائے گی :-

تصویر خیال۔ مصنفہ جناب سید سرفراز حسین خاں صاحب ارمان دہلوی +

مناظرۂ چشم وگوش۔ جناب عبدالحکیم صاحب نشتر جالندھری +

مثنوی زہر عشق۔ مرزا شوق لکھنوی مرحوم +

"اڈیٹر"

پنجابی سٹیم پریس لاہور میں باہتمام لالہ جگو مال ٹنڈن چھپا اور دفتر رسالہ کہکشاں لاہور سے بحکم سید ممتاز علی صاحب منیجر سے شایع ہوا۔

اُردو کا ادبی رسالہ

کہکشاں

مرتبہ

سید امتیاز علی تاج

مقام اشاعت

دارالاشاعت پنجاب لاہور

فی پرچہ چھ آنہ

قیمت سالانہ چار روپیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد (۳) فہرست مضامین کہکشاں بابت ماہ جولائی ۱۹۱۹ء نمبر (۱)

تنبیہ: جتنے مضامین کہکشاں کے اس نمبر میں درج کئے گئے ہیں۔ ان سب کے حقوق محفوظ ہیں۔

تقریب

حکیم ارسطاطالیس - مولانا خلیل الرحمٰن صاحب نے اس سے پہلے بعنوان "تاریخ صقلیہ کا ایک ناتمام ورق" سکاٹ کی تاریخ سے ایک مضمون کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ اور اُس کی چند اقساط کہکشاں میں شائع بھی ہوئی تھیں لیکن بوجوہ اس کی اشاعت ملتوی کی گئی۔ عنقریب مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سکاٹ کی مکمل تاریخ کا ترجمہ شائع کرنے والے ہیں۔ اور وہ اُردو کے ذخیرۂ تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔ مولانا موصوف نے "تاریخ حکمائے یونان" میں سے حکیم ارسطاطالیس کے حالات کہکشاں کے لئے لکھے ہیں جس کے لئے ہم موصوف کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اب موصوف کہکشاں کو مسلسل امداد عطا فرمائیں گے۔

مرگ ناگہاں - جناب سید ناصر نذیر فراق دہلوی سے کون واقف نہیں۔ آپ خواجہ میر دردؒ کی یادگار اور دہلی کی پُرانی معاشرت کے دیکھنے والے ہیں۔ انشا پردازی میں آپکا انداز ایک ممتاز و مخصوص انداز ہے۔ زبان ایسی نفیس ہے گویا آبِ کوثر میں دھل کر آئی ہے۔ آپنے ہماری استدعا پر یہ مضمون عطا فرمایا ہے۔ جو تاریخی حیثیت سے کچھ حقیقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو ادبی حیثیت سے بہت عمدہ ہے لیکن ابھی ہم تشنہ ہیں ؎

با ہمیں قدر تو راضی نیستم اندر سخن،
شاہیا سحر است ایں اعجاز مے باید کرد

کرشن کنہیا کی مُرلی - دیوان آتم انند صاحب شرر بی۔ اے ملتان کے خوشگو شاعر ہیں۔ اس سال جنم اشٹمی مطابق ۱۹ اگست کے موقع پر آپنے یہ نہایت سلیس و پُر اثر نظم لکھی ہے۔ بو شتی کا عالم ہے لیکن ابھی فتنہ میں کسی نے قیامت ہو گئی "

اہلِ قلم کی قدردانی

اعلیٰ حضرت شہریارِ دکن کے محکمہ تعلیمات کی نظر انتخاب مستحق ہزار تحسین ہے۔ کہ اس نے حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی جیسے ادیب فطرت طراز کی مشہور تصنیف "بیوی کی تعلیم" کو تمام قلمرو دکن کے زنانہ مدارس کے لئے بطور نصاب تعلیم منتخب کیا۔ فی الحقیقت خواجہ صاحب موصوف کا انداز تحریر اس قدر سلیس و دلنشیں ہے کہ اگر موصوف ایک سلسلۂ کتب قوم کی بچیوں کے لئے لکھدیں تو بہت مفید ہو۔ اور قلمرو دکن کے علاوہ ہندوستان کے تمام اسلامی مدارس اسے بطور نصاب اختیار کریں۔ ہم اس پر خواجہ صاحب مدظلہٗ اور محکمہ تعلیمات دکن دونوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

کہکشاں کے مضمون نگار خصوصی جناب مولانا نیاز فتحپوری جیسا علمی ذوق رکھنے والا شخص یقیناً اس قابل ہے۔ کہ کسی والیٔ ریاست کی طرف سے اس کی قدر افزائی ہو۔ اور وہ معاش کی طرف سے مطمئن ہو کر خالص علمی مشاغل میں زندگی بسر کر سکے۔ چنانچہ خوشی کی بات ہے۔ کہ دربار بھوپال نے مولانا نیاز کو اپنی بساطِ علمی کے لئے منتخب کر لیا ہے۔ اور محکمہ تالیف و تصنیف میں انہیں سرفراز فرما کر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ حضور بیگم صاحبہ بھوپال اور ان کے ارکان دولت اس امر پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کہ انہیں ایک قابل و اہل شخص کی قدر افزائی کی توفیق ہوئی۔ اور مولانا نیاز اس فخر پر لائق تہنیت ہیں کہ انہیں بھوپال کے روشن خیال فرمانروا کے زیر سایہ خدمات علمی کا موقع ملا۔

بزم انجم

معارف

ماہ جولائی سے معزز معاصر "معارف" اعظم گڑھ میں چند خوشگوار
تغیرات کئے گئے ہیں ضخامت ۸۰ صفحے تک بڑھادی گئی ہی
قیمت چار روپے سے پانچ روپے سالانہ کردی گئی ہی۔ کاغذ
پہلے سے بھی اچھا لگایا گیا ہی + یہ تو ہوئیں ظاہری تبدیلیاں۔ اب
باطن ملاحظہ ہو۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے "توجہ کی ماہیت نفسی"
پر بہت زور کا مضمون لکھا ہی + سلطنت اودھ کے وزیر
حکیم مہدی کے حالات اور ہندو فلسفے میں وحدت وجود۔
یہ دونوں مضامین انگریزی رسائل سے لئے گئے ہیں۔ اور
دونوں خوب ہیں۔ "موجودہ مشرقی کتب خانے" مولانا
عبدالسلام کا مضمون ہی۔ اور بہت قابلیت اور تلاش
و تحقیق سے لکھا گیا ہی + اس رسالے کی ترتیب میں اعلیٰ
درجے کے انگریزی رسائل سے بہت مدد لی گئی ہی +

صبح امید

معزز ہمعصر صبح امید لکھنو نے جولائی اور اگست کے نمبر
جمع کرکے ایک "رفارم نمبر" شائع کیا ہی۔ اس پرچے کی ضخامت
سو صفحے کے قریب ہی۔ اس میں آنریبل ڈاکٹر تیج بہادر سپرو
ایم۔ اے ایل۔ ایل ڈی مسٹر شام ناتھ مشران ایم اے
پنڈت ہردے ناتھ بی۔ اے بی۔ ایس سی اور نواب مرزا
صادق علی خاں۔ بی۔ اے نے آئینی اصلاحات ہند کے
اس کے مختلف پہلوؤں پر نہایت مدلل و مبسوط مضامین
لکھے ہیں۔ اخیر میں سر سنکرن نائر کے اختلافی نوٹ کا ترجمہ
بھی دیا گیا ہی۔ جو بجائے خود نہایت قابل قدر چیز ہی۔
جو لوگ اصلاحات ہند سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ ضرور
اس پرچے کو منگا کر پڑھیں۔ اس ایک پرچے کی قیمت ۱۲ ار
مقرر کی گئی ہی +

زمانہ

محترم معاصر زمانہ (کان پور) کا جولائی نمبر بہت اچھا نکلا
اس میں منشی رگھوپت سہائے بی۔ اے کا مضمون کلام
ٹیگور بہت مدلل و دلنشیں ہی + ایک نظر" کے عنوان سے
ایک مضمون سید سجاد حیدر بی۔ اے کے نام پر چھپا ہے۔ لیکن
یہ کوئی اور سجاد ہیں۔ مصنف خیالستان نہیں + بنکم چندر
چٹرجی کے ایک نہایت دلاویز قصے کا ترجمہ "گریہ سکیں"
کے عنوان سے شائع کیا گیا ہی + نظموں کا حصہ بھی
اچھا ہی +

ریویو

پریم پچیسی

فطرت نگار منشی "پریم چند" کو کون نہیں جانتا۔ ان کے لکھے ہوئے افسانے ملک بھر میں مقبول ہیں۔ جذبات انسانی کا صحیح خاکہ اتارنا اور فطرت کا نہایت عمیق مطالعہ کرکے لکھنا ان کی خصوصیات میں شامل ہے۔ کہکشاں کے ناظرین "زنجیر ہوس" "تخت اکبر" "بنک کا دیوالہ" "سوتیلی ماں" میں ان کا کمال فسانہ نگاری دیکھ چکے ہیں + ان کے پچیس قصوں کا ایک مجموعہ دو حصوں میں "پریم پچیسی" کے نام سے چھپا ہے۔ ۱۳ قصے پہلے حصے میں ہیں۔ اور ۱۲ دوسرے میں۔ یوں تو سب ہی خوب ہیں۔ نظر انتخاب مجروح ہے لیکن وکرما دت کا تیغہ۔ رانی سارندھا۔ راجہ ہٹ۔ راجہ ہردول۔ نمک کا داروغہ۔ بے غرض محسن۔ خون سفید صرف ایک آواز۔ تریا چرتر۔ امرت۔ اماوس کی رات۔ منزل مقصود نہایت اعلیٰ درجے کے افسانے ہیں۔ منشی پریم چند کے فسانوں کے نتیجے ہمیشہ اخلاقی ہوتے ہیں۔ آج کل ہندوستانیوں کے اخلاق روبہ انحطاط ہیں۔ ایسے زمانے جس مقبول و عام پسند انشاپرداز کو یہ ملکہ حاصل ہو جائے۔ کہ وہ اپنے زور قلم سے اخلاقی تعلیم دے سکے۔ اسے اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو خوش قسمت سمجھنا چاہئے۔ دونوں حصوں کی قیمت ۱۲ر ۱۲ر اچھا کاغذ۔ اچھی لکھائی اچھی چھپائی

دفتر رسالہ کہکشاں لاہور سے طلب فرمائیے

نقشہ افغانستان

میسرز عبدالقدیر و الاخوان تاجران کتب دہلی نے ہمارے پاس افغانستان کا ایک نقشہ ریویو کے لئے بھیجا ہے۔ یہ نقشہ ایک جلد میں محفوظ ہے۔ اور اچھا چھپا ہے۔ افغانستان کا اس سے زیادہ مفصل نقشہ ہم نے نہیں دیکھا۔ اس میں مشہور مقامات سے لیکر غیر مشہور دیہات تک۔ دریا۔ جھیلیں۔ سڑکیں۔ درے سب دکھائے ہیں۔ پہاڑوں کو دانستہ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تلاش مقامات میں دقت نہ ہو + افغانستان کی حدود اربعہ مفصل دکھانے میں تین چوتھائی حصہ پنجاب کا بھی نقشے میں آگیا ہے + انگریزی علاقے کا رنگ گلابی۔ اور افغانستان کا رنگ سبز دکھایا گیا ہے۔ بہت اچھا ہوتا۔ اگر معمولی رنگ کی جگہ عمدہ روغن کرایا جاتا +

مجلد رنگین نقشے کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ جو کسی قدر زیادہ ہے۔ بہرحال نقشہ بہت کار آمد ہے۔ اس کی پشت پر دو تین صفحوں میں افغانستان کے متعلق معلومات بھی بہم پہنچائی ہیں +

عبدالقدیر و الاخوان تاجران کتب مکان ۹۴۲

چھتہ لال میاں۔ دہلی سے طلب کیجئے

اپنے تئیں انڈین سول سروس میں منتخب کرالو۔ یہ بات کچھ مشکل نہیں ہے جس طرح پر ہو۔ تم مجھ سے ملو۔ میں شروع دسمبر میں کلکتہ چلا جاؤں گا۔ اخیر دسمبر کی تعطیل میں تم بھی کلکتہ چلے آؤ۔ میرے پاس رہو۔ سب طرح آسایش اور میرے دل کو راحت ہوگی۔ طمانیت سے سب باتیں حاصل ہوں گی۔ مسودہ درخواست تمہیں مرتب ہوجائے گا۔ اور سب تدبیریں بتادوں گا۔ کلکتہ آنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ سیر بھی کروگے۔ ملاقات بھی ہوگی۔ دل خوش ہوگا کیا امر تم کو کلکتہ آنا کا مانع ہے۔ میں تم کو اپنا عزیز سمجھتا ہوں جو بات ہو۔ مجھ کو لکھو۔ اگر کلکتہ آنے میں کسی امر کی ضرورت ہو۔ مجھے لکھو۔ میں اس کا انجام کروں گا۔ تمہاری عمر اس وقت ایسی ہے۔ کہ انڈین سول سروس کی ابھی تدبیر ہوسکتی ہے۔ چند روز بعد تدبیر ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

والسلام۔　　خاکسار سید احمد علی گڑھ

۱۷ر نومبر ۱۸۸۸ء

محب دلنواز من۔ آپ کا عنایت نامہ مع مضمون کے پہنچا جس کے پڑھنے سے میری دلنوازی ہوئی۔ میرے دل کو تقویت ہوئی۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ میں نے ایک جلسے میں کہا تھا۔ کہ میری یہ آرزو ہے۔ کہ ہماری قوم لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر یقین رکھے۔ اور ترقی پاوے۔ اور اگر یہ یقین جاتا رہا۔ تو وہ ہماری قوم نہیں رہی۔ پھر اگر وہ آسمان کے تارے ہوجائیں۔ تو ہم کو کیا۔ ایک محض حماقت کی سمجھ ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ میں کوئی علاحدہ فرقہ قایم کرتا ہوں یہ تو میرے مقصد کے خلاف ہے۔ جو فرقے اسلام سے باہر جانا چاہتے ہیں۔ ان کو ملا رکھنا چاہتا ہوں۔

آپ کا مضمون جو کہ خاص میری نسبت تھا ہر چند چاہا کہ اس کے چھاپنے کا قصد نہ کروں۔ مگر ایسا دل میں بیٹھ گیا۔ اور اس کی سچائی کا ایسا دل پر اثر ہوا کہ چھاپنے سے چپ رہا نہ گیا۔ میرے دل کو ترغیب کی یہ مضمون لکھا ہے جس میں میری دلی کیفیت ہے۔ انشاء اللہ اس شنبہ کے بعد جو شنبہ ہوگا۔ اس دن کے اخبار میں چھپے گا۔ تفسیر اور تصانیف احمدیہ اس قدر تاخیر سے نہیں چھپیں گی۔ جیسا کہ آپ حساب لگاتے ہیں۔ اتفاقات سے کمپوزیٹر بیمار ہوگئے اور چلے گئے۔ ایک مصحح مرگیا۔

یہ شہر نہایت چھوٹا ہے۔ الہ آباد سے کمپوزیٹر طلب ہوئے ہیں مجھے امید ہے۔ کہ تفسیر و جملہ کتب دو برس کے عرصے میں اگر زندگی ہے۔ تو چھپ جاویں گی۔ تفسیر کا بہت بڑا کام ہے۔ اور اس کی مشکلات ظاہری کا حل کرنا اور واقعی و اصلی بات کا بتانا ذرا مشکل پڑجاتا ہے۔ بہرحال خدا کی مدد چاہیے۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

تصویر اپنی خدمت اقدس میں بھیجتا ہوں۔ کلکتہ جاکر دوسری بھیجوں گا۔

(حاشیے پر) دو تصویریں بھیجتا ہوں۔ جو ن سی پسند ہو۔ رکھ لی جائے۔ دونوں نذر جناب ہیں۔

والسلام

خاکسار سید احمد علی گڑھ

۲۵ر نومبر ۱۸۸۸ء

مجبی و شفیقی - چوتھی مئی کا عنایت نامہ میرے پاس ہے جس کا جواب لکھتا ہوں - پندرہویں مئی کو یہاں سے روانہ ہوں گا اور سیدھا شملہ چلا جاؤں گا - بروقت معاودت ضرور آپ سے ملاقات ہوگی - انجمن اسلامیہ لاہور میں جو آپ نے گفتگو کی اس کا میں شکرگزار ہوں - مگر حال یہ ہے - کہ میں ایک واعظ مذہب بننا نہیں چاہتا - نہ ایسے جلسوں میں جو مذہبی نام سے ہوں - شریک ہونا یا ان میں لکچر دینا پسند کرتا ہوں - صرف یہ خیال ہوتا ہے - کہ اپنے احباب کے سامنے اپنے خیالات ظاہر کروں تاکہ ان کو اس پر غور کرنے کا اور جو نقص اس میں ہو اس کی اصلاح کا موقعہ ملے - اور مجھ کو بھی فائدہ پہنچے - پس اس کام کے لئے کوئی عام مجلس کی ضرورت نہیں ہے - بہر حال موسم سرما میں جو ہوگا - وہ ہوگا - اس وقت اس کی گفتگو بے فائدہ ہے - تہذیب الاخلاق چھپنا شروع ہوگیا چار ورق چھپ چکے ہیں - بقیہ اور چھپ جائیں - تو بخدمت احباب روانہ ہوگا - ایک مضمون میرا ہے - ایک مولوی مشتاق حسین کا اور ایک منشی ذکاء اللہ صاحب کا - منشی ذکاء اللہ صاحب نے "نیچر" پر سلسلہ وار آرٹیکل لکھنے شروع کئے ہیں - اور اس کے متعدد نمبر ہوں گے - والسلام - خاکسار سید احمد علی گڑھ - ۱۳ / مئی ۱۸۷۹ء

شفیقی و مجبی - آپ کا عنایت نامہ و نوٹ بیس روپیہ بابت خریداری تہذیب الاخلاق پہنچا ممنون عنایت کیا - اصل یہ ہے - کہ میں نے تہذیب الاخلاق صرف آپ کے شوق کے سبب سے مکرر جاری کردیا ہے - اس بات کی کچھ پروا نہیں ہے - کہ بقدر خرچ خریدار ہوں گے یا نہیں - میرا روپیہ ایسی ہی لغو باتوں میں تمام عمر ضائع ہوتا رہا ہے - آپ میرے نقصان کا کچھ خیال نہ کریں - محمد برکت علی خاں صاحب تو دوست قدیم ہیں - مگر اور کسی غیر شخص سے اصرار کرنا یا لجاجت اس کی خریداری پر کرنا کچھ ضرور نہیں ہے - حقیقت میں تہذیب الاخلاق بند ہونا نامناسب تھا - گویا تحریر مضامین اور خیالات سب بند ہوگئے تھے - اس کے سبب برا یا بھلا تحریر کا لگا رہے گا - بعض بعض مضمون قابل پڑھنے کے تحریر ہوئے ہیں بعضے صرف معمولی ہیں - بہرحال ایک امر جاری رہنے سے امید ہے - کہ کوئی عمدہ مضمون بھی آجائے گا - مولوی چراغ علی - منشی ذکاء اللہ صاحب - مولوی الطاف حسین حالی - منشی مشتاق حسین نے مضامین بھیجنے کا وعدہ کیا ہے - اور ایک اور صاحب ہیں - جو مولوی مستعد ہیں - اور تمام خیالات تہذیب الاخلاق و تفسیر کے ان کے دل میں بھر گئے ہیں - اور تمام پچھلی تعلیم کو بھلا دیا ہے - وہ بھی وعدہ تحریر مضامین کرتے ہیں - مگر نام ظاہر کرتے ہوئے کانپتے ہیں - بہرحال اس کا جاری رہنا بہتر ہے - والسلام

خاکسار سید احمد

شملہ پارک ہوٹل - ۱۲ / جون ۱۸۷۹ء

مجبی و شفیقی - آپ کا عنایت نامہ پہنچا مضمون مرسلہ چھپنے کو بھیج دیا - تصانیف احمدیہ چھپ رہی ہے - مگر تہذیب الاخلاق کے چھپنے سے کام زیادہ ہوگیا ہے - اس سبب اور نیز اس سبب سے کہ اس کے پروف میرے پاس شملہ پر آتے ہیں تاخیر

سے چھپتی ہی۔ شملہ پر میں نے کام تفسیر کا بہت کیا ہی۔ سورۂ بقر کی کل تفسیر قریب ختم ہونے کے ہی۔ نہایت مشکل مقام جو ظاہرا معلوم ہوتے تھے۔ نہایت صفائی اور خوبی سے حل ہوئے ہیں۔ اور مجھے یقین کامل ہی۔ کہ وہی مطلب قرآن کا ہی۔ جو میں نے بیان کیا۔ میں آپ کی عنایت و محبت کا ہمیشہ شکرگزار رہوں۔ اور آپسے ایک خاص محبت اس خیال پر رکھتا ہوں۔ کہ مجھ کو آپسے قومی فائدے پہنچنے کی توقع ہی۔ خدا آپ کو زندہ رکھے۔ اور بوڑھا کرے۔ اور میرا جو خیال آپ کی نسبت ہی۔ اس کو پورا کرے۔ آپکے والد ماجد آپکے ان خیالات کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ پسند کرتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں۔ کہ میرا نوعمر بیٹا بگڑ گیا۔ بروقت مراجعت شملہ کسی مقام پر اب ضرور ملاقات ہونی چاہئے۔ پنجاب میں جو قانون مالگذاری، اور قانون لگان جاری ہی۔ وہ غالباً اُردو زبان میں لوگوں نے چھاپے ہوں گے۔ ایک ایک کاپی اگر ان کو دستیاب ہو۔ تو مرحمت فرمائیے۔

والسّلام

خاکسار سید احمد

شملہ ۱۲ جولائی ۱۸۷۹ء

محبی و شفقی۔ ایک خط ملفوف ہی۔ اس کو پڑھ کر اور دوسرے لفافے میں رکھ کر کاتب خط کے نام روانہ فرما دیجئے۔ آپ کی تحریر سفیر ہند میں پڑھ کر نہایت خوش ہوا جس سے معلوم ہوتا ہی۔ کہ تمام پہلو اور باریکیاں اُن مسائل کی بخوبی آپ کی پیش نظر ہیں۔ اور ہر ایک کو کما حقہٗ غور کیا ہی۔ مولوی محمد حسین صاحب (بٹالوی) کا دماغ اس قسم کے مضامین سمجھنے کے مناسب نہیں ہی۔ ان پر کیا موقوف ہی۔ ہمارے علما کی قوت دماغی اُن ہی معمولی کتابوں کے پڑھنے میں صرف ہو جاتی ہی۔ پھر طاقت مطالب دیگر پر غور کی باقی نہیں رہتی۔ رسالہ اشاعۃ السنۃ میں آپنے دیکھا ہوگا کہ "فطرت" کے لفظ پر کیسی لغو اور غیر مناسب تقریر لکھی ہی جس سے معلوم ہوتا ہی۔ کہ مطلق وہ نہیں سمجھتے۔ والسلام دو رسالے نسبت مزارعان پنجاب بھیجے جنکا نہایت دلی شکریہ قبول ہو۔ فقط

خاکسار سید احمد ۲۰ جولائی ۱۸۷۹ء شملہ پارک ہوٹل

محبی و مکرمی۔ عنایت نامہ پہنچا۔ نماز فی حد ذاتہ نہایت مناسب فطرت انسانی کی ہی۔ ارکان معینہ اس فطرت کے محافظ ہیں۔ اور اس لئے بمنزلہ اس کے جزو کے ہیں۔ باقی رہا تعین ارکان بہیئت موجودہ۔ اس کی نسبت جو شبہ کیا جائے۔ وہی شبہ بعینہ اُس ہیئت پر بھی وارد ہوگا جو اور طرح پر قرار دی جائے۔ اس لئے یہ شبہ از قبیل شبہ عامۃ الورود ہوگا۔ جو مقبول نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس میں کچھ شبہ نہیں ہی۔ کہ ہیئت موجودہ کی خوبی اور عمدگی کا ثبوت چاہئے۔ جو علانیہ ظاہر ہو۔

آپ کا مضمون چھاپہ خانہ والوں نے تہذیب الاخلاق کے ساتھ چھاپنا تجویز کیا ہی۔ مگر تعجب یہ ہی۔ کہ تہذیب الاخلاق ماہ رجب بھی اب تک نہیں آیا۔ معلوم نہیں کیا آفت پڑی ہی۔ والسلام۔

خاکسار آپ کا نیازمند

سید احمد

شملہ پارک ہوٹل۔ ۲۷ جولائی ۱۸۷۹ء

مجبی وعزیزی - تمہارا مضمون تہذیب الاخلاق کی نسبت
متعدد دفعہ میں نے پڑھا - اس وقت بھی پڑھ رہا ہوں - جو بات
میرے دل میں آئی - آپ کو لکھتا ہوں +

شکر ہی خدا کا کہ ہماری قوم میں تم سا نوجوان لایق پیدا ہوا
خدا تم کو زندہ سلامت رکھے مضمون کی عمدگی - اس کا طرز
بیان - اس کی ترتیب - اس کے شستہ الفاظ بے انتہا تعریف
کے لایق ہیں - جو بات خدا نے ہم کو ڈاڑھی سفید ہو جانے کے
بعد دی - وہ خدا نے تم کو اس عمر میں دی - کہ شاید ابھی پوری
ڈاڑھی بھی نہ نکلی ہو گی سہ

بالائے سرش ز ہوشمندی
تابندہ ستارۂ بلندی

خدا تم کو زندہ رکھے - اور جیسی مجھ کو اُمید تمہاری ذات سے
قوم کی بھلائی کی ہی - خدا اس کو پورا کرے - انگریزی علوم
علی الخصوص لٹریچر کی تحصیل میں زیادہ محنت کرو - معلوم نہیں
کہ تمہاری شادی ہو گئی ہی یا نہیں - اگر نہ ہوئی ہو تو جلدی مت
کرنا - یہ ایسا پیچ ہی - کہ انسان کو مشکلات میں پھنسا دیتا ہی +

والسلام — آپ کا دلی ترقی خواہ

خاکسار سید احمد - شملہ پارک ہوٹل - ۲ر اگست ۱۸۷۹ع

مکرمی و مجبی - آپ کا عنایت نامہ پہنچا - اگرچہ مجھ کو آپ کے
تشریف لانے سے نہایت خوشی ہی - مگر برابر چار روز کا سفر کرنا
جو آپ کو تکلیف دے گا - اُس کا افسوس ہی - بہر حال ملاقات
ہونے کے بعد سب کچھ مبدل بخوشی ہو جائے گی - آتے وقت
علی گڑھ مت ٹھہرنا - جب یہاں آؤ گے تو مولوی خواجہ محمد یوسف
صاحب بھی یہاں ہوں گے - ان سے ملاقات ہو جاوے گی
اور بروقت مراجعت شاید ساتھ بھی ہو گا - اور مدرسۃ العلوم
کی بھی علی گڑھ میں خوب سیر ہو گی - اور مراجعت کے وقت تک
مدرسہ کھل بھی جاوے گا - اگر رستے میں سے اپنے پہنچنے کا ٹھیک
وقت بذریعہ تار برقی بتا دو گے - تو میں آدمی و سواری سٹیشن
پر بھیج دوں گا - شاید کچھ غلطی ہو جاتے - اس لئے لکھتا ہوں
کہ میرے محلے کا انگریزی نام تو آپ کو معلوم ہی - مگر گاڑی والے
یہ نام کم تر سمجھتے ہیں - اُس محلے کو ہندوستانی "باہمنی چھتہ" کہتے
ہیں - پس اگر شاید میرا آدمی نہ ملے - تو جس گاڑی بان سے
کہو گے - برابر لے آئے گا - اسٹیشن پر کثرت سے گاڑیاں کرائے
کی حاضر و موجود رہتی ہیں - یہ سب باتیں احتیاطاً لکھ دی ہیں

والسلام - خاکسار سید احمد - کلکتہ

۱۵ر دسمبر ۱۸۷۹ع

عزیزی مجبی - تمہارے تین خط پہنچے - پہلا خط جو شکریہ کا تھا -
اس کی کچھ ضرورت نہ تھی - مجھ کو تم سے دلی محبت ہی - اور ہر
طرح ترقی کا خواہاں ہوں +

پچھلے دو خطوں کو پڑھ کر افسوس ہوا - ولایت جا کر تعلیم
حاصل کر کے ہندوستان میں وجہ معاش حاصل کرنے کے جو
بغیر ولایت جائے حاصل نہیں ہو سکتی - صرف تین کام ہیں -
بیرسٹری - انجنیری - ڈاکٹری - اول کام تم بھی ناپسند کرتے
ہو - اور میں بھی چنداں پسند نہیں کر سکتا - صرف بیرسٹری کے
بعد دو امر کی ضرور اُمید ہی - ایک یہ کہ بذریعہ بیرسٹری گو وہ
کیسی ہی کم ہو تین چار سو روپیہ مہینہ ضرور ملے گا - اور اس سے

زیادہ ترقی ہو جانی تقدیری بات ہے۔ دوسری یہ کہ بعد واپسی
ہندوستان کوئی ابتدائی عہدہ عدالت کا ضرور مل سکے گا۔
اور اسی سلسلہ میں جلد ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔ اور ہندوستان
کے امتحانوں سے نجات ملے گی۔ بارسٹری میں اس سے زیادہ
توقع نہیں ہے۔ انجینیری میں داخل ہونے کو اُن وجوہات سے
جو آپ نے لکھی ہیں۔ بلاشبہ نہایت مشکل اور نہایت دقت
ہے۔ ڈاکٹری میں بھی وہ وقت پیش آوے گی۔ علاوہ ڈاکٹری
اس لئے زیادہ نامناسب ہے۔ کہ ہندوستانیوں کو سول سرجن
کا عہدہ ملنا انگریز اور لیڈیاں پسند نہیں کرتیں۔ اور اس لئے
ہندوستانی فوجی ڈاکٹری پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ پس
درحقیقت تمہارے لئے کوئی ایسا موقع نہیں ہے۔ کہ بعد ایسی
ولایت سے ایسا عہدہ پا سکو۔ جو یہاں کی تعلیم سے حاصل
نہ ہو سکتا ہو۔ پس آپ کا ولایت جانا دو امر کی توقع پر
ہو سکتا ہے۔ اول بارسٹری کے لئے جس سے ان فوائد کے
سوا جو اوپر مذکور ہوئے۔ اور کسی بات کی توقع نہیں۔ شاید
یہ ہو۔ کہ عدالت کے ابتدائی عہدے ملنے میں ولایت کی
تعلیم کے سبب کچھ آسان ہو۔ دوسرے بغرض عمدہ تعلیم
حاصل کرنے کے اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ انگریزی میں عمدہ
تعلیم ہندوستان میں حاصل ہونی ناممکن ہے۔ اور ولایت
میں جو عمدہ انگریزی تعلیم حاصل ہو جاوے گی۔ وہ لازوال
دولت ہے۔ اور ولایت سے واپس آنے کے بعد اسی تعلیم
کے ذریعے سے چار۔ پانچ سو روپیہ ماہواری ہر صورت
سے کما سکتے ہو۔

تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میری رائے یہ ہے۔ کہ اگر
تم چار برس کے لئے بھی ولایت جا سکتے ہو۔ تو جاؤ۔ فی الفور
جاتے ہی کسی یونیورسٹی میں داخل ہو جاؤ۔ اور لٹریچر کی شاخ
اختیار کرو۔ برس روز تک کسی چیز کا بجز محنت کے ترقی تعلیم
پر خیال مت کرو۔ برس روز کے بعد "لنکن ان" میں بارسٹری
کے لئے داخل ہو جاؤ۔ تعلیم بدستور یونیورسٹی میں جاری رکھو۔
اور صرف لکچر کے زمانے میں "لنکن ان" میں آکر لکچر سن جایا
کرو۔ دو برس بعد امتحان دینا ہوگا۔ چند روز پہلے امتحان کے
لئے اپنے تئیں تیار کرو۔ اور اگر "لنکن ان" میں یہ قاعدہ اب
بھی ہو کہ جو شخص تین برس تک لکچر سنے۔ اس کو امتحان کی
ضرورت نہیں ہے۔ تو امتحان کا خیال بھی مت کرو تین
برس برابر لکچر سنتے جاؤ۔ اور یونیورسٹی کی تعلیم میں اس قدر
محنت کرو۔ کہ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لاؤ۔ یہ دولت
ایسی ہوگی جس سے مسلمانوں کو تمہاری ذات پر فخر ہوگا
اور ہمیشہ کو تمہاری ذاتی اور دلی خوشی کا باعث ہوگا۔
اور اگر یہ امور تمہاری دانست میں اور تمہارے والد ماجد
کی دانست میں کافی معاوضہ ولایت جانے کا اور
چار برس تک صعوبات سفر اختیار کرنے کا اور سب سے زائد
روپیہ خرچ ہونے کا نہ ہو۔ تو ارادہ موقوف کرو۔ تن
بہ تقدیر یہاں تعلیم میں کوشش کرو۔ تم کو انگریزی لٹریچر
میں ترقی کی بہت حاجت ہے۔ اور اس پر بہت زیادہ
کوشش درکار ہوگی۔

والسلام
خاکسار تمہارا خیر طلب
سید احمد
کلکتہ۔ ۱۶ فروری سنہ ۱۸۸۰ء

مجبی و مشفقی - آپ کے دو عنایت نامے پہنچے - آپ کی عنایت کا شکرگزار ہوا - میں بخیریت ہوں - اور اپنے کام میں دن رات مشغول ہوں +

نسبت آرٹکل کے جو آپ نے لکھا ہے - اس کا ترجمہ انگریزی میں ہونا نہایت وقت کی بات ہے - شاید وہ انجام نہیں ہو سکنے کا - کوئی ایسا لکھنے والا یہاں نہیں ہے - جو اس کو اسی خوبی سے انگریزی میں لکھ دے +

درحقیقت جو لوگ یونیورسٹی پنجاب کے طرفدار ہیں - وہ اس سے ناخوش ہوئے ہوں گے - اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ تمام پنجاب کے اخبار اس کی تردید کریں گے - وہ آرٹکل خاص پنجاب کی یونیورسٹی پر نہیں ہے - بلکہ گورنمنٹ کی پالیسی پر ہے - اُن میں جن کتابوں کے نام ہیں - اس کا یہ منشا نہیں ہے - کہ وہ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی ہیں - بلکہ علوم شرقی کے ذکر میں ان کا نام آیا ہے - اگر کسی کو اس قدر بھی سمجھ نہ ہو - تو اُس کی بھی زیادہ تشریح کا کوئی مضمون چھاپنا محض بے فائدہ ہے - یہ میں جانتا ہوں - کہ وہاں ان کتابوں کا ترجمہ پڑھایا جاتا ہے - جو انگریزی سکیم میں ہیں - ان کی نسبت میں نے لکھا ہے - کہ پُرانی تدبیر ہے - جو ناقص قرار پا کر چھوڑ دی گئی - معہذا ترجموں سے ترقی اعلیٰ درجے کی ناممکن ہے - پس میرے نزدیک اس مضمون کے لکھنے پر زیادہ تر صرف اوقات محض فضول ہے - پنجاب یونیورسٹی کالج ضرور یونیورسٹی ہو جائے گا - لارڈ رپن کی ایسی ہی پالیسی ہے - بلکہ اکثر حکام کی - افسوس یہ ہے - کہ خود ہندوستانی اپنا بھلا برا نہیں سمجھتے - اب ہم اس قابل ہوں تو کچھ مشکل نہیں ہے - گورنمنٹ کی کچھ بھی پالیسی ہو ہم کو وہ کرنا چاہئے - جو ہمارے لئے فی الواقع مفید ہے - والسلام - خاکسار سید احمد

علیگڑھ - ۸ر دسمبر سنہ ۱۸۸۰ء

جب وہ دو نو بہنیں پانی بھرنے جاتی ہیں - تو اس جگہ آتی ہیں - اور مسکراتی ہیں - وہ ضرور اس سے آگاہ ہونگی کہ کوئی شخص درختوں کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے - جب کبھی وہ پانی بھرنے جاتی ہیں +

جب وہ دو نو بہنیں اس جگہ پر سے گزرتی ہیں - تو ایک دوسری سے کچھ سرگوشیاں کرتی ہیں - انہوں نے ضرور اس شخص کا بھید معلوم کر لیا ہے - جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے - جب کبھی وہ پانی بھرنے جاتی ہیں +

جب وہ اس جگہ پہنچتی ہیں - تو یکایک ان کی کلسیاں ڈگمگا جاتی ہیں اور پانی چھلک جاتا ہے +

انہوں نے جان لیا ہوگا کہ اس شخص کا دل دھڑک رہا ہے - جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے - جب کبھی وہ پانی بھرنے جاتی ہیں +

جب وہ دو نو بہنیں اس جگہ آتی ہیں - تو ایک دوسری کی طرف دیکھتی ہیں - اور مسکراتی ہیں - ان کے تیز قدم پاؤں میں ایک قہقہہ پوشیدہ ہوتا ہے - جو اس شخص کے دل میں ہلچل ڈال دیتا ہے - جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے - جب کبھی وہ پانی بھرنے جاتی ہیں +

(ٹیگور)

ماں کی دُعا

راجہ دھرت راشٹر:۔ کوروں کا نابینا راجہ +

راجکمار دریودھن:۔ اس کا بیٹا جس نے ابھی جوئے کے ایک کھیل میں جیت حاصل کی ہی۔ اور اس سے اس کے چچیرے بھائی پانڈوں کو اپنی ملکت کھونا اور بن باس قبول کرنا پڑا ہی +

رانی گاندھاری:۔ دریودھن کی ماں +

دھرت راشٹر

تمہیں جس چیز کی جستجو تھی وہ تم نے حاصل کر لی +

دریودھن

میں نے کامیابی حاصل کی ہی +

دھرت راشٹر

کیا تم خوش ہو؟

دریودھن

میں فیروزمند ہوں +

دھرت راشٹر

میں پھر تم سے دریافت کرتا ہوں کہ ایک غیر منقسم ملکت حاصل کر کے تمہیں کیا خوشی ہوئی؟

دریودھن

پتاجی ایک کشتری کی تشنگی خوشی کے لئے نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ فتح کا، اس آتشیں شراب فتح کا پیاسا ہوتا ہی جو کھولتی ہوئی رقابت سے کشید ہوتی ہی + ہم ہیبت زدہ طور پر خوش وخرم تھے جب ہم اپنے چچیرے بھائیوں کی فرمانروائی میں یوں امن سے رہتے تھے جیسے بدرکال کے سینے پر خفیف داغ افسردہ پڑے ہیں۔ یہ پانڈو تمام عالم کی دولت بٹور رہے تھے۔ اور اس میں برادرانہ تحمل سے ہمارا حصہ بھی روا رکھتے تھے لیکن اب کہ وہ اپنی شکست کے معترف اور بن باس کے لئے تیار ہیں میں خوش ہی نہیں بلکہ پھولا نہیں سماتا +

دھرت راشٹر

کمبخت تو بھول گیا ہی کہ پانڈو اور کورو کے باپ دادا ایک ہی تھے +

دریودھن

اس کو فراموش کرنا مشکل تھا۔ اور اسی لئے ہمارا اور ان کا فرق میرے دل میں اور زیادہ کھٹکھتا تھا + آدھی رات کا چاند دوپہر کے آفتاب سے کبھی حسد نہیں رکھتا لیکن اُفق کو تقسیم کرنے کے لئے دونوں کروں کی کشمکش ہمیشہ کے لئے جاری نہیں رہ سکتی + پرماتما کا شکر ہی کہ وہ کشمکش تمام ہوئی۔ اور ہم نے آخرکار تنہائی و یکتائی کی شان وشوکت حاصل کر لی +

دھرت راشٹر

یہ کمینہ حسد ہی!

دریودھن

حسد کبھی کمینہ نہیں ہوتا۔ یہ بڑے آدمیوں کی فطرت ہی۔ صرف گھاس ہی مل جل کر گنجان پیدا ہو سکتی ہی عظیم الشان درخت یکجا نہیں پھول پھل سکتے + ستارے گچھوں میں رہتے ہیں لیکن سورج اور چاند اپنی درخشانی میں تنہا ہیں + پانڈوں کا زرد رو چاند کوروں کے جدید الطلوع آفتاب کو شادمانی کے لئے چھوڑ کر درختوں کے سائے کے پیچھے غروب ہو رہا ہی +

دھرت راشٹر

لیکن جو حق تھا اسے شکست ہوئی +

دریودھن

جو راجہ کے لئے حق ہی۔ وہ وہ نہیں جو پرجا کے لئے ہو+ لوگ باہمی رفاقت میں نشو ونما پاتے ہیں لیکن راجہ کے ہمسر اس کے دشمن ہیں + وہ اگر مقابل میں ہوں۔ تو باعث مزاحمت ہیں۔ اور اگر پشت پر ہوں تو ایک دہشت ہیں + ایک راجہ کی سیاست میں بھائیوں اور دوستوں کے لئے کوئی جگہ نہیں اس کی ایک مستحکم بنیاد "فتح" ہو +

دھرت راشٹر

جوئے میں دھوکے سے بازی لے جانے کو میں فتح کے نام سے موسوم کرنے سے انکار کرتا ہوں +

دریودھن

انسان کے لئے یہ باعث عار نہیں۔ اگر وہ شیر کو برابر کی شرطوں پر پنجوں اور دانتوں سمیت دعوت مقابلہ نہیں دیتا+ ہمارے اسلحہ وہ ہیں جو ہمیں خودکشی کی نہیں بلکہ کامرانی کی راہ دکھاتے ہیں + پتا جی۔ میں حصول مقصد پر نازاں ہوں۔ اور وسائل پر متاسف ہونے کی پرواہ نہیں کرتا +

دھرت راشٹر

لیکن انصاف :-

دریودھن

فتح حاصل کرنے سے پیشتر صرف نادان انصاف کے خواب دیکھتے ہیں لیکن جو راجہ بننے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ اس قوت پر بھروسا رکھتے ہیں۔ جو رحم کا نام نہیں جانتی اور شبہات کے بوجھ تلے دبی ہوئی نہیں ہوتی +

دھرت راشٹر

تمہاری کامیابی سے تم پر بلند آہنگ اور غضبناک تہمتوں کا طوفان چڑھ رہا ہی +

دریودھن

نہایت تھوڑے وقت میں عوام کو معلوم ہو جائے گا کہ دریودھن ان کا راجہ ہی۔ اور تہمتوں کو پامال کرنے کی قوت رکھتا ہو +

دھرت راشٹر

تہمت نوک زبان پر رقص کرتی ہوئی درماندہ ہو کر مرتی ہی اس کو دل کے خفیہ امن میں پناہ دے کر یہ قوت نہ ہونے دو+

دریودھن

ناگفتہ بدگوئی راجہ کی عظمت کو ہاتھ نہیں لگا سکتی + لوگ ہمارے ساتھ محبت کرنے سے انکار کریں۔ تو مجھے پرواہ نہیں لیکن گستاخی برداشت نہ ہو سکے گی + محبت کرنا محبت کرنے والے کی مرضی پر منحصر ہی۔ اور مفلس سے مفلس اس فیاضی میں مصروف ہو سکتا ہی + محبت انہیں اپنی پیاری بلیوں۔ پالتو کتوں اور ہمارے نیک چچیرے بھائیوں پر ضائع کرنے دو میں ان پر رشک نہ کروں گا + لیکن خوف وہ خراج ہی۔ جس کا میں اپنے تخت شاہی کے لئے مطالبہ کرتا ہوں + پتا جی۔ تم اصل میں نہایت فراخ دلی سے ان لوگوں کی باتوں پر کان لگا دیتے ہو جو تمہارے بیٹوں پر تہمت لگاتے ہیں لیکن اگر آپ اپنے ان نیک دوستوں کو اپنی اولاد کی زبان پر بھی ایسی سخت بدگوئی میں مصروف رہنے دیں گے تو پھر ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنی سلطنت کو چچیرے بھائیوں کے بن باس سے بدل لیں۔ اور ویرانوں کو چلے جائیں۔

جہاں خوش قسمتی سے دوست کبھی ارزاں نہیں ہوتے +

دھرت راشٹر

اگر میرے دوستوں کی پرخلوص تنبیہ میرے دل سے
بیٹوں کی محبت کم کرسکتی۔ تو ہم محفوظ رہ سکتے تھے لیکن
میں اپنے ہاتھ تمہاری تہمتوں کی کیچڑ میں ڈبو چکا ہوں۔
تمہاری خاطر میں نے اپنے شاہانہ شجرے کے قدیم درخت کو
بے پروائی سے آگ لگا دی ہے۔ میری محبت اس قدر خوفناک
ہے۔ تم میرے سینے سے چمٹے ہوئے ہو۔ اور ہم ایک ٹوٹے ہوئے
شہاب ثاقب کی طرح ایک تاریک تنزل میں گر رہے ہیں +
اس لئے میری پدرانہ اُلفت پر شک نہ کر۔ اپنے چمٹے ہوئے
بازو ڈھیلے نہ چھوڑ جب تک ہم ساحل فنا پر نہ پہنچ جائیں +
اپنی فتح کے نقارے بجاؤ۔ اور اپنی کامرانی کے پھریرے
اُڑاؤ + خوشی کے اس دیوانہ ہنگامے میں بھائی اور دوست
منتشر ہو جائیں گے اور بدبخت باپ۔ بدقسمت بیٹے اور
پرماتما کی لعنت کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے گا +

(خادم داخل ہوتا ہے +)

مہاراج۔ رانی گاندھاری باریابی کی خواہشمند ہیں +

دھرت راشٹر

میں ان کا منتظر ہوں +

دریودھن

میں رخصت چاہتا ہوں + (جاتا ہے)

دھرت راشٹر

بھاگ جا! کیونکہ تو اپنی ماں کی موجودگی کی آگ برداشت
نہیں کرسکتا +

(رانی گاندھاری دریودھن کی ماں داخل ہوتی ہے)

گاندھاری

میں آپکے چرنوں میں ایک عرض لے کر آئی ہوں +

دھرت راشٹر

تمہاری آرزو کے اظہار ہی میں تکمیل شامل ہے +

گاندھاری

وقت آگیا ہے کہ ہم اسے عاق کردیں +

دھرت راشٹر

میری رانی کس کو؟

گاندھاری

دریودھن کو +

دھرت راشٹر

اپنے بیٹے دریودھن کو؟

گاندھاری

ہاں!

دھرت راشٹر

راجاؤں کی ماں۔ تمہاری یہ غرض ہولناک ہے +

گاندھاری

یہ التجا میری ہی نہیں۔ یہ کوروں کے باپ دادا کی بھی ہے
جو سُورگ میں ہیں +

دھرت راشٹر

پرمیشور اس کو سزا دے گا جس نے اس کی قانون شکنی کی ہے
لیکن میں اس کا باپ ہوں +

گاندھاری

اور کیا میں اس کی ماں نہیں؟ کیا میں نے اسے اپنے ممتا
سے دھڑکتے سینے پر نہیں اُٹھایا؟ لیکن میری تم سے التجا ہے

کہ سیاہ باطن دریودھن کو عاق کر دو +

دھرت راشٹر

اور اس کے بعد ہمارے لئے کیا رہ جائے گا ؟

گاندھاری

پرماتما کا فضل +

دھرت راشٹر

اور اس سے ہمیں کیا ملے گا ؟

گاندھاری

نئی مصائب + ہم اپنے سینے میں اپنے فرزند کی موت کی اور بدی کی قیمت پر حاصل کردہ نئی سلطنت کا غرور یہ خوشی کے دو کانٹے کیوں کر برداشت کر سکتے ہیں ؟ پانڈو ہمارے ہاتھوں سے اس دیس کو کبھی واپس لینا قبول نہ کریں گے۔ جو وہ دے چکے ہیں + لہٰذا ہمارے لئے یہی مناسب ہو کہ اپنے سر پر کوئی ایسا بڑا غم لیں جو اس غلطی کا خمیازہ ہو +

دھرت راشٹر

رانی۔ تم مجروح دل پر نمک پاشی کر رہی ہو +

گاندھاری

مہاراج۔ اپنے بیٹے پر عاید کردہ سزا اُس سے زیادہ ہمارے لئے ہوگی۔ اگر منصف اپنی دی ہوئی تکلیف کی طرف سے بے حس ہو تو اسے انصاف کرنے کا کوئی حق نہیں + اور اگر تم اپنے آپ کو درد و الم سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنا وہ فیصلہ واپس لے لوگے جو تم اپنے بیٹے کے حق میں صادر کر چکے ہو۔ تو جتنے مجرموں نے تمہاری عدالت میں سزائیں پائی ہیں وہ سب پرماتما کے تخت کے روبرو انتقام کی فریاد کریں گے کیونکہ کیا ان کے بھی باپ نہ تھے ؟

دھرت راشٹر

رانی۔ پرماتما کے لئے اب بس کرو + ہمارے بیٹے کو ایشور نے عاق کر دیا ہی اور یہی وجہ ہو کہ میں اسے عاق نہیں کر سکتا اس کو بچانا اب میرے بس میں نہیں۔ اور اس لئے میرے اطمینان کی محض یہ صورت ہو کہ اس کے گناہ میں حصّہ لوں اور تباہی کے راستے پر اُس کا تنہا رفیق بن کر اس کے ساتھ ہی گر جاؤں + جو کچھ ہو چکا ہو چکا اور جو ہونا ہے ہونے دو + (جاتا ہی)

گاندھاری

میرے دل۔ چپ ہو جا۔ اور صبر سے خدائی فیصلے کا انتظار کر + بھول جانے والی رات فرسودہ ہوتی جاتی ہی۔ روزِ شمار کی صبح آ رہی ہی۔ اور وقت جاگ رہا ہی کہ اس کے شنگا فوں کو رفو کر دے + اس کی رتھ کی گرجتی ہوئی آواز میرے کانوں میں آ رہی ہو + اے عورت اپنا سر نیاز خاک پر جھکا دے۔ اور اپنا دل قربانی کے لئے اس کی راہ میں ڈال دے + کہ اس کے پہیوں سے پامال ہو + اور پھر تاریکی آسمان کو ڈھانک لے گی۔ زمین لرز اُٹھے گی۔ آہ و بکا کی صدائیں ہوا کا دامن چاک کر دیں گی + اور پھر خاموش اور ظالم انجام۔ ہولناک امن۔ ایک عظیم الشان فراموشی۔ نفرت کی فنائے مہیب آپہنچے گی۔ اور موت کی آگ سے ایک نجاتِ ارفع بلند ہوگی +

مترجمہ سیّد امتیاز علی تاج

از (رابندرا ناتھ ٹیگور)

(در رسالہ ماڈرن ریویو کلکتہ)

دل زیر سنگ

"ساری کائنات کا سمٹ کر صرف ایک ہستی میں سما جانا" "اک تنہا ہستی کا، پھیل کر الٰہیانہ وسعت اختیار کرلینا" یہ ہے محبت"

"محبت سلام ہے فرشتوں کا تاروں کو"

"کیسی مغموم ہے وہ روح، جو غمزدہ محبت ہو"

"کسی ایسی ہستی کا نہ پایا جانا، کہ صرف اسی سے خلائے عالم پُر کیا جاسکتا ہے، کیسا اُداس منظر ہے۔ کس قدر دُرست ہے یہ خیال کہ محبوب ہو جانا گویا خدا ہو جانا ہے۔ ایک شخص یہ خیال کرسکتا کہ خدا محبوب پر رشک کرتا ہے، اگر یہ یقین نہ ہوتا کہ ساری کائنات صرف رُوح کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور رُوح صرف محبت کے لئے"

کسی کے سیاہ بالوں کا پیٹھ پر ہوا سے منتشر ہو جانا، کافی ہے کہ رُوح کو ہمیشہ کے لئے سُلا دے ممکن ہے کہ زیر نقاب اک ہلکی سی شعاعِ تبسم، رُوح کو بیداریِ دوام میں تبدیل کر دے لیکن مجھے اس کا ہوش نہیں"

"خدا کو موجوداتِ عالم چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ موجودات تاریک ہیں، دھندلی ہیں لیکن کسی سے محبت کرلینا ساری کائنات کو شفاف بنا دینا ہے"

"بعض خیال دعا ہوتے ہیں۔ زندگی میں کچھ لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُس وقت جسم انسانی خواہ کسی حال و انداز میں ہو لیکن روح دوزانو ہوتی ہے"

"ایک دوسرے سے جدا ہو کر، عاشق و معشوق، ہزاروں طریقے تکلیف جُدائی کو فریب دینے کے لئے پیدا کرلیتے ہیں یوں بظاہر وہ نہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں لیکن خط و کتابت کے لئے وہ بیشمار مخفی ذرائع رکھتے ہیں۔ وہ حکم دیتے ہیں طیور کے نغمے کو، پھولوں کی نکہت کو، کلیوں کے تبسم کو، چاند کی روشنی کو، تاروں کی شعاعوں کو اے بہار، تو بھی ایک خط ہے جو میں اُسے لکھتا ہوں"

"صرف محبت ہی وہ چیز ہے جس سے ابدیت معمور ہو سکتی ہے۔ غیر محدود کو پُر کرنے کے لئے غیر فانی چیز کی ضرورت ہے"

محبت ایک جزو ہے رُوح کا۔ رُوح کی طرح محبت بھی اک شعلۂ اُلوہیت ہے۔ رُوح کی طرح محبت بھی غیر فانی ہے اور نا قابلِ تجزیہ۔ وہ اک نقطۂ آتشیں ہے جو ہمارے اندر پایا جاتا ہے وہ غیر محدود ہے اور غیر فانی۔ نہ اُسے کوئی چیز محدود کرسکتی ہے اور نہ وہ کسی چیز سے بجھ سکتی ہے۔ ہم اُسے اپنے مغز استخواں کے اندر جلتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ اور آسمان کے عمق میں اُس کی شعاعوں کو منور"

"اے میری محبت، اے میری پرستش، اے اُن دو نفوس
کی روشنی جو ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں، اے
اُن دو دلوں کی ضیاء جو ایک دوسرے میں سما جاتے ہیں،
اے اُن دو نگاہوں کی تنویر جو ایک دوسرے میں تحلیل ہو
رہی ہیں۔ تو میرے پاس آئے گی۔ کیا تو نہ آئے گی، اے
میری مسرت! وہ تنہائیوں میں ساتھ مل کر چلنا! وہ مسرور
و منور دنوں کا طلوع! بعض اوقات میں نے خواب میں معلوم
کیا ہے کہ کبھی کبھی چند ساعتیں فرشتوں کی زندگی سے جدا ہو کر
یہاں زمین پر کچھ لوگوں کی قسمتوں میں نفوذ کر کے بسر ہوتی ہیں۔"

"خدا دو محبت کرنے والے دلوں کی مسرت میں کسی
چیز کا اضافہ نہیں کر سکتا، سوائے اس کے کہ وہ اُن کو
دوام بخش دے۔ محبت کی زندگی کے بعد، محبت کا دوام
یقیناً اک اضافہ ہے لیکن محبت کی شدت میں کسی ناقابل
بیان لذت کا اضافہ، جو محبت رُوح کو عطا کر چکی ہے۔ خدا کے
لئے بھی ناممکن ہے۔ خدا معموری ہے کائنات کی اور محبت
معموری ہے انسان کی۔"

"تم ستاروں کو دیکھتے ہو اس لئے کہ وہ منور ہیں اور
ناقابل فہم مگر تمہارے پہلو میں اُن سے زیادہ نرم روشنی
اور اُن سے زیادہ عظیم راز موجود ہے — عورت —"

ہمارے لئے اس دنیا میں بعض ہستیاں بھی ہیں جنہیں
ہم تنفس کر سکتے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو ہمارا دم گھٹ جائے
اور ہم مر جائیں۔ فقدان محبت سے مرجانا بھی کیسا مہیب
مرجانا ہے۔ رُوح کا تعطلِ مطلق۔"

"اُس دن جب ایک عورت تمہارے سامنے سے گزرتی
ہوئی تمہارے اوپر روشنی ڈالتی ہے، تم کھو جاتے ہو۔ تم محبت
کرنے لگتے ہو۔ پھر اُس وقت تمہارے لئے صرف ایک شغل
رہ جاتا ہے۔ اُس کو سوچنا، یہاں تک سوچنا کہ وہ بھی تمہیں
سوچنے لگے۔

"وہ چیز جسے محبت شروع کرتی ہے، صرف خدا ہی سے
انجام تک پہنچائی جا سکتی ہے۔"

"تم اگر پتھر ہو تو سنگِ مقناطیس بننے کی کوشش کرو،
تم اگر درخت ہو تو لجالو بنو، تم اگر انسان ہو تو محبت کرنا سیکھو۔"

محبت کے لئے کوئی چیز کافی نہیں۔ ہم کو مسرت حاصل
ہوتی ہے تو ہم فردوس کی خواہش کرتے ہیں، ہم کو فردوس
حاصل ہوتی ہے، تو ہم کونین کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ اے
وہ لوگو، جو محبت کرتے ہو، سب کچھ محبت ہی میں ہے۔ اُس
کے پا لینے میں ذرا فراست سے کام لو۔"

"محبت میں اک نوع کی طفولیت ہے اور دوسرے
جذبات میں چھوٹا پن۔ پھر شرم ہے اُن جذبات پر جو انسان
کو چھوٹا بنا دیں اور عزت ہے اُس جذبہ کے لئے جو اُسے
بچہ بنا دیں۔"

"ایک عجیب غریب بات! کیا تم اُسے جانتے ہو؟ میں رات میں ہوں اور ایک ہستی ابھی ابھی میرے پاس سے گزری اور سارے آسمانوں کو اپنے ساتھ لے گئی"

"آہ، ایک ہی مزار میں پہلو بہ پہلو دفن ہونا، ہات کا ہات سے ملا رہنا اور کبھی کبھی تاریکی میں اک نازک انگلی کا کھینچ دینا میرے دوام کے لئے کافی ہو"

"محبت اک ملکوتی تنفس ہی ہوائے فردوس کا"

"تم اگر اذیت میں ہو، اس لئے کہ تم محبت کرتے ہو، تو اور زیادہ محبت کرو، کیونکہ محبت میں مرجانا، محبت کے ساتھ زندہ رہنا ہی"

"میں نے گلی میں ایک نہایت غریب شخص کو دیکھا، جو کسی سے محبت کرتا تھا، اُس کی ٹوپی پھٹی ہوئی تھی اور سارا ملبوس تار تار۔ پانی اُس کے جوتوں کے اندر سے ہو کر گزرتا تھا۔ اور ستارے اُس کی رُوح کے اندر سے"

"اگر دنیا میں ایک بھی محبت کرنے والا دل باقی نہ رہے تو آفتاب اپنی حرارت کھو بیٹھے"

نوٹ۔ یہ تھا وہ خط جو ایک شخص نے لکھ کر اپنی محبوبہ کے باغ میں پتھر کے نیچے دبا کر رکھ دیا تھا۔ (دلِ زیر سنگ) (ملخص) **نیاز فتحپوری**

میں اس طرح بھاگتا ہوں۔ جیسے ایک آہوئے مشکیں جنگل کے سائے میں اپنی خوشبو سے مست ہو کر بھاگتا ہی

رات مئی کی درمیانی رات ہے۔ ہوا جنوب کی ہوا ہی

میں اپنا راستہ بھول جاتا ہوں۔ اور بھٹکتا پھرتا ہوں۔ میں اس شے کی تلاش کرتا ہوں جسے نہیں پا سکتا۔ میں اس شے کو پا لیتا ہوں جس کی تلاش نہیں کرتا

میرے دل میں سے میری اپنی آواز کا مجسمہ باہر نکل آتا اور ناچنے لگتا ہی۔ یہ چمکتا ہوا منظر پرواز کرتا ہی

میں اسے اچھی طرح دبوچ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے بچ نکلتا اور مجھے گمراہ و آوارہ کر دیتا ہی!

میں اس شے کی تلاش کرتا ہوں۔ جسے نہیں پا سکتا۔ میں اس شے کو پا لیتا ہوں جس کی تلاش نہیں کرتا

(ٹیگور)

دیوانی کی سرگزشت

کاظمی کی حالت ظاہری میں مرض کا تو کوئی اثر نہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر ڈاکٹر نے جو شبہ ساجد کے دل میں ڈال دیا کچھ اس لئے نہیں کہ وہ وہمی آدمی تھا اور نہ اس لئے کہ سول سرجن کی رائے ہی بلکہ اس تخیل سے کہ اگر خدانخواستہ سل شروع اور مرض ترقی کر گیا تو انجام کیا ہوگا کسی طرح رفع نہ ہوتا تھا۔ شکایت کچھ نہ تھی۔ مگر دوا بدستور۔ تکلیف کا پتہ نہ تھا۔ لیکن علاج کا سلسلہ جاری۔ وہ علی الصباح ایک روز شفا خانہ گیا ڈاکٹر صاحب زنانہ حصہ میں تھے وہیں بلوالیا۔ ایک عورت کو دوا پلا رہے تھے صورت آشنا تھی غور سے دیکھتا ہوا اور وہیں دیوانی ساجد کو دیکھ کر کفن پوش مسکرائی اور کہنے لگی۔

کئی سال بعد آج میرا دل ذرا ٹھیک ہوا ہے مجھے تیری حالت پر رحم آتا ہے تو میرے پنجہ میں پھنسا اپنی ساس کے مکر سے ہشیار رہیو وہ اپنے فن میں یکتا اور اپنے نام کی ایک ہے۔

(ساجد) میں مدت سے تمہارا حال معلوم کرنے کا منتظر ہوں اگر اس وقت کچھ بیان کرو تو بڑا احسان ہو۔

(دیوانی) میرا سر جو ہمیشہ ایک پہاڑ میں دبا رہتا تھا میری گردن جس پر سدا منوں کا بوجھ تھا آج پھول ہیں۔ میرا بدن جو ہر وقت آگ کی طرح بھنتا تھا میری آنکھیں جن سے رات دن شعلے نکلتے تھے۔ اس وقت ٹھنڈے برف ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے میں دوزخ سے جنت میں آگئی۔

مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ سپاہیوں نے زبردستی میری مشکیں باندھ یہاں داخل کر دیا۔ نگران کا ظلم میرے واسطے کرم ہو گیا میں اب بالکل تندرست ہوں۔ تو میرے زخموں کو چھیڑتا ہے۔ اچھا اے سن میں کیا ہوں۔

تیری ساس کائنات کی اُن قابل ملامت ہستیوں میں سے جن کے اعمال سیاہ صفحہ دنیا پر ہمیشہ ہمیشہ روشن رہیں گے میں اس کی حقیقی بہن ہوں میں نے اس کی ماں کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے اس کے باپ کی گود میں سر رکھا جن چھاتیوں نے اس کو پال پوس کر ظلم کے قابل کر دیا یا اس میں دودھ سے پل کر اور بڑھ کر میں اس کی بیرحمی کا شکار ہونے کے لایق ہوئی۔ میں وہ ہوں جو اس کے دودھ میں برابر کی شریک۔ میں وہ ہوں جس کا خون جس کا گوشت جس کی ہڈی جس کا پوست اس سے جدا نہیں مگر وہ بہن کی صورت میں ڈائن اور ماں جائی کی حیثیت میں قصائی نکلی دنیا مجھے دیکھے اور سبق لے۔ لوگ میری سنیں۔ اور عبرت پکڑیں میں مصیبت کی مجسم تصویر اور خواب ظلم کی مکمل تعبیر ہوں میری زندگی بتائے گی کہ محبت بھری آنکھوں اور شفقت آمیز نظروں سے خون برسا۔ میں تم دنیا داروں کو دکھاؤں گی کہ جس سینہ سے دریائے محبت اُبلنے کی توقع تھی۔ اس سے شرارے نکلے۔ جو صورت باپ سے مشابہ اور ماں سے ملتی ہوئی تھی اور جس کو دیکھ کر باپ کی یاد اور ماں کا خیال تازہ ہوتا تھا جس ہستی سے ماں اور باپ دونوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تھی اس نے ظلم کا خنجر میری گردن پر رکھا۔ اور جو ہاتھ ماں کے بعد اور باپ کے پیچھے شفیق و رفیق تھے۔ انہوں نے میرا گلا گھونٹا۔ ماں کی چہیتی اور باپ کی پیاری ناشاد بہن نے مجھے برباد کیا۔ میں وہ ہوں جس کا نیر کیا

ظالم ساس نے عمر بھر کے واسطے ناس کر دیا

میں اُس شخص کی بیوی ہوں جس سے بہتر انسان میری آنکھوں نے آج تک نہیں دیکھا۔ وہ اس صورت کی جس سے اب دُنیا ڈر کر بھاگتی اور دیکھ کر گھبراتی ہو پرستش کرتا تھا وہ بتا گیا کہ کیوں کر اور دکھا گیا کہ کس طرح شریف اور نیک شوہر بدصورت اور بدسیرت بیویوں کی قدر کر سکتے ہیں خدا اس کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اس نے شادی کے بعد اپنے گھر پر کوار پتہ کی سے بے نکاری اور ماں کی چوکھٹ دل سے بھلا دی میں ساحر ہوں یا کافر دیوانی ہوں یا سیاپی مگر میرا یہ عقیدہ ہو۔ اور ایمان۔ رائے ہو اور یقین کہ اس پاک انسان اور نیک شخص کو دنیا میں رہنا تھا وہ کچھ کرتا اور کچھ دکھاتا مگر میری بدنصیبی موت بن کر اس پر نازل ہوئی اور وہ ہری کونپل جس کی مہک ایک عالم کو معطر اور ایک دنیا کو مسخر کر رہی تھی محض میرے مقدر سے خاک سیاہ ہو گئی وہ میرے خانہ عمر میں صرف تین سال کا مہمان تھا اور میری آنکھوں نے وہ وقت دیکھ لیا کہ جن آنکھوں سے قہر آلود نگاہوں کے جواب میں ہمیشہ محبت ٹپکی وہ سدا کو بند ہو گئیں موت اس پیارے کو مجھ سے جدا کر گئی لیکن عمر اس کا خیال مجھ سے دور نہیں کر سکتی ۔ رات اس کے دھیان میں سحر اور دن اس کے ارمان میں بسر ہوتا ہو آفتاب جہانتاب کو قمر چہار دہم کو۔ گرمی کے دنوں کو۔ تاروں بھری راتوں کو کنار دریا پر پہاڑ کی چوٹیوں پر جنگل بیابان میں۔ لق ودق میدان میں ان اُمیدوں پر وداع کیا ہو کہ شاید نظام عالم کا پتہ تغیر میرے سلسلہ فراق میں بھی انقلاب پیدا کر دے۔ سُن او بدنصیب ساجد توجہ سے دیکھ او کم بخت ہستی غور سے ۔ وہ گیا۔ مگر اتنا چھوڑ کر وہ جدا ہوا لیکن اس قدر دے کر کہ اگر یاں کا پیٹ دشمن اور حقیقی بہن بیرن نہ ہوتی تو یہ بدنصیب لاش جو تیرے روبرو شفا خانہ میں پڑی ہو عمر بھر راج کرتی ۔ میں آج یہاں کی روٹی کو محتاج ہوں لیکن جس وقت اس جسمانی ہستی کا روشن چراغ وہ قابل ناز ہستی مجھ سے جدا ہوئی تو یہ آٹھ ہزار روپیہ کی مالک تھی ۔ ساجد میرے کتوں تک کو روٹی کی کمی نہ تھی میں کھلا کر کھاتی اور پہنا کر پہنتی ۔ شوہر کے بعد اب اگر کوئی وارث تھا اور کہیں ٹھکانا ۔ تو وہ بہن کی صورت اور بہنوئی کا گھر دل کی خوشیاں سہاگ کی چوڑیوں کے ساتھ ختم ہوئیں۔ بیوگی کا برقع سر پر ڈال بہن کے ہاں پہنچی ۔ اور جو اثاثہ پاس تھا اس کے سپرد کر دیا آسمان کے فرشتے اور اس گھر کے در و دیوار میرے بیان کے شاہد ہیں ۔ روپے کا لالچ پردہ بن کر بہن کی آنکھوں پر پڑا اور وہ میری موت کے فکر میں پڑی ۔ یہ ہو تمہاری دنیا کی حقیقت اور دنیا والوں کی اصلیت؟ یہ ہیں تمہارے حقیقی رشتے اور سچی محبت ؟ میں جانتی ہوں اور اچھی طرح مجھے معلوم ہو اور تم سب سے بہتر کہ باپ دادا کی لاج بڑوں کی آن ۔ خاندان کی عزت اور بزرگوں کی وقعت میری وجہ سے ختم ہوئی ۔ لیکن تمہارا خیال غلط تمہاری رائے جھوٹی ۔ تمہارا قیاس لغو اور تمہاری عقل اوندھی ۔ تمہارا خیال الزام ۔ تمہاری عقل اتہام ۔ تمہارا قیاس بہتان ۔ تمہاری رائے طوفان ۔ میں بے گناہ ہوں بے قصور ہوں مجبور ہوں ۔ معذور ہوں اس کی تمام ذمہ داری اور ذمہ داری کا تمام بار اس عورت کی گردن پر ہو جس کو قدرت نے بہن بنا کر بھیجا ۔ اور جو بہشتن ماں کی یادگار اور جنتی باپ

کی نشانی تھی +

اس نے مجھ کو اناڑوں کے قیمہ میں پارہ اور پراٹھوں میں
دھتورا دیا۔ میں نے آدھا ہی پیٹ کھایا تھا کہ بدن میں آگ
پھک گئی اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔ جب ہوش آیا تو گو حالت
خراب تھی مگر دماغ کچھ کام کر رہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ سطح
آسمان موتیوں سے جگمگا رہی تھی اور ایک لق و دق جنگل
میں درختوں کے پتے میری بیکسی پر کف افسوس مل رہے
تھے وہ جنگل کی ڈراؤنی رات اور ہو کا عالم کلیجہ لرز رہا تھا
میری بات کا یقین کرنا میں ہمیشہ کی ایسی نہیں ہوں میں
بھی کبھی پردے میں رہتی تھی۔ اور مجھ پر وہ وقت گزرا ہے
کہ بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک سے دوڑ کر کمرہ میں گھس
جاتی تھی۔ میری اس وقت کی حالت کا اندازہ کرو۔ آبادی
صحرا نے جنگل سر پر اٹھا رکھا تھا میری روح فنا اور دم خشک
ہو رہا تھا جدھر نظر ڈالتی تھی تنہائی اور جس طرف آنکھ اٹھاتی
تھی اندھیرا جسم آگ میں غرق اور زبان شعلوں سے لبریز۔
اس زبردست طاقت کے سوا وہ جب بھی تھی اور اب بھی
ہے اور جب میں نہ ہوں گی جب بھی ہو گی کوئی میرا مددگار نہ تھا
میں چلتی تھی اور گرتی تھی۔ بڑھتی تھی اور بیٹھتی تھی ہوا کے جھکڑ
اژدہوں کی پھنکار درختوں کا غل شور۔ جانوروں کی چیخیں
دہاڑ کس کس کا رونا روؤں۔ مختصر یہ کہ اس حالت میں جدھر
منہ اٹھا۔ ادھر ہو لی + میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ میں ایک گھر
کی ملکہ اور اس شوہر کی بیوی رہ چکی ہوں جس کا پلڑا میزان
محبت میں تمام دنیا سے برتر ہو گا۔ ساجد اس دیوانی نے نوکروں دل
پر حکومت اور شوہر پر سلطنت کی ہے۔ یہ میری عدت کا زمانہ اور
بیوگی کی مدت تھی میرا گھر اجڑے سترھواں روز تھا۔ اور

ابھی میری آنکھیں سہاگ کا نقشہ نہ بھولی تھیں کہ مصیبت
کا یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بتاؤ کیسا تھا وہ وقت جب ایک بیوی جس کے
قدموں میں کل تک شوہر آنکھیں بچھا رہا تھا اندھیرے گھپ اور
جنگل بیابان میں رات کے وقت تن تنہا کانٹوں پر پاؤں
رکھتی چلی جا رہی تھی + میرا حوصلہ پست ہوا۔ میرے قدم شل ہو گئے
میرا جی چھوٹ گیا میری ہمت ٹوٹ گئی۔ پیاس کے مارے
میری زبان باہر نکل پڑی میں تھک کر گر گری اور حسرت سے
آسمان کی طرف دیکھا۔ میری آنکھیں خاموش اور میری
زبان بند تھی۔ مگر میرا دل خدا کے حضور میں رویا۔ قدرت کی
امانت میری مصیبت پر دوسری صورت میں ظاہر ہوئی۔
تارے جھلملائے اور بلبل صبح میری بدنصیبی پر روئی پو پھٹ
رہی تھی اور روز روشن میری دستگیری کو جلدی جلدی قدم
بڑھا رہا تھا۔ میں پھر اٹھی اور ایک طرف چلی۔ دن اسی حال
میں کٹا۔ بھوکی پیاسی لق لق کرتی گرتی پڑتی تڑپتی تڑپاتی
چلی جا رہی تھی۔ کہ شام کے وقت مجھے شہر پناہ دکھائی دی
جب اندر داخل ہوئی تو دنیا اپنے چہرہ پر رات کا برقع اوڑھ
چکی تھی۔ سڑکوں سے ناواقف۔ کوچوں سے نابلد۔ رستہ
سے ناآشنا ساکت کھڑی تھی۔ ضرورت تھی مگر دل گوارا نہ
کرتا تھا کہ غیر مرد سے بات کروں اور رستہ پوچھوں۔ آدھی
رات کے قریب بہن کے گھر پہنچی دروازہ کھلا ہوا تھا۔
اندر گئی تو بہن بہنوئی جو مجھ کو مردہ سمجھ کر یا مردہ ہونے والی
جان کر جنگل میں ڈال آئے تھے۔ سر جوڑے کچھ حساب کتاب
کر رہے تھے۔ میری آہٹ سے ان کے کان کھڑے ہوئے
اور میری صورت دیکھ کر ان کی امیدیں خاک میں مل گئیں
بہن آگے آئی اور کہا ــــ

"نکل اس گھر میں سے مردار ہمارے ہاں کیوں آئی تو کون ہی غارت ہو"

میں نے حسرت سے اس کی طرف دیکھا اور صرف اتنا کہا "دو قطرے پانی کے میرے حلق میں ٹپکا دے"

اس نے میری التجا پر رحم نہ کھا ایک لات ماری اور کہا "نکل جلدی" میں گر پڑی مجھ سے اٹھا نہ جاتا تھا میں نے ہاتھ جوڑے مگر اس کا دل نہ پسیجا اور یہ ہی کہتی رہی کہ یہاں سے نکل جا۔ میں نے تب اتنا کہا کہ میرا روپیہ؟

اس پر وہ آگ بگولا ہو گئی۔ اور مجھے مارنا شروع کیا +

پارے کا زور دھتورے کا اثر۔ روپیہ کا دھکا مجھے صرف اتنا یاد ہی کہ میری وہ نگاہ جو بہن کی صورت پر اس وقت پڑی اس کا اندازہ تم لوگ نہیں کر سکتے۔ اس کی وقعت صرف وہی خالق الموجودات جانتا ہی جو اس رات میری حالت دیکھ رہا تھا ظالموں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میرا دل الٹ گیا میں دیوانی ہو گئی اور اب اس وقت کی منتظر ہوں جب موت دونوں بہنوں کو اس حاکم کے حضور میں پہنچا دے جس کا فیصلہ اٹل جس کا راج ابدی۔ اور جس کی حکومت لازوال ہی۔ ساجد میں وہ مظلوم ہوں جس کا دل بجھ گیا اور جس کے آنسو خشک ہو چکے اب میرا کلیجہ رو رہا ہی۔ میرا دل تڑپ رہا ہی دیدے دلا دے ساجد میری کھوئی ہوئی عزت میری گئی ہوئی دولت میرا چھٹا ہوا ساجن دے +

خدا کا واسطہ دے۔ دلوا۔ اپنی ساس سے ظالم انوکھی سے +

اس کے بعد مریضہ کی حالت بگڑ گئی اور دیوانگی کا دورہ شروع ہوا تو ساجد چلا گیا +

(راشد الخیری)

اکثر معاملات پر خصوصاً ادب پر اور سب سے زیادہ شعر کے متعلق رائے زنی مجھے ایسی معلوم ہوتی ہی۔ جیسے ایک انڈے کا خالی چھلکا کسی تالاب کی سطح پر پڑا ہوا ہو اور جیسے بلا کا ایک ہلکا سا جھونکا تالاب کے کھڑے پانی پر الٹ دیتا ہو کبھی اس کا ٹوٹا ہوا پہلو دکھائی دیتا ہے۔ اور کبھی ثابت۔ لیکن اس کا کھوکھلا پن ہر وقت ظاہر رہتا ہی +

جب کبھی کسی شاعر کا امتحان کیا جاتا ہی۔ تو لوگ اکثر اسے یا تو آسمان پر چڑھا دیتے ہیں یا ٹکڑے ٹکڑے کر کے قدموں میں روند ڈالتے ہیں۔ اڈیٹروں کا طریق اکثر اول الذکر ہوتا ہی۔ اور ایڈیٹروں کے نقادوں کا موخر الذکر +

تاج زلینڈور

شادی مرگ

مانی جائسی { عرق شرمِ جفا سے اُن کی پیشانی پہ آیا
پسینہ موت کا، افسوس! جیتے جی جبیں پہ تھا }

ایک بیمار سے جو شدید مرض میں گرفتار پڑا کراہ رہا ہو، اگر پوچھا جائے کہ صحت کی وہ کیا قیمت ادا کر سکتا ہے، تو شاید جان، جان سے زیادہ عزیز کوئی چیز جو ہو، اُسے اور صرف اُسی کو مستثنےٰ کر دے، ورنہ اور تو ہر چیز وہ صحت کے معاوضہ میں دینا گوارا کرے گا بشرطیکہ مسلوب الحواس نہیں ہے۔

لیکن ایک مریض تھا جسے بیماری نے صاحبِ فراش بنا رکھا تھا، جس کا کرب [illegible] کے معنی سمجھاتا تھا، جس کی ہر سانس پہ نفسِ مابعد کے لئے ایک اندیشہ مایوسی تھی، جس کا منہ ایک طرف سے دوسری طرف پھرنا عبارت تھی اُس کی زندگی کے کروٹ بدلنے سے اور جس کی ہر جنبشِ نگاہ مفہوم ادا کرتی تھی اُس کی حیات کے آنکھ پھیر لینے کا۔ اسی خیال میں، اسی عالمِ سکرات میں، اُس نے صحت کی حقارت کی سخت حقارت، اور اپنی بیماری کو صحت کیا، دنیا و مافیہا کے داموں بیچنا بھی منظور نہ کیا۔

ہاں جسے مدت العمر التفاتِ محبوب میسر ہی نہ ہوا ہو، جس ناکام کے نزدیک پرسشِ دل نوازانہ اک لفظ بے معنی ہو، اور جس نے مرادِ محبت کو، آہ! اپنے نامراد دل کو جیتے جی جب دیکھا ہو، ضیائے شمعِ حسن سے بیگانہ ہی دیکھا ہو۔ اُس سے پوچھو کہ جو سر اُس کا سرِ زانوئے حبیب اس طرح گزر رہا ہے کہ روح کششِ شوق سے کھچ کے آنکھوں میں آ گئی ہو اور نظر بن کر اپنے مطلوب کی بلائیں لینے میں مصروف ہو، دل اک چشمہ میں، اک لبریز اشک آنکھ میں ڈوب ڈوب کر اُبھرتا اور حیاتِ تازہ کے مزے لیتا ہے۔ اُن سانسوں کی کیا قدر اور اُن دقیقہ ہائے بیماری کی کیا قیمت ہے اُس کے نزدیک۔ آہ! ساری زندگی اور زندگی بھر کی صحت ایک طرف، اور یہ ایک لمحۂ بیماری اور اُس کی کامرانی ایک طرف۔

غالب { خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو وہ آئے ہیں
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے }

ہاں! اُسی سے پوچھو۔ وہ جانتا ہے کہ

مانی جائسی { کبھی پہلے نہ تھا مبذول مجھ پر التفات اُن کا
مگر یہ منحصر میری نگاہِ واپسیں پر تھا }

لیکن اسے اپنی مصروفیتِ روحانی سے اتنی فرصت کہاں کہ قیاس و انداز کو کام میں لائے اور قیمت بتلائے۔ اور فرصت بھی ہو تو جو بات اُس کے قیاس سے باہر اور انداز سے خارج ہو اُس کے متعلق کون توقع رکھتا ہے۔ اُس سے شافی جواب کی۔

بالکل درست ہے کہ اک ساری عمر کا تشنۂ دیدار اپنی نقدِ عمر کو جلوۂ محبوب پر، صرف جلوۂ محبوب پر نثار کر دے اور پھر بھی اہلِ دل کہیں کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ پھر کیا ذکر ہے اُن الطافِ مزید کا جو بیمار کے سر کو اپنے زانو پر اور اپنے حنائی ہاتھ کو بیمار کے سینہ پر رکھنے، یا نشیلی آنکھوں کو پرنم اور لمبے لمبے بالوں کو رخساروں اور شانوں پر پریشان کر دینے میں صرف کئے جا رہے تھے۔ آہ! ان میں سے تو اک ایک ادائے سوگوار ہزار ہزار جانوں کی قربانی چاہتی تھی، اور بیمار کی اکیلی جان اور جو لُٹ صرف ایک جلوہ کا عوض ہونے کیلئے بھی ناکافی۔ بہرحال اک نحیف سی آواز نکلی

"تیر تو نکلا مرے سینہ سے لیکن جان سمیت" (دبیر)

بس اتنا تو سنا، اور دیکھا کہ آنکھیں بند ہو گئیں اور زبان خاموش، اور کیفیت یہ نتیجہ تھا وہ جس کے پیش نہ آنے پر ساری عمر روتا اگر اُسے صحت نصیب ہو لی اور اس نعمتِ عیادت سے اس مسرتِ جاں ہی سے محروم ہو جاتا جو کسی نصیب ہوتا ہے وصل منتہی بہ وصال۔

(مانی جائسی)

هوالناصر

مرگ ناگہاں

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی

چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

بنی اُمیہ کی سلطنت مٹ کر اُن کا قبرستان بھی کُھد چکا ہی عباسیوں کا تیسرا بادشاہ مہدی ممالک اسلام کا تاجدار ہی دولت اور حکومت کی مشاطہ نے بغداد کو دولھن بنا دیا ہی دجلہ اگر سلسبیل و کوثر ہو تو اُس کی دو رویہ آبادی بہشت بریں ہو مہدی کے دربار میں چین روم ہندوستان افریقہ کے سفیر حاضر ہیں۔ مکہ مدینہ کوفہ کے عالم محدث فقیہہ مفسر اور مصر و ہندوستان کے حکیم بید بھی موجود ہیں۔ زبیر بن العوام کے صاحبزادے نے کہا یا امیر المومنین بنی اُمیہ کے اگر ظلم و ستم لکھے جائیں تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائیں ولید بن عبد الملک نے ہماری جائداد جو شام کی حدود میں تھی خدا واسطہ ضبط کر لی ہم لوگوں نے ہر چند داد بیداد کی مگر اُس نے اعتنا بھی نہ کیا اور اُس کے بعد جتنے بادشاہ ہوئے سب کے ہی اُس کا استغاثہ ہوا مگر + کون سنتا تھا فغان درویش + قہر درویش بجان درویش +

مہدی۔ آپ نے عمر بن عبد العزیز کے سامنے اپنا دعویٰ شاید پیش نہیں کیا ورنہ وہ آپ کا حق ضرور دلوا دیتے کیونکہ عمر بن عبد العزیز بنی اُمیہ میں بڑے باخدا اور نیک دل بادشاہ تھے +

ابن زبیر۔ یا امیر میں نے عمر بن عبد العزیز سے بھی اس بارہ میں کہا تھا مگر خدا اُنہیں بخشے میری بات سن کر اُنہوں نے سر جھکا لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ ابن زبیر یہ باتیں کر رہے تھے جو مروان بن حفصہ دربار میں حاضر ہوا اور آداب بجا لا کر چپ کھڑا ہو گیا +

مہدی مروان تم نے کوئی تازہ قصیدہ یا شعر کہا ہی +

مروان بن حفصہ۔ اللہ امیر المومنین کو سلامت رکھے۔ حضور کی توجہ سے ہر وقت دل تازہ رہتا ہی اور نت نئے شعر کہتا رہتا ہوں اگر اجازت ہو تو ایک شعر عرض کروں +

مہدی۔ ہاں ہاں ہم تمہارے کلام کے بہت مشتاق ہیں جلدی سناؤ +

مروان ابن ابو حفصہ شعر

شبعین الفا واشتری حسانہ + ومالہا فی الناس مرساعقیل[1]

شعر فی الواقع اچھا ہی مگر مہدی کو بہت پسند آیا اُس نے کہا واہ واہ اے مروان تو نے تو اس وقت ایام جاہلیت کو یاد دلا دیا مہدی کی تعریف کرتے ہیں تمام دربار نے کہا سبحان اللہ کیا فصاحت اور بلاغت ہی +

مہدی اے مروان بن حفصہ تو کہے گا امیر المومنین خشک تعریف کرتے ہیں مگر کچھ نقد نہیں دیتے ہیں آج میں ایک شعر کا اتنا صلہ تمہیں دوں گا کہ اگر کوئی اگلی تاریخ میں ڈھونڈھے گا تو اس کی مثال نہ پائے گا۔ اچھا بلاؤ خزانچی کو + خزانچی فوراً حاضر ہوا

مہدی۔ پچاس ہزار اشرفیاں حاضر کرو +

خزانچی۔ بہت خوب بس حضور کا حکم ہو گیا میں اشرفیاں

---

[1] ستر ہزار یعنی خوبصورت خریدے گئے۔ اور ان میں سے کوئی بھی عقیل کو نہیں پہنچ

گن کر مروان بن حفصہ کو دیدوں گا +

مہدی ۔ نہیں نہیں میرے سامنے اشرفیاں لاؤ اور دیر نہ لگاؤ
خزانچی بڑبڑاتا ہوا گیا غضب خدا کا ایک شعر کے بدلے پچاس ہزار
اشرفیاں دی جاتی ہیں ۔ خزانہ میں کیا دھول رہے گی جب
کاغذ دیکھیں گے تو میری جان کو آئیں گے اور فرمائیں گے
پچاس ہزار اشرفیاں کیوں دیدیں جان عجیب ضیق میں ہے
اشرفیاں خزانچی نکال کر لایا اور تخت کے سامنے ڈھیر کر دیا +

مہدی ۔ مروان بن حفصہ ان اشرفیوں کو گھر لے جاؤ ۔ مروان
نے مہدی کو ہزاروں دعائیں دیں اور اشرفیاں اٹھوا کر لے گیا ۔
مہدی دربار سے اٹھ کر محل سرا میں گیا اور کہا حسنہ کہاں ہے
حسنہ ایک کنیز کا نام تھا جس پر مہدی فریفتہ تھا اور اسے دیکھ کر
جیتا تھا حسنہ بہت ہی حسینہ جمیلہ عورت تھی حریری لباس میں
اس کے بدن کی جھلک اس طرح پھوٹتی تھی کہ گویا چودھویں
رات کا چاند ہلکے بادل میں سے چمک رہا ہے خلیفہ مہدی کا
ہی حوصلہ تھا کہ ایسے ماہرو حسین کو وہ خلوت میں دیکھتا اور
جیتا رہتا تھا اس زمانہ کے کم ظرف عاشق اگر حسنہ کی ایک
ادا دیکھ لیتے تو پھڑک کر دم نکل جاتا دل کو دل کے ساتھ
راہ ہوتا ہے حسینہ کا دل بھی بادشاہ پر آگیا تھا اور اس میں
کوئی شک نہیں ہے کہ مہدی مردانہ خوبصورتی رکھتا تھا اہل
تاریخ لکھتے ہیں کہ مہدی کا قد لمبا تھا مگر موزون معلوم ہوتا
تھا رنگ سرخ و سفید اور ڈاڑھی مونچھ کے بال بھورے
تھے ۔ ایک آنکھ میں چیچک یا چوٹ پہنچنے سے چھوٹا سا سفید
نقطہ تھا جو بہت غور کرنے سے دکھائی دیتا تھا اس کنیز کے
عشق میں مہدی اس لئے بدنام ہوگیا تھا کہ اس نے اس
لونڈی کی تعریف میں کچھ شعر لکھے تھے جنہیں وہ شوق سے
پڑھا کرتا تھا اور وہ اشعار اس کی زبان سے بغداد کے
بچوں کی زبان تک پہنچ گئے تھے جو گلی کوچوں میں گاتے پھرتے تھے [۵۰]

اما ملکنی بملکی + والناس کلھم عبید [۵۱]

وانک لو قطعت یدی خلی + فقلت من الرضاء احسنت زیدا [۵۲]

اری ماء ولی عطس + ولکن لا سبیل الی الورد [۵۳]

اتفاقاً کوئی سوداگر ملک گرجستان سے ایک لونڈی اور
لایا اور اسے مہدی کی نذر گزرانا ۔ لونڈی حسنہ سے زیادہ خوبصورت
نہ تھی مگر بادشاہ نے اسے بھی پسند کرکے اپنے حرموں میں داخل
کر لیا حسنہ کو یہ بات بادشاہ کی بری لگی اور وہ گرجن لونڈی
سے جلنے لگی ایک دن حسنہ کا موقع لگ گیا تو اس نے بادشاہ
سے کہدیا خدا جانے حضور کو اس موٹی گرجن کی طرف کیوں
رغبت ہوئی ہے آنکھ نہ ناک بنو چاندنی میٹیک رنگ تو
اس کا ایسا گورا ہے کہ دھوپ سے میلا ہوتا ہے مگر نقشہ بالکل بھونڈا
ہے بلی جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھورے بال ہاتھ پاؤں
اتنے دبلے پتلے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے بڑا آنا رہو گیا ہے +

مہدی (ہنسکر) اسے نزاکت کہتے ہیں +

حسنہ ایسی نزاکت کو بھی سلام ہے جسے دیکھنے سے ڈر لگے
بے دو عورتوں کے سہارے تو بچھونے پر سے اٹھ بھی نہیں
سکتی ہے +

مہدی ۔ اچھا اب یہ تو کہو میں شکار کے لئے ماسندان جا رہا
ہوں تم میرے ساتھ چلو گی +

حسنہ کنیز کی تاب و طاقت ہے جو جانے سے انکار کرے

---

۵۱ کیا وہ میرے ملک کی مالک نہیں ہوئی ۔ باوجودیکہ سب میرے غلام ہیں ۔
۵۲ اگر وہ میرے دخل ہونے کی وجہ سے میرے ہاتھ کاٹ دے ۔ تو میں اسے رضامندی سے قبول
کروں گا اور کہوں گا کہ تو نے بہت اچھا کیا ۵۳ میں دیکھتا ہوں کہ مجھے پیاس نہیں ہے مگر میں گھاٹ کی طرف نہیں دوڑتا

سر آنکھوں سے چلوں گی. مگر میں سمجھی نہیں ماسندان کیا جگہ ہو؟
مہدی۔ ہماری قلمرو میں بغداد اور موصل کے بیچوں بیچ ایک
مقام ہے ماسندان وہاں چرند پرند اور سب قسم کا شکار ملتا ہے
اس لئے میں نے وہاں شکارگاہ بنوائی ہے اور اس کے کنارہ
پر ایک باغ اور کئی محلسرائیں اور ایوان تیار کرائے ہیں جن
کی تیاری میں لاکھوں روپیہ خرچ ہوا ہے جب بغداد میں لیٹے لیٹے
میرا جی گھبرا جاتا ہے تو وہاں جاتا ہوں اور مہینوں رہتا ہوں
ماسندان والے باغ میں ایک جوز کا درخت ہے اس کے ساتھ
مجھے بہت محبت ہے اکثر اس کے نیچے بیٹھا کرتا ہوں تم اس
درخت کو دیکھو گی تو بہت خوش ہو گی +

حسنہ. گرجن تو اس سفر میں حضور کے ساتھ نہیں ہو گی +

مہدی. نہیں اسے نہیں لے جاؤں گا +

مہدی ماسندان پہنچ گیا اور وہاں جا کر حسنہ کو معلوم ہوا
کہ گرجن بھی ساتھ آئی ہے بادشاہ نے ہنسی سے کہدیا تھا کہ ہم
اسے ساتھ نہیں لائیں گے حسنہ رشک کے مارے جل گئی اور
اس نے بادشاہ سے کہدیا ایک میان میں دو چھریاں نہیں
رہ سکتی ہیں مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ گرجن میری چھاتی پر مونگ
دلے یا تو مجھے دوسرے محل میں اتار دیجئے یا گرجن کو۔ بادشاہ نے
گرجن کو دوسری حویلی میں بھیج دیا اور اس کی خواصیں خدمتگار
عورتیں اور سارا عملہ بھی اس کے پاس چلا گیا بادشاہی فوج
کے پہنچنے سے شکارگاہ میں عجب گہما گہمی اور رونق پیدا ہو گئی
ان زنانہ محلوں میں جہاں ایک چڑیا بھی نہ دکھائی دیتی تھی
سیکڑوں لونڈیاں بلبلیاں چلتی پھرتی تھیں اور پرستان کا اکھاڑا
معلوم ہوتا تھا ایک دن بادشاہ نے گرجن اور حسنہ کو اپنے
پاس بلوا کر انہیں گلے ملوا دیا اور حسنہ سے کہا میری خوشی
یہی ہے کہ تم آپس میں سگی بہنوں کی طرح رہو اور اپنے دل
میں سے رشک و حسد کو نکال ڈالو. گرجن اور حسنہ نے کہنا بہت
خوب اور ان کا خوب میل ملاپ ہو گیا بادشاہ نے حسنہ کا
ہاتھ پکڑ کر اسے سارا باغ دکھایا اور اس جوز کے درخت کے
پاس بھی لے گیا جو اسے دل و جان سے پیارا تھا حسنہ نے
اسے دیکھ کر کہا حضور سچ فرماتے تھے یہ پیڑ بہت ہی موزوں ہے
اور آنکھوں کو بھلا لگتا ہے باغ میں چلتے پھرتے شام ہو گئی۔
مہدی نے مغرب کی نماز ادا کی خاصہ نوش فرمایا کھانے کے
بعد گائنین قانون اور رباب اور قسم قسم کے ساز لے کر بیٹھ
گئیں اور خوش آوازی کے ساتھ ایک عربی قصیدہ انہوں
نے گانا شروع کیا مہدی کو راگ راگنی کی تمیز میں بڑا دخل تھا
اور وہ بہت غور سے راگ سنا کرتا تھا اس موقع پر بھی وہ
تال سم اور گلے کے اتار چڑھاؤ پر گائنوں کو داد دیتا تھا۔
اور اگر لے سر میں ذرا سی کسی سے چوک ہو جاتی تو فوراً ٹوک
دیتا تھا رات کے بارہ بجے وہ پھولوں کی سیج پر لیٹ گیا۔
اور ایک ہلکی دولائی اس نے اوڑھ لی باغ کے صحن چبوترہ
پر اس کا پلنگ لگا ہوا تھا شبنمی تن رہی تھی جس کے استادہ
سونے چاندی کے تھے روشنی خاموش کر دی گئی تھی مگر کمرہ
کے اندر ایک شمع فانوس میں روشنی تھی مہدی نے آنکھ بند
ہی کی تھی جو اسے معلوم ہوا کوئی شخص بھاری آواز و لہجہ
میں میرے پلنگ کے پاس کھڑا یہ اشعار پڑھ رہا ہے ؎

کأنی بهذا القصر ما واهله + اوحش منه ربعه ومنازعه
گویا کہ اس محل میں اور اس کے رہنے والوں میں اس کی تقسیم کے تنازع کی وجہ سے وحشت ہے ۱
وصار عند القوم من بعد + وملك الى امير شاه ۱
اور قوم کے نزدیک اس کے بعد ملک امیر کی طرف
لم يبق الا ذكره في الحديث +؛
اس کا ذکر نہیں رہ گیا۔ مگر باتوں میں

مہدی اُس بھیانک آواز کو سن کر ڈرا اور اُس نے غلاموں
کو پکارا جب غلام حاضر ہوئے تو مہدی نے کہا یہ کون نالائق
شخص تھا جس نے ہماری پٹی کے پاس کھڑے ہو کر یہ اشعار
پڑھے غلاموں نے ہاتھ باندھ کر کہا یا امیرالمومنین پہرا ایسا سخت
لگا ہوا ہے کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا ہے آدمی اور وہ بھی ایسا گستاخ
یہاں تک کدھر سے آسکتا ہے اور شعر پڑھ سکتا ہے ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ حضور نے کوئی خواب پریشان دیکھا ہوگا اور خواب
میں ہی یہ اشعار سُنے ہوں گے مہدی نے کہا ایسا ہی ہوگا
اچھا پہرے پر ہوشیار رہو یہ کہکر وہ پھر بستر پر لیٹ گیا چونکہ
اُن اشعار میں کھُلم کھُلا موت سے خبردار کیا گیا تھا اس لئے
مہدی کا دل پکڑا گیا وہ سو تو گیا مگر خدا جانے کے بار اُس
کی آنکھ رات میں کھُلی وہ صبح ہی اُٹھ بیٹھا اور نماز پڑھ کر شکار
کے لئے سوار ہو گیا سارا دن وہ جنگل میں رہا عصر کے وقت
اُسے ایک ہرن دکھائی دیا اور اُس نے شکاری کتّے ہرن
پر دوڑائے اور پیچھے سے اپنا گھوڑا بھی ہرن کے پیچھے ڈال
دیا ہرن شرارہ کی طرح آنکھوں سے اوجھل ہو گیا کتّے تھک
گئے مگر مہدی گھوڑا سرپٹ ڈالے ہرن کے کھوج پر چلا گیا جب
وہ ایک پہاڑ کے پاس پہنچا تو اُس نے دیکھا ہرن کھڑا ہے
مہدی کو دیکھ کر ہرن پہاڑ کے ایک غار میں کود گیا غار کا دہانہ
اتنا تنگ تھا کہ آدمی یا گھوڑا اُس میں نہیں جا سکتا تھا اس لئے
مہدی اپنے گھوڑے کو روک کر وہاں کھڑا ہو گیا اور اُس نے
جھک کر ہرن کو دیکھنا چاہا وہ اتنا جھکا کہ اُس کا سر زمین سے
مُڑنے تُڑنے میں اُس کی کمر میں چک بھی
پلٹ آیا اور غروب آفتاب
سے ماشدان کے باغ میں
پہنچ گیا اور حوض کے کنارے پر آرام کرسی بچھوا کر بیٹھ گیا اور
ایک غلام سے کہا میری کمر دباؤ اور سامنے سے اُس نے دیکھا
محل کے اندر سے ایک لونڈی نکلی جس کے ہاتھ میں ایک زرنفتی
کسنا تھا +

مہدی سے مخاطب ہو کر اس کسنے میں کیا ہے +

لونڈی روحی فداک یا امیرالمومنین اس میں حلوہ کی ایک رکابی
ہے جو حسنہ بیوی نے گرجن بیوی کو بھیجی ہے +

مہدی شکر ہے اب بی حسنہ اُس غریب گرجن کی بہن بن گئیں
اور تحفے بھیجنے لگیں اچھا ادھر لاؤ دیکھیں حسنہ نے کیسا حلوہ
بنایا ہے اس وقت ہمارا جی حلوہ کھانے کو بے اختیار چاہتا تھا
کیونکہ ہماری کمر میں درد کی کچھ کسک بھی ہے لونڈی نے آرام
کرسی کے سامنے جو میز تھی اُس پر کسنا رکھ دیا ایک غلام نے
جلدی سے کسنا کھولا رکابی کا سنہری سرپوش اُٹھایا مہدی
نے چمچے کا بھی انتظار نہ کیا اُنگلیوں سے حلوہ کھانا شروع کیا
تین ہی لقمے اُس کے معدے میں اُترے تھے جو وہ آرام
کرسی پر ڈھلک گیا اور اُس کی مرغ روح نے پرواز کی۔ لونڈی
گھبرا کر حسنہ کے پاس گئی کہ بیوی بادشاہ سلامت آپ کا حلوہ
کھاتے ہی خدا کے ہاں سدھار گئے ذرا ڈیوڑھی میں چل کر
دیکھو تو باہر سب نوکر چاکر اُنہیں پلنگ پر لٹا رہے ہیں حسنہ نے
اپنے سر میں دو ہتڑ مار کر کہا اے ناشدنی تو اُس حلوہ کو بادشاہ
کے پاس لے گئی تھی جو انہوں نے کھایا ارے کمبخت وہ تو
میں نے اپنی سوکن گرجن مردار کے مارنے کے لئے زہر ملا کر
بھیجا تھا اتنے میں باہر ایک شور قیامت برپا ہو گیا غلام
اور سب نوکر چاکر روتے پیٹتے تھے اور سروں میں خاک ڈال
رہے تھے تاصح نام ایک پرانا مصاحب مہدی کا جو اگلے زمانے

کی تواریخ پڑھے ہوا تھا وہ مہدی کے سرہانے رو رو کر یہ کہہ رہا تھا کہ اے آقا میں نے آپ کو بارہا سمجھایا کہ آپ بہت شکار نہ کھیلا کیجیے کیونکہ جسے جس بات کا شوق ہوتا اُس کی جان اُسی میں جاتی ہے اتنے میں حسنہ اپنے سر کے بال نوچتی ہوئی مہدی کی لاش کے اوپر آ کر گر پڑی اور اُس نے اپنا سر پیٹ پیٹ کر کہا بادشاہ شکار کے صدمہ سے یا کمر کے درد سے نہیں مرا مجھ کمبخت نے اُسے زہر کھلا کر مارا ہے ہائے مہدی میری تمنا تو یہ تھی کہ تو اکیلا میرا ہی مالک اور آقا ہو اور اسی واسطے میں نے گرجن کے مارنے کے لئے زہر بھیجا تھا مگر خدا نے یہ چاہا کہ نہ تو میرا ہو نہ کسی اور کا تمام پرستاروں نے مہدی کے کپڑے پھاڑ کر پھینک دیئے اور کالے ٹاٹ کے کرتے مہدی کے ماتم میں پہن لیے حسنہ یہ کہتی تھی میں واجب القتل ہوں میرا کام تمام جلدی کردو مگر ان باتوں سے کیا ہوتا تھا ۵

خیال زلف دوتا میں نصیر پیٹا کر گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

آخر مہدی کو اُسی جوز کے درخت تلے دفن کیا جسے وہ اپنی زندگی میں پسند کرتا تھا اللہ رے محبت کے کرشمے کہیں نشتر بن کر ہلاک کرتی ہے کہیں ناگن بن کر ڈستی ہے کہیں تیشہ بن کر سر اُڑاتی ہے کہیں دریا بن کر ڈبوتی ہے کہیں مسیحا بن کر جلاتی ہے بس فراق بس۔

نازک دلوں کو ٹھیس نہ لگ جائے فقط

علیگ ناصر نذیر فراق کوچہ چیلاں بارہ دری خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ
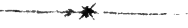
دریا کا گھاٹ سنسان تھا اور کائنات پر فرشتۂ خواب حکمراں +

چاند ایک نوشگفتہ کنول کی طرح آسمان کے نیلے پانی پر تیر رہا تھا۔ اور ایک لطیف بدلی کا نقاب اپنے خاموش استقلال سے اس کے حسن بیتاب کی پردہ پوشی میں مصروف تھا +

دریا کی محو خواب لہریں آہستہ آہستہ لپک کر اس کی تہ کے راز ساحل سے کہہ رہی تھیں +

درختوں کے سخت تاریکی میں کبھی کبھی کسی پرند کے پھڑپھڑانے کی ایک مختصر سی آواز اُبھرتی اور پھر اندھیرے کی خاموشی میں ڈوب جاتی +

میرا بربط میرے قریب ایک مرجھائے ہوئے پھول کی طرح افسردہ پڑا تھا۔ اس کے تار میرے مضمحل ہاتھوں کو دعوت رقص نہ دیتے تھے +

میرا سینہ اب تاریک تھا۔ میری آواز اس میں کھو گئی تھی۔ اور اسے رستہ نہ ملتا تھا کہ حلق تک آئے۔ میرا دل اندھیرے میں ایک ننھے بچے کی طرح چیخ رہا تھا +

دو آنسو میری آنکھوں سے اُبل کر رخساروں پر بہ آئے +

آہ کیا ان آنسوؤں کے ننھے سے دامن میں میرے تمام سینے کی تاریکی سمٹ گئی تھی!

قاج

پیام محبّت

اوگریباں چاک کو وازمستی ومن سینہ چاک

یاد ایامے کہ در ہائے محبت باز بود

تم سکہ اپنے بربط کے زریں تاروں سے دنیا کی موسیقی میں ایک اضطراب مستقل، اپنی آنکھوں کے پُرکیف خمار سے دنیا والوں میں ایک وجدانی کیفیت پیدا کرسکتی ہو، اے میری ملکہ! مجھے یاد ہے وہ دن، جب پہلے پہل تم سے ملنے کے بعد میری نگاہوں میں ایک کپکپی سی پیدا ہوئی، اور پھر خدا جانے مرعوب ہوکر یا اپنی بیتابیوں کے اضمحلال سے کچھ اس طرح جُھک گئیں کہ پھر اوپر نہ اٹھیں۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ تمہیں دیکھوں اور دیکھتا رہوں میری آرزو تھی کہ اپنی عاجز صداؤں میں کوئی ایسی التجا پیدا کرکے تمہارے قدموں پر ڈال دوں، جس سے تم میری پرستاریوں کو قبول کرلینے کے لئے، اپنے دامن کی انتہائی وسعت کو، میرے اور صرف میرے لئے وقف کردو —— مگر نہ تمہاری لانبی گردن میں کوئی خم پیدا ہوا، اور نہ اُس وقت کے مہلک سکوت میں میری التجاؤں کی پذیرائی میں کوئی صدا بلند ہوئی، پھر کیا اب میری نیازمندیاں، سب تمہاری بے التفاتیوں کی قربان گاہ پر نذر ہو جائیں گی اور تم میری راحت میرے عیش میرے سکون اور میرے اطمینان کو ہمیشہ کیلئے مجھ سے جدا کردو گی +

ہاں مجھے یاد ہے، اور خوب یاد ہے تمہاری گفتگو کا وہ سلسلہ بھی، جب کنجون کے کنارے کنارے روشوں پر ٹہلتے ہوئے تم نے کہا تھا کہ "دولت و ثروت کی مجھے خواہش نہیں، عزت و وقعت کی خواہاں نہیں، میں تو صرف محبت چاہتی ہوں —— میرا دل اب بھی اُن نغموں سے لبریز، میرا سینہ اس وقت بھی اُسی مسرت کا آئینہ ہے جس میں سوائے میرے دنیائے محبت کا ذرہ ذرہ برابر کا شریک ہوکر مصروف پرستاری ہے"+

اُس وقت میں خاموش تھا، اور تمہارا دل کائنات کے سکون سے لبریز، مگر حسن خود بین و خود آرا حسن عشق کی اس فتحمندی کو نہ دیکھ سکا، جبین ناز پر دریائے نور کی ہلکی ہلکی لہریں نمودار ہوئیں، آبدار آنکھوں کے باریک باریک ڈوروں میں ایک سُرخی سی جھلکی، میں ان کے اس مفہوم کو سمجھ گیا، اور تم بھی میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں۔ آہ!

کوئی نا اُمیدانہ کرنے نگاہ سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

میری عزیز راتوں کے ہر لمحے، لمحے کی ہر مایوسی اور اُس رات کے سکر خواب کو اپنے ساز کے تاروں میں ڈھونڈھو، میرا اولین پیام محبت کے لئے اگر یاد نہ ہو تو دیکھو کہ تمہارے بربط کا ہر تار اُس سے معمور اور مصروف ہم آہنگی ہے، اب بھی ان نغمہائے خموش میں ایک طوفان اضطراب، ایک دریا، تمہارے سیل اشک کے لئے موجود ہے، اس لئے چھین لو اپنے بربط کی وہ لے جو ایک فریاد ہوکر تمہارے کانوں تک پہنچ رہی ہے، اور منتقل کرلو میرے پیام محبت کو اپنے اُس گیت میں جسے اکثر شب ماہ میں گا گا کر پھولوں کے ڈھیر پر تم بیہوش ہو جایا کرتی ہو۔ فقط

سرور

بیہولا

اہل بنگال کے نزدیک عفت تاب عورتوں میں سے
بیہولا کا نام بے انتہا عزیز و معزز ہی۔ وہ لوگ اس نام کی
اس قدر عزت اور اس کی یاد کا اس قدر احترام کرتے ہیں
کہ جب کوئی بنگالی دلہن اپنے پتی کے گھر جانے والی ہوتی
ہی تو اس کی ماں اسے یہی دعا دیتی ہی۔ کہ "پرماتما تجھے بیہولا
جیسی بیوی بنائے"۔

بہت مدت کا ذکر ہی۔ ضلع بردوان کے قصبہ سنجانی
میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ اس کا نام سیا تھا۔ اور اس کے
ہاں ایک حسین لڑکی بیہولا تھی۔ وہ خوبصورت لڑکی زبان
کی میٹھی۔ فرمانبردار۔ باحیا۔ اور مخلص تھی۔ جو لوگ اس سے
محبت کرتے تھے۔ وہ ان سے الفت و ہمدردی کا سبق
سیکھتی۔ جو اس سے نفرت کرتے تھے۔ ان سے حزم و
احتیاط کی تعلیم پاتی۔ جو اس کے ساتھ بے رخی کرتے۔ ان
سے خود اعتمادی کی روح حاصل کرتی۔

جب بیہولا نے گہوارۂ طفلی سے نکل کر خیابان حسن و
شباب میں قدم رکھا۔ تو اس کے ماں باپ کو اس کی شادی
کی فکر پیدا ہوئی۔ اس کی عمر سولہ سال کی تھی۔ مگر اب تک اس
کا بر تجویز نہ ہوا تھا۔ انہی دنوں میں ایک دن بیہولا اپنی ماں کے
کمرے میں آئی۔ اس کے رخسار شرم و حجاب سے تمتما اٹھے۔
اس نے سر جھکا کر اپنی ماں سے زیر لب یہ کہا۔ کہ "اماں۔
میں نے آج ایک لڑکا دیکھا ہی۔ اس کا نام لکھندر ہی۔ چونکہ
تم نے مجھے بر کے معاملہ میں رائے دینے کی آزادی دے رکھی
ہی۔ اس لئے میں یہ کہتی ہوں۔ کہ اگر لکھندر میرا بر ہو۔ تو بہت
مناسب ہی"۔

لکھندر ایک ہمسایہ قصبے چمپا کے مشہور سوداگر چاند کا اکلوتا
بیٹا تھا۔ پرماتما کا دیا سب کچھ تھا۔ لکھندر شکل صورت کا بہت
اچھا۔ حرکات و سکنات کا مہذب اور دل کا سخی تھا۔ بیہولا اس
پر جان دیتی تھی۔ اور وہ بیہولا پر۔

جن دنوں میں بیہولا کے والدین بیہولا کی اس تجویز پر غور کر رہے
تھے۔ ایک نجومی آیا۔ بیہولا کی ماں نے اس سے معاملے کا ذکر کیا
اور پوچھا۔ کہ کیا یہ سمبندھ سُبھ ہوگا؟ نجومی نے حساب لگا کر
جواب دیا۔ "دیکھنا! لکھندر کو لڑکی نہ دینا۔ اسے ایک سادھو
نے سراپ دیا تھا۔ کہ وہ شادی کی پہلی رات سانپ کے کاٹنے
سے مر جائے گا"۔

بیہولا یہ سن کر زرد ہو گئی۔ کیونکہ ہر ہندوستانی عورت
اپنے سرتاج سے پہلے مرنا چاہتی ہی۔ لیکن جب اس کے باپ نے
اس سے کہا۔ "بیٹی۔ ہم تو چاہتے تھے۔ کہ تمہاری رائے
کو رد نہ کریں۔ مگر نجومی کی بات سے دل کانپتا ہی۔ تم کوئی
اور بر تلاش کرو"۔ تو بیہولا نے صاف کہہ دیا۔ کہ "پتا جی! یہ
نہیں ہو سکتا۔ یہ ہندو کنیا کا دھرم نہیں۔ کہ ایک سے زیادہ
آدمیوں سے محبت کرے۔ میں اور کوئی بر نہیں تلاش کر سکتی
بیوہ ہونا بری بات ہی لیکن جب میں نے ایک دفعہ لکھندر

کو چُن لیا۔ تو اب کوئی آنے والی مصیبت مجھے لکھندر سے جُدا نہیں کر سکتی"۔

یہ جواب اس قدر برجستہ اور مستحکم تھا۔ کہ اس کے ماں باپ بالکل چپ چاپ رہ گئے۔ اور بہولا کی شادی لکھندر کے ساتھ کر دی گئی۔

***

حجلۂ عروسی کا فرش۔ اس کی دیواریں۔ اس کی چھت غرض سب کچھ لوہے کا بنایا گیا۔ تاکہ سانپ کسی طرح سے داخل نہ ہو سکے۔ بہولا اور لکھندر اس کمرے میں داخل ہوئے۔ آدھی رات کا وقت تھا لکھندر سو رہا تھا۔ بہولا اس کے پہلو میں جاگ رہی تھی۔ اور برابر اس آنے والی مصیبت کا خیال کر رہی تھی۔ دفعتہً ایک بہت بڑا زہریلا ظالم سانپ خدا جانے کس راستے سے حجلہ عروسی میں داخل ہوا۔ وہ جھٹ اٹھی سانپ کے سامنے ہاتھ زمین پر رکھ دیا۔ اور کہا "دیوتا! کرپا کرو۔ مجھے بے تاج کرنے سے تمہارے ہاتھ کیا آئے گا"۔ لیکن تقدیر کا لکھا کسی کے مٹائے کب مٹ سکتا ہے۔ اس کی تمام منتیں بے سود ہوئیں۔ سانپ نے لکھندر کو کاٹا۔ اور وہ نامراد نوجوان صبح سے پہلے پہلے اس دنیا میں نہ تھا۔

***

صبح کے وقت بہولا کے ماں باپ حجلۂ عروسی میں آئے۔ تاکہ اپنے داماد کا انجام دیکھیں۔ لکھندر بے جان پڑا تھا لیکن بہولا کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو یقین دلایا کہ لکھندر پھر زندہ ہو جائے گا۔ غمزدہ ماں باپ کو اپنی بیٹی پر دیوانگی کا شبہ ہوا۔ بہولا نے کیلے کے تنوں اور پتوں کا ایک بڑا تختہ بنایا۔ اپنے لکھندر کی نعش اس پر رکھی۔ آپ بھی اسی کے پاس بیٹھ گئی۔ اور تختے کو دریائے گنگا کی موجوں کے حوالے کر دیا۔

بہولا اپنے پتی کی نعش کے پاس بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ اس نے لکھندر کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا۔ سسکیاں لینے لگی۔ اور بین کرنے لگی "اے ناگ دیوی میں لٹ گئی۔ ہے میرے مالک اٹھو۔ میرے پتی تو کہاں ہے میرے دکھ اور سکھ کے ساتھی۔ مجھے چھوڑ گئے؟ مجھے بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ اے منسا دیوی سانپوں کی ماں۔ مجھے بھی لے لے۔ میں نے تیرا کیا گناہ کیا۔ کہ تو نے مجھ پر یہ مصیبت ڈالی۔ اے آسمانی دیوی تو کیا جانتی ہے۔ کہ زمین والے کیونکر محبت کرتے ہیں"۔

بہولا روئی اور روتی رہی۔ درخت اپنی ٹہنیاں زور زور سے ہلا رہے تھے۔ اور یہ کہتے معلوم ہوتے تھے۔ "بہولا نہ رو۔ نہ رو"۔ ہوا بین کر رہی تھی۔ پرندے رو رہے تھے۔ اور بہولا چلا رہی تھی۔ "میرے پتی۔ تو کہاں ہے؟ اگرچہ تو دور ہے۔ مگر میرا من تیرے چرنوں ہی میں پڑا رہے گا۔ او منسا دیوی۔ اگر یہ سچ ہے۔ کہ میں نے لکھندر کے سوا اور کسی شخص کے خیال کو اپنے من میں جگہ نہیں دی۔ تو مجھ پتی برتا کی پرارتھنا سن۔ اور مجھے میرا بچھڑا ہوا ساجن واپس دے دے"۔

تین مہینے گزر گئے۔ بہولا روتی رہی اور زمین و آسمان۔ درخت اور ہوا پرندے اور آسمان کی روحیں اس کے غمناک نالوں کو سن کر روتی رہیں۔ بہولا ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی۔ خون کا ایک قطرہ اس کے جسم میں باقی نہ رہا۔ آخر ناگوں کی دیوی منسا کو اس پر رحم آیا۔ ایک دن اچانک بہولا کے سر پر تابندہ اور خوبصورت پھولوں کی پتیاں برسنے لگیں۔ ہواؤں میں غیر مرئی روحوں کا نعرہ گونجنے لگا "پتی برتا بہولا کی جے"!

عین اس وقت منسا دیوی بہولا کے سامنے تھی۔ بہولا نے جھک کر اس کے چرن پکڑ لئے۔ منسا دیوی نے بہولا کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور اسے یہ کہکر برکت دی۔ "تم دھن ہو۔ بہولا دھن ہو۔ تمہاری وفاداری پر آسمان کی روحیں آفرین کے پھول برسا رہی ہیں۔ تم سچی پتی برتا ہو۔ یہ ساری مصیبت صرف تمہارے آزمانے کیلئے ڈالی گئی تھی"۔

اس کے بعد دیوی نے لکھندر کو اپنے نورانی ہاتھوں سے چھوا۔ اور وہ آنکھیں مل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دیوی بولی "جاؤ۔ تم دونوں مزے سے رہو۔ میں عمر بھر تمہاری حفاظت کروں گی۔ جے ہو بہولا ستی کی جے ہو"۔ یہ کہکر دیوی ماتا ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ اور لکھندر اور بہولا خوش و خرم کامیابی کے گیت گاتے ہوئے از سر نو دنیا میں داخل ہوئے۔ گمنام

معذرت

اس پرچہ کہکشاں کی فہرست مضامین میں حصۂ نظم کے عنوان اور شعرائے نامدار کے اسمائے گرامی تو مندرج ہیں۔ لیکن حصہ نظم مفقود ہے۔ یہ بوالعجبی دیکھ کر ناظرین کرام یقیناً بہت متعجب ہوں گے۔ اس بے قاعدگی کی وجہ بھی سُن لیجئے۔ اس پرچے میں دو نظمیں داستان حسرت اور کرشن کنہیا کی مُرلی نہایت لطیف و بلند سرتاپا حب وطن کے جذبات صادقہ میں ڈوبی ہوئی درج کی گئی تھیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے۔ ان میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جو کسی طرح قانون مطبوعات کی گرفت میں آسکتی۔ یا جس سے سرکار انگریزی کے متعلق کسی قسم کی نفرت وحقارت پھیلنے کا احتمال ہوتا۔ لیکن ہمارے بے انتہا محتاط پرنٹر بابو غلام قادر صاحب مسیحی مالک یونیورسل پریس لاہور نے رسالہ چھاپنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اور فرمایا۔ کہ جب تک یہ دونوں نظمیں نکال نہ دی جائیں گی۔ میں اپنے پریس میں رسالہ نہ چھاپوں گا۔ یہی دو نظمیں حصۂ نظم کی جان تھیں۔ اور رسالے کی اشاعت پہلے ہی بے حد معرض تعویق میں آچکی تھی۔ اس لئے ہم نے یہی مناسب سمجھا۔ کہ حصہ نظم کاٹ دیا جائے۔ اور اس دفعہ یوں ہی رسالہ شائع کیا جائے۔ اگر آئندہ موقع ملا تو ہم یہ کسر نکال دیں گے + کیا کیا جائے۔ انتہائے مجبوری ہے۔ اب ہماری معصوم شاعری کو بھی حجلہ دماغ سے باہر آنے میں سیکڑوں ٹھوکریں۔ اور ہزاروں رکاوٹیں پیش آنے لگیں + ؎

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

خاکسار تاج
اڈیٹر کہکشاں

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کی مشہور دوائیوں

کا اشتہار

تار کا پتہ کیمفر

پوسٹ بکس نمبر ۵۴۴

جیسا کیا ہو جو ایک دوسرے کو آرام نہ پہنچا سکے یہی خیال پر ڈاکٹر ایس کے برمن کی دوائیاں بنی ہیں اور ان کے انمول فائدے کے حساب سے بہت سستی بکتی ہیں

نام دوا	قیمت	نام دوا	قیمت	نام دوا	قیمت	نام دوا	قیمت	نام دوا	قیمت
عرق کافور ہیضہ کی دوا	سہ	کی دوا	عہ	زخم کا مرہم	۵ر	لونڈر	۱ر	روغن رینڈی	۶ر
دمہ کی دوا	۴عہ	کھیگھا کے لگانے		زخم دھونے کی ٹکیہ	۱ر	بدہضمی کی دوا عرق		〃 صندل	۶ر
بخار کی دوا شیشی		کی دوا	۴ہر	پرانے ملیریا بخار کی		پودینہ	۸ر	〃 اجوائن	۶ر
کلاں	۱۴ر	کھیگھا کے کھانے		گولیاں	۸ر	کلوروڈائن پیچش کی دوا	۶ر	〃 سونٹھ ادرک	۸ر
بخار کی دوا شیشی		کی دوا	۱۲ر	کونین کی ٹکیہ	۸ر	لال شربت بچوں کی طاقت		〃 سونف	۴ہر
خورد	۸ر	پین ہیلر نمانمدعنی اوس		بدہضمی اور بدہضمی کے		کی دوا	۱۲ر	〃 دارچینی	۶ر
سالسہ خون صاف		پیر مغنی درد کی دوا	۱۲ر	دست کی گولیاں	۴عہ	خارشت کھجلی کی [illegible]	۸ر	〃 لونگ	۴ہر
کرنے کی دوا	۲ع	کھانسی کی دوا شیشی کلاں	عہ	درد سر کی دوا	۲ر	امراض مستورات کی دوا	۴عہ	〃 لیمو	۴ہر
سینی لائن خون بند		کھانسی کی دوا شیشی خورد	۸ر	طاعون کی گولیاں ٹیکہ		امراض دنداں	۴ہر	〃 الائچی	۶ر
کرنے کی دوا	۴عہ	کان بہنے کی دوا	۴ر	ثوبیہ	۸ر	پیپرمنٹ کا ست	۲ر	جلاب کی گولیاں	۵ر
کولا ٹانک طاقت		داد کا مرہم	۴ر	طاعون کی گولیاں نئی قسم	۲ر	روغن پیپرمنٹ	۲ر	نمونہ کا بکس	۴عہ

پیسہ اخبار کے منیجر کا تجربہ — میں نے آپ کا بھیجا ہوا عرق کافور۔ بدہضمی۔ درد شکم وغیرہ میں استعمال کرایا اور ہر موقع پر اس کو بے خطا اور حتمی علاج پایا........ میں آپ کو اس دوا کی ایجاد کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔

ایڈیٹر صاحب اخبار عام کی رائے — کلکتہ کے نیک نام اور مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن صاحب نے ایک بکس ادویات کا بطور ریویو کارخانہ ہذا میں سال فرمایا ہے........ اس مفید اور پر تاثیر بکس کا ہر گھر میں ہونا بہت مفید ہوگا۔

یہ کارخانہ چھتیس سال سے جاری ہے

ڈاکٹر ایس کے برمن تاراچند دت سٹریٹ۔ کلکتہ

مفصل حالات کی فہرست مفت منگا کر دیکھئے

یونیورسل پریس لاہور میں بابو غلام قادر مسیحی پرنٹر کے اہتمام سے چھپا اور سید ممتاز علی نے مالک مہینہ لاہور سے شائع کیا

اُردو کا ادبی رسالہ

کہکشاں

مرتبہ

سید امتیاز علی تاج

مقام اشاعت

دارالاشاعت پنجاب لاہور

قیمت سالانہ چار روپے

جلد ۵ | فہرست مضامین کہکشاں بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۰ء | نمبر ۸

تنبیہ:- جتنے مضامین کہکشاں میں شائع کئے گئے ہیں۔ ان سب کے حقوق محفوظ ہیں ۔

تقریب

توسیع و ترقیٔ اُردُو۔ مولوی سید ممتاز علی صاحب قبلہ کا یہ مضمون نہایت مفید و دلچسپ ہے۔ اس وقت زبان اردو کی توسیع و ترقی کے لئے اسی قسم کے کارآمد مضامین کی ضرورت ہے جن میں زبانوں کے عروج و زوال کا فلسفہ بیان کرنے کی بجائے موجودہ ضروریات کے مطابق ایسی تجاویز بتائی جائیں جو عمل کرنے کے قابل ہوں۔ اس مضمون کو آپ کے اس قسم کے مضامین کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہئے +

امراء القیس۔ علامہ علی حیدر صاحب نظم طباطبائی ہندوستان کے بڑے باکمال بزرگوں میں سے ہیں۔ ہماری درخواست پر آپ نے اس دلچسپ مضمون سے کہکشاں کی عزت افزائی فرمائی ہے + عربی اشعار کی بے ساختگی و سادگی شہرۂ آفاق ہے۔ اور ان کا مطالعہ موجب دلچسپی۔ چنانچہ اس زمانے میں کہ عربی زبان جس کا اردو سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہندوستان سے عنقا ہوتی جاتی ہے۔ اس قسم کے مضامین کی اشاعت قطعاً مفید ثابت ہوگی۔ مولانا موصوف نے عربی زبان کے اشعار کا جس خوبی و عمدگی سے ترجمہ کیا ہے۔ وہ مستغنی عن التعریف ہے +

فروغ ادب۔ جناب شیخ عبد القادر صاحب بی اے سابق ایڈیٹر مخزن کے نام نامی سے کونسا بدقسمت اردو دان ناواقف ہوگا۔ جب سے شیخ صاحب کا مخزن سے تعلق ٹوٹا تھا۔ شیخ صاحب خاموش تھے۔ شیخ صاحب کی نشاۃ ثانیہ کہکشاں کا معجزہ سمجھنی چاہئے + آپ کا مضمون گو مختصر ہے مگر اقل و دل ہے۔ اکثر جدید مضمون نگاروں کے مفصل مضامین بھی اس قدر پُر معنی نہیں ہوتے۔ جتنا یہ مختصر مضمون ہے

عراقی کا ایک قطعہ۔ جناب محمود شیرانی اپنے ایک نہایت قدیم دیوان عراقی سے یہ قطعہ نقل فرما کر اسے نظامی کے بجائے عراقی کا قرار دیتے ہیں۔ اس دعوے کا تمام مدار دیوان کی صحت و قدامت پر ہے گو دلیل و قیاس کی بنا پر بہت کچھ لکھے جانے کی گنجائش تھی لیکن اس شہادت کے بعد عراقی کے سوا اس قطعے کا مالک کون قرار دیا جا سکتا ہے بہرحال اگر کوئی صاحب اب بھی اختلاف رائے رکھتے ہوں۔ تو ہم ان کے خیالات شائع کرنے کے شوق سے منتظر ہیں جناب محمود کے ہم شکرگذار ہیں۔ کہ انہوں نے اس نایاب دیوان سے ناظرین کہکشاں کو مستفید و محظوظ فرمایا +

علامۂ رُعب۔ زمانۂ قدیم میں تو اردو زبان کے کتنے ہی ایسے عدیم المثال شعرا ہو چکے ہیں جن کا اس وقت ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہوتا لیکن حیرت ہے۔ کہ اس زمانے میں بھی رُعب ایسا باکمال شخص جن کا انتقال ابھی گذشتہ سال ہوا۔ یُوں حالت گمنامی میں اُٹھا جناب رعب کی شاعری کے متعلق جناب یاس بہاری کے مضمون کے بعد ہمیں کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہم دلی شکریئے کے ساتھ اس گراں بہا مضمون کو کہکشاں میں درج کرتے ہیں۔ اور جناب رُعب مرحوم کا اور کلام جو ہمیں حضرت یاس کی معرفت حاصل

ہوا ہے۔ وقتاً فوقتاً ناظرین کہکشاں کی ضیافتِ طبع کیلئے
شائع کرتے رہیں گے +

یادِ رفتگان۔ سرسید احمد خان علیہ الرحمۃ کے خطوط
میں ان کی اپنی تصنیف کردہ ایک غزل بھی دستیاب ہوئی
جو اس نمبر میں ان ہی کے دستخط میں شائع کی جاتی ہے۔ امید
ہے ناظرینِ کہکشاں اس نایاب تحریر کو قدر و دلچسپی کی
نظروں سے دیکھیں گے +

بوڑھی کاکی۔ ادیب فطرت نگار منشی "پریم چند" نے
اس مختصر قصہ میں جس خوبی سے ضعیفی کی کوائف کو بیان کیا
ہے۔ اور جس عمدگی سے پڑھنے والے کے لطیف حسیات کو
بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت میں معجز نگاری ہے
منشی صاحب موصوف اردو کی مختصر افسانہ نویسی کے نہ
صرف موجد ہیں۔ بلکہ وہ خود ہی اسے معراجِ کمال پر پہنچانے
والے بھی ہیں +

کروڑپتی۔ جناب "پطرس" نے آسکر وائلڈ کے قصے
"دی ماڈل ملینیر" کا ترجمہ کہکشاں کے لئے عنایت فرمایا ہے
ترجمہ کی خوبی کا وہی حضرات کچھ اندازہ لگا سکیں گے جنہوں
نے مصنف مذکور کی اصل انگریزی پڑھی ہے +

نام کیا لوں۔ جناب قمر ایک مدت کے بعد صفحات
کہکشاں پر پھر نمودار ہوتے ہیں۔ "اللہ کا بندہ" خوجی کے
بھائی بندوں میں سے معلوم ہوتا ہے۔ مضمون میں جابجا
ظرافت کے پرلطف چھینٹے ہیں۔ اور واقعیت کی جھلک تو
مجبور کرتی ہے۔ کہ جناب قمر کی دعوت بصد شوق قبول کر لی
جائے +

ہذیانِ آرزو۔ شیخ عبداللطیف صاحب تپش کہکشاں
میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ اور کہکشاں کے لئے بہترین
مضامین نثر و نظم بہم پہنچانے کی غرض سے اپنے چیدہ احباب
کے بامذاق حلقے میں کوشش فرماتے رہتے ہیں۔ شباب اردو
کی ادارت کے باوجود کہکشاں کی ترقی کے لئے یہ سرگرم
کوششیں آپکی عالی حوصلگی اور فراخ دلی کا ثبوت ہیں۔ جن کا
ہم تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ آپ کا دوسرا مضمون نثر
بھی لطیف خیالات و جذبات سے لبریز ہے۔ مشکل پسندی اور
مذاق فارسی آپ کی تحریر کی خصوصیات میں سے ہے +

ابنِ مقنع۔ انقلابِ فرانس نے ابھی نپولین اعظم کی فوجی
قابلیتوں کو عالم افروز ہونے کا موقع نہ دیا۔ تو اس کی
دلی آرزو یہ تھی۔ کہ وہ ایک بلند پایہ ادیب بن جائے چنانچہ
ابھی اس کی عمر بیس سال کی ہوگی۔ کہ اس نے اپنے آباو اجداد
کے وطن کارسیکا کی ایک تاریخ لکھی۔ وہاں کی معاشرت کے
متعلق ایک ناول تصنیف کیا۔ اور بہت سے مختصر افسانے نظمیں
اور مضامین تحریر کئے۔ لیکن ان تمام چیزوں میں سے کسی کے
ذریعے اس کو ادبی نمود حاصل نہ ہو سکی۔ اس کی تاریخ شائع
نہ ہوئی۔ ناول اب تک مسودے کی صورت میں پڑا ہے اور
کہانیاں اور مضامین بھی مدت مدید کے بعد شائع ہو سکیں +

ابن مقنع کو بعض مغربی مصنفین نے محض پرواز تخیل قرار دیا ہے
لیکن یہ غلط ہے۔ گو بعض جزئیات کی تفصیل میں کچھ اختلاف
ہو۔ تاہم یہ قصہ صحیح تاریخی واقعات کی بنا پر لکھا گیا ہے۔ گو
مختصر ہے لیکن اس میں ڈراما کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہ کہانی
نپولین نے سنہ ۱۷۸۹ء میں لکھی تھی۔ اور اس میں والٹیر کے رنگ
تحریر کا تتبع کرنے کی کوشش کی تھی۔ مصنف کے انتقال کے
قریبی زمانے میں یعنی سنہ ۱۸۲۱ء میں یہ فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی

تھی +

کلام اکبر۔ لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین صاحب الٰہ آبادی نے ہماری استدعا پر اپنا غیر مطبوعہ کلام کہکشاں کے لئے عطا فرما کر اس کی قدر و وقعت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس عنایت کا شکریہ ادا کرنا ہمارے لئے چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ کلام کا لطف اٹھایئے اور دعا فرمایئے کہ خدا ہمارے زمانے کے اس بابرکت بزرگ کی قوت و بصارت و ہمت میں برکت عطا فرمائے اور ان کے یہ آخری ایام راحت و اطمینانِ قلب سے بسر ہوں +

خدا خیر کرے۔ ہم میر غلام بھیک صاحب نیرنگ کے بے انتہا ممنون ہیں۔ کہ آپ اپنی مصروفیات کے باوجود کہکشاں کو فراموش نہیں کرتے۔ اور اپنے کلام بلاغت نظام سے صرف کہکشاں ہی کو مشرف فرماتے ہیں + آپکی یہ نظم بے انتہا موثر اور دلاویز ہے +

جذبات حشر۔ ہندوستان کے مشہور ڈرامائسٹ جناب آغا محمد شاہ صاحب حشر کاشمیری کسی معرفی کے محتاج نہیں۔ ہندوستانی اسٹیج کی ترقی و اصلاح کے متعلق آپ نے جو قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں وہ اردو ڈراما کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی + آپکی نظمیں شکریہ یورپ اور مفرح زمزم نزاکت تخیل اور علوِ جذبات کا بہترین نمونہ ہیں۔ امید ہے کہ آپ کی یہ غیر مطبوعہ ... ل بھی پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی جائیگی +

... مہر۔ جناب مولوی سید خورشید علی صاحب ... دہلوی کی سحر کاری محتاجِ تعریف نہیں۔ جذباتِ انسانی کی صحیح ترجمانی کے علاوہ آپ ایک خاص دلاویز اور اثر انداز رنگِ سخن کے مالک ہیں۔ ان اشعار کا ایک ایک مصرع پیکرِ سوز و گداز ہے۔ اور سادگیٔ ادا کی دلنشین صفت سے متصف۔ امید کہ آپ آیندہ بھی اپنی جادو بیانی سے کہکشاں کی رونق افزائی کے باعث ہوں گے +

کلام وحشت۔ جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت ایم۔ آر۔ اے۔ ایس دورِ حاضر کے شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ہم آپ کے بے انتہا ممنون ہیں کہ آپ نے اپنے کلام معجز نظام سے کہکشاں کو زینت بخشی۔ آپ کی یہ غزل آپ کی بلندی تخیل اور پختگی کلام کی بدیہی مثال ہے +

حدیث درد۔ کہکشاں کے شاعرِ خصوصی جناب تپش کے کلام کی خصوصیات سے ناظرین بخوبی واقف ہیں آپکی یہ تازہ غزل بھی اوجِ تخیل اور علو جذبات کے بہترین نمونوں میں سے ہے +

اضطراب شوق۔ جناب محمد محمود صاحب مخمور اکبرآبادی نقادوں میں خوب خوب دادِ سخنوری دے چکے ہیں۔ ہم آپ کے شکرگذار ہیں۔ کہ اب آپ نے کہکشاں کی طرف توجہ مبذول فرمائی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین کہکشاں اس لطیف و پاکیزہ نظم کو پسند فرمائیں گے۔ اور جناب مخمور آیندہ بھی سلسلۂ توجہات جاری رکھیں گے +

خدنگ رزمی۔ جناب ابوالہدیٰ مولانا سعید رزمی بھوپالی گو دنیائے شعر میں نووارد ہیں لیکن آپ کے کلام کی سلاست و پختگی قابل داد ہے۔ اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ +

موجود نہیں۔ حالانکہ انگریزی میں ایسے مضامین کا کثرت سے
مصالحہ مل سکتا ہے۔ اس باب میں اگر انگریزی کتابوں کو مطالعہ
کرنے کے بعد خود مجتہدانہ طور پر ایسے مضامین لکھے جائیں۔ تو ہمارے
ادب میں یقیناً ایک گراں بہا و دلپسند اضافہ ہوگا +

ماہ جولائی میں صرف ادب ہی کے متعلق مضامین شائع
کئے گئے ہیں۔ لیکن چونکہ نامہ نگاروں کو ابھی اطلاع نہیں
دیگئی۔ اور بہت تنگ وقت میں اس قسم کے مضامین حاصل
کرنے کی کوشش کیگئی تھی۔ اس لئے خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا
غالباً ایک دو ماہ بعد کہکشاں اپنی اصلی شان سے چمکے گا +

جناب مولانا سید اکبر حسین صاحب قبلہ نے اپنے اشعار کے
ساتھ جو چند سطریں بطور خط کے لکھیں۔ ان کا فقرہ فقرہ ضعف و
نقاہت اور رنج و غم کی تصویر ہے۔ اس کے پڑھنے سے جسم
میں سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ اور بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے
کہ اللہ تعالےٰ آپ کے دم قدم سے اس محفل ملت کو روشن و آباد
رکھے۔

مکرمی۔ پبلک کو کم واقفیت ہے۔ کہ میں کیا ہوں۔ اور
کس حالت میں ہوں۔ اگرچہ کسی قدر موزون طبع ہوں لیکن اب
نہ ضرورت ہے۔ نہ شوق ہے۔ نہ موقع نہ قوت۔ نہ وہ دل و
دماغ۔ لوگ زبانی سن کر کبھی کچھ لکھ لیتے تھے۔ وہی ادھر ادھر
چھاپ دیتے ہیں۔ آپ کے کئی الطاف نامے آئے تعمیل نہ ہو سکی
پرانی بیاض سے بلا انتخاب دو چار شعر ارسال خدمت کرتا ہوں
اب اور بھی دو ایک صاحبوں کو کچھ بھیجنا پڑے گا۔ زمانہ بدل گیا
بدلا جاتا ہے۔ میں بھی نہیں جانتا۔ کیا کہنا چاہئے۔ میری کوئی
پارٹی نہیں۔ آپ لوگوں کا وقت ہے خدا آپ پر زندگی شیریں
کرے۔ میری عمر ۷۵ سے متجاوز ہے۔ علیل ہوں مصیبت زدہ
ہوں۔ اور کیا کیا نہیں لکھتا دشوار ہے۔ رسید لکھئے گا۔ تاکہ
اطمینان ہو +   ممنون یاد آوری اکبر

+

افادی الاقتصادی مولانا مہدی حسن کے نام نامی سے ادب
آشنا حضرات بخوبی واقف ہیں۔ کہکشاں بابت جون سنہ ۱۹ء میں
کہکشاں کے متعلق آپکی رائے اور قلمی اعانت کا نیم وعدہ شائع ہوا
تھا اس وقت سے جیسے ناظرین کہکشاں آپ کے مضامین کے
منتظر تھے ویسے ہی ہم خود چشم براہ تھے۔ اب پورے ایکسال کے بعد
اس وعدہ کی تجدید کی گئی ہے۔ اور چونکہ یہ وعدہ پختہ معلوم ہوتا ہے
اس لئے ہم اس سے ناظرین کہکشاں کا بھی اطمینان کرانا مناسب
سمجھتے ہیں خط درج ذیل ہے :-

برادر محترم۔ مفصل عنایت نامہ اور ضمیمہ دونوں ملے مختصر جواب
یہ ہے۔ کہ مضمون آخر جولائی تک قطعاً آپ کی خدمت میں پہنچے گا
اور جبتک یہ وعدہ پورا نہیں ہوئے گا۔ ایک حرف کسی پرچہ میں
نہیں لکھوں گا +   آپکا مہدی

معزز ہمعصر زمانہ اپنے جون نمبر میں اس امر کی بجا شکایت
کرتا ہے۔ کہ اردو میں انشاپردازوں کی مناسب قدردانی نہیں
ہوتی۔ چنانچہ منشی پریم چند صاحب کی مشہور تصنیف پریم پچیسی کا
ابھی پہلا اڈیشن ختم نہیں ہوا۔ حالانکہ ہندی میں آپکی تصانیف
کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بعض تصانیف کے ترجمے نہایت
حسن اہتمام سے گجراتی زبان میں شائع ہو رہے ہیں۔ اور بنگالی
میں تو آپ کا ایک ناول بائیسکوپ میں منتقل ہو رہا ہے۔ ہم منشی
صاحب کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ کہ غیر زبانیں آپکی تصانیف کی

قدر افزائی کر رہی ہیں۔ اور اردو خواں پبلک کی ناقدری پر افسوس کر کے اب یہ خبر سناتے ہیں۔ کہ کہکشاں اور زمانہ بک ڈپو منشی پریم چند کے قصص کا تازہ مجموعہ پریم بتیسی شائع کر رہے ہیں۔ تصنیف مذکور کا پہلا حصہ عنقریب زمانہ پریس سے اور دوسرا حصہ کہکشاں بک ڈپو سے شائع ہوگا۔ اس کے علاوہ کہکشاں بک ڈپو آپ کا ایک ضخیم ناول "بازارِ حسن" بھی شائع کر رہا ہے یہ ناول نہ صرف اردو زبان میں منشی صاحب کا پہلا ناول ہے بلکہ ادبی حیثیت سے بھی اردو کا پہلا ناول ہے۔ جسے اہمیت دی جا سکتی ہے۔ ورنہ اردو میں تو ناول نویسی بازیچۂ طفلاں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی + کچھ عرصے کے بعد ناول مذکور چھپ کر تیار ہو جائے گا۔ اور ہمیں امید ہے کہ اردو خواں حضرات اپنی قدردانی کا ثبوت دیں گے +

⁂

ہم دلی رنج و قلق کے ساتھ یہ خبر درج کہکشاں کرتے ہیں کہ منشی پریم چند صاحب کا چھوٹا بچہ کچھ عرصہ چیچک میں مبتلا رہ کر والدین کو داغ مفارقت دے گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہمیں اس صدمہ میں آپ سے [illegible] +

چترا

کہکشاں نے تصانیف و تراجم کے شائع کرنے کا جو انتظام کیا تھا اب اس سلسلے کی دوسری تصنیف چھپ کر تیار ہو گئی ہے۔ یہ کتاب ملک الشعراء ڈاکٹر رابندرو ناتھ ٹیگور کا مشہور و معروف راگ ناٹک چترا ہے۔ جس کا ترجمہ مولانا عبد المجید خانصاحب سالک بٹالوی اڈیٹر فانوس خیال نے کیا ہے +

گو یہ ناٹک پچیس سال پیشتر تصنیف ہوا تھا لیکن اس زمانے میں بھی مصنف کی نازک خیالی کا وہی عالم تھا۔ جو اب انکی تازہ ترین تصانیف میں قدر و وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے + یہ قصہ محبت کے متعلق ایک تمثیل ہے۔ جو روز روشن کی طرح صاف اور واضح ہے۔ اس میں ارجن "اس آخری تم۔ سچائی کی اس برہنہ سادگی کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہے" جس کا اس نازک تصنیف سے زیادہ ٹیگور کی اور کسی تصنیف میں اظہار نہیں + اس کتاب میں ترجمہ کی خوبی و عمدگی کا بیحد خیال رکھا گیا ہے۔ نہ زبان عربی فارسی کے الفاظ سے گرانبار بنا دی گئی ہے۔ نہ ہندی اور سنسکرت الفاظ کی کثرت ہے بلکہ سیدھی سادی اردو ہے۔ اور کہیں کہیں ہندی اور فارسی الفاظ کے لطیف چھینٹے ہیں +

اکثر مترجم ترجمہ کرتے وقت صرف مطالب کا خیال رکھتے ہیں اور مصنف کے انتخاب الفاظ کو کچھ وقعت نہیں دیتے۔ گویا الفاظ کی موسیقی کی جانب سے ان کے کان بالکل بند ہوتے ہیں۔ لیکن اس تصنیف میں مترجم نے خاص کوشش کی ہے کہ اگر انگریزی الفاظ کے لئے کوئی ایسے ہندی لفظ ملیں۔ جو حقیقت میں ایک ہی ہوں تو حتی الامکان انہیں ہی استعمال کرے۔ مثلاً "کریمی ایڈ" کا ترجمہ "کرتار" اور "رامٹس" کا ترجمہ "رتیں" کیا ہے۔ اسکے علاوہ اور الفاظ کے ترجمے میں بھی خاص تلاش و کوشش سے کام لیا ہے اور لفظ لفظ کے اثرات بعینہٖ قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً "ٹچ اینڈ سویٹ نس" کا ترجمہ "رس اور مس" "انونسیبل" کا ترجمہ "اجیت" "ڈرم بیٹس آف تھنڈرنگ کلاؤڈس" کا ترجمہ "گرجتے ہوئے بادلوں کی بانگ دہل" "کیورن" کا ترجمہ "گپھا" اور "کلوک" کا ترجمہ "فرغل" کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ترجمہ شروع سے آخر تک خوبیوں سے لبریز ہے۔ نمونۃً ایک سین [illegible]

کہکشاں

جلد ۵ لاہور۔ ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء نمبر ۴

زمین بحیثیت ایک مقناطیس کے

موجودہ مضمون ہمارے سابقہ مضمون "مبادیٔ علم مقناطیس" مطبوعہ کہکشاں مارچ سنہ ۱۹۱۹ء میلادی کا آخری اور ضروری جزو ہے اس میں ہم نے "مقناطیس اعظم" یعنی زمین کی مقناطیسی حالت اور اس کے متعلقہ مظاہر کی عام فہم تشریح کی ہے۔

"ارضی مقناطیسیت" علم مقناطیس کا ایک اہم شعبہ ہے۔ اور فی زمانہ مختلف مقامات پر سیکڑوں معامل ہیں زمین کی مقناطیسی حالت کا صحیح معلومات النادر کالمعدوم تھیں۔ الحمدللہ کہ فی زمانہ ایسا علمی قحط ناممکن ہے۔

علم مقناطیس کا ایک ضروری حصہ زمین کی مقناطیسی قوت کے متعلق ہے۔ اس لئے ڈاکٹر گلبرٹ کا سب سے اہم کارنامہ زمین کی مقناطیسیت کا صحیح مطالعہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے ثابت کیا۔ کہ زمین بجائے خود ایک مقناطیس کی مانند تمام مقناطیسوں اور مقناطیسی اشیاء پر عمل کرتی ہے۔

کسی علمی قیاس یا نظریہ کی تفہیم تام کے لئے اس کے متعلق جملہ ضروری امور کا مطالعہ لازمی ہوتا ہے۔ اس لئے پیشتر اس کے کہ ہم گلبرٹ کے اس کارنامہ کی تشریح کریں۔ ہم مختصراً امور متعلقہ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

مقناطیسی پتھر اور مقناطیسی سوئی لٹکانے کے بعد ہمیشہ ایک ہی سمت میں ساکن ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ تانبا، لکڑی، پیتل یا کسی اور چیز کے ایک ٹکڑے کو دھاگے سے باندھ کر

لٹکائیں۔ تو یہ کبھی ایک سمت میں ساکن ہوتے ہیں اور کبھی دوسری سمت میں۔ ان کے لئے تمام سمتیں یکساں ہیں۔ لیکن مقناطیس ہمیشہ شمالی جنوبی سمت میں لٹکتا ہے۔ آپ ایک مقناطیس کو دھاگے سے باندھ کر ذرا سے گھما دیں تو ساکن ہونے پر اس کے دونوں سرے اسی سمت میں پائے جائیں گے۔ فصل دوم میں مبادی علم مقناطیس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس قدر تو ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کہ مقناطیس کا یہ انوکھا طریق عمل ضرور کسی مقناطیسی کشش کا نتیجہ ہے۔ اس مقناطیسی کشش کا باعث کیا ہے؟ متقدمین کہتے تھے۔ کہ قطب ستارہ یا اس کے قریب کے کسی ستارہ کی کشش سے مقناطیسی سوئی ہمیشہ شمالاً جنوباً ساکن ہوتی ہے۔ لیکن گلبرٹ نے ثابت کیا۔ کہ یہ توجیہ ناکافی اور غلط ہے ۔

اگر لوہے کی ایک سلاخ (یا فولاد کے سیسے کی سلائی) کو اس کا توازن ٹھیک کر کے لٹکائیں۔ تو یہ متوازی الافق لٹکتی ہے۔ اب اگر اسے مقناطیس سے رگڑ دیں۔ تو اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ خود مقناطیس بن جاتی ہے۔ اس کا سر شمال کی جانب ہوتا ہے۔ وہ نیچے کی طرف جھک جاتا ہے۔ اور دوسرا سرا یعنی قطب جنوبی اوپر کی طرف اٹھا رہتا ہے ۔
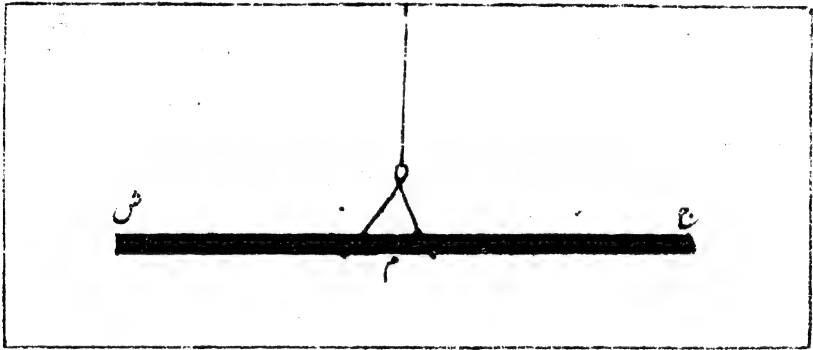
شکل (۱) لوہے کی سلاخ (سلائی) اپنے مرکز نقطہ م سے غیر مقناطیسی حالت میں متوازی الافق لٹکتی ہے ۔

کہکشاں

جلد (۵) — لاہور - ماہِ جولائی سنہ ۱۹۲۰ء — نمبر (۱)

توسیع و ترقی اُردو

اُردو زبان کی وسعت سے اِس وقت ہماری مراد وسعتِ مکانی نہیں ہے - گو یہ بات بھی ہماری کچھ کم خوشی کا موجب نہیں ہے - کہ ہمارے وطن کی زبان عدن مسقط - بصرہ - بغداد - سویز اور مصر میں بھی بولی اور سمجھی جانے لگی - اس وقت ہمارا روئے سخن صرف اس کے ذخیرۂ الفاظ کی طرف ہے - علوم جدیدہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو عموماً یہ شکایت رہتی ہے - کہ مختلف انحاء کلام کے اظہار کے لئے ہمارے پاس کافی ذخیرہ الفاظ نہیں ہے - اس میں ذرا بھی شبہ نہیں - کہ جتنا کافی و وافی ذخیرہ الفاظ انگریزی زبان میں موجود ہے - اتنا سرمایہ ہماری زبان میں نہیں ہے - مگر وہ ایسی بھی گئی گزری نہیں جیسا اسے ہمارے انگریزی خوان نوجوانوں نے سمجھ رکھا ہے -

اس غلط خیال پیدا ہونے کے کئی سبب ہیں - سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ عموماً تعلیم یافتہ نوجوانوں کو فارسی و عربی تعلیم کافی درجے کی نہیں دی جاتی ہے - اور چونکہ ہماری مادری زبان کے علمی اور اخلاقی زبان کے معدن یہی زبانیں ہیں - اس لئے ہمارے نوجوان اس قسم کے خیالات کے اظہار میں قاصر رہتے ہیں - یعنی اس کے لئے اپنے ذخیرہ میں کافی الفاظ نہیں پاتے -

دوسرا سبب اس شکایت کا یہ ہے - کہ آج کل ہاں

باپ اور اَور بزرگوں کو خاص خیال اولاد کی زبان کی درستی کا ہونا چاہئے۔ وہ نہیں ہے۔ انہوں نے اس چھکڑا پلٹن کو بالکل مطلق العنان چھوڑ دیا ہے۔ وہ جس طرح چاہیں اپنی زبان بگاڑیں + یہ زمانہ روشن خیالی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اور ہر شخص اپنے تئیں فلسفی جانتا ہے۔ اور یقین کرتا ہے۔ کہ فلسفہ کے جس ذروہ اقصیٰ پر میں پہنچا ہوں وہاں تک اَور کوئی نہیں پہنچا + زبان کا فلسفہ ان کے نزدیک یہ ہے۔ کہ زبان یعنی زبان کے الفاظ علامات ہیں اظہار مافی الضمیر کی۔ پس جس علامت سے مافی الضمیر ظاہر ہو جائے وہی زبان ہے۔ بھوک میں کھانا مانگنے کے لئے روٹی کہکر مانگو۔ یا نان کہکر یا اہل پنجاب کی طرح ٹُک یا ٹکر کہکر۔ یا صرف منہ کو ہاتھ لگا دو۔ سب کا ماحصل ایک ہے +

یہ فلسفہ صرف گھر کی چار دیواری میں ہی محدود رہتا تو تب بھی خیر تھی۔ مگر زیادہ حیرت تو یہ ہے۔ کہ ہمارے جری فلاسفر اپنے اس فلسفے کو مجالس اور مجامع تک پہنچاتے ہیں۔ میرے دوست چاہے بُرا ہی مانیں۔ مجھے تو یہ بگڑی زبان پسند نہیں آتی۔ مجھے اُردو زبان میں بلاضرورت انگریزی الفاظ ملے ہوئے نہایت کریہہ معلوم ہوتے ہیں اور بعض مجالس میں اس دوغلی زبان کے سننے سے اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔ مگر صدر مجلس و اعیان قوم ہیں۔ کہ اس بھونڈی زبان پہ چیرز دے رہے ہیں +

قوم کے بزرگوں کے علاوہ ماں باپ بھی اپنی اولاد کے اس فلسفہ کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے صاحبزادے فضل و علم میں ہم سے بڑھ گئے ہیں۔ اور ہمیں رہنمائی کر سکتے ہیں۔ نہ کہ ہم ان کی رہنمائی کریں +

یہ خیال خصوصاً ان خاندانوں میں ہے۔ جہاں علم و تہذیب کا آغاز اسی پشت سے ہوا ہے۔ ان نو علم نوجوانوں کے والدین اپنی اولاد پر کوئی فوقیت علمی نہ رکھنے کی وجہ سے انکی زبان میں کوئی روک ٹوک یا اصلاح نہیں کر سکتے + پھر ان خاندانوں سے یہ مرض متعدی نکل کر کسی حد تک دوسروں کو بھی چمٹتا جاتا ہے۔ اور مجھے اس بات کے دیکھنے سے سخت قلق ہوتا ہے۔ کہ یہ تعدیہ بعض نہایت متانت پسند یا وقار مصنفوں پر بھی اثر پہنچانے لگا ہے +

زبان میں اس قسم کا بیہودہ و ناواجب اختلاط جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔ عربی و فارسی کی عدم مہارت کی وجہ سے ہی نہیں ہے۔ بلکہ انگریزی فیشن کے اثر سے یا یُوں کہنا چاہئے کہ انگریزوں کی نقالی سے بھی ہے۔ مثلاً ایک انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان اپنے کوچوان کو حکم دیتا ہے۔ "اسی دم گاڑی تیار کرو۔ ہم ابھی جائیگا" "تم اس قدر دیر میں کیوں آیا" یا کسی دوکاندار سے کہتا ہے "ہم اس موافق نہیں مانگتا" + ہم حیران ہیں۔ کہ شرفا میں رہ کر۔ شریفوں کے بچے کہلا کر۔ صاحب علم بن کر یہ چماروں کی بولی بولنا کیوں پسند کرتے ہیں۔ اور دوسرے شرفا اس بدعت کو کیوں بڑھنے دیتے ہیں + قوم کے بزرگوں کو اپنی زبان کی درستی کی طرف خاص اہتمام سے توجہ کرنی چاہئے۔ آداب مجلس اور آداب گفتگو میں یہ بات داخل ہونی چاہئے۔ کہ بلاضرورت اپنی زبان میں اجنبی الفاظ مخلوط کرنا سخت گنوارپن سمجھا جائے۔ اور ایسی بولی بولنے والے کی ضرور ہنسی اڑائی جائے + والدین کا فرض ہے کہ اول روز سے بچوں کے بول چال پر روک ٹوک رکھیں +

اِس روک ٹوک کے یہ معنی نہیں۔ کہ اگر بچے نے کوئی انگریزی لفظ منہ سے نکالا۔ تو جھٹ اسے جھڑک دیا بلکہ دیکھنا چاہئیے۔ کہ وہ لفظ بلا ضرورت تو نہیں۔ بہت سے انگریزی الفاظ ہماری زبان میں داخل ہو کر جزو زبان بن گئے ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں ہماری زبان میں ہندی الفاظ موجود نہیں۔ ان کے استعمال میں کچھ ہرج نہیں بلکہ ان کا استعمال لابدی ہے۔ وہ الفاظ اس قسم کے ہیں۔ ریل۔ ٹکٹ۔ بسکٹ۔ بوتل۔ اسٹیشن۔ لیمپ۔ ان الفاظ کو ہم اب مثل مادری زبان کے الفاظ کے سمجھتے ہیں لیکن مفصلہ ذیل بولی کو میں ہرگز اردو نہ کہوں گا:۔

آج ٹون ہال میں میٹنگ ہونے والی ہے۔ وہاں کا ہال چھوٹا ہے اس لئے اندر نہیں بلکہ لان میں اوپن ایر میٹنگ ہوگی۔ ابھی یہ سرٹن نہیں۔ کہ کون پریزائڈ کرے گا۔ مگر یہ یقینی ہے۔ کہ آڈئینس بہت ہوگی۔ اور ڈسکشن بہت انٹرسٹنگ ہوگا۔ آپ بھی جائیں گے یا نہیں؟

دوست۔ میں ایسی میٹنگ کے بالکل اگینسٹ ہوں۔ ان میں کوئی بات آرگیومنٹ کی نہیں ہوتی صرف سنٹی منٹل تقریریں ہوتی ہیں۔ جو ماب کو بہت اکسائٹ کرتی ہیں۔ اِن سپائٹ آف آل دِس میں یہ میٹنگ اٹنڈ کرتا۔ مگر اَن فورچونیٹ لی عین اسی ٹائم یعنی ہاف پاسٹ سکس پر میری ایک اَور انگیجمنٹ ہے

کون کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ اردو زبان ہے۔ اور اگر آج تعلیم یافتہ لوگوں کی یہ بولی ہے۔ تو پچاس برس بعد ہماری زبان کا کیا حال ہوگا؟

زبان کی اس قسم کی خرابی کا تدارک روک ٹوک وغیرہ سے بخوبی ممکن ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ ہماری زبان میں جو الفاظ ضروری کی بہت کمی ہے۔ اس کی طرف توجہ کی جائے۔ اور اس کمی کے پورا کرنے کی تدابیر سوچی جائیں۔ جن اصحاب کو علمی مضامین کے لکھنے اور اس قسم کی دقتوں سے مقابلہ کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ ان سے یہ امر بھی مخفی نہ ہوگا۔ کہ ہماری زبان میں کس خاص قسم کے الفاظ کی کمی ہے۔ اور اس کا کیا سبب ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ زمانہ حال میں ہر چیز کی حقیقت و ماہیت معلوم کرنے میں کوششوں کو درجہ کمال پر پہنچایا گیا ہے۔ اور نہ صرف مادیات میں بلکہ ذہنیات میں بھی تحلیل و تجزیہ سے انتہا درجہ کا کام لے کر بال کی کھال نکالی گئی ہے۔ اس تحقیق و تدقیق کا یہ نتیجہ ہوا ہے۔ کہ مادیات اور کیفیات ذہنی کی حقائق کے زیادہ منکشف ہوجانے کے وجہ سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اور ان کے بیان کے لئے نئے الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر باغ میں جاکر کسی ایک پھول کے مختلف اقسام صرف بلحاظ رنگ ہی دیکھی جائیں۔ تو ان سب رنگوں کے لئے ہماری زبان میں نام نہ ملیں گے اس کی کیا وجہ؟ یہی وجہ ہے۔ کہ ہمارے ملک میں زیادہ غور و نظر کی عادت نہیں۔ صرف سرخ اور گلابی دو بہت بیّن رنگوں کو دیکھا۔ اور دو نام تجویز کرنے کافی سمجھے۔ لیکن جو درجے گلابی اور سرخ کے درمیان ہیں نہ ان کو دیکھا۔ نہ ان کے لئے نام تجویز کئے۔ مادیات میں تو اس نقص سے چنداں غلط فہمی کا اندیشہ نہیں لیکن

امورِ ذہنی میں ذرا ذرا سے فرق سے بڑی غلطیوں کے
پیدا ہونے کا خوف ہے۔ میں تمثیلاً ایک معمولی لفظ بیان
کرتا ہوں یعنی چاہنا۔ یہ لفظ دو ذہنی فعلوں کے لئے
بولا جاتا ہے۔ ایک تو ارادہ کے لئے۔ دوسرے پسندیدگی
کے لئے۔ اور عام طور پر یہ دونو فعل مترادف و ہم معنی
سمجھے جاتے ہیں لیکن اگر ہم کسی الہیات کی کتاب کے
ترجمے میں یہ لکھیں۔ کہ ہر گناہ جو وقوع میں آتا ہے
اللہ اسے چاہتا ہے یعنی پسند کرتا ہے تو یقیناً یہ اسلامی
عقیدہ کے خلاف ہوگا۔ عقیدہ اسلامی یہ ہے۔ کہ دنیا
میں کوئی ذرہ بغیر ارادہ و مشیت ایزدی حرکت نہیں
کرتا۔ لیکن اس ارادہ سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ اللہ تعالےٰ
کی رضامندی یا پسندیدگی بھی اس فعل پر ہو۔ ارادہ اَور
ہے۔ اور پسندیدگی اَور۔ مگر اردو میں دونو کے لئے چاہنا
بول دیتے ہیں۔ جو بسا اوقات موجب غلط فہمی ہوتا ہے
محققینِ الفاظ کو ایسے الفاظ کی بخوبی تشریح کرنی چاہئے
اور مختلف معانی کے لئے مختلف الفاظ تجویز کرنے چاہئیں +

جن لوگوں کو عربی زبان پر اچھی قدرت ہے۔ ان
کو چاہئے کہ الفاظ مناسب جو ہماری زبان میں آسانی
اور خوبصورتی کے ساتھ کھپ سکیں ان کو رواج دینا
شروع کریں۔ نہ اس خیال سے کہ آسان عبارت کو
مشکل کیا جائے۔ بلکہ اس خیال سے کہ کلام میں تنوع اور
وسعت پیدا ہو + ہر مصنف بجائے اس کے کہ وہ موجودہ
ذخیرہ الفاظ سے ہی کام لے ۔ وہ اپنی کوشش خاص
سے چند جدید الفاظ کا اضافہ کرنا اپنا فرض ضروری
سمجھے۔ جن لوگوں نے مولانا شبلی کی تصانیف کا مطالعہ
کیا ہوگا۔ وہ ان میں ضرور چند الفاظ ایسے پائیں گے
کہ ان سے پہلے دوسرے مصنف ان کو ایسے عام طور
پر استعمال نہیں کرتے تھے۔ جیسے انہوں نے کئے ہیں۔
تمثیل کے طور پر میں پانچ الفاظ اس قسم کے پیش کرتا ہوں
جن میں سے تین عربی ہیں۔ اور ایک فارسی اور ایک
ہندی + عربی الفاظ یہ ہیں استقصا۔ استیعاب۔ اعتنا
اور فارسی لفظ ہمہ گیر ہے۔ اور ہندی کڑی ہے۔ میں یہ
نہیں کہتا۔ کہ ان الفاظ خاص کے استعمال میں وہ بالکل
منفرد ہیں۔ نہیں اَور لوگوں نے بھی احیاناً یہ الفاظ استعمال
کئے ہوں گے۔ مگر جس طرح انہوں نے ان سے کام لیا
اور ان کے استعمال کو عام رواج دیا۔ اس طرح اَور
کسی نے نہیں کیا +

میں جن الفاظ جدید سے اردو زبان کو وسعت دینا
چاہتا ہوں۔ یہ عموماً تین قسم کے ہوں گے۔ ایک وہ الفاظ
جو اب بھی کسی ہیئت خاص سے ہماری زبان میں مروج
و مستعمل ہیں لیکن وہی الفاظ باندک تغیر دوسری ہیئت
میں ہماری زبان میں مروج نہیں۔ ان الفاظ کی
دوسری صورتیں بھی زبان میں جاری کی جائیں۔ اس
سے کچھ تو زبان میں وسعت ہوگی۔ اور وسعت نہ سہی
تو ایک قسم کا تنوع تو ضرور ہوگا۔ تمثیلاً ہم چند الفاظ یہاں
بیان کرتے ہیں۔

ہماری زبان میں شغل اور اشتغال بخوبی مستعمل ہیں
لیکن انشغال بولنے کا رواج نہیں۔ حالانکہ ایسے موقعوں پر
جہاں لازمی معنی اور حالت انفعالی ظاہر کرنی مقصود ہو یہ
لفظ بخوبی کام دے سکتا ہے +

فضل و کرم و شرف اور تفضیل و تکریم و تشریف کثرت
سے بولے جاتے ہیں۔ لیکن تفضّل۔ تکرّم۔ تشرّف بولنے کا
بالکل دستور نہیں۔ یہ الفاظ بھی نہایت خوبی کے ساتھ
ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں۔ ضایع و تضییع الفاظ
روزمرہ استعمال میں آتے ہیں۔ لیکن ضیاع و اضاعت
مروج نہیں۔ اسی طرح عوض معاوضہ کے الفاظ ہماری
زبان میں عام طور پر بولے جاتے ہیں۔ لیکن استعاضہ کا لفظ
کبھی کوئی استعمال نہیں کرتا ہے۔ سرعت۔ الفت۔ علاقہ
وغیرہ الفاظ رات دن بولنے میں آتے ہیں لیکن تسرّع
ائتلاف۔ تعوید وغیرہ الفاظ کام میں نہیں لائے جاتے
اگر یہ الفاظ اور ان کے مانند سیںیوں اور کارآمد الفاظ
ہم اپنی تحریروں میں داخل کریں۔ تو کیا اس سے توسیع
و تنوّع کا کام حاصل نہ ہوگا؟

ان الفاظ کے علاوہ بعض اور الفاظ نہایت سادہ
اس قسم کے ہیں۔ جو علمی یا اخلاقی کارآمد خیالات کے اظہار
کے لئے ادب اردو میں بخوبی جگہ پا سکتے ہیں۔ مثلاً نکث
(عہد شکنی)۔ تہاون (حقیر سمجھنا)۔ تجاورت (قرب)۔
مکث (دیر و انتظار)۔ شیون (جمع شان)۔ تبرّج
(اظہار زیب و زینت)۔ وسخ (میل کچیل)۔ تمشّی (پیدل
چلنا)۔ استکراہ۔ تکثیر۔ انتعاش وغیرہ وغیرہ۔

مصر و شام کے اہل ادب نے بعض الفاظ کے معنی
میں تصرف کیا ہے۔ اور پرانے الفاظ کو نئے معانی پہنائے
ہیں۔ ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہئے۔ مثلاً معصر یا
معاصر کو رصیف کہتے ہیں۔ اخبار کے کالم کو عمود۔ فہرست
کو قائمہ۔ اجیٹیشن کو مجاہرہ۔ ڈیمانسٹریشن کو مظاہرہ
بائی کاٹ کو مقاطعہ۔ وقعت اور وقیع کے لئے فخامت
اور فخیم استعمال کرتے ہیں۔ متانت و سنجیدگی کے لئے حشمت
کا لفظ بولتے ہیں۔ ووٹ کو صوت کہتے ہیں۔ ان الفاظ
کو ہم بھی اسی طرح کیوں نہ استعمال کریں؟

ان تین قسم کے الفاظ کے علاوہ وسعت زبان کے
لئے عربی کی بعض ترکیبات بآسانی زبان میں داخل
ہو سکتی ہیں۔ مثلاً علی الاقل۔ مافی الباب۔ سدّ اللباب
هضماً للنفس۔ رفعاً للتعارض۔ لا الی النہایۃ۔ علی سبیل
کے ساتھ بعض مرکبات نہایت کارآمد بن سکتے ہیں۔ مثلاً
علی سبیل الحکایۃ۔ علی سبیل الاستعارہ۔ علی سبیل المجاز۔ علی سبیل
المبالغہ۔ علی سبیل الاختصار وغیرہ وغیرہ۔

غرض اگر اہل علم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ کریں۔ لعدیہ توجہ
بالالتزام جاری رہے تو ہم ذخیرہ الفاظ کی کمی کا الزام ایک بڑی
حد تک اپنی زبان پر سے مٹا سکتے ہیں۔ اور اردو کو قیمتی لغات
سے مالا مال کر سکتے ہیں۔

خاکسار رشید ممتاز علی

صحیح تناسب

انشا میں صحیح تناسب اسے کہتے ہیں۔ کہ جن نتائج کا استنباط کیا جائے وہ بالطبع ہوں۔ خیالات کا تتابع درست ہو
اور ہر جملہ میں اتنے ہی الفاظ ہوں۔ جتنے کسی قوی تصور کے بعد ہونے ضروری ہیں۔

تاج (دلینڈ طرح)

مقابلہ امرؤ القیس و علقمہ

محاکمہ اُمِ جُندب

قحمی کا بیان ہے۔ کہ جن دنوں امرؤ القیس بنی طے کے جوار میں تھا۔ اسی قبیلہ کی ایک عورت سے جس کا نام اُمِ جُندب تھا عقد کر لیا تھا۔ مگر دونوں میں نا اتفاقی تھی۔ انہیں دنوں علقمہ کا وہاں ورود ہؤا۔ اس کو زعم تھا۔ کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی شاعر نہیں اور امرؤ القیس کو یہ ادعا۔ کہ شعر میں کوئی میرا مقابل نہیں۔ علقمہ نے کہا۔ اپنے گھوڑے اور شکار کی تعریف میں کچھ سناؤ۔ اسی باب میں میں بھی کچھ کہوں گا ہمارا تمہارا محاکمہ اسی سے ہو جائیگا +

امرؤ القیس نے یہ قصیدہ فی البدیہہ پڑھنا شروع کیا۔

خَلِیلَیَّ مُرَّا بِی عَلیٰ اُمِّ جُندَبِ
لِنَقضِ لُبَانَاتِ الفُؤَادِ المُعَذَّبِ

دوستو مجھے اُم جُندب کے پاس لے چلو۔ کہ اس ستم زدہ دل کی آرزوؤں کو میں پورا کروں۔

فَاِنَّکُمَا اِن تَنظُرَانِی سَاعَۃً
مِنَ الدَّھرِ تَنفَعنِی لَدَی اُمِّ جُندَبِ

اگر تم تھوڑی دیر کے لئے میرا انتظار کرو تو اتنی دیر اُم جُندب کے پاس ٹھہرنا میرے حق میں بہتر ہے +

تخییل شاعر کی یہ ہے۔ کہ وہ دوستوں کے ساتھ حالتِ سفر میں اُم جندب کی طرف گزر رہا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ دوست اس کے انتظار میں اتنی دیر ٹھہرے رہیں۔ کہ یہ جاکر اُم جُندب سے مل آئے +

اَلَم تَرَیَانِی کُلَّمَا جِئتُ طَارِقًا
وَجَدتُ بِھَا طِیبًا وَاِن لَم تَطَیَّبِ

تمہیں یہ نہیں معلوم۔ کہ میں جب کبھی رات کو اس کے ہاں گیا۔ تو میں نے اس میں ایک طرح کی خوشبو پائی گو اس نے کوئی خوشبو نہ لگائی تھی۔

عَقِیلَۃُ اَترَابٍ لَھَا لَا دَمِیمَۃٌ
وَلَا ذَاتُ خُلقٍ اِن تَاَمَّلتَ جَانِبِ

وہ ایسی ویسی نہیں۔ بلکہ اپنی ہم سن خواتین میں عزت دار ہے۔ اور اگر تو غور سے دیکھے۔ تو اس میں بیگانگی کی ادا نہ پائے گا۔ یعنی ملنسار بہت ہے +

اَلَا لَیتَ شِعرِی کَیفَ حَادِثُ وَصلِھَا
وَکَیفَ تُرَاعِی وُصلَۃَ المُتَغَیِّبِ

کاش مجھے معلوم ہو کہ اس کا دل (میری طرف سے) اب کیسا ہے۔ اور عاشقِ ہجور کی محبت کا اب کتنا پاس ہے +
شاعر یہ تخییل کرتا ہے۔ کہ چونکہ اُم جندب کہیں چلی گئی ہے۔ اس

لئے وہاں جانے کے بعد اس کی طبیعت بدل تو نہیں گئی +

أَقَامَتْ عَلَى مَا بَيْنَنَا مِنْ مَوَدَّةٍ
أُمَيْمَةُ أَمْ صَارَتْ لِقَوْلِ الْمُخَبِّبِ

کاش یہ معلوم ہو۔ کہ امیمہ کو جو محبت مجھ سے تھی اب بھی اس محبت پر قائم ہے۔ یا بہکانے والے کے کہنے میں آگئی۔ امیمہ ام جندب کا نام ہے +

فَإِنْ تَنْأَ عَنْهَا حِقْبَةً لَا تُلَاقِهَا
فَإِنَّكَ مِمَّا أَحْدَثَتْ بِالْمُجَرِّبِ

اگر تو اس سے ایک زمانہ تک دور رہے اور کبھی ملاقات نہ کرے۔ تو جو کچھ وہ کر گزرے گی۔ اس کا تجھے تجربہ ہو چکا ہے +

وَقَالَتْ مَتَى يُبْخَلْ عَلَيْكَ وَيُعْتَلَلْ
يَسُؤْكَ وَإِنْ يُكْشَفْ غَرَامُكَ تَدْرَبِ

بولی (بڑی مشکل ہے)۔ جب تجھ سے بخل کیا جاتا ہے اور تیری بات ٹال دی جاتی ہے۔ تو تجھے برا معلوم ہوتا ہے اور اگر تیری آرزو پوری کر دی جاتی ہے۔ تو پھر پیچھا نہیں چھوڑتا۔

تَبَصَّرْ خَلِيلِي هَلْ تَرَى مِنْ ظَعَائِنٍ
سَوَالِكَ نَقْبًا بَيْنَ حَزْمَيْ شَعَبْعَبِ

یار ذرا غور سے دیکھنا۔ موضع شعبعب کی دو نو چڑھائیوں کے درمیان جو رستہ نکلا ہے۔ اس راستہ میں کچھ محملیں جاتی ہوئی تجھے دکھائی دیتی ہیں۔ گویا یہ گزرا ہؤا واقعہ دل پر نقش تھا۔ کہ آج تک آنکھوں میں اس کی تصویر پھر رہی ہے۔ اپنے رفیق سے کہتا ہے۔ ذرا تو بھی دیکھ۔ واقع میں محملیں جا رہی ہیں۔ یا مجھی کو دکھائی دیتی ہیں +

عَلَوْنَ بِأَنْطَاكِيَّةٍ فَوْقَ عِقْمَةٍ
كَجِرْمَةِ نَخْلٍ أَوْ كَجَنَّةِ يَثْرِبِ

(یہ خواتین جب سوار ہوئی ہیں تو محملوں پر) انطاکیہ کی پوششیں ڈال لی تھیں جس کے نیچے مشجّر تھا جس میں نخلستان کے خوشے یا یثرب کا باغ (بنا ہؤا تھا)

وَلِلّٰهِ عَيْنَا مَنْ رَأَى مِنْ تَفَرُّقٍ
أَشَتَّ وَأَنْأَى مِنْ فِرَاقِ الْمُحَصَّبِ

اے افسوس ہے ان آنکھوں پر۔ جنہوں نے ایسی مفارقت کا صدمہ اٹھایا ہو۔ جو محصّب کی جدائی سے بھی بڑھ کر ہو۔ (ملکوں ملکوں کے زن و مرد حج کے لئے جمع ہوتے ہیں وہ محصّب میں پہنچ کر بچھڑ جاتے ہیں)

فَرِيقَانِ مِنْهُمْ جَازِعٌ بَطْنَ نَخْلَةٍ
وَآخَرُ مِنْهُمْ قَاطِعٌ نَجْدَ كَبْكَبِ

محصّب سے جانے والوں کے دو راستے ہیں۔ ایک راہ نشیب کی طرف نخلستان ابن عمر سے ہو کر۔ دوسری راہ بلندی کی طرف کوہ کبکب کے قریب سے۔

فَعَيْنَاكَ غَرْبَا جَدْوَلٍ فِي مَفَاضَةٍ
كَمَرِّ الْخَلِيجِ فِي صَفِيحٍ مُصَوَّبِ

اب آنکھیں تیری دو پکھالیں اس ندی پر کی ہیں۔ جو زمین وسیع پر جاری ہے۔ (یا) روانی ہے اس چشمے کی جو چٹان پر بہہ رہا ہو۔ جو ڈھلوان جگہ پر (رکی) ہوئی ہے

وَإِنَّكَ لَمْ يَفْخَرْ عَلَيْكَ كَفَاخِرٍ
ضَعِيفٍ وَلَمْ يَغْلِبْكَ مِثْلُ مُغَلَّبِ

جو (تجھ سے) کمزور رہے اس کی سی بڑائی تجھ سے کسی نے نہ کی ہوگی۔ اور جو تجھ سے مغلوب ہے۔ اس سے بڑھکر کسی نے

تجھ پر غلبہ نہ پایا ہوگا۔

عرب کا یہ ایک خاص طرز بیان ہے۔ اُردو میں اس طرح کہتے ہیں جو کمزور ہوتا ہے وہی زیادہ بڑائی کرتا ہے جو کمینہ ہوتا ہے وہی زیادہ اِتراتا ہے۔ جو ذلیل ہوتا ہے وہی غلبہ پاکر طرح نہیں دیتا ہے۔ جو کنوڈا ہوتا ہے وہی زیادہ شیخی بگھارتا ہے۔ لَمْ يَفْخَرْ عَلَيْكَ كَفَاخِرٍ ضَعِيف شاید علقمہ پر طعن ہے +

وَاِنَّكَ لَمْ تَقْطَعْ لُبَانَةَ عَاشِقٍ
بِمِثْلِ غُدُوٍّ اَوْ رَوَاحٍ مُاَوَّبِ

دل مفتوں کے تعلق کو تو اور کسی طرح قطع نہیں کر سکتا سوا اس کے کہ صبح کو نکل گئے یا شام کو نکل گئے۔ تو رات گئے واپس آئے۔ یعنی قطع تعلق منظور ہو تو جدائی اختیار کرنا چاہئے پھر صبر آ ہی جائے گا +

بِاَدْمَاءَ حُرْجُوْجٍ كَاَنَّ قُتُوْدَهَا
عَلٰى اَبْلَقِ الْكَشْحَيْنِ لَيْسَ بِمُغْرَبِ

(صبح یا شام کو نکل جانا) ایک دراز قامت سفید ناقہ پر کہ معلوم ہو پالان کا ڈھانچہ (اس کی پشت پر نہیں ہے بلکہ) ایک حمار تیز رفتار کی پشت پر ہے۔ جس کی کمر ابلق ہے۔ اور مُغرب ہونے کا عیب اس میں نہیں ہے +

تُغَرِّدُ بِالْاَسْحَارِ فِيْ كُلِّ سُدْفَةٍ
تَغَرُّدَ مَيَّاحِ النَّدَامٰى الْمُطَرِّبِ

یہ حمار صبح ہوتے دھندلکے کے وقت اس طرح ترنگتا ہے جیسے حریفوں میں کوئی نشہ میں جھومنے والا مزہ میں آکر گانے لگتا ہے۔

شاعر ناقہ کو حمار سے تشبیہہ دے کر ناقہ کو بھول ہی گیا +

اَقَبَّ رَبَاعٍ مِنْ حَمِيْرِ عَمَايَةٍ
يَمُجُّ لُعَاعَ الْبَقْلِ فِيْ كُلِّ مَشْرَبِ

(یہ حمار) چھریرے ڈیل کا چار سالہ کوہ عمایہ کے حماروں میں سے ہے۔ جہاں پانی پیتا ہے۔ اس کے منہ سے گھانس پات کی سبزی چھوٹ کر پانی میں آجاتی ہے۔ یعنی ڈیل سن وطن چارہ کے لحاظ سے اس کا چالاک و تیز رفتار ہونا ثابت ہے۔

بِمُحْنِيَةٍ قَدْ آزَرَ الضَّالَ نَبْتُهَا
مَجَرَّ جُيُوْشٍ غَانِمِيْنَ وَخُيَّبِ

(یہ گدھا) اس وادی کا ہے جہاں کی گھانس (بڑھ کر) جھربیری کے برابر ہوگئی ہے۔ جو کہ منزل ہے اس لشکر جرار کی جو سالم و غانم واپس آئے یا جو مایوس ہو کر پھرے۔ مطلب یہ کہ یہ حمار وحش اس وادی کا ہے۔ جہاں چارہ کثرت سے ہے۔ جہاں لشکر کے لشکر منزل کرتے ہیں۔

گھوڑے کی تعریف و سراپا

وَقَدْ اَغْتَدِيْ وَالطَّيْرُ فِيْ وُكُنَاتِهَا
وَمَاءُ النَّدٰى يَجْرِيْ عَلٰى كُلِّ مِذْنَبِ

میں سویرے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ اور طائر ابھی اپنے آشیانوں ہی میں ہوتے ہیں۔ اور زمین سیراب کا پانی (باغوں کے) نالوں میں بہتا ہوتا ہے +

بِمُنْجَرِدٍ قَيْدِ الْاَوَابِدِ لَاحَهُ
طِرَادُ الْهَوَادِيْ كُلَّ شَاْوٍ مُغَرِّبِ

کم بالوں والے گھوڑے پر سوار ہو کر جو وحشیوں

کے لئے کمند ہے۔ جس کو دُور دُور تک وحشیوں کے
پیچھے دوڑنے نے کُھلا دیا ہے ÷

عَلَی الْاَیْنِ جَیَّاشٌ کَاَنَّ سَرَاتَہٗ
عَلَی الضُّمْرِ وَالتَّعْدَاءِ سَرْحَۃُ مَرْقَبِ

تھک جانے پر اُبل پڑتا ہے۔ اور پشت اس کی
اس لاغری اور اس دوڑ پر گویا ایک درخت بلند ہے
جس پر دیدبان چڑھ کر دشمن کو دور سے آتے ہوئے
دیکھ سکتا ہے ÷

یُبَارِی الْخُنُوفَ الْمُسْتَقِلَّ زِمَاعُہٗ
تَرٰی شَخْصَہٗ کَاَنَّہٗ عُوْدُ مِشْجَبِ

یہ گھوڑا مقابلہ کرتا ہے سرپٹ دوڑنے والے سے
جس کے سُم پیچھے کی طرف اُبھرے ہوئے ہیں۔ اس کا
(چھریرا) ڈیل دیکھو تو یہ معلوم ہو جیسے (کپڑے پھیلانے
کا) بانس۔ یعنی جس طرح رستی کی الگنی کپڑے پھیلانے
کے لئے ہوتی ہے اسی طرح بانس پر بھی کپڑے پھیلایا
کرتے ہیں۔ گھوڑے کو اس بانس سے تشبیہ زبان کی
خصوصیات سے ہے جس کا ترجمہ ممکن نہیں جس طرح
ہماری زبان میں کہتے ہیں۔ کہ فلاں شخص سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔
کھیچی سے ہاتھ پاؤں ہوگئے۔ ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا
فرق اتنا ہے کہ یہ سب مذمت کے پہلو ہیں۔ یہی لاغری
جہاں حسن دیتی ہے۔ تو کہتے ہیں کہ اس کا قد شاخ یاسمین
ہے یا ایک ہری بھری ٹہنی ہے ÷

لَہٗ اَیْطَلَا ظَبْیٍ وَسَاقَا نَعَامَۃٍ
وَصَہْوَۃُ عَیْرٍ قَائِمٍ فَوْقَ مَرْقَبِ

ہرن کی سی کمر شتر مرغ کی ساقیں۔ گورخر کی سی پشت
جو کسی بلندی پر کھڑا ہو۔

وَیَخْطُو عَلٰی صُمٍّ صِلَابٍ کَاَنَّہَا
حِجَارَۃُ غَیْلٍ وَارِسَاتٍ بِطُحْلُبِ

وہ چلتا ہے ایسے ٹھوس سخت (سموں) پر۔ جیسے بہتے
ہوئے پانی کے اندر پتھر جو کائی جم جانے سے زرد ہوگئے
ہوں ÷

لَہٗ کَفَلٌ کَالدِّعْصِ لَبَّدَہُ النَّدٰی
اِلٰی حَارِکٍ مِثْلِ الْغَبِیطِ الْمُذَأَّبِ

اس (گھوڑے) کا کُولا ریتی کا ٹیلہ ہے۔ جسے سیلن نے
جما دیا ہے۔ اس مونڈھے کے مقابل جو ہودج کے کھٹولے
کی مانند ہے۔ یعنی گھوڑے کے کولے بھی بڑے بڑے
ہیں۔ اور مونڈھے بھی چوڑے چوڑے ہیں۔ میر انیس کہتے
ہیں ؎

گردن تلک اسوار چھپے پیش و پس ایسا
سایہ پہ بھی بل کرتا تھا۔ فاقوں میں کس ایسا
مرکب جو لڑائی میں خدا دے تو بس ایسا
اسوار جو ایسا ہو تو ہووے فرس ایسا
رفرف بھی اس انداز سے فر فر نہیں جاتا
یوں تخت سلیماں بھی ہوا پر نہیں جاتا

وَعَیْنٍ کَمِرْآۃِ الصَّنَاعِ تُدِیرُہَا
لِمَحْجَرِہَا مِنَ النَّصِیفِ الْمُنَقَّبِ

اس (گھوڑے) کی آنکھ ایک ہنرمند عورت کی آرسی
ہے۔ جسے وہ گردش دے رہی ہو۔ اپنے چشم و ابرو کے
سامنے جو اوڑھنی کے گھونگھٹ میں سے دکھائی دے
رہے ہیں۔ یعنی اس کی آنکھ آرسی ہے۔ اور آرسی بھی دلہن

کی۔ جب وہ اپنا بناؤ سنگار دیکھنے کے لئے اسے گردش
دے رہی ہو +

لَہٗ اُذُنانِ تَعرِفُ العِتقَ فِیھِما
کَسامِعَتَیْ مَذعُورَۃٍ وَسْطَ رَبْرَبِ

اس کی کنوتیاں ایسی ہیں جس سے اصالت ظاہر
ہے جیسے گلّہ کے درمیان ایک ڈری ہوئی نیل گائے
کان کھڑے کرتی ہے ÷

وَمُستَفلِكُ الذِّفرَى كَأَنَّ عِنانَهُ
وَمَثناتَهُ فِي رَأسِ جِذعٍ مُشَذَّبِ

سر اس کا ایسا ہے۔ کہ کانوں کے پیچھے کا حصّہ اُبھرا
ہُوا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ باگ ڈور اس (گھوڑے)
کی ایک چھانٹے ہوئے درخت کے ٹہنے میں لگا دی
گئی ہے۔ یعنی گھوڑے کی گردن اور کندا ایسا تیار ہے
جیسے درخت کا ٹہنا جسے چھانٹ کر صاف اور چکنا کر دیا
ہے ÷

وَأَسحَمُ رَيّانُ العَسِيبِ كَأَنَّهُ
عَثاكِيلُ قِنوٍ مِن سُمَيحَةَ مُرطِبِ

دُم اس کی سیاہ جڑ کے پاس سے تیار جیسے گچھے
خوشہ درخت خرما کے۔ اور درخت بھی موقع سمیحہ
کا جو پھلا ہُوا ہو ÷

إِذا ما جَرى شَأوَينِ وَابتَلَّ عِطفُهُ
تَقولُ هَزيزُ الريحِ مَرَّت بِأَثأَبِ

جب دو دفعہ وہ دوڑ چکا ہو اور اس کے پہلو پسینہ
میں تر ہو گئے ہوں۔ تو گویا ہوا کا جھونکا درخت اثأب
میں سے گزر گیا۔ یعنی اس کے فراٹے کی آواز ایسی معلوم
ہوتی ہے۔ جیسے درختوں میں ہوا کے گزرنے کی آواز
ہوتی ہے +

يُدِيرُ قَطاةً كَالمَحالَةِ أَشرَفَت
إِلى سَنَدٍ مِثلِ الغَبيطِ المُذَأَّبِ

گردش دیتا ہے پشت کو دولاب کی طرح۔ جو بلند ہے
اور مقابل میں مونڈھوں کے واقع ہے - ہودج کے
وسیع کھٹولے کی طرح (کشادہ) ہے یعنی پشت و شکم کا
دولاب کی طرح مدوّر ہونا دکھاتا ہے۔ میر انیسؒ

ان دونوں اشہبوں کی وہ چھل بل وہ تنگ جائے
جو ان کی چال دیکھنے آئے وہ دنگ جائے
صورت کا نہ بناؤ نہ سرعت کا ڈھنگ جائے
اُڑتے تھے یُوں کہ جیسے ہوا پر خدنگ جائے
پریاں تھیں دو وہ اسپ سعادت اثر نہ تھے
سب تھی ہما کی تیز پری اور پر نہ تھے

اسوار آفتاب تو گھوڑے تھے ماہ رُو
سرعت یہ تھی کہ دوڑتا تھا جسم میں لہُو
جاندار و خوش رکاب و سعید و خجستہ خُو
صاف آتی تھی پسینہ سے جن کے وفا کی بُو
ڈھالا تھا جوڑ بند کو سانچے میں نور کے
نازک کلائیاں تھیں کہ پہنچے تھے حور کے

دونوں کنوتیاں ہیں کہ پیکانِ تیر ہیں
چاروں سُم ان کے غیرتِ ماہِ منیر ہیں
آنکھوں پہ کیجئے جو نظر بے نظیر ہیں
یال ایسی جس کے پیچ میں پریاں اسیر ہیں
سرعت میں ان سے طیر کو نسبت نہ تیر کو

نرمی یہ جلد میں کہ خجالت حریر کو
آئے اِدھر سے گر تو اُدھر سے نکل گئے
پہنچے کنارِ بحر تو بر سے نکل گئے
مانندِ برق لشکرِ محشر سے نکل گئے
دو تیر آگے تیرِ نظر سے نکل گئے
یُوں پھر رہے تھے بیچ میں فوجِ غنیم کے
جیسے سحر کو چلتے ہیں جھونکے نسیم کے
غنچے تھے دو ملے ہوئے اِک جا کہ ان کے گوش
برگستواں میں جسم کہ رستم تھا درع پوش
سرعت کو دیکھ لیں تو اُڑیں طائروں کے ہوش
گرتا تھا منہ سے کف تو شجاعت کا تھا یہ جوش
پریاں اڑا سکیں نہ روش انکی چال کی
بالکل مزاج شیر کا آنکھیں غزال کی
وہ سم وہ نعل اور وہ سینے وہ ترکتاز
بدر و ہلال و آئینہ و کبک و شاہباز
زیور تھا ایک شب کی دُلہن کا کہ انکے ساز
وہ کلغیاں کہ طرۂ لیلی سے سرفراز
بن کر گہر پسینہ کے قطرے ٹپکتے ہیں
ہیکل کی تختیاں کہ ستارے چمکتے ہیں

فیوماً علی سرب نقیّ جلودہ
ویوماً علی بیدانۃ ام تولب

کسی دن یہ گھوڑا اس ریوڑ پر (حملہ کرتا ہے) جس کی کھالیں نفیس و پاکیزہ ہیں۔ اور کسی دن مادہ گورخر پر جو بچہ کی ماں ہے۔

نکتہ:۔ اردو میں یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کہ ریوڑ کے مقابلہ میں مادہ گورخر پر حملہ کرنے میں کیا خوبی ہے۔ لیکن اصل میں کوئی عجیب امر نہیں ہے۔ ہر زبان کی شاعری میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ اور اس قسم کی مجبوری شاعر کو قافیہ کے سبب سے پیش آتی ہے۔ یہاں قافیہ ہے۔ تولب یعنی کرۂ خر۔ اس سبب سے ریوڑ کے ساتھ ام تولب کا ذکر شاعر کو لانا پڑا +

فبینا نعاجٌ یرتمین خمیلۃً
کمشی العذاری فی الملاء المھدّب

اس درمیان میں کہ نیل گائیں ایک جھاڑی پر گر رہی تھیں جس طرح جوان جوان لڑکیاں حاشیہ دار شال اوڑھ کر، خرامِ ناز کرتی ہیں +

فکان تنادینا وعقد عذارہ
وقال صحابی قد شأونک فاطلب

ہم لوگوں میں پکار پڑ گئی۔ اور معاً گھوڑے کے لگام چڑھا دی گئی۔ اور میرے ساتھ والے کہنے لگے۔ کہ دوڑ۔ وہ چلیں ہ

وقت ہے صید رمیدہ جلکے آنے کا نہیں
وار کرنا ہو تو کر۔ زو ترشکار ایسے میں ہے

فلأیاً بلأيٍ ما حملنا غلامنا
علی ظہر محبوک السراۃ محنّب

کچھ تاخیر کے بعد ہم نے اپنے غلام کو (ایک گھوڑے پر) سوار کر دیا۔ جو پشت کا استوار اور تیز رفتار تھا

وولّی کشؤبوب العشیّ بوابلٍ
ویخرجن من جعدٍ ثراہ منصّب

(گھوڑا اس طرح) روانہ ہوا۔ جیسے رات کی بارش کا

دو نگڑا پڑتا ہے۔ اور (دنبل گائیں) غبار کے اندر سے
نکل رہی تھیں۔ جو چھایا ہوا تھا۔ یعنی ٹاپوں کی آواز
کو دونگڑا پڑنے سے مثال دیتا ہے۔ سعدی کہتے ہیں؎

بتگ ژالہ می ریخت بر کوہ و دشت
تو گوئی گر ابر نیساں گذشت

اور غبار سے وہ غبار مراد ہے جو وحشیوں کے بھاگنے
سے بلند ہوا تھا +

فَلِلسَّاقِ أُلْهُوبٌ وَلِلسَّوْطِ دِرَّةٌ
وَلِلزَّجْرِ مِنْهُ وَقْعُ أَهْوَجَ مُنْعَبِ

ایڑ لگانے سے (اس کی) تیزی (بڑھتی تھی) اور
کوڑا کرنے سے روانی (زیادہ ہوتی تھی۔) اور گھرکی
دینے سے اس کا وہ حال ہوتا تھا جو ایک باولے تیز
رفتار (اونٹ کی حالت ہو جاتی ہے)۔ یعنی جس طرح
باولا اونٹ گھرکی دینے سے از خود رفتہ ہو جاتا ہے اسی
طرح یہ گھوڑا بھی چل نکلتا تھا۔ یعنی شتر بے مہار کی طرح
دوڑنے لگتا تھا +

فَأَدْرَكَ لَمْ يُجْهَدْ وَلَمْ يَثْنِ شَأْوَهُ
يَمُرُّ كَخُذْرُوفِ الْوَلِيدِ الْمُثَقَّبِ

وہ پا گیا (شکار کو) بغیر اس کے کہ زحمت کرے
یا دوبارہ دوڑے۔ جب کہ وہ اس طرح پھر رہا تھا۔
جس طرح کسی لڑکے کی پھرکی جس میں سوراخ کیا ہو
سوراخ کی قید محض قافیہ کی مجبوری سے ہے۔

تَرَى الْفَأْرَ فِي مُسْتَنْقَعِ الْقَاعِ لَاحِبًا
عَلَى جَدَدِ الصَّحْرَاءِ مِنْ شَدٍّ مُلْهِبِ

(اس گھوڑے کی) روانی کا یہ عالم ہے۔ کہ موش صحرائی
بلند زمینوں پر پھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں یعنی ٹاپوں
کی آواز سن کر مینہ برسنے کا شبہہ ہوا ہے۔ اور اس حالت
میں موش صحرائی اپنے اپنے سوراخوں سے نکل کر بلند
زمینوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ کہ کہیں ڈوب نہ جائیں +

خَفَاهُنَّ مِنْ أَنْفَاقِهِنَّ كَأَنَّمَا
خَفَاهُنَّ وَدْقٌ مِنْ عَشِيٍّ مُجَلِّبِ

ان جانوروں کو سوراخوں سے اس طرح اس نے نکالا
جس طرح رات کی بارش جس میں زور شور کی آواز ہو
چوہوں کو بلوں سے باہر نکال دیتی ہے۔

فَعَادَى عِدَاءً بَيْنَ ثَوْرٍ وَنَعْجَةٍ
وَبَيْنَ شَبُوبٍ كَالْقَضِيمَةِ قَرْهَبِ

اس نے پے در پے شکار کیا۔ نر اور مادہ اور جوان
سفید بچھڑا جیسے سانڈ +

وَظَلَّ لِثِيرَانِ الصَّرِيمِ غَمَاغِمٌ
يُدَاعِسُهَا بِالسَّمْهَرِيِّ الْمُعَلَّبِ

ریگستان کے بیلوں میں شور مچ گیا (غلام) ان کو
اس برچھی سے مار رہا تھا جس پر پٹھا منڈھا ہوا تھا۔ یعنی
برچھی کے ٹوٹنے کا ڈر نہ تھا +

فَكَابٍ عَلَى حُرِّ الْجَبِينِ وَمُتَّقٍ
بِمَدْرِيَةٍ كَأَنَّمَا ذَلْقُهَا مِشْعَبُ

کوئی نخچیر تو منہ کے بھل گرا ہوا پڑا تھا۔ اور کوئی (اپنے
کو) بچا رہا تھا۔ سینگ (مار کر) جس کی باڑھ ایسی تھی
جیسی کفش دوز کا سوا۔ یعنی سینگ کی نوک ایسی تیز تھی
جیسے سوئے کی نوک +

وَقُلْنَا لِفِتْيَانٍ كِرَامٍ أَلَا انْزِلُوا

فَعالوا عَلَيْنا فَضْلَ ثَوْبٍ مُطَنَّبٍ

ہم نے (سب) معزز جوانوں سے کہا کہ ہاں اب اُترو۔ اُنہوں نے (اُتر کر) ایک چادر ہم پر تان دی جس میں ڈوریاں بندھی ہوتی تھیں۔ یعنی ایک چادر جو اس کام کے لئے ساتھ لائے تھے تان دی گئی کہ دھوپ سے بچیں۔

وَاَوْتادُهٗ مازِنِيَّةٌ ۔ وَعِمادُهٗ

رُدَيْنِيَّةٌ فيها اَسِنَّةُ قَعْضَبٍ

اس (خیمہ) کی کھونٹیاں زرہیں تھیں اور اس کے ستونوں پر برچھیاں تھیں جن کے پھل قعضب آہن گر کے بنائے ہوئے تھے۔ گویا کھونٹیوں کا کام زرہوں سے لیا یعنی چادر کے کونے زرہ میں باندھ دیئے۔ ڈنڈوں کے بدلے برچھے لگا کر ڈیرہ ڈال لیا +

وَاَطْنابُهٗ اَشْطانُ خُوصٍ نَجائِبٍ

وَصَهْوَتُهٗ مِنْ اَتْحَمِيٍّ مُشَرْعَبٍ

اس خیمہ کی طنابیں اصیل اونٹنیوں کی رسیاں اور چھت اس کی اتحمی کے تھان کی تھی۔ جو بہت طولانی تھا۔ یعنی اونٹوں کی رسیاں اور دھاریں کھول کر برچھیوں پر اتحمی کو تان دیا تھا۔ اور زرہوں میں رسیاں اس کی باندھ دی تھیں +

فَلَمّا دَخَلْناهُ اَضَفْنا ظُهُورَنا

اِلیٰ كُلِّ حارِيٍّ جَدِيدٍ مُشَطَّبٍ

ہم لوگ جب اس خیمہ میں داخل ہوئے۔ تو پالانوں سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔ جو ملک حیرہ کے نئے بنے ہوئے تھے۔ اور کپڑا جو ان پالانوں پر منڈھا ہوا تھا۔ اس میں دھاریاں تھیں +

كَاَنَّ عُيُونَ الْوَحْشِ حَوْلَ خِبائِنا

وَاَرْحُلِنا الْجَزْعُ الَّذِي لَمْ يُثَقَّبِ

ہمارے خیمہ اور پالانوں کے گرداگرد وحشیوں کی آنکھیں (جو نکلی پڑی تھیں) جزع یمانی معلوم ہوتی تھیں جس میں ابھی سوراخ نہیں کیا گیا تھا۔

یعنی جزع کے نگینہ میں سپیدی و سیاہی ہوتی ہے آنکھوں کو اس کے ساتھ بہت مشابہت ہے۔ علمائے فن بلاغت میں یہ شعر بہت مشہور ہے۔ کہ تشبیہ غریب پائی جاتی ہے +

نَمُشُّ بِاَعْرافِ الْجِيادِ اَكُفَّنا

اِذا نَحْنُ قُمْنا عَنْ شِواءٍ مُضَهَّبٍ

ہم لوگ جب بھونے بھلسے کباب دکھا کر اُٹھے۔ تو گھوڑوں کی یالوں سے اپنے ہاتھ پونچھ رہے تھے +

وَرُحْنا كَاَنّا مِنْ جُواثٰى عَشِيَّةً

نُعالِي النِّعاجَ بَيْنَ عِدْلٍ وَمُحْقَبِ

رات کو ہم سب روانہ ہوئے۔ جیسے کوئی نخلستان جواثیٰ سے (لاد پھاند کر چلتا ہے) تھیلوں میں اور باردانوں میں نیل گائیں (بھر بھر کر اونٹوں پر) ہم لاد رہے تھے۔ یعنی جواثی کے رہنے والے جس طرح تھیلوں میں خرمے بھر بھر کے اونٹوں پر لاد لاتے ہیں +

(جواثی) ایک قریہ بحرین کا ہے جس میں قبیلہ عبدقیس آباد ہے۔ وہاں خرما بہت پیدا ہوتا ہے۔ وہیں سے

اطراف و جوانب میں جاتا ہے +

وَرَاحَ کَتَیْسِ الرَّبْلِ یَنْفُضُ رَاسَہٗ
اَذَاۃٌ بِہٖ مِنْ صَائِكٍ مُتَحَلِّبِ

گھوڑا اس طرح گردن ہلاتا ہوا چلا جیسے سبزہ زار ربل کا بکرا پسینہ کی بدبو سے اذیت پاکر اپنے سر کو بار بار جھٹکتا ہے +

کَاَنَّ دِمَاءَ الْهَادِیَاتِ بِنَحْرِہٖ
عُصَارَۃُ حِنَّاءٍ بِشَیْبٍ مُخَضَّبِ

سب سے آگے بھاگنے والے وحشیوں کا خون گھوڑے کے سینہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے مہندی کا رنگ خضاب کئے ہوئے سفید بالوں میں +

وَاَنْتَ اِذَا اسْتَدْبَرْتَہٗ سَدَّ فَرْجَہٗ
بِضَافٍ فُوَیْقَ الْاَرْضِ لَیْسَ بِاَصْہَبِ

اگر تو اس گھوڑے کو پیچھے سے دیکھے تو دونو پاؤں کے درمیان کا فاصلہ گھنی اور لمبی دُم چھپائے ہوگی جس کا رنگ بھورا نہیں ہے۔ اور زمین سے ذرا اوپر وار رہ گئی ہے۔ رنگ کا اصہب ہونا ممکن ہے کہ بدنما ہو لیکن یہاں یہ قید محض قافیہ کی ضرورت سے ہے +

علقمہ جواب دیتا ہے

امرؤ القیس نے قصیدہ تمام کیا۔ اور علقمہ نے اسی بحر و قافیہ میں فی البدیہہ اس کا جواب دینا شروع کیا فارسی و اردو میں فردوسی و سعدی و انیس و دبیر سے بھی یہ ممکن نہ تھا۔ کہ چھیالیس شعر کا قصیدہ اس طرح پڑھتے چلے جائیں۔ جیسے پہلے سے زبانی یاد تھا۔ اس کی وجہ یہ سمجھنا کہ علقمہ ان لوگوں سے یا امرؤ القیس کیوں نہ ہو۔ شعر میں زیادہ کمال رکھتا تھا۔ عرب کے شعرا اور وہ بھی زمانہ جاہلیت کے فن کو ان لوگوں کے مقابلہ میں کیا جانتے تھے۔ انہوں نے شعر میں عمریں صرف کیں۔ وہ لوگ کبھی کچھ کہہ لیتے تھے جیسے کوئی ولولہ میں آکر اُبل پڑتا ہے۔ مگر یہ جوش فارسی و اردو میں کسی کو کیوں نہیں آتا۔ اس کی وہی وجہ ہے جو دیوان غالب کی شرح میں عرض کرچکا ہوں۔ کہ عرب اپنے طبعی اوزان میں شعر کہتے تھے۔ اور فارسی و اردو والے عرب کے اوزان میں بتکلف شعر کہا کرتے ہیں۔ عرب فقط آخر مصرع میں تشابہ کا التزام رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ زحاف بے تکلف جس جگہ چاہتے تھے لاتے تھے۔ اس وجہ سے وزن میں بڑی گنجائش تھی۔ فارسی و اردو کے شعر میں اول مصرع سے آخر تک تشابہ کا التزام واجب کرلیا ہے۔ عرب میں جو فروع تھے کہ ان میں تغیر کا اختیار شاعر کو تھا۔ یہاں ان کو اصول قرار دے لیا ہے۔ کہ ذرا تغیر نہیں کرسکتے۔ اور اب اگر کوئی عروض کا ماہر کہیں زحاف کا استعمال کرتا ہے۔ تو لوگ اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔ کانوں کو برا بھی معلوم ہوتا ہے۔ موزون الطبع اسے سُن کر کہتے ہیں مصرع ٹوٹ گیا۔

علقمہ کا سارا قصیدہ نقل کرنا مقصود کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے امرؤ القیس کے شعر بعینہ یا ذرا سے تغیر کے ساتھ اس نے اپنے قصیدہ میں شریک کرلئے ہیں۔ چند شعر جو خاص اسکی طبیعت کے ہیں ان میں بھی جو منتخب ہیں یہاں لکھتا ہوں۔ کہ

مقابلہ کا ہے اس کے لطف نہیں آسکتا۔ وہ کہتا ہے

ذَهَبْتَ مِنَ الْهِجْرَانِ فِي كُلِّ مَذْهَبٍ
وَلَمْ يَكُ حَقًّا كُلُّ هٰذَا التَّجَنُّبِ

(اے شخص) تو نے مفارقت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ اس قدر بیگانگی بھی مناسب نہ تھی۔

فارسی و اردو میں اس طرح خطاب معشوق سے کرتے ہیں۔ یہاں شاعر اپنے نفس سے خطاب کرتا ہے

أَطَعْتَ الْوُشَاةَ وَالْمُشَاةَ بِصَرْمِهَا
فَقَدْ أَنْهَجَتْ حَبْلًا لَهَا لِلتَّقَضُّبِ

جو لوگ سخن چین تھے۔ اور تجھ میں اس میں جدائی ڈلوانے والے تھے۔ ان کی بات تو نے سن لی انہوں نے قطع محبت کی راہ نکال ہی لی *

وَقَدْ وَعَدَتْكَ مَوْعِدًا لَوْ وَفَتْ بِهِ
كَمَوْعُودِ عُرْقُوبٍ أَخَاهُ بِيَثْرِبِ

وہ تجھ سے ایک وعدہ کر گئی۔ جیسا وعدہ عرقوب نے اپنے بھائی سے یثرب میں کیا تھا۔ کاش اسے وفا کرتی *

قصہ۔ قوم عمالقہ میں سے عرقوب ایک شخص گزرا ہے۔ کہ اس کے بھائی نے اس سے سوال کیا۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ کہ میرے نخلستان میں پھول آجائیں۔ تو تیرے سوال کو پورا کر دوں۔ جب نخل میں پھول آ گئے تو یہ کہکر ٹال دیا۔ کہ خوشے آجائیں۔ تو آنا۔ جب خوشے بھی درختوں میں آگئے۔ تو یہ حیلہ کیا۔ کہ خرموں کو ذرا رنگ آجائے * جب خرمے زرد ہو گئے تو اسے یہ امید دلائی۔ کہ خرموں کو رطب تو ہو جانے دے۔ جب رطب ہو گئے تو کہا کہ رطب کے تمر ہونے تک انتظار کر۔ جب اس نے دیکھا۔ کہ سب رطب تمر ہو گئے۔ تو نخلستان سے راتوں رات سب خرمے تڑوا لئے۔ اور اسے کچھ نہ دیا۔ جب سے عرب میں اس کا نام ضرب المثل ہو گیا ہے جھوٹے وعدوں کو مواعید عرقوب کہتے ہیں *

علقمہ نے اس شعر کے بعد امرؤ القیس کا یہ شعر

وَقَالَتْ مَتَى يُبْخَلْ عَلَيْكَ وَيُعْتَلَلْ
يَسُؤْكَ وَإِنْ يُكْشَفْ غَرَامُكَ تَدْرَبِ

پڑھ دیا۔ اس کے بعد کہتا ہے۔

فَقُلْتُ لَهَا فِيئِي فَمَا تَسْتَفِزُّنِي
ذَوَاتُ الْعُيُونِ وَالْبَنَانِ الْمُخَضَّبِ

میں نے (یہ سن کر) اسے جواب دیا۔ کہ تو اپنے گھر چلی جا۔ مجھے خوبصورت آنکھوں والی مہندی ملنے والی عورتوں کی کچھ پروا نہیں ہے *

گھوڑے کا سراپا بیان کر کے آخر میں کہتا ہے

إِذَا أَنْفَدُوا زَادًا فَإِنَّ عِنَانَهُ
وَأَكْرُعَهُ مُسْتَعْمَلًا خَيْرُ مُكْسِبِ

اگر زاد و توشہ خرچ کر ڈالیں۔ تو اس کی عنان اور اس کے قدم اگر اس سے کام لیں۔ تو بہت ہی اچھی کمائی ہے۔ یعنی راہ میں کھانے کو کچھ پاس نہ ہے تو اس اسب کی باگ اور قدم بہترین زاد راہ ہو جاتے ہیں۔ باگ ہاتھ میں لی اور اس نے قدم اٹھایا پھر شکار نہیں بچ سکتا *

فَظَلَّ الْأَكُفُّ يَخْتَلِفْنَ بِحَانِذٍ
إِلَى جُؤْجُؤٍ مِثْلِ الْمَدَاكِ الْمُخَضَّبِ

اب ایک بھونے ہوئے نخچیر کے سینہ پر ہاتھ پڑنے لگے۔ سینہ کیا تھا۔ ایک سِل تھی جس پر مہندی پیسی گئی ہو۔ یعنی شکار کرنے کے بعد کباب لگائے گئے۔ اور لوگوں کے ہاتھ متواتر اس بھونے ہوئے نخچیر کے سینہ پر پڑنے جو بھوننے سے سرخ ہو رہا تھا۔ یا زعفران وغیرہ کی سُرخی تھی۔

محاکمہ

مشاعرہ ہو چکا۔ تو دونوں اُم جُندب سے فیصلہ کے طلبگار ہوئے۔ اس نے امرؤالقیس سے خطاب کر کے کہا۔ کہ علقمہ کا گھوڑا تیرے گھوڑے سے تیز ہے۔ اس نے کہا سبب؟ اس نے جواب دیا۔ سبب تیرے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

خللساق الھوب وللسوط درۃ
وللزجر منہ وقع اھوج منعب

تو نے گھوڑے کو کوڑا بھی کیا۔ ایڑ بھی لگائی۔ گھرکا بھی۔ اور علقمہ کہتا ہے۔

فَاَقْبَلَ یَھْوِیْ ثَانِیًا مِنْ عِنَانِہٖ
یَمُرُّ کَمَرِّ الرَّائِحِ الْمُتَحَلِّبِ

(گھوڑا) سامنے آ پڑا۔ باگ پھیرتے ہی زشکار پر) گرا۔ رفتار کا یہ حال تھا۔ جیسے برستا ہوا بادل گزر گیا۔

امرؤالقیس اس فیصلہ کو سُن کر غضبناک ہوا۔ بگڑ کر کہنے لگا۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ علقمہ پر تیرا دل آگیا ہے۔ جا میں نے تجھے طلاق دی۔ امرؤالقیس طلاق دے کر بنی طے سے چلا گیا۔ اور علقمہ نے اُم جُندب سے عقد کر لیا۔

علی حیدر طباطبائی

شاعری

بعض حضرات کا غالباً اس امر پر اصرار رہیگا۔ کہ گو شاعری ایک فن تو ضرور قرار دی جاتی ہے۔ لیکن یہ کسی صورت سے اکتسابی نہیں ہے۔ لیکن میں اسے نہ فن قرار دیتا ہوں اور نہ علم۔ علوم و فنون ہمیشہ غور و فکر کے نتائج ہوتے ہیں۔ لیکن شاعری کچھ اور ہی چیز ہے۔ کیونکہ شاعری الہام ہے۔ جب پہلی مرتبہ شاعری عالم افروز ہوئی تو یہ شاعر کی روح میں حلول کی ہوئی تھی۔ اس لئے اسے نہ فن سمجھنا چاہئے اور نہ علم۔ بلکہ اسے جوہر طباعی کہنا چاہئے۔

تاج (گیٹے)

فروغِ ادب

اگر ادبی رسالوں کی کثرت۔ اخبارات کی بہتات اور نئی کتابوں کے اشتہارات کو دیکھ کر رائے لگائیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں علم ادب کو بہت فروغ ہے۔ اور اردو زبان کے دن پھرنے والے ہیں۔ لیکن نظر غائر سے دیکھیں۔ تو یہ آثارِ ترقی محض سطحی ہیں۔ اور ابھی ہمارے ملک میں لٹریچر کی وہ قدر جس کا وہ مستحق ہے پیدا نہیں ہوئی ابھی نہ ادیبوں کو یہ خبر ہے۔ کہ ان کے سینوں میں کیسی دولت اور ان کے دماغوں میں کیسی قوت پنہاں ہے۔ اور نہ ان کے خرمنِ ادب کے خوشہ چین یہ جانتے ہیں۔ کہ انہیں ادبی خدمت کرنے والوں کی کس درجہ قدر کرنی چاہئے +

دنیا میں لٹریچر سے بڑے بڑے کام نکلے ہیں اور نکل سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی اردو خواں دنیا ابھی اس اصول سے بہت کچھ بے خبر ہے۔ لٹریچر بظاہر تو الفاظ کا مجموعہ ہے مگر الفاظ اگر دل سے نکلیں۔ اور کسی عالی دماغ کے افکار کا نتیجہ ہوں۔ تو تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور دلوں میں گھر کر جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ادیب فنا فی الادب ہو جائے۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اسے فکرِ سخن کے سوا اور کوئی کام نہ ہو۔ وہ ہو اور اس کی کتابیں۔ وہ ہو اور اس کے خیالات + دنیا کے معمولی تفکرات سے جہاں تک ممکن ہو اس کی قوم یا اس کا ملک اس کو بے فکری مہیا کر دے اور عملی زندگی کی کشمکش سے وہ الگ اور آزاد رہے۔ یہاں کیا ہوتا ہے۔ جہاں کہیں کسی شخص میں اس کمال کی جھلک نظر آئی۔ لوگ ہر قسم کی توقعات اس سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے معمولی تحریرات کا کام بھی اسی سے لو۔ کوئی کہتا ہے تقریر کے لئے بھی اسے ہی بلاؤ۔ کوئی اسے کسی تحریک کا بانی بنانا چاہتا ہے۔ کوئی کسی تجویز کا عملی پیشوا بے چارہ ادیب آخر انسان ہی تو ہے۔ اور کوئی انسان کمزوریوں سے خالی نہیں۔ اسے یہ گوناگون رجوعِ خلائق اپنی اصلی جگہ کھڑا نہیں رہنے دیتا۔ کہیں میدانِ تقریر کی تالیوں کی دلکش آواز اُسے لبھاتی ہے۔ کہیں عارضی تحریروں کی داد اُسے اپنی طرف کھینچتی ہے کبھی سیاسی تحریکوں کی دلچسپی اور آسان شہرت اسے اپنا گرویدہ بناتی ہے۔ اور کبھی وہ تجارتی تجاویز سے مالا مال ہونے کی آرزو کا شیدائی ہوتا ہے۔ اس رنگا رنگ کی کشش کے سبب خالص ادبیات کی راہ سے معراجِ کمال پر پہنچنا اُسے ایک کٹھن راستہ نظر آتا ہے۔ جب وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر وہ ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر محوِ سخن رہے گا تو خواہ وہ کیسے ہی اچھے اور اچھوتے خیال پیدا کرے۔ مدتوں خود اس کے سوا کوئی انکا مزا لینے والا نہ ہوگا۔ اگر ان کو شائع کرنا چاہے گا۔ تو اس کے پاس اشاعت کے خرچ کے لئے روپے نہ ہوں گے۔ اور اگر صرف برداشت بھی کر سکے گا تو شاید دیر تک اس مطبوعہ جنس کا کوئی خریدار نہ پیدا ہو۔ تو وہ اس شہرت کو جو فوراً یا جلد ہاتھ آئے۔ خواہ ناپائدار ہو۔ شہرتِ پائدار پر جو ایسی مصائب کے بعد ہاتھ آئے

ترجیح دیتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھیں تو ترقی جاہ و منصب
کی ہر بلندی اور ہر شہرت اس حیاتِ جاوید کے مقابل
جو ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جنہوں نے اعلےٰ لٹریچر
کی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ کیا حقیقت رکھتی
ہے ؟

آج کل بہت سے ادبی قابلیت والے دماغ اپنا
کام معمولی مضمون نگاری سے شروع کر کے مضمون نگاری
پر ختم کر دیتے ہیں مضمون نگاری بطورِ مشق تو ابتدا میں
لازم ہے۔ مگر حیف ہے۔ اگر یہی انتہا ہو۔ قوتِ مضمون
نگاری اکثر وقفِ سیاسیات نظر آتی ہے۔ سیاسیات
بجائے خود اہمیت رکھتی ہیں۔ اور جدید زندگی کے لوازم
میں ہیں لیکن جو درجہ ہمہ اوست کا سیاسیات کو ہمارے
ملک میں بعض اصحاب نے دے رکھا ہے۔ یہ نہ ان کے
لئے نہ اغراضِ ملکی کے لئے مفید ہے۔ بلکہ خود سیاسیات
کی خدمت لٹریچر کے ذریعے سے بہت کچھ ہو سکتی ہے کسی
استادِ فن کا ایک فقرہ یا ایک مصرعہ بسا اوقات زبان زد
خاص و عام ہو کر سیاسی تخیل میں ایسی لہر پیدا کر تا ہے۔ جو
سارے ملک میں پھیل جاتی ہے۔ اور ملک کی سیاسی زندگی
میں جان ڈال دیتی ہے۔ جو لوگ اس ایک فقرہ یا ایک
مصرعہ سے محظوظ ہوتے ہیں۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوتی
کہ جس شخص کی زبان سے وہ فقرہ یا وہ مصرعہ نکلا ہے۔ اس
نے کتنے ایسے فقرے یا مصرعے سوچے اور رد کئے ہوں
گے پیشتر اس کے کہ اسکی نگاہِ انتخاب ان موزون الفاظ
پر پڑی جنہیں سُن کر سر دُھننے والے نے یہ سمجھا۔ کہ کہنے والے
نے گویا اس کے دل کی بات کہہ دی ہے۔ آمیر مینائی نے
کیا خوب کہا ہے ؎

آمیر اک مصرعۂ تر تب کہیں صورت دکھاتا ہے
بدن میں خشک جب شاعر کے ہوتا ہے لہو برسوں

یہ محنت۔ یہ کوفت برداشت کرنا۔ یہ سوز۔ یہ گداز۔ ادب
کی زندگی کے لئے مایۂ ناز ہے۔ اور اپنے جوہرِ اصلی کی
حفاظت کرنا اس پر فرض ہے۔ اور اس کو اس کی حفاظت
میں مدد دینا اہلِ ملک کے لئے لازم ہے ۔

یہ اصول اگر عام طور پر تسلیم ہو جائے اور اس پر عملدرآمد
ہونے لگے۔ تو ادب کو وہ فروغ نصیب ہو جسکی آرزو ہے
اور اس سے ملک کے حق میں مفید نتائج پیدا ہوں جب
اہلِ ادب اس اصول پر کار بند ہوں۔ اور ان کے ابنائے
ملک ان کے کام کی کما حقہ قدر کریں۔ تو ادب کی ترقی کا ایک
نیا دَور شروع ہو۔ اس نئے دَور کے متعلق اردو کی ادبی دنیا
کو چند باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہئیں۔ اوّل یہ کہ اعلیٰ
درجہ کے ماہرانِ فن کے کمالات تو اپنی قدردانی پر خلائق
کو خود مجبور کر لیتے ہیں۔ قدردانی وہ چاہئے جو ہر کہ و مہ کو
حسبِ مراتب نصیب ہو۔ یعنے جیسے کسی عمارت کے کام میں
معمار۔ مزدور۔ نجار۔ آہن گر۔ نقشہ نویس۔ اوورسیر۔ انجینیر
سب درکار ہیں۔ اسی طرح ایوانِ ادب کی تکمیل کے لئے ناظم
ناثر۔ فسانہ نویس۔ مورخ اور مترجم سب بکار ہیں۔ اور ہر
کسی کا کام اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ گو شائقینِ ادب کے
زمرہ میں کچھ لوگ نظم کے زیادہ دلدادہ ہوں گے۔ اور کچھ
نثر کے زیادہ قائل بعض فسانوں کے مشتاق اور بعض تاریخ
کی طرف مائل۔ کوئی ترجمے سے حظ اٹھانے والے اور کوئی طبعزاد
مضامین کی تلاش میں رہنے والے لیکن کسی کو حق نہیں کہ ادنیٰ

کے کسی ایک حصّہ کو بے قدر یا حقیر جانے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہئیے کہ ادبی دنیا کے سب کارکن فروغِ ادب کے خواہاں ہیں۔ اور ان کا مقصدِ اصلی ایک ہے +

عبدالقادر

زندگی و ادبیات

کسی قوم کی صحت و توانائی جس قدر یقینی طور پر اس کے ادبیات سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ اس قدر کسی اور چیز سے ظاہر نہیں ہو سکتی ہے۔ ایسا اور کوئی آئینہ نہیں ہے جس میں کسی عہد کی سیرتیں اور خواہشیں ایسی درستی سے منعکس ہو سکتی ہوں۔ سوچنا چاہئیے۔ کہ کسی قوم کے گیت کیا ہیں؟ وہ اس کی روح کے لطیف اجزا ہیں۔ جو اس کے مشتعل ہونے سے اُٹھے۔ اور راگوں کی شکل میں منجمد ہو کر جواہر ریزے بن گئے۔ وہ قوم کے آتشکدہ کے مقدس شعلے ہیں۔ کامیابی کا تاج۔ یا شجرِ قوم کی روح سیال کے پھول ہیں۔ جو نور میں ڈوبے اور آسمانی شبنم میں بھگوئے گئے ہیں +
ادبیات اور روزمرہ کی زندگی میں تضاد پیدا کرنا یعنی شعر کو عمل سے جدا کرنا ویسا ہی ناممکن ہے جس طرح تعقل اور تخیل میں تفریق کرنا کیونکہ ادبیات کیا ہیں؟ یہی کوائف زندگی۔ اور کوائف بھی اُس حالت کے جب زندگی اپنی حقیقی صورت میں متکیف ہو۔ اور کشمکش کی بے انتہا شدت ہو + شاعر جو خلاق اور تلمیذ الرحمٰن کہلاتا ہے۔ معاملات زندگی میں سب سے اعلیٰ انسان ہوتا ہے۔ اور جب وہ قوم کے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔ تو وہ اس کے قوائے عقلیہ کو جمع کر کے ان سے کام لیتا ہے۔ اور قوائے عقلیہ کا اجتماع ایک ایسا ضروری امر ہے۔ کہ اگر کوئی عامل اس کے بغیر کام کرے تو وہ بے سود ہو گا۔ بلکہ وہ وجود میں ہی نہ آسکے گا۔ ادب کے جس حصے میں قوم کی سرگرمی اور اسکی اُمنگیں ظاہر نہیں کی جاتی ہیں۔ وہ محدود اور تنگ و تاریک و ناتندرست رہتا ہے۔

جن امنگوں اور افعال زندگی کو آرٹ کا مہر درخشاں اپنے نور سے پاک نہ کرے۔ اور وہ فکر شاعر کے کنار عاطفت میں آرام نہ پائے۔ وہ روح قوم کے لئے تاریک بھونرے ہوں گے۔ جہاں موذی حشرات الارض بستے اور طماع حریص اپنے ذخائر سیم و زر سینت سینت کر رکھتے ہیں جس شاعری کی جڑ سویدائے قلب میں ہے اس نے ہمارے لئے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اگر ہماری یہ خواہش ہے۔ کہ ہم شاد و شیریں کام رہیں اور ہمارے قلوب صحیح و با اطمینان۔ تو شعر اور بھی زیادہ ہمارا ورد زبان ہونا چاہئیے لیکن شعر وہ ہو۔ جو دل سے نکلے۔ اور دل میں ہی گھر کرے +

ایتھینیم (تاج)

عراقی کا ایک قطعہ

تحقیق کی روشنی میں

دوش رفتم بخرابات مرا راہ نبود ‏ می زدم نعرہ و فریاد کس از من نشنود
یا بند ہیچکس از بادہ فروشان بیدار ‏ یا کہ من ہیچکسم ہیچکسم در نہ کشود
پاسے از شب چو بشد بیشتر ک یا کمتر ‏ رندے از غرفہ بروں کرد و سر و رخ بنمود
گفت خیر است درین وقت گرامی طلبی ‏ بیحل آمدنت بر در ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگوئے ‏ کہ چنیں وقت کسے بہر کسے در نہ کشود
این نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشانید ‏ کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش استی زود
این خرابات مغانست در و رندانند ‏ مومن و ارمنی و گبر و نصاریٰ و یہود
ہر چہ در جملۂ آفاق درین جا حاضر ‏ شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

گر تو خواہی کہ سر صحبت ایشانگیری
خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

آتشکدۂ آذر اور شعر العجم علامہ شبلی میں یہ قطعہ نظامی گنجوی مصنفِ سکندر نامہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ چنانچہ نظامی کے کلام کے ساتھ یہ قطعہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ مولوی کبیر الدین احمد بھی اس کو نظامی کا بتاتے ہیں۔

لیکن میرے پاس ایک قدیم دیوان مولانا عراقی کا موجود ہے۔ ناقص ہونے کی وجہ سے اس میں تاریخ کتابت موجود نہیں ہے۔ لیکن اس امر میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کہ اگر وہ مصنف کے زمانہ کا نہیں تو اس کے نہایت ہی قریب زمانہ کا ہے جس کی کاغذ خط اور رسم الخط بھی شہادت دیتے ہیں۔ اس دیوان میں یہ قطعہ موجود ہے۔ آخر کے دو شعروں میں اختلاف ہے باقی اشعار میں سوائے بجائے (د) کے (ذ) اور ی کے نقطے اوپر تلے لکھے جانے وغیرہ کے چنداں تفاوت نہیں۔ ہماری رائے میں یہ دیوان آٹھویں صدی ہجری کی تحریر ہے +

قطعہ کی تصنیف کا کون مالک ہے؟ میرے خیال میں عراقی کا حق نظامی کے مقابلہ میں بہت زبردست معلوم ہوتا ہے۔ یہ قطعہ سرتا پا عشق و معرفت

کے ذوق میں ڈوبا ہوا ہے۔ جو عراقی کے کلام کا اصلی جوہر ہے۔ باعتبار زبان یہ قطعہ عراقی کا نہیں تو عصمت بخاری کا ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ انہی دونو کے زمانہ کی زبان ہے لیکن اگر مقطع کے تخلص اور عراقی کے اصلی رنگ پر نظر کی جائے تو اس کا مالک عراقی اور صرف عراقی ہے۔ اب ناظرین کہکشاں کی دلچسپی کے لئے میں اس اصلی قطعہ کو نقل کرتا ہوں۔

وہو ہذا:۔

بخرابات شدم دوش مرا بار نبود
می زدم نعرہ و فریاد ز من کس نشنود

یا نبد ہیچکس از بادہ فروشاں بیدار
یا خود از ہیچکسے ہیچ کسم در نہ کشود

چونکہ یک نیمہ ز شب باکم یا بیش برفت
رندے از غرفہ برون کرد سر و رخ بنمود

گفت خیر است درین وقت تو دیوانہ شدی
مغز برداختی آخیر نہ بگوئی کہ چہ بود

گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگوئے
تا درین وقت ز بہر چو توئی در نہ گشود

این نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایم
تا تو اندر دوی اندر صف پیش آری زود

ایں خرابات مغانست درو زندہ دلاں
شاہد و شمع و شراب و غزل و رود و سرود

زر و سر را نبود ہیچ درین بقعہ محل
سود شاں جملہ زیانست زیانشاں ہمہ سود

سر کوشاں عرفاتست و سرائشاں کعبہ
عاشقاں ہمچو خلیلہ و رقیباں نمرود

اے عراقی چہ زنی حلقہ برین در شب و روز
زیں ہمہ آتش خود ہیچ نہ بینی جز دود

چونکہ ناظرین دونوں کا مقابلہ کرکے خود اس کے بعض الفاظ کا ردو بدل اور عجیب طریقہ پر نقطے وغیرہ ملاحظہ فرمالیں گے۔ اس لئے مجھے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں +

محمد داؤد شیرانی اختر

ناول

ناول مصنف کے نفسیات کا رزم نامہ ہے جس میں وہ جگ بیتی کو آپ بیتی پر ڈھالتا ہے۔ یعنی دنیا کو اپنے طریق پر قیاس کرنا چاہتا ہے۔ اندریں صورت سوال صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ مصنف اپنا کوئی طریق خاص رکھتا بھی ہے یا نہیں۔ یہ ہے۔ تو باقی سب درست ہے +

(ٹیگور)

علّامۂ رُعبؔ

نام حنیف علی تخلص رُعبؔ۔ کنیت ابو الصواب آپ کا مولد محلہ انصاریاں۔ قصبہ شاہ آباد ضلع کرنال ہے۔ جہاں آپ ۱۰ ستمبر سنہ ۱۸۷۹ء یوم چہار شنبہ کو پیدا ہوئے۔ آپ کے مورثِ اعلےٰ جناب شیخ فخر الدین قریشی ایک معزز اور با اثر زمیندار تھے۔ آپ کے والدِ بزرگوار شیخ محمد وارث علی قریشی انصاری ایک عرصہ دراز تک ریاست گوالیار میں بعہدۂ پیشکاری سرفراز رہے قصبۂ شاہ آباد کے طبقۂ اعلیٰ و ادنےٰ میں کوئی ایسا شخص مشکل سے ملے گا۔ جو حضرت رُعبؔ کے خاندانی اقتدار و ذاتی اعزاز سے کلیتاً واقف نہ ہو۔

آپ نے تسمیہ خوانی کے بعد کلام مجید اور اردو کی چند کتابیں اپنی والدۂ محترمہ سے پڑھیں جس سے نوشت و خواند کی کافی استعداد پیدا ہوگئی۔ درسیاتِ فارسی اپنے خالو شیخ بدر الاسلام فاروقی سے تمام کیں اور کچھ دنوں بطور خود کتب بینی کرتے رہے۔ چونکہ آپ کو فطرتاً علوم سے بےحد رغبت اور تحصیل فنون کا بیحد انتہا شوق تھا۔ اور گھر بیٹھے عربی تعلیم کا پورا ہونا سخت دشوار۔ ناچار قصبۂ شاہ آباد کو خیر باد کہکر رائے پور ضلع سہارن پور آنا پڑا۔ اور عربی کی ابتدائی تعلیم مولانا عبد الرحیم صاحب سے ختم کی۔ تقریباً دو سال کے بعد مزید تعلیم کے لئے اپریل سنہ ۱۸۹۵ء میں آپ جھانسی تشریف لائے۔ مگر یہاں خاطر خواہ اسبابِ تعلیم مہیا نہ ہو سکے۔ اور اس پچھلے دو برس کی مدت محض بیفکروں کی صحبت اور موزون طبع حضرات کی دلجوئی میں گزری۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں جھانسی سے بغرضِ تکمیل لکھنؤ آئے۔ اور مولانا امیر علی صاحب شارح ہدایہ و مولوی عبد الحی صاحب (نائب ناظم ندوہ) سے منقولات و معقولات اور ادب کی کل کتابیں مطالعہ فرمائیں ✦

بعد حصولِ اسناد تکمیل الطب انسٹی ٹیوشن لکھنؤ میں داخل ہو کر سنہ ۱۹۰۱ء میں علم طب سے بھی فراغت حاصل کی۔ چند مہینے سیاحتِ چین کے نذر کئے۔ اور کچھ دنوں بصیغۂ طبابت ریاست پرتاب گڈھ (اودھ) سے تعلق رکھا پھر حسبِ ارشاد شفاء الملک جناب حکیم عبد الرشید صاحب ایس ڈیوڈ اسکوائر (کلکتہ) کے ہاں معالجِ خاص مقرر ہوئے۔ اور چند سال تک کلکتہ مقیم رہے۔ اور وہیں سے مرض اکلہ میں مبتلا ہو کر لکھنؤ آئے میڈیکل کالج میں آپریشن ہوا کسی قدر صحت کے بعد کلکتہ مراجعت فرمائی یہاں کی آب و ہوا نے مرض میں دوبارہ اشتداد پیدا کر دیا۔ اور بڑے بڑے ڈاکٹروں نے سرطان تجویز کرکے خاص طور پر عمل جراحی کیا مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" آخر ۱۹ اگست کو کلکتہ سے مکان پہنچے اور ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۹۱۹ء کو اکتالیس برس کی عمر میں جہان فانی سے رخصت ہو کر احباب و اعزا کو ہمیشہ کے لئے وقف ماتم کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

شاعری

ابھی ادب فارسی کی تکمیل نہ ہونے پائی تھی کہ اس کی

غیر معمولی چاشنی سے زبان چٹخارے لینے لگی۔ مذاقِ سلیم
ودیعتِ ازلی موزونیتِ طبع خداداد تھی۔ جیسا کہ آپ خود
ایک مطلع میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

از پئے فکرِ مضامیں دل بکارم کردہ اند
روزِ اول شاعری یعنی شعارم کردہ اند

مزید براں یہ حسنِ اتفاق کہ مزاج بھی بادۂ عشق سے
لبریز واقع ہوا تھا۔ رسائی فکر اور فطانت ذہن کے دو
بیش بہا جوہر آپ کو مبداء فیاض نے خصوصیت کے ساتھ
عنایت کئے تھے جس نے رنگینیٔ طبیعت کو اور بھی چار چاند
لگا دیئے۔ اتنے قدرتی اسباب فراہم ہونے پر کیسے ممکن
تھا۔ کہ خود شاعری لبیک کہہ کر حضرتِ رُعب کا شاندار
استقبال نہ کرتی؟ یہ زمانہ اگرچہ آپ کے عنفوانِ شباب
کا تھا۔ مگر فارسی کی قابلِ داد نظمیں بے تکلف کہتے اور سناتے
تھے۔ جب رائے پور سے آپ جھانسی آئے۔ تو اکثر احباب
کی صحبتوں نے نظمِ اُردو کا مذاق بھی آپ کی پُرجوش
طبیعت میں بھر دیا۔ یہاں جیسا کہ میں لکھ آیا ہوں۔ کہ
خاطر خواہ سامانِ تعلیم مہیا نہ ہوسکے۔" اس لئے یہاں کا زمانہ
نذرِ مشاغلِ ہوسِ سخن رہا۔ اور اسی حسین کے جلووں کی
بہار لوٹا کئے۔ یہاں تک کہ یہاں کے خوش گو اور کہنہ مشق
شعراء نے آپکو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اس اجنبیانہ حیثیت
پر بھی ایک با اثر جماعت کے اصرار سے آپ میرِ مشاعرہ
منتخب ہوئے۔ آپ ابتدائے مشق سے ہمیشہ غالب اور
مومن کے رنگ کے دلدادہ رہے۔ اور کسی زبردست سے
زبردست اُستاد کے کلام سے آپ اس قدر متاثر نہ ہوئے
جتنا کہ مسبوق الذکر کی اعلیٰ ترین شاعری نے آپکا دل
مسخر کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی نظموں میں جدت وندرت
نزاکت ولطافت اور اختراعی خصوصیت دلکش ہوتی ہے
اور خاص ترکیبوں کے ساتھ نئے لفظوں کی تراش خراش
پوری ذہانت وطباعی کا پتا دیتی ہے۔ سب سے بڑی
خوبی آپ کے کلام میں یہ ہوتی ہے۔ کہ باوجود اجنبیت
الفاظ دلچسپی اور دلفریبی کم نہیں ہوتی حقیقت میں آپکی
طرزِ ادا ایک خاص امتیازی درجہ حاصل کئے ہوئے ہے
طبیعت کی روانی کے ساتھ قوتِ آخذہ عالی کی طرح دامن
سے لگی ہوئی ہے۔

اگرچہ ایسے دل ودماغ کے لئے اس کی مطلق ضرورت
نہیں۔ کہ کسی کو اپنا اُستاد بنائے۔ مگر ہجرت ارضی لکھنؤ
پہنچتے ہی محض صحتِ زبان کے لئے حضرتِ رُعب نے امیر الشعرا
منشی امیر احمد صاحب مینائی کی طرف رجوع کرنا چاہا۔ پیشتر
خط لکھ کر غزل بھیج دی۔ پھر ان سے جاکر ملے۔ لیکن حضرتِ
امیر نے اپنی معذوری بیان کی۔ اور افسوس کے ساتھ یہ
کہا۔ کہ اب قویٰ اس لائق نہیں رہے۔ کہ کسی کو کچھ مشورہ
دے سکوں۔ اس وقت لکھنؤ کے مشہور و کہنہ مشق شعراء میں
منشی امیر احمد صاحب کے بعد جناب ضامن علی جلال ہی
ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے حضرتِ رُعب
کو انہیں کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہونا پڑا۔ حضرتِ جلال
نے ان کی قابلیت اور مبلغ علم دیکھ کر آنکھوں پر بٹھایا
اور ایک قابلِ رشک خصوصیت ہمیشہ ان کے ساتھ
رکھی۔ اب لکھنؤ کی صحبتوں میں حضرتِ رُعب کی طرف
رمز سنج و دقیقہ شناس نگاہیں اُٹھنے لگیں۔ اور انکی غزل
کے بعد سامعین میں سرگوشیاں بھی ہوا کیں مشاعروں

میں خصوصیت کے ساتھ آپ رجوع کئے جانے لگے۔ اور قدردانان سخن کو آپ کا انتظار رہنے لگا۔ رفتہ رفتہ یہاں بھی آپ کی شاعری نے اپنا رنگ جما ہی چھوڑا۔ اور نظمیں خوب خوب پھلیں پھولیں۔ یہاں تک کہ اساتذۂ لکھنؤ کو آپ کی قادر الکلامی اور استادی کا اعتراف کرنا پڑا۔

حضرت رعب کی شاعری اگرچہ بے حد رنگینی کے سبب عام طبائع کو پسند نہ ہوگی۔ مگر بمصداق "چشمۂ آفتاب را چہ گناہ" اس میں آپ کا قصور نہیں۔ کیونکہ جہاں بلاغت مضامین چستی بندش، تناسب لفظی، تدِ نظر اور قابلیت کا اتنا بڑا جوہر موجود ہو۔ وہاں ترکیبیں یقینی طور پر کسی قدر پیچیدہ ہوں گی۔ اور یہ قابل اعتراض بھی نہیں سمجھنے والوں کی فہم نارسا یا کم مایگی کا قصور ہے۔ آخر ظہوری۔ عرفی۔ نعمانی غنی کے دیوان کے دیوان دیکھ جائیے۔ اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں مومن و غالب کی شان تغزل کو دیکھئے تقریباً ہر جگہ اسی کی جھلک نظر آئے گی۔ غرض حسن ادا ہونا چاہئے۔ جدت آفرینی و اجتہاد کوئی عیب نہیں۔ اسی لئے موجودہ دور کے شعرا سے آپ کا رنگ بھی جداگانہ ہے۔ اور ان کی نازک خیالیوں بلند پروازیوں کو کسی کا دماغ نہیں پہنچتا۔ اس لئے ہر سخن فہم کو ماننا پڑے گا کہ آپ کی نظموں کا پایہ موجودہ شعرا کے کلام سے کہیں اعلےٰ وارفع ہے۔

حضرت غالب کی طرح "گذر از اردوئے من کیں رنگ بیرنگ من ست" آپ کی فارسی کی مشق اردو سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے جس میں اردو کی روش سے بھی جدا ہو کر حضرت سعدی و حافظ کے جلووں کی بہار ہے۔ اور یہ آپ کے انتہائی کمال کا ایک بیّن ثبوت کہا جا سکتا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ کسی موقعہ پر وہ بھی ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔

اردو فارسی کے علاوہ اعلےٰ سے اعلےٰ قصائد اور بہتر سے بہتر غزلیں آپ کی زبان عربی میں یادگار ہیں جن کے متعلق قابل ادیبوں کا خیال ہے کہ جاہلیت عرب کے بعد والے قصیدوں سے انکا درجہ کسی حال میں کم نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ زبان کے اعتبار سے بھی وہ ایک عرب کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ انہیں کا ایک وہ قصیدہ جو مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی مدحت میں ہے اپنی بلاغت معانی کے سبب آجتک مدرسۃ العلوم دیوبند کے کورس میں داخل ہے۔ افسوس کہ انکی حیات نے وفا نہ کی ورنہ خسرو و فیضی و غالب کی طرح کسی زمانے میں ہندستان کا ایک فخر ہوتے۔ ذیل کے کلام سے ناظرین اس کا خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

تاثرات

عبرت کی کس مپرسی ہے محو داد خواہی — اے چشمِ خوش تماشا تو اور غلط نگاہی؟

محشر سے پہلے اکدن برپا کریگی محشر — تیری جفا نوازی میری وفا پناہی

بس منہ کہیں چھپائے رنگِ سفید کاری — اظہارِ سرخروئی ہے وجہِ روسیاہی

بالیدہ روح کو کرلے غم کی گرمجوشی — افسردگی فزا ہے راحت کی عمر کاہی

وہ چشم نشہ آگیں کب بات پوچھتی ہے — ساقی کا منہ بحسرت دیکھا کرے جماہی

اک مدّعی کی کشتی راحت نصیبِ ساحل
اور اک مرا سفینہ پروردۂ تباہی

اے شیوۂ ستم کیوں رنگِ بہانہ جوئی ؟
خود معترف ہے مجرم کیا حاجتِ گواہی

ہم سا بھی کوئی ہوگا محرومِ دین و دنیا
ردکردۂ اوامر حسرت کشِ مناہی

رہنِ ہوس فروشی وقفِ محال سنجی
سر ہے کہ عین سودا دل ہے کہ محض واہی

شوخی مجاز کی خود پردہ اٹھا رہی ہے
جلوے کی اب حقیقت کھلنے کو ہے کماہی

گلچیں سمجھ خدارا رازِ نسیم و شبنم
یہ گریۂ شبی ہے وہ آہِ صبح گاہی

جو ظلم ہو بجا ہے میری یہی سزا ہے
اک عیب جاں نثاری اک جرم بےگناہی

اے بختِ خفتہ دیکھا اک خواب کا سماں تھا
وہ اقتدارِ شاہی وہ شانِ کج کلاہی

وقتی کرشمہ نکلا نیرنگ آسماں کا
جمشید بارگاہی افراسیاب جاہی

اے دورِ گریۂ خوں اب بھی کہیں ہیں پیدا
وہ بزم کے رنگیلے وہ رزم کے سپاہی

میرا فسانۂ غم مصداقِ ناتمامی
میری شبِ مصیبت مفہومِ لاتناہی

کچھ صحت آفریں ہے آب و ہوائے دوراں
آزارِ رعب کی بھی تدبیر یا الٰہی

تغزل

خفا کر دے ہمیں کو جہاں سے نطق آزما ہو کر
کوئی جادو جگائے چشمِ فتاں سرمہ سا ہو کر

رہے آشفتۂ حرماں گرفتارِ بلا ہو کر
بڑھا طولِ امل کا سلسلہ زلفِ رسا ہو کر

تغافل کی ادا نے مار ڈالا ہے زمانے کو
نزاکت پہ ستم اب کس لئے تیغ آزما ہو کر

تبسم میں وہ طرزِ جنبشِ لب تھی قضا میری
ادائے جاں ستاں نے جان لی ہے جاں فزا ہو کر

الٰہی کچھ تو امیدِ اثر کی آبرو رہتی نذ
مجھی پر آہِ سوزاں آگ برساتی رسا ہو کر

کہیں رسوا نہ کر دے ضبطِ غم کر سامنے ان کے
سکوں پیرا تپش ہو کر خموشی التجا ہو کر

نیا نغمہ سنائے کوئی اہلِ بزمِ عبرت کو
خموشی میری سازِ بےنوائی کی صدا ہو کر

حریمِ ناز میں ہم بینوا اے رنجِ ہستی تھے
مقدر میں تماشا دیکھنا تھا کیسے کیا ہو کر

نہیں منت کشِ تابِ بیاں شرحِ تپش ورنہ
یہ ساری شوخیاں رہ جائیں تفسیرِ حیا ہو کر

حریفِ امتحانِ تاب فرسا کون ہوتا ہے جفا تیری رہے گی میری ممنونِ وفا ہوکر
بتوں نے دہر میں تماشا بنایا اسے معاذ اللہ
کہ آخر رُعب کعبے کو سدھارے پارسا ہوکر

امید افزا ہے تمہیدِ شہادت شوقِ بسمل کی رگِ گردن کے کھچنے میں ادا ہے تیغِ قاتل کی
نہ کام آئی عطا کوشی کسی کے فیضِ شامل کی قسم کھاتی ہے ناکامی بھی میری سعیِ باطل کی
مرا رنگِ خموشی ہے کہ اک آئینۂ حیرت مری بزم تصور ہے کہ تصویر اسکی محفل کی
مبارک جوش سرگرمی برائے خرمن اندوزی چمکنے کو ہے قسمت آرزوئے برقِ حاصل کی
تماشا تھا مری محویتِ نظارہ کا عالم مجھے اٹھوا کے رونق تو نے کھو دی اپنی محفل کی
جنابِ رُعب کی تقدیر اور تجھ تک پہنچ جانا
کرم تدبیرِ ناقص کا عنایت شوقِ کامل کی

حرمانِ لطفِ زیست کو آوارہ کر گئے یعنی حریفِ لذتِ آزار مر گئے
وہ بوالہوس کہ دردِ جدائی سے مر گئے تمکینِ ضبطِ عشق کو بدنام کر گئے
کونین اور تجسس گم گشتگانِ شوق کیا جانئے کس طرف تیرے آشفتہ سر گئے
طولِ شبِ فراق کا جھگڑا ہی چک گیا لو آج صبح ہو گئی بیمار مر گئے
اے رُعب زیست لذتِ غم کی کفیل تھی
جی میں یہ کیا جناب کے آیا کہ مر گئے

ایس۔ ایم یاس بہاری

ذخیرۂ ادب

ادبیات کیا ہیں؟ وہ پارہائے جواہر ریزہ ہیں۔ جو کچھ وقوع میں آیا۔ اور زبانِ خلق پر مشہور رہا۔ اس کا اقل حصہ معرضِ تحریر میں آیا ہے۔ اور جو کچھ معرضِ تحریر میں آیا ہے۔ اسکا قلیل ترین حصہ محفوظ رہ سکا ہے۔ ستم یہ کہ اس غیر مکمل حالت میں بھی ادبیات ہزارہا تکرار و اعادہ سے پر ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ذہنیات و سرگذشت انسانی کسقدر قیود سے مقید و محدود ہے۔

گلستانِ سعدی

اور

نکات عروضی

گلستانِ سعدی کا بقیہ مضمون میں نے ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۱ء کے رسالہ کہکشاں میں دیکھا۔ اس میں بھی بعض مقامات غور طلب ہیں چنانچہ صفحہ ۵ا کے آخر میں لکھا گیا ہے۔ کہ "مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ میں تسکینِ اوسط کا زحاف لگایا جا سکتا ہے جس سے مندرجۂ ذیل اوزان پیدا ہوتے ہیں الخ" میں کہتا ہوں کہ یہاں جو اوزان پیدا کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مولود ناقص الخلقۃ پیدا ہوا ہے یعنے نمبر (۴) پر جو مفعولن مفعولن مفاعیلُ لکھا گیا ہے۔ وہ کسی طرح صحیح نہیں ہے اس لئے کہ مفاعیل کا پہلا حرف یعنے میم جب اپنے ماقبل کے حرف سے ملکر وہاں مفعولن ہو گیا تو پھر اس کے بعد مفاعیل کہاں باقی رہا۔ بلکہ میم نکل جانے کے بعد فاعیل رہ جائے گا جس کے عوض میں مفعول رکھا جائے گا اس لئے یہاں مفعولن کے بعد مفاعیل نہیں آئے گا۔ بلکہ مفعولن مفعول ہو جائیگا +

اس تحریر میں زحاف لگانا جو لکھا گیا ہے۔ وہ بھی اہل زبان کے محاورہ کے خلاف ہے۔ ف۲ صفحہ ۱۷ کے دوسرے کالم کے آخر میں حضرتِ سعدی کے ایک شعر کی تقطیع اس طرح کی گئی ہے "شہ بہ اُشتر فاعلاتن الخ" لکھا یہ بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اگر (شہ) میں ہائے مظہرہ سمجھی جائے۔ اور اس کو فا کے وزن پر خیال کیا جائے تو فارسی کے تمام دیوانوں پر پانی پھر جائے گا۔ یہاں کتابت کی غلطی کا احتمال بھی نہیں ہے اس لئے کہ فاضل مضمون نگار نے لکھدیا ہے۔ کہ اس میں پہلے مصرع کے کل ارکان سالم ہیں۔ یعنے فاعلاتن ہیں۔ اور یہ پہلے ہی مصرع کی تقطیع ہے جس میں شہ باُشتر فاعلاتن لکھا ہے +

ف۳ جناب صفی کے مصرع کے متعلق جو بحث کیگئی ہے۔ وہ مدعی سست گواہ چست کے حکم میں داخل ہے۔ انشاءاللہ اس پر آیندہ ہم بھی کچھ لکھدینگے +

ف۴ صفحہ ۱۸ میں گلستاں کے دو باب سے نکات کو منتخب کرنا لکھا گیا ہے لیکن اس میں ایک نکتہ بھی ایسا نہیں ہے۔ جس سے عروضیوں کی معلومات میں کچھ اضافہ ہو سکے۔ یا اس کے متعلق وہ کچھ بحث کر سکیں اور جو شخص عروض نہیں جانتا۔ اس کو بھی اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ وہ ان افاعیل تفاعیل کو کیا جانے۔ وہ تو صرف مطبوع اوزان کو موزون سمجھتا ہے۔ باقی جھگڑوں سے اسے کوئی مطلب نہیں ہے + وہ تو اس مضمون کو

سُن کر یہی کہے گا ؎

من نزانم فاعلاتن فاعلات
شعر می گویم بہ از آبِ حیات

گلستاں کے دو باب کے اشعار لکھ ڈالے لیکن تعجب ہے کہ دیباچہ کے اس قطعہ کو چھوڑ دیا۔ جس میں کسی قدر عروضی بحث کی گنجائش ہے۔ (قطعہ)

اول اردی بہشت ماہ جلالی
بلبل گوینده بر منابر قضبان الخ

اس میں عروضیوں کی دلچسپی کی کئی باتیں ہیں۔ یعنے اس کے دوسرے مصرع میں اگر بلبل کے لام کو کسرۂ توصیفی قرار دیا جائے اور گوینده کو صفت سمجھا جائے۔ تو وزن میں کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔ اور بغیر کسرے کے بلبل کو مبتدا اور گوینده کو خبر قرار دیا جائے۔ تو کیا صورت پیدا ہوتی ہے؟ اور اس کے وزن میں ہر مصرع کے آخر میں جو کہیں فع اور کہیں فاع آیا ہے۔ یہ کیا زحاف ہے۔ اس زحاف کی تعریف میں عروضیوں نے کیا کیا اختلاف کیا ہے۔ اور قول فیصل کیا ہو سکتا ہے۔ یہ باتیں قابل ذکر ہیں۔ جن سے عروضیوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یعنے اس فع اور فاع کو مفتی مظفر علی اسیر نے شجرۃ العروض میں منحور اور مجدوع لکھا ہے۔ اور نحر اور جدع کی تعریف میں اہلِ عروض نے باہم اختلاف کیا ہے۔ قدر بلگرامی نے ان ناموں ہی کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ جس میں فع ہے اس کو اصلم محذوف اور جس میں فاع ہے اس کو اصلم مقصور لکھتے ہیں۔ اور منحور نام رکھنے میں خرابی بتاتے ہیں۔ غرض یہ ایسی باتیں ہیں کہ ان کے متعلق کوئی عروضی کچھ رائے دے سکتا ہے۔ مگر صرف یہ لکھ دیا جائے۔ کہ کریا یہ بتائے بر حالِ ما فعولن فعولن فعولن فعل۔ اور اس کے ساتھ فعولن فعولن فعولن فعول کا اجتماع بھی جائز ہے۔ تو اس کو سُن کر کوئی عروضی کیا کہے گا۔ مضمون میں جب روئے سخن اہلِ فن کی طرف ہے۔ تو انہیں کی توجہ کے قابل نکات سے بحث ہونا چاہئے۔ ناواقفوں کو اوزان کا اجتماع سمجھایا جائے۔ اور جنابِ آغا ہلوری اور مولانا حضرت نظم طباطبائی سے اس پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی جائے۔ اور اہلِ قلم کو اسکے ساتھ دلچسپی ظاہر کرنے کے لئے کہا جائے۔ تو یہ روشنی ڈال سکتے ہیں نہ کوئی اہلِ قلم اسکے لئے اپنی روشنائی خرچ کر سکتا ہے ؎

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عُشّاق کی غبار نہیں ہے

سید نوازش علی لمعہ

وجہ تصنیف

اکثر کتابوں کے متعلق مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ بہر خاص ہدایت دینے کی غرض سے نہیں لکھی گئیں۔ بلکہ محض اسلئے معرضِ تحریر میں لائی گئی ہیں۔ کہ ہمیں ان کے مصنفین کے متعلق اتنا علم ہو جائے۔ کہ وہ بھی کچھ جانتے تھے۔ (دگنے) مترجم

یادِ رفتگان

سرسید علیہ الرحمۃ کے خطوط مولوی سید ممتاز علی صاحب کے نام

مخمی و مکرمی۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ انبہ بہار نید جو ازراہِ عنایت بھیجے تھے وہ بھی پہنچے۔ دونو عنایتوں کا شکریہ قبول ہو۔ انبہ نہایت عمدہ حالت میں پہنچے۔ اور نہایت خوشی سے یقیقت میں دل کی خوشی سے کھائے گئے اس خیال نے کہ وہ آپ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ انکا لطف بہت زیادہ کر دیا تھا۔

تفسیر کے لکھنے کا کام شروع ہو گیا ہے اور بہت سی لکھ ڈالی ہے۔ اس سورت میں مشکل مقام ہیں دنیا کی پیدائش چھ یوم میں۔ عرش و حاملانِ عرش کی بحث اسی میں ہے دو تو بحثیں عمدگی سے لکھی گئی ہیں۔ مگر اب تک دو آیتیں حل طلب باقی ہیں۔ جو متعلق عرش و حاملانِ عرش ہیں۔ انکی نسبت کتابیں الٹ پلٹ رہا ہوں مجھے امید ہے کہ خدا کے فضل سے آپکی طبیعت اچھی و خوش ہے۔ کب تک آپ دیوبند میں رہیں گے اور لاہور کب جاویں گے۔ آپ اس بات سے خوش ہوں گے کہ سجاد حسین خلف مولوی الطاف حسین صاحب حالی بی۔ اے میں پاس ہو گئے۔ مدرسۃ العلوم میں سول سروس کلاس کھولنے کے لئے بروز یکشنبہ کمیٹی ہو رہی تھی وہ سب روئداد کل کے اخبار میں چھپے گی۔ آپ کے پاس بھیجوں گا اگر فرصت ہو اور طبیعت اچھی ہو تو اس پر اپنی رائے لکھئے گا اور اخبار انجمن پنجاب میں چھپوا دیجئے گا۔ محرم علی چشتی نے جو طریقہ اختیار کیا ہے مجھے نہایت رنج و افسوس ہے۔ محرم علی ایک خلوص سے ہم لوگوں سے ملاقات رکھتے ہیں۔ پس ان سے جو بات نامناسب ہوتی ہے ضرور ہے کہ ہم لوگوں کو اس کا رنج ہو۔ مگر بجز افسوس و رنج کے اور کچھ چارہ نہیں۔

والسلام۔

خاکسار سید احمد۔ علی گڑھ۔ ۴۔ جولائی [illegible]ء

مخمی و مکرمی مولوی سید ممتاز علی صاحب

تفسیر کا مسودہ لکھتے لکھتے ایک شعر کا مضمون اتفاقیہ خیال میں آیا۔ اس وقت طبیعت اس طرف متوجہ ہو گئی چھ شعر حسب حال قلم سے نکلے۔ آپ کو بھیجتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ پسند کریں گے۔ اگر آپ کا دل چاہے تو ان کو اخبار انجمن پنجاب میں چھپنے کے لئے بھیج دیجئے۔ والسلام

خاکسار سید احمد علی گڑھ۔ ۷ جولائی [illegible]ء

فلاطون طفلکی باشد ز لونانے کہ من دارم

مسیحا رشک می دارد ز درمانے کہ من دارم

ز کفرِ من چہ می خواہی ز ایمانم چہ می پرسی

سماں یک جلوۂ عشق است ایمانے کہ من دارم

خدا دارم دلی بریان زعشق مصطفےٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

ز جبریل امین قرآن بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنی کہ من دارم

فلک یک مطلع خورشید دارد با ہمہ شوکت
ہزاران مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم

ز برہان تا بہ ایمان سنگلہا دارد رہ واعظ
ندارد ہیچ واعظ نحو برہانی کہ من دارم

محبی مکرمی مخدومی۔ دو قطعہ عنایت نامجات پہنچے اول شکریہ اس اصلاح کا کرتا ہوں جو میرے شعر میں آپنے کردی نہایت عمدہ اصلاح ہوئی۔ بلکہ لفظ انجینیں سے تمام شعر میں جان تازہ آگئی ہے۔ دوسرا شکر اس آرٹیکل کا ہے۔ جو نسبت بورڈنگ ہاؤس کے لکھا ہے جس قدر وہ چھپا ہے۔ وہ بھی بہت ہے۔ منشی شمس الدین صاحب کا نہایت شکر ہے کہ اس قدر آرٹیکل انہوں نے اپنے اخبار میں چھاپ دیا۔ چار دیواری بورڈنگ ہوس کے گرد دیواری ہو گئی۔ صرف ایک دروازہ آمد و رفت کا جس پر پہرہ مقرر کیا جاوے گا۔ اور کسی لڑکے کا کسی وقت غیر حاضر ہو جانا ناممکن ہو جاوے گا ابھی میں سوچ رہا ہوں۔ کہ اس آرٹیکل کا ہمارے اخبار میں بھی چھاپنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ اگر مولوی سمیع اللہ خان صاحب کی رائے بھی متفق ہوگی۔ تو چھاپوں گا۔ مجھے خیال ہے۔ کہ ہمارے اخبار میں چھپنے سے اس کی قوت کم ہو جاوے گی۔ اور لوگ سمجھیں گے کہ ہمارے لکھوانے سے لکھا گیا ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہوا کہ سوسائٹی کا اخبار آپ کے پاس نہیں جاتا۔ مدت ہوئی میں نے کہہ دیا تھا کہ ایک پرچہ بلاقیمت آپ کی خدمت میں روانہ ہوتا رہے۔ آج میں نے پھر تحریری حکم بھیج دیا ہے۔ آیندہ سے برابر ایک پرچہ آپ کے پاس پہنچا کرے گا۔ اس پرچہ میں گو مضامین عمدہ نہ ہوتے ہوں۔ مگر مدرسۃ العلوم کے ہر قسم کے حالات چھپتے ہیں۔ اور ایسے دلی دوستوں کو اور مدرسۃ العلوم کے دلی خیر خواہوں کو جیسے کہ آپ ہیں۔ اس کے حالات کا معلوم رہنا نہایت ضرور ہے۔ پس وہ پرچہ ہمیشہ برابر آپ کے پاس پہنچا رہے گا۔

تفسیر پر بہت مصروف ہوں۔ مگر ہود۔ عاد۔ ثمود صالح حضرات نے نہایت دق کر رکھا ہے۔ مفسرین و مورخین پر خدا رحمت کرے کیسی کیسی لغو و مہمل باتیں لکھی ہیں۔ چونکہ یہ واقعات خاص عرب کے لوگوں کے ہیں انکی صحت کی بہت کم مدد ملتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ واقعات بالکل صاف اور تاریخانہ طرز پر لکھ دیئے جائیں

علہ مولوی سید ممتاز علی صاحب قبلہ نے ہزاراں مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم کی بجائے ہزاراں انجینیں دارد گریبانے کہ من دارم تجویز کیا تھا +

ایک اور آفت یہ ہوئی کہ اصل مسودہ خطبات احمدیہ کا گم ہوگیا ہے۔ دستیاب نہیں ہوتا۔ خدا جانے منشی ذوالفقار خان مرحوم نے کہاں غارت کر دیا۔ اب یہاں محمد علی حسب حالات انگریزی خطبات احمدیہ سے منتخب کر دیتے ہیں تو کام چلتا ہے۔ میری ٹانگ کا درد بالکل نہیں گیا تخفیف ہے۔ ایک ہفتہ ہوا کہ درد میں شدت ہوگئی تھی۔ تین دن شدت رہی کچھ کام نہیں کر سکا اب بہت تخفیف ہے۔ کسی قدر کسک باقی ہے۔ ایک جلد سفرنامہ پنجاب کی ہدیۃً آج آپ کی خدمت میں روانہ کی ہے۔ اس نذر کو قبول فرمانے سے مجھ کو عزت اور میرے دل کو خوشی بخشئے۔ والسلام

خاکسار سید احمد۔ علی گڑھ۔ ۲۳ جولائی سنہ ۱۸۸۴ء

(حاشیے پر) نوروزِ نبوی خدا آپ کو اور تمام امت محمدیہ کو مبارک کرے۔ آمین +

مخدومی و مکرمی۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا جس جوشِ محبت سے آپ نے وہ عنایت نامہ لکھا ہے۔ اس کا دل سے شکر گزار ہوا۔ سول سٹیشن میں مطلق بیماری نہیں ہے اور شہر میں بھی نہایت کم ہے۔ گو ہم نیچری ہوں۔ مگر ہم کو خدا پر مولویوں سے زیادہ بھروسہ ہے۔ میں تفسیر لکھنے میں بہت زیادہ مشغول ہوں۔ اور نہایت مشکل مشکل مقام لکھ چکا ہوں۔ آپ دیوبند میں کب تک قیام کریں گے۔ والسلام۔

خاکسار سید احمد۔ علی گڑھ

۱۶ اگست سنہ ۱۸۸۴ء

مخدومی و مکرمی مولوی سید ممتاز علی صاحب۔ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ تفسیر کا کام ابھی تک شروع نہیں ہوا۔ رپورٹ سال تمام و بجٹ مرتب کر چکنے کے بعد شروع کروں گا۔ جو مضامین تفسیر کے آپ نے پسند کئے۔ وہ باعث میرے اعزاز کا ہے۔ حیدر آباد کی جو خبریں آپ نے سنیں سب غلط ہیں میں صرف نواب سالار جنگ کی ملاقات کو گیا۔ مل کر چلا آیا۔ ماصہ روپیہ ماہانہ کالج کا جو اضافہ ہوا تھا۔ اسکی منظوری حضور نظام سے ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ میرے جانے پر اس کی منظوری ہوگئی۔ دیگر ایں کہ قرآن مجید اور اس کی کنکارڈنس دونوں کے ٹیمپل پیج کی نقل بھیجتا ہوں۔ تصانیف احمدیہ تصنیف کی ترتیب سے چھپی ہیں۔ رسالہ طعام اہلِ کتاب چھپ رہا ہے اسکے بعد خطبات احمدیہ چھپنی شروع ہوگی۔ اس سفر میں مجھ کو بہت تکلیف ہوئی میں بیمار ہوگیا تھا۔ ابھی تک ایک شمہ تکان یا بیماری کا باقی ہے۔ بڑا فکر یہ ہے کہ سنٹرل ہال چندہ پورا ہونے کو ۲۰ ہزار باقی ہیں۔ ان کا پورا ہونا نہایت مشکل معلوم ہوتا ہے دن رات یہی فکر ہے۔ دو یورپین پروفیسر کالج کے لئے کیمبرج سے بلائے گئے ہیں۔ امید ہے کہ یکم اکتوبر تک آجاویں گے۔ خدا سے امید ہے کہ آپ بفضلہ صحیح و تندرست اور ہم نیازمندوں کے حال پر مہربان ہیں۔ والسلام

خاکسار سید احمد۔ علی گڑھ

۱۰ اگست سنہ ۱۸۸۴ء

جلال الدین خوارزم شاہ

ایک ڈراما

مصنفہ نامق کمال (سلسلے کے لئے گذشتہ پرچہ ملاحظہ ہو) **مترجمہ سید سجاد حیدر بی اے**

مجلس سوم

جلال الدین۔ قطب الدین۔ اوزبیگ

جلال الدین۔ خیریت تو ہے۔

اوزبیگ۔ خیریت کہاں ہے میرے بادشاہ! میرے طالعِ منحوس نے مجھے بوم صفت کرکے اس بات پر معین کیا ہے کہ اپنے بادشاہ کو (گویا میں نعوذ باللہ چنگیز کا آدمی ہوں) ہمیشہ غم انگیز خبریں پہنچاؤں۔ تورالدین آیا۔ اور ہم بھی اس طرف کو آئے۔ اس کے بعد وہ فوج جو خوارزم میں تھی۔ بالکل منتشر و پریشان ہوگئی۔ حضور کے سرداروں میں سے ایک اپنے تئیں بچالے گیا۔ لیکن اس غریب کو بھی اتنے زخم لگے تھے۔ کہ وہ بیہوش ہوکر گر پڑا۔ اور مردہ خیال کیا گیا۔ تاتاریوں کو لوٹ مار کی اس قدر حرص تھی۔ کہ شکست خوردہ فوج کی طرف انہوں نے زیادہ توجہ نہ کی۔ اس سردار کو جو کمیت گھوڑا حضور نے بخشا تھا وہ اسکی طرح وفادار تھا۔ اپنے دانتوں سے پکڑ کر وہ اپنے بیہوش مالک کو باہر ایک طرف کو نکال لے گیا۔

جلال الدین۔ ان تمام تفصیلات کی ضرورت نہیں۔ کیا خوارزم ہاتھ سے نکل گیا؟ بھائی کیا ہوئے اور وہ لوگ .....

اوزبیگ (بات کاٹ کر) ملک ہاتھ سے نکل گیا حضور، ملعونوں نے اسے بھی بخارا اور خیوا کی طرح ویران کر دیا۔

جلال الدین۔ آہ خوارزم۔ جہاں میں پیدا ہوا اور جوان ہوا۔ کیا تجھے بھی دشمنوں نے محو کر دیا! اُف انسان کتنی ہی اصلاح نفس کی کوشش کرے ایسی اچانک مصیبت کے وقت، فرض کے احساس میں ذاتی اور دلی جذبات ضرور شامل ہو جاتے ہیں۔ اس قدر مملکت اسلام خراب و ویران ہوئی ہیں کیوں اتنا متاثر نہ ہوا۔ جتنا کہ خوارزم کی ویرانی سے۔

اگر خدا نے فرصت دی، تو انشاء اللہ جب خوارزم کو دوبارہ آباد کروں گا۔ اس وقت اینٹوں کی بجائے تاتاریوں کی ہڈیاں استعمال کروں گا۔

اوزبیگ۔ آہ کتنے لوگ ہلاک ہوگئے۔

جلال الدین خدا رحمت کرے شہید ہوئے۔

اوزبیگ - میرے بادشاہ! اگر اپنے ملک کے جھنڈے
کے نیچے ان لوگوں نے اپنی جانیں دی ہوتیں تو بیشک وہ
شہید ہوتے۔ مگر انہوں نے تو خود اپنے ملک کو تباہ و مضمحل
کیا۔ اور اس طرح خوار ہوگئے۔ جو شمشیر کہ اسلام کی خدمت
کے لئے میان سے باہر لائی جاتی ہے۔ وہ صرف دین کے
دشمنوں کو ٹکڑے کرتی ہے۔ موحد شور و عصیان کا آلہ نہیں
بنتے۔ اگر یہ لوگ اپنے فرض کو بجا لاتے۔ تو آج کے دن مملکت
خوارزم خواہ آدھی ہی رہ جاتی، مگر رہ تو جاتی۔ میری جان
اپنے بادشاہ پر قربان۔ حضور اپنے غلام کو ایسی نظر سے نہ
دیکھیں جس سے یہ ٹپکے کہ میں نے حضور کے ضمیر کے حیات
کے خلاف کوئی بات کہی۔ اگر میری زبان سے کوئی لفظ خلاف
ادب نکل گیا ہو تو حضور سے التجا ہے کہ مجھے معاف کریں
اپنے دین و ملت سے جو مجھے محبت ہے۔ اور اپنے بادشاہ و
مملکت کے حق میں جو وفاداری کا جذبہ دل میں رکھتا ہوں
وہ میری زبان سے یہ باتیں کہلوا رہا ہے۔

فصل چہارم

اشخاص سابق - نورالدین

نورالدین - (داخل ہو کر) میرے بادشاہ!

جلال الدین - آئیے مولانا۔ خدا آپکی ہمت سے
خوشنود و راضی ہو۔ یوں آئیے میرے پاس بیٹھئے آپس میں
آداب و تکلفات کی ضرورت نہیں۔
وہ خوارزم کی اور فوج کی سلامتی کی خبر تو نہ لا سکا۔ مگر
ان مدعیوں کا حال جو میرے بھائی کہلاتے ہیں۔ اوزبیگ
مجھے سنا چکا ہے۔ بدعہد۔ بدسگال۔ خائن بھائی۔ ہاں وہ
نوشتگین اور خادم خان والی کیا ہوئے۔ وہ لوگ چنگیز کی
طرف چلے گئے ہوں گے۔ اس کا حال ذرا مجھے سنائیے۔

نورالدین - نہیں میرے بادشاہ شکر ہے خدا
کا کہ انہیں اس ذلت تک بھی دسترس نہ ہوئی تاتاریوں
کے سامنے ان کا ایمان یاس، شرکِ ابلیسانہ قرار دیا گیا
اور ان سب کے قتل کا حکم دیا گیا۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی
بہر حال جس طرح کسی گھر میں آگ لگے۔ تو گھر میں سانپ
وغیرہ جو موذی جانور ہوں وہ بھی جل جاتا ہے۔ اس طرح
تاتاریوں نے مملکت اسلام کے جہاں لاکھوں انسان
شہید کئے۔ وہاں کچھ بچھو اور سانپ بھی مار ڈالے
کم سے کم انہوں نے اسلام کی اتنی خدمت تو کی۔ ان
میں سے صرف براق حاجب بچ نکلا۔ یہ خبیث شاید
سب سے زیادہ چالاک اور جسور تھا۔ میرے بادشاہ
آپ کا یہ دعا گو ابھی زخمی بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ اس
کے ساتھ جس قدر حشرات تھی۔ سب چنگیز کے جھنڈے
کے نیچے جا جمع ہوئے۔ یہ سب واقعات میں نے
اپنی آنکھ سے دیکھے۔ کیونکہ جہاں میں تھا۔ وہاں سے
قریب ہی ہو رہے تھے۔ براق حاجب تنہا رہ گیا تھا
یہاں تک کہ اس کا گھوڑا ابھی زخمی ہو گیا۔ جس طرح
اژدہا گھاس کے جنگل میں سے نکل جاتا ہے۔ اس طرح
تاتاری فوج میں سے جو اسے گھیرے ہوئے تھی۔ وہ
ایک پُر دہشت نمائش کے ساتھ بے دھڑک نکلا چلا
گیا۔ اگر اپنی شجاعت کا سواں ایک حصہ بھی وہ دین
کی راہ، اور اطاعتِ الٰہی میں دکھاتا۔ تو وہ نادر المثال

فداکاری شمار کی جاتی، اور حقیقت میں وہ حضور کی خدمتِ ہمایوں میں رہنے کے قابل آدمی ہوتا۔

اوز بیگ ۔یہاں اس سے بھی زیادہ شایاں تاسف، آدمی موجود ہیں سیف الدین عراقی سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔

جلال الدین پچھلی لڑائی میں، اس نے بہت کارنمایاں دکھلائے۔ مگر یہ فرض کرکے کہ فتح کا سہرا اسی کے سر تھا۔ تمہارا مطلب کیا ہے؟ میں اس کی ہر آرزو کا غلام ہو جاؤں۔ اس کے گھوڑے کو، تاج زرین کی طرح سر پر اٹھائے پھروں۔

اوز بیگ ۔نہیں میرے بادشاہ۔ غلام کا یہ مقصد نہیں۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا۔ کہ وہ حضور کے سلوک کی شکایت کرتا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کورنمکی کرنا چاہتا ہے۔ کیا عجب کہ وہ دشمن سے جا ملے اور یہ کمینہ پن بھی کر دکھائے۔ بہر حال یہ تو صاف معلوم ہو رہا ہے۔ کہ خدمتِ ہمایوں سے ہٹنا چاہتا ہے۔

جلال الدین ۔کون؟ سیف الدین؟ وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ، ابھی ابھی پہاڑوں کی طرف جا رہا تھا۔ شاید اک گھنٹہ ہوا وہ پکار رہا تھا "جو مجھ سے محبت رکھتا ہے۔ میرے ساتھ آئے۔ جو بادشاہ سے محبت رکھتا ہے۔ وہ یہاں رہے۔ میں نے یہ سنا تو خیال کیا کہ شہید ہونے جا رہا ہے اپنے تئیں اپنی قوم پر فدا کرنا چاہتا ہے۔

اوز بیگ ۔حضور کا کیا خیال ہے۔ اصل میں فوج میں بغاوت پھیل گئی ہے۔ حقیقتِ حال کو شہزادہ، مجھ سے زیادہ صاف بیان کرسکتے ہیں۔

نورالدین ۔جی ہاں، دو ایک نمکحراموں نے آخرت میں ابوجہل اور یزید کے ساتھ محشور ہونے کا ارادہ کر لیا ہے۔

جلال الدین ۔ان کے لئے جہنم تک راستہ صاف ہے نہ مجھے اور تمہیں رتبہ شہادت نصیب ہوگا۔ مزا تو میں خدمتگاروں اور تابعین کے ساتھ نہیں جایا جاتا میری قسمت میں جو کچھ ہے۔ اس کے لئے میں کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہوں۔ یہ شور و شغب کیسا؟

مجلسِ پنجم

اشخاص سابق۔ سیف الدین

سیف الدین ۔(اندر داخل ہوکر) میرے بادشاہ! بارگاہِ سلطنت سے ہر شخص اپنا نصیبہ لینا چاہتا ہے۔ حضور سے جو میری التجا ہے۔ وہ صرف اتنی ہے کہ میرے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ اور میری بے عزتی نہ کی جائے۔ دو گھنٹے قبل میں نے ایک خاص آدمی کے ہاتھ حضور کی خدمت میں یہ عرض کی تھی۔ کہ میری تحقیر کی گئی۔ جو لوگ میرے زیر حکم ہوکر حضور پر جان فدا کرنے کے لئے آئے ہیں۔ وہ اپنے سردار کی ذلت دیکھنی گوارا نہیں کرتے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ میرے گھوڑے کو قمچی مارے۔

جلال الدین ۔جو شخص تمہارے گھوڑے کو قمچی مارے۔ کیا میں اسے یہ سزا دوں۔ کہ اس کا سر تلوار سے اڑا دیا جائے۔ میں تمہاری خاطر احکام شرعیہ کو

چھوڑ کر، سیاست چنگیزی کو اختیار کروں۔ تاتاریوں
نے ایک خنزیر کو درجہ الوہیت دینے کے لئے جوانان
تلف کئے گویا وہ کافی نہ تھے۔ کہ میں تمہارے گھوڑے
کو گوسالہ سامری بناکر، اس آدمی کو محو کروں جس نے
اسے قمچی ماری۔ گھوڑے کو قمچی مارے جانے پر فوج میں
بغاوت ہو رہی ہے لیکن ادھر اسلام خطرہ میں ہے
خدا کا پاک نام، پاؤں تلے روندا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ
یہ منارے چنگیز کو سجدہ کو ہیں۔ مسجدیں گرائی جا رہی
ہیں۔ تاتاریوں کے خوف سے لوگ یہ کہتے ہوئے ڈرتے
ہیں۔ کہ ہم مسلمان ہیں۔ یہ سب، کچھ نہیں۔ ہاں
تمہارا گھوڑا سب کچھ ہے۔ وہ دین، وطن، انسانیت
سے بھی زیادہ مقدس ہے۔ تاتاری اک کتے کی
پرستش کر رہے ہیں۔ مسلمان بھی تمہاری خاطر ایک
گھوڑے کو پوجنا شروع کر دیں۔ نکل باہر کافر، جا اور
چنگیز کا معین و مددگار بن۔ تجھ جیسے کمینہ مخلوق کے لئے
اسی جیسے دنی پادشاہ کی ضرورت ہے۔ جا اور جو کچھ
میرے خلاف کر سکتا ہے، کر

سیف الدین۔ میرے پادشاہ!

جلال الدین۔ جواب دیئے جاتا ہے۔ نکل
باہر۔

سیف الدین۔ میرے پادشاہ۔ میں اپنی
عزت کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا۔ میرے گھوڑے
کو کوئی قمچی نہیں مار سکتا۔ میں بھی دوسرے درجہ کا
ایک پادشاہ......

نورالدین۔ اُفوہ! چیونٹی نے بھی کہا تھا کہ
میں اپنے ملک کی بادشاہ ہوں۔ سلطان مسلمین
کے فرمان کی اطاعت اس طرح کی جاتی ہے؟
سلطان اسلام، احکام الٰہیہ سے تیرے سامنے
بحث کرتا ہے۔ اور تو یہی رٹ لگائے جاتا ہے۔ کہ
میرے گھوڑے کو قمچی مارنے کا کسی اختیار حاصل نہیں
ہے۔ وہ تجھے اللہ و دین و اسلامیت و انسانیت
کے قائم کردہ حکم دے رہا ہے۔ تو جواب میں حیثیت،
عزت، حیوان اور اس قبیل کی چیزوں کا ذکر کرتا ہے
تجھے شرم نہیں آتی بے دین۔ بے عقل۔ تو بھی کیا
عجیب مخلوق ہے۔

سیف الدین۔ میرے پادشاہ! حضور غالباً
اس مجنون کے خیالات سے متاثر ہو گئے ہیں حضور
غور فرمائیں۔ کہ حضور کے اجداد عظام نے ان معاملات
کی رعایت کی ہے۔ مجھ جیسے سردار کے گھوڑے کو
اگر کوئی قمچی مارے۔ اور اس طرح میری توہین کرے
تو کیا اس کو سزا نہ دی جائے گی۔

جلال الدین۔ تمہارے ان قاعدوں پر، اور
تم پر، اور تمہارے گھوڑوں پر خدا کی پھٹکار۔ یہ جو
دنیا اس وقت جہنم سے بدتر حالت میں ہے۔ وہ کیا
سب شیطان کے ایجاد کردہ انہیں قاعدوں، اور
تجھ جیسے دشمن خدا مخلوق کی باعث نہیں ہے خبیث!
وہ اسلام جس پر تجھے بھی اعتقاد ہے۔ کہ تاقیامت باقی
رہے گا۔ اور جس کے ذریعہ سے آخرت میں نجات کا
تو بھی طلبگار ہے۔ کس حالت میں ہے؟ اسلام کی
قدسیت پر ایمان رکھنے والے کا دنیا سے ازالہ آجکل

واجب شمار کیا جارہا ہے۔ ایک شخص جو ہم سب کو زندگی بخشنے والے خدائے تعالے و برتر کے پیدا کردہ ذلیل ترین طبقہ میں سے ہے۔ نعوذ باللہ اپنے تئیں مقام الوہیت پر پہنچانا چاہتا ہے۔ اور خدا کے تمام بندوں کے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہتا ہے۔ جو وہ اپنی قوم کے ساتھ کر رہا ہے۔ تو ان میں سے کسی بات سے متاثر نہیں ہوتا۔ حکومتِ اسلامیہ کو، اپنی اس موہوم حیثیت سے ٹکرا رہا ہے۔ اس سے زیادہ تو سوچ نہیں سکتا۔ گھوڑا، تیرا معبود، نخوت، تیرا دین، انتقام، تیری عبادت ہے۔ تو، اسلام کیلئے تاتاریوں سے بھی زیادہ مُضر ہے۔

سیف الدین۔ اس کے بعد، اے میرے بادشاہ! میں جو کچھ کروں۔ اس میں معذور سمجھا جاؤں مجھے حضور سے یہ امید تھی کہ میرے حق میں رعایت کی جائے گی۔

جلال الدین۔ رعایت انسان کی کی جاتی ہے تو بھی اپنے تئیں انسان سمجھتا ہے۔ سبحان اللہ۔

سیف الدین۔ بہت خوب! اب چونکہ ہم انسان نہیں ہیں۔ جانتے ہیں۔ (سیف الدین جاتا ہے)

اوزبیگ۔ حضور حکم دیں تو ابھی اس غدار کا سر تن سے جدا کر دوں۔ اگر یہ دشمن سے جا ملا تو ہمارے لئے ایک دوسرا چنگیز ہو جائے گا۔

جلال الدین۔ قوتِ اسلام کا انحصار اس فوج پر تھا۔ اب کیا اس میں آپس میں ہی تلوار چل جائے۔ تا کہ ہم ایک دوسرے کو تلف کر کے، چنگیز کو موقع دیں کہ وہ دُور سے میٹھا میٹھا سیر دیکھے! اور بے ہاتھ پاؤں ہلائے فتح حاصل کرے۔ سیف الدین جائے۔ خدا کی مدد ہمارے ساتھ ہے۔ اس غدار کو خدا پر ترجیح دینے والا اس کے ساتھ جائے۔ کیا ہمارا مقصد غزا و شہادت نہیں ہے۔ الحمد للہ ہم غازی تو ہو چکے۔ انشاءاللہ شہادت بھی نصیب ہوگی۔ یا الٰہی تیرا استغنا بھی تیری حکمت کی کیا دلیل عظیم ہے۔ اگر تیرے ارادہ کا عمل میں آنا۔ تیرے بندوں کی رائے پر معلق ہوتا۔ تو تیرے مقدس نام کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ ملعون، ذاتِ الوہیت کو خلقتِ آدم سے پشیمان کرنے کی کوشش کرتے۔

(پردہ گرتا ہے)

ڈراما

ڈراما لکھنے کے لئے طباعی کی ضرورت ہے۔ احساسات کا غلبہ اختتام پر نمایاں ہونا چاہئے۔ استدلال وسط میں اور فہم آغاز میں اور یہ ہر سہ اجزا صاف و شگفتہ قوتِ تخیل کی مدد سے نہایت مناسب مقادیر میں مرتب ہونے چاہئیں۔

(از گوئٹے)

بُوڑھی کاکی

بڑھاپا اکثر بچپن کا دَورِ ثانی ہُوا کرتا ہے۔ بوڑھی کاکی میں ذائقہ کے سوا اَور کوئی حس باقی نہ تھا۔ اور نہ اپنی شکایتوں کی طرف مخاطب کرنے کا رونے کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ۔ آنکھیں۔ ہاتھ۔ پیر سب جواب دے چکے تھے۔ زمین پر پڑی رہتیں۔ اور جب گھر والے کوئی بات اُن کی مرضی کے خلاف کرتے۔ کھانے کا وقت ٹل جاتا۔ یا مقدار کافی نہ ہوتی۔ یا بازار سے کوئی چیز آتی۔ اور انہیں نہ ملتی۔ تو رونے لگتی تھیں اور ان کا رونا محض بسورنا نہ تھا۔ وہ بہ آواز بلند روتی تھیں + ان کے شوہر کو مرے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا سات بیٹے جوان ہو ہو کر داغ دے گئے۔ اور اب ایک بھتیجے کے سوا دنیا میں اُن کا اَور کوئی نہ تھا + اسی بھتیجے کے نام انہوں نے اپنی ساری جائداد لکھ دی تھی۔ ان حضرت نے لکھاتے وقت تو خوب لمبے چوڑے وعدے کئے لیکن وہ وعدے صرف قلی ڈپو کے دلالوں کے سبز باغ تھے اگرچہ اس جائداد کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ دو سو روپیہ سالانہ سے کم نہ تھی۔ لیکن بوڑھی کاکی کو اب پیٹ بھر روکھا دانہ بھی مشکل سے ملتا تھا + اس میں پنڈت بُدھ رام کی خطا تھی۔ یا ان کی بیوی روپا کی۔ اس کا تصفیہ کرنا مشکل ہے + بُدھ رام طبیعت کے نیک آدمی تھے لیکن اسی وقت تک کہ ان کی جیب پر کوئی آنچ نہ آئے + روپا طبیعت کی تیز تھی۔ لیکن ایشور سے ڈرتی تھی۔ اس لئے بوڑھی کاکی کو اس کی تیزی اتنی نہ کھلتی تھی۔ جتنی بُدھ رام کی نیکی +

بُدھ رام کو کبھی کبھی اپنی بے انصافی کا احساس ہوتا وہ سوچتے۔ کہ اسی جائداد کی بدولت میں اس وقت بھلا آدمی بنا بیٹھا ہوں۔ اگر زبانی تسکین یا تشفی سے صورت حال میں کچھ اصلاح ہو سکتی۔ تو انہیں مطلق دریغ نہ ہوتا لیکن مزید خرچ کا خوف ان کی نیکی کو دبائے رکھتا تھا۔ اس کے برعکس اگر دروازہ پر کوئی بھلا مانس بیٹھا ہوتا اور بوڑھی کاکی اپنا نغمہ بے ہنگام شروع کر دیتیں۔ تو وہ آگ ہو جاتے تھے اور گھر میں آ کر انہیں زور سے ڈانٹتے تھے + لڑکے جنہیں بڈھوں سے ایک بغض للّٰہ ہوتا ہے والدین کا یہ رنگ دیکھ کر بوڑھی کاکی کو اور بھی دِق کرتے کوئی چٹکی کاٹ کر بھاگتا۔ کوئی ان پہ پانی کی کُلّی کر دیتا۔ کاکی چیخ مار کر روتیں لیکن یہ تو مشہور ہی تھا کہ وہ صرف کھانے کے لئے روتی ہیں۔ اس لئے کوئی ان کے نالہ و فریاد پر دھیان نہ دیتا تھا + ہاں اگر کاکی کبھی غصہ میں آ کر لڑکوں کو گالیاں دینے لگتیں۔ تو روپا موقع واردات پر ضرور جاتی۔ اس خوف سے کاکی اپنی شمشیرِ زبان کا شاذ ہی کبھی استعمال کرتی تھیں۔ حالانکہ رفع شر کی یہ تدبیر رونے سے زیادہ کارگر تھی +

سارے گھر میں اگر کسی کو کاکی سے محبت تھی۔ تو وہ بُدھ رام کی چھوٹی لڑکی لاڈلی تھی۔ لاڈلی اپنے دونوں

بھائیوں کے خوف سے اپنے حصہ کی مٹھائی یا چبینا بوڑھی کاکی کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتی تھی۔ یہی اس کا ملجا تھا۔ اور اگرچہ کاکی کی پناہ ان کی سائلانہ سرگرمی کے باعث بہت گراں پڑتی تھی لیکن بھائیوں کے دستِ تطاول سے بدرجہا قابلِ ترجیح تھی۔ اس مناسبت اغراض نے ان دونوں میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دی تھی +

رات کا وقت تھا۔ بُدھ رام کے دروازہ پر شہنائی بج رہی تھی۔ اور گاؤں کے بچوں کا جم غفیر نگاہ حیرت سے گانے کی داد دے رہا تھا۔ چارپائیوں پر مہمان لیٹے ہوئے نائیوں سے پیروں میں مُکیاں لگوا رہے تھے قریب ہی ایک بھاٹ کھڑا کبت سُنا رہا تھا۔ اور بعض سخن فہم مہمانوں کے واہ واہ سے ایسا خوش ہوتا تھا گویا وہی اس داد کا مستحق ہے + دو ایک انگریزی پڑھے ہوئے نوجوان ان بیہودگیوں سے بیزار تھے۔ وہ اس دہقانی مجلس میں بولنا یا شریک ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے + آج بُدھ رام کے بڑے لڑکے سُکھ رام کا تلک آیا ہے۔ یہ اسی کا جشن ہے۔ گھر میں مستورات گا رہی تھیں۔ اور روپا مہمانوں کی دعوت کے سامان کرنے میں مصروف تھی۔ بھٹھوں پر کڑاہ چڑھے ہوئے تھے۔ ایک میں پُوریاں کچوڑیاں نکل رہی تھیں۔ دوسرے میں سموسے اور پیڑا کیں بنتی تھیں۔ ایک بڑے ہنڈے میں مسالے دار ترکاری پک رہی تھی۔ گھی اور مصالحے کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی +

بُوڑھی کاکی اپنی اندھیری کوٹھڑی میں خیالِ غم کی طرح بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ لذت آمیز خوشبو انہیں بیتاب کر رہی تھی۔ وہ دل میں سوچتی تھیں۔ شاید مجھے پوریاں نہ ملیں گی۔ اتنی دیر ہو گئی۔ کوئی کھانا لے کر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ لوگ سب کھا گئے۔ میرے لئے کچھ نہ بچا۔ یہ سوچ کر انہیں بے اختیار رونا آیا۔ لیکن اشگون کے خوف سے رو نہ سکیں +

"آہا! کیسی خوشبو ہے۔ اب مجھے کون پوچھتا ہے؟ جب روٹیوں ہی کے لالے ہیں۔ تو ایسے نصیب کہاں کہ پوریاں پیٹ بھر ملیں۔" یہ سوچ کر انہیں پھر بے اختیار رونا آیا۔ کلیجہ میں ایک ہوک سی اُٹھنے لگی۔ لیکن روپا کے خوف سے اُنہوں نے پھر ضبط کیا +

بوڑھی کاکی دیر تک انہیں افسوسناک خیالوں میں ڈوبی رہیں۔ گھی اور مصالحے کی خوشبو رہ رہ کر دل کو آپے سے باہر کئے دیتی تھی۔ منہ میں پانی بھر بھر آتا تھا۔ پوریوں کا ذائقہ یاد کر کے دل میں گدگدی ہونے لگتی تھی "کسے پکاروں آج لاڈلی بھی نہیں آئی۔ دونوں لونڈے روز دق کیا کرتے ہیں۔ آج ان کا بھی کہیں پتہ نہیں۔ کچھ معلوم ہوتا کہ کیا کیا بن رہا ہے" +

بوڑھی کاکی کے چشم خیال میں پوریوں کی تصویر ناچنے لگی "خوب لال لال۔ پھولی پھولی۔ نرم نرم ہوں گی۔ روپا نے خوب مائن دیا ہو گا۔ کچوریوں میں اجوائن اور الائچی کی مہک آ رہی ہو گی۔ ایک پُوری ملتی۔ تو ذرا ہاتھ میں لیکر دیکھتی۔ کیوں نہ چل کر کڑاہ کے سامنے ہی بیٹھوں۔ پُوریاں چھن چھن کر کے کڑاہ میں تیرتی ہونگی۔ کڑاہ سے گرما گرم نکل کر کٹھوتے میں رکھی جاتی ہونگی۔" پھول ہم گھر میں بھی سونگھ سکتے ہیں لیکن سیرِ باغ کا کچھ اور ہی لطف ہے +

اِس طرح فیصلہ کرکے بوڑھی کاکی اکڑوں بیٹھ کر
ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی بمشکل تمام چوکھٹ سے اتریں
اور دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی کڑاہ کے پاس جا بیٹھیں
یہاں انہیں کچھ وہی تسکین ہوئی۔ جو کسی بھوکے کتے کو
کھانے والے کے سامنے بیٹھنے میں ہوتی ہے +

روپا اس وقت ایک سراسیمگی کی حالت میں تھی کبھی
اس کمرے میں جاتی۔ کبھی اس کمرے میں۔ کبھی کڑاہ کے
پاس۔ کبھی کوٹھے پر + کسی نے باہر سے آکر کہا۔ "مہراج
ٹھنڈائی مانگ رہے ہیں + ٹھنڈائی دینے لگی۔ اتنے
میں پھر کسی نے آکر کہا "بھاٹ آیا ہے۔ اسے کچھ دیدو"
بھاٹ کے لئے سیدھا نکال رہی تھی۔ کہ ایک تیسرے
آدمی نے آکر پوچھا۔ ابھی کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر
ہے + ذرا ڈھول مجیرا اُتار دو + بے چاری اکیلی عورت
چاروں طرف دوڑتے دوڑتے حیران ہو رہی تھی جھلاتی
تھی۔ کڑھتی تھی۔ پر غصہ باہر نکلنے کا موقع نہ پاتا تھا + خوف
ہوتا تھا کہیں پڑوسنیں یہ نہ کہنے لگیں۔ کہ اتنے ہی میں
اُبل پڑیں۔ پیاس سے خود اس کا حلق سوکھا جاتا تھا
گرمی کے مارے پھنکی جاتی تھی۔ لیکن اتنی فرصت کہاں۔
کہ ذرا پانی پی لے۔ یا پنکھا لے کر جھلے + یہ بھی اندیشہ تھا
کہ ذرا نگاہ ہٹی۔ اور چیزوں کی لوٹ مچی + اس کشمکش کے
عالم میں اس نے بوڑھی کاکی کو کڑاہ کے پاس بیٹھے دیکھا
تو جل گئی۔ غصہ نہ رک سکا۔ یہ خیال نہ رہا۔ کہ پڑوسنیں بیٹھی
ہوئی ہیں۔ دل میں کیا کہیں گی۔ مردانے میں لوگ سنیں گے
تو کیا کہیں گے۔ جیسے مینڈک کیچوے پر جھپٹتا ہے۔ اسی طرح
وہ بوڑھی کاکی پر جھپٹی۔ اور انہیں دونوں ہاتھوں سے
جھنجھوڑ کر بولی۔ "ایسے پیٹ میں آگ لگے۔ پیٹ ہے کہ
آگ کا کنڈ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھتے کیا دم گھٹتا تھا۔
ابھی مہمانوں نے نہیں کھایا + دیوتاؤں کا بھوگ تک
نہیں لگا۔ تب تک صبر نہ ہو سکا۔ آکر چھاتی پر سوار ہو گئیں
نوج ایسی جیبھ۔ دن بھر کھاتی نہ رہتیں۔ تو نہ جانے کس
کی ہانڈی میں منہ ڈالتیں۔ گاؤں دیکھے گا تو کہے گا کہ
بڑھیا بھر پیٹ کھانے کو نہیں پاتی۔ تب تو اس طرح
بوکھلائی پھرتی ہے (اس خیال سے اس کا غصہ اور
بھی تیز ہو گیا) ڈائن نہ مرے نہ ماچا چھوڑے۔ نام بیچنے
پر لگی ہے۔ ناک کٹوا کے تب دم لے گی۔ اتنا ٹھونستی ہے۔
نہ جانے کہاں بھسم ہو جاتا ہے۔ بھلا چاہتی ہو۔ تو جا کر
کوٹھری میں بیٹھو۔ جب گھر کے لوگ کھانے لگیں گے۔ تو
تمہیں بھی ملے گا۔ تم کوئی دیوی نہیں ہو۔ کہ چاہے کسی
کے منہ میں پانی تک نہ جائے۔ لیکن پہلے تمہاری پوجا
کردے" +

بوڑھی کاکی نے سر نہ اٹھایا۔ نہ روئیں۔ نہ بولیں
چپ چاپ رینگتی ہوئی وہاں سے اپنے کمرے میں چلی
گئیں صدمہ ایسا سخت تھا۔ کہ دل و دماغ کی ساری
قوتیں۔ سارے جذبات۔ ساری حسیات اسی طرف رجوع
ہو گئی تھیں۔ جیسے ندی میں جب کرار کا کوئی بڑا ٹکڑا
کٹ کر گرتا ہے۔ تو آس پاس کا پانی چاروں طرف سے
سمٹ کر اسی خلا کو پورا کرنے کے لئے دوڑتا ہے +

کھانا تیار ہو گیا۔ آنگن میں پتل پڑ گئے۔ مہمان کھانے
لگے۔ عورتوں نے جیونار گانا شروع کیا۔ مہمانوں کے نائی
اور خدمت گار بھی اسی جماعت کے ساتھ پر ذرا ہٹ کر

کھانے بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن آداب مجلس کے مطابق
جب تک سب کے سب کھانہ چکلیں۔ کوئی اُٹھ نہ
سکتا تھا۔ دو ایک مہمان جو ذرا تعلیم یافتہ تھے۔
خدمت گاروں کی پُرخوری پر جھنجھلا رہے تھے۔ وہ
اس قید کو بے معنی و مہمل سمجھتے تھے۔

بوڑھی کاکی اپنی کوٹھری میں جا کر پچھتا رہی
تھیں۔ کہ کہاں سے کہاں گئی۔ انہیں روپا پر غصہ
نہیں تھا۔ اپنی عجلت پر افسوس تھا "سچ ہی تو ہے۔
جب تک مہمان لوگ کھانہ چکیں گے۔ گھر والے کیسے
کھائیں گے۔ مجھ سے اتنی دیر بھی نہ رہا گیا۔ سب کے
سامنے پانی اُتر گیا۔ اب جب تک کوئی بُلانے نہ آئے
گا۔ نہ جاؤں گی"۔

دل میں یوں فیصلہ کرکے وہ خموشی سے بُلاوے کا
انتظار کرنے لگیں لیکن گھی کی مرغوب خوشبو بہت صبر آزما
ثابت ہو رہی تھی۔ انہیں ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹہ
معلوم ہوتا تھا۔ اب پتل بچھ گئے ہوں گے۔ اب مہمان
آگئے ہوں گے۔ لوگ ہاتھ پیر دھو رہے ہیں۔ نائی
پانی دے رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ لوگ کھانے پر بیٹھ
گئے۔ جیونار گایا جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر وہ دل کو بہلانے
کے لئے لیٹ گئیں۔ اور دھیرے دھیرے ایک گیت
گُنگنانے لگیں۔ انہیں معلوم ہوا۔ کہ مجھے گاتے بہت دیر
ہو گئی۔ کیا اتنی دیر تک لوگ کھا ہی رہے ہوں گے۔
کسی کی بول چال نہیں سنائی دیتی۔ ضرور لوگ کھا پی
کے چلے گئے۔ مجھے کوئی بُلانے نہیں آیا۔ روپا چڑ گئی ہے
کیا جانے نہ بلاوے۔ سوچتی ہو۔ کہ آپ ہی آئیں گی۔
کوئی مہمان نہیں کہ بُلاؤں"۔

بوڑھی کاکی چلنے کے لئے تیار ہوئیں۔ یہ یقین کہ
اب ایک لمحہ میں پوریاں اور مصالحے دار ترکاریاں
سامنے آئینگی۔ ان کے حسِ ذائقہ کو گدگدانے لگا۔
انہوں نے دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھے
پہلے ترکاری سے پوریاں کھاؤں گی۔ پھر دہی اور
شکر سے۔ کچوریاں رائتہ کے ساتھ مزے دار
معلوم ہوں گی۔ چاہے کوئی بُرا مانے یا بھلا۔ میں تو
مانگ مانگ کھاؤں گی۔ یہی نہ لوگ کہیں گے انہیں
لحاظ نہیں ہے۔ کہا کریں۔ اتنے دنوں کے بعد
پوریاں مل رہی ہیں۔ تو منہ جھوٹا کرکے تھوڑے ہی
اُٹھ آؤں گی"۔

وہ اُکڑوں بیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی
آنگن میں آئیں۔ مگر وائے قسمت! اشتیاق نے
اپنی پُرانی عادت کے مطابق وقت کا غلط اندازہ
کیا تھا۔ مہمانوں کی جماعت ابھی بیٹھی ہوئی تھی
کوئی کھا کر اُنگلیاں چاٹتا تھا۔ اور کنکھیوں سے
دیکھتا تھا۔ کہ اور لوگ ابھی کھا رہے ہیں یا نہیں
کوئی اس فکر میں تھا۔ کہ پتّل پر پوریاں چھوٹی جاتی
ہیں۔ کاش کسی طرح انہیں اندر رکھ لیتا۔ کوئی
دہی کھا کے زبان چٹخارتا تھا۔ لیکن دوسرا سکورا
مانگتے ہوئے شرماتا تھا۔ کہ اتنے میں بوڑھی کاکی
رینگتی ہوئی ان کے بیچ میں جا پہنچیں۔ کئی آدمی
چونک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آوازیں آئیں "ارے
یہ کون بڑھیا ہے؟ یہ کہاں سے آگئی؟ دیکھ کسی کو

چھوٹ مت دے"!

پنڈت بدھو رام کاکی کو دیکھتے ہی غصہ سے تلملا گئے۔ پوریوں کا تھال لئے کھڑے تھے۔ تھال کو زمین پر پٹک دیا۔ اور جس طرح بے رحم ساہوکار اپنے کسی نادہند مفرور اسامی کو دیکھتے ہی جھپٹ کر اس کا ٹیٹوا لیتا ہے اسی طرح لپک کر انہوں نے بوڑھی کاکی کے دونوں شانے پکڑے۔ اور گھسیٹتے ہوئے لا کر انہیں اس اندھیری کوٹھری میں دھم سے گرا دیا۔ آرزوؤں کا سبز باغ لو کے ایک ہی جھونکے میں ویران ہو گیا!

مہمانوں نے کھانا کھایا۔ گھروالوں نے کھایا۔ باجے والے۔ دھوبی۔ چمار بھی کھا چکے۔ لیکن بوڑھی کاکی کو کسی نے نہ پوچھا۔ بدھو رام اور روپا دونوں ہی انہیں ان کی بے حیائی کی سزا دینے کا تصفیہ کر چکے تھے۔ ان کے بڑھاپے پر بیکسی پر۔ فتور عقل پر کسی کو ترس نہیں آتا تھا اکیلی لاڈلی ان کے لئے کڑھ رہی تھی۔

لاڈلی کو کاکی سے بہت اُنس تھا۔ بیچاری بھولی۔ سیدھی لڑکی تھی۔ طفلانہ شوخی اور شرارت کی اس میں بو تک نہ تھی۔ دو نو بار جب اس کے باپ اور ماں نے کاکی کو بے رحمی سے گھسیٹا۔ تو لاڈلی کا کلیجہ اینٹھ کر رہ گیا۔ وہ جھنجھلا رہی تھی۔ کہ یہ لوگ کاکی کو کیوں بہت سی پوریاں نہیں دے دیتے۔ کیا مہمان سب کی سب تھوڑے ہی کھا جائیں گے۔ اور اگر کاکی نے مہمانوں کے پہلے ہی کھا لیا۔ تو کیا بگڑ جائے گا؟ وہ کاکی کے پاس جا کر انہیں تشفی دینا چاہتی تھی۔ لیکن ماں کے خوف سے نہ جاتی تھی۔ اس نے اپنے حصے کی پوریاں مطلق نہ کھائی تھیں۔ اپنی گڑیوں کی پٹاری میں بند کر رکھی تھیں۔ وہ یہ پوریاں کاکی کے پاس لے جانا چاہتی تھی۔ اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ بوڑھی کاکی میری آواز سنتے ہی اُٹھ بیٹھیں گی۔ پوریاں دیکھ کر کیسی خوش ہوں گی۔ مجھے خوب پیار کرینگی!

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ روپا آنگن میں پڑی سو رہی تھی۔ لاڈلی کی آنکھوں میں نیند نہ آتی تھی۔ کاکی کو پوریاں کھلانے کی خوشی اسے سونے نہ دیتی تھی۔ اس نے گڑیوں کی پٹاری سامنے ہی رکھی تھی۔ جب اسے یقین ہو گیا۔ کہ اماں غافل سو رہی ہیں۔ تو وہ چپکے سے اُٹھی اور سوچنے لگی۔ کہ کیسے چلوں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا صرف چولھوں میں آگ چمک رہی تھی۔ اور چولھوں کے پاس ایک کُتا لیٹا ہوا تھا۔ لاڈلی کی نگاہ دروازے والے نیم کے درخت کی طرف گئی۔ اسے معلوم ہوا۔ کہ اس پر ہنومان جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی دُم ان کی گدا سب صاف نظر آتی تھی۔ مارے خوف کے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنے میں کتا اُٹھ بیٹھا۔ لاڈلی کو ڈھارس ہوئی کئی سوتے ہوئے آدمیوں کی نسبت ایک جاگتا ہوا کتا اس کے لئے زیادہ تقویت کا باعث ہوا۔ اس نے پٹاری اٹھائی۔ اور بوڑھی کاکی کی کوٹھری کی طرف چلی۔

بوڑھی کاکی کو محض اتنا یاد تھا کہ کسی نے میرے شانے پکڑے۔ پھر انہیں ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی پہاڑ پر اڑائے لئے جاتا ہے۔ اس کے پیر بار بار پتھروں سے ٹکرائے تب کسی نے اسے پہاڑ پر سے پٹک دیا۔ وہ بے ہوش ہو گئیں۔

جب ان کے ہوش بجا ہوئے۔ تو کسی کی ذرا بھی آہٹ

نہ ملتی تھی۔ سمجھ گئیں، کہ "سب لوگ کھا پی کر سو گئے۔ اور ان کے ساتھ میری تقدیر بھی سو گئی۔ رات کیسے کٹے گی رام! کیا کھاؤں؟ پیٹ میں آگ جل رہی ہے۔ ہا! کسی نے میری سُدھ نہ لی۔ کیا میرا ہی پیٹ کاٹنے سے دھن ہو جائے گا؟ ان لوگوں کو اتنی دیا بھی نہیں آتی۔ کہ بڑھیا نہ جانے کب مر جائے۔ اس کا روپیاں کیوں نہ کھائیں میں پیٹ کی روٹیاں ہی کھاتی ہوں کہ اور کچھ۔ اس پر یہ حال۔ میں اندھی اپاہج ٹھہری۔ نہ کچھ سوجھے نہ بوجھے۔ اگر آنگن میں چلی گئی۔ تو کیا بدھ رام سے اتنا کہتے نہ بنتا تھا۔ کہ کاکی ابھی لوگ کھا رہے ہیں۔ پھر آنا؟ مجھے گھسیٹا۔ پٹکا۔ انہیں پوریوں کے لئے بہو نے سب کے سامنے گالیاں دیں۔ انہیں پوریوں کے لئے! اور اتنی درگت کر کے بھی ان کا پتھر کا کلیجہ نہ پسیجا سب کو کھلایا میری بات نہ پوچھی۔ جب تب ہی نہ دیا تو اب کیا دیں گی"۔ یہ سوچ کر کاکی مایوسانہ صبر کے ساتھ لیٹ گئیں۔ رقت سے گلا بھر بھر آتا تھا لیکن مہمانوں کے لحاظ سے روتی نہ تھیں۔

یکایک ان کے کان میں آواز آئی "کاکی اٹھو میں پوریاں لائی ہوں"۔

کاکی نے لاڈلی کی آواز پہچانی۔ چٹ پٹ اٹھ بیٹھیں۔ دونوں ہاتھوں سے لاڈلی کو ٹٹولا۔ اور اسے گود میں بٹھا لیا۔ لاڈلی نے پوریاں نکال کر دیں۔

کاکی نے پوچھا "کیا تمہاری اماں نے دی ہیں؟"

لاڈلی نے فخر سے کہا "نہیں یہ میرے حصے کی ہیں"۔

کاکی پوریوں پر ٹوٹ پڑیں۔ پانچ منٹ میں پٹاری خالی ہو گئی۔ لاڈلی نے پوچھا "کاکی پیٹ بھر گیا؟"

جیسے تھوڑی سی بارش ٹھنڈک کی جگہ اور بھی اُمس پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح ان چند پوریوں نے کاکی کی اشتہا اور رغبت کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ بولیں "نہیں بیٹی۔ جا کے اماں سے اور مانگ لاؤ"۔

لاڈلی۔ "اماں سوتی ہیں۔ جگاؤں گی تو ماریں گی"۔

کاکی نے پٹاری کو پھر ٹٹولا۔ اس میں چند ریزے گرے تھے۔ انہیں نکال کر کھا گئیں۔ بار بار ہونٹ چاٹتی تھیں۔ چٹخارے بھرتی تھیں۔ دل مسوس رہا تھا۔ کہ اور پوریاں کیسے پاؤں؟ صبر کا باندھ جب ٹوٹ جاتا ہے۔ تو خواہش کا بہاؤ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ مستوں کو سرود کی یاد دلانا انہیں دیوانہ بنانا ہے۔ کاکی کا بیتاب دل خواہش کے اس بہاؤ میں بہہ گیا۔ حلال و حرام کی تمیز نہ رہی۔ وہ کچھ دیر تک اس خواہش کو روکتی رہیں۔ یکایک لاڈلی سے بولیں میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے چلو۔ جہاں مہمانوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔

لاڈلی اس کا منشا نہ سمجھ سکی۔ اس نے کاکی کا ہاتھ پکڑا اور انہیں لا کر جھوٹے پتلوں کے پاس بٹھا دیا۔ اور غریب بھوک کی ماری۔ فاتر العقل بڑھیا پتلوں سے پوریوں کے ٹکڑے چن چن کر کھانے لگی۔

دہی کتنا لذیذ تھا۔ سالن کتنا مزہ دار۔ کچوریاں کتنی سلونی۔ سموسے کتنے خستہ اور نرم! کاکی فتورِ عقل کے باوجود جانتی تھیں۔ کہ میں وہ کر رہی ہوں جو مجھے نہ کرنا چاہئے۔ میں دوسروں کے جھوٹھے پتل چاٹ رہی ہوں لیکن بڑھاپے کی حرص مرض کا آخری دور ہے۔ جب سارے حواس ایک ہی مرکز پر آکر جمع ہو جاتے ہیں + بوڑھی کاکی میں یہ مرکز ان کا حسِ ذائقہ تھا +

عین اسی وقت روپا کی آنکھ کھلی۔ اسے معلوم ہوا کہ لاڈلی میرے پاس نہیں ہے۔ چونکی۔ چارپائی کے اِدھر اُدھر تاکنے لگی۔ کہ کہیں لڑکی نیچے تو نہیں گر پڑی۔ اسے وہاں نہ پاکر وہ اٹھ بیٹھی۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ لاڈلی جھوٹے پتلوں کے پاس چپ چاپ کھڑی ہے اور بوڑھی کاکی پتلوں پر سے پوریوں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر کھا رہی ہیں + روپا کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ کسی گائے کی گردن پر چھری چلتے دیکھ کر اس کے دل کی جو حالت ہوتی۔ وہی اس وقت ہوئی + ایک براہمنی دوسروں کا جھوٹا پتل ٹٹولے۔ اس سے زیادہ عبرتناک نظارہ ناممکن تھا + پوریوں کے چند لقموں کے لئے اسی کی چچیری ساس ایسا رکیک اور حقیر فعل کر رہی ہے! یہ وہ نظارہ تھا جس سے دیکھنے والوں کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین رک گئی ہے آسمان چکر کھا رہا ہے۔ دنیا پر کوئی نئی آفت آنے والی ہے + روپا کو غصہ نہ آیا۔ عبرت کے سامنے غصہ کا کیا ذکر! درد اور خوف سے اسکی آنکھیں بھر آئیں۔ اس ادھرم کا پاپ کا الزام کس پر ہے؟ اس نے صدقِ دل سے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پرماتما میرے بچوں پر رحم کرنا۔ اس ادھرم کی سزا مجھے مت دینا۔ ہمارا ستیاناس ہو جائے گا" +

روپا کو اپنی خود غرضی اور بے انصافی آجتک کبھی اتنی صفائی سے نظر نہ آئی تھی "ہائے میں کتنی بے رحم ہوں۔ جس کی جائداد سے مجھے دو سو روپیہ سال کی آمدنی ہو رہی ہے۔ اس کی یہ دُرگت اور میرے کارن! اے ایشور! مجھ سے بڑا بھاری گناہ ہوا ہے مجھے معاف کرو۔ آج میرے بیٹے کا تلک تھا۔ سیکڑوں آدمیوں نے کھانا کھایا۔ میں ان کے اشارے کی غلام بنی ہوئی تھی۔ اپنے نام کے لئے اپنی بڑائی کے لئے سینکڑوں روپے خرچ کر دیئے لیکن جسکی بدولت ہزاروں روپے کھائے۔ اسے اس تقریب کے دن بھی بھر پیٹ کھانا نہ دے سکی۔ محض اسی لئے نہ کہ وہ بڑھیا ہے۔ بے کس ہے۔ بے زبان +"

اس نے چراغ جلایا۔ اپنے بھنڈارے کا دروازہ کھولا۔ اور ایک تھالی میں کھانے کی سب چیزیں سجا کر لئے ہوئے بوڑھی کاکی کی طرف چلی +

آدھی رات جا چکی تھی۔ آسمان پر تاروں کے تھال سجے ہوئے تھے۔ اور ان پر بیٹھے ہوئے فرشتے بہشتی نعمتیں سجا رہے تھے لیکن ان میں کسی کو وہ مسرت نہ حاصل ہو سکتی تھی۔ جو بوڑھی کاکی کو اپنے سامنے تھال دیکھ کر ہوئی۔ روپا نے رقت آمیز لہجہ میں کہا "کاکی! اٹھو کھانا کھا لو۔ مجھ سے آج بڑی بھول ہوئی

اس کا بُرا نہ ماننا - پرماتما سے دعا کرو - کہ وہ میری خطا معاف کرے "

بھولے بھالے بچے کی طرح جو مٹھائیاں پا کر مار اور گھڑکیاں سب بھول جاتا ہے - بوڑھی کاکی بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں - ان کے ایک ایک روئیں سے سچی دعائیں نکل رہی تھیں - اور روپا بیٹھی یہ روحانی نظارہ دیکھ رہی تھی +

"پریم چند"

غزال

اے دشتِ نجد کے غزال! یہ تو کس کی تلاش میں یوں گم سم آوارہ پھر رہا ہے - کہ کہیں تیری منزل کا اختتام معلوم نہیں ہوتا؟ تیری آہستگیٔ رفتار کا تسلسل - تیرے قدموں کی بے نیازی اور تیری نظروں کا تجسس تو ایسا ظاہر کرتا ہے جیسے تیرا سفر اس صحرا کی حدود پر بھی ختم نہ ہوگا - کسی جلے جُھلسے اور ویران درخت کے نیچے تیرا ذراسی دیر کا آرام! یا ایک مختصر سی نیند بھی تیرے اعضا کو اطمینان و فراغت کی صورت اختیار نہیں کرنے دیتی - ان سے یہی مترشح ہوتا رہتا ہے - کہ تیرا قرار عارضی اور تیرا سکون غیر مستقل ہے! تو جاگتا ہے اور پھر یوں دفعتاً اپنا سفر شروع کر دیتا ہے - گویا تیری نیند بھی تیرے سفر کا ایک جزو تھی! اور خواب میں بھی مختلف راستوں پر پھر کر تو اپنے لئے کسی خاص سمت کا فیصلہ کر رہا تھا -

تیری نگاہوں سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے - جیسے اس صحرا میں یا اس کے پار کوئی تیرا منتظر بیٹھا ہے! اور تو اس کے پاس جا رہا ہے لیکن کچھ بتا تو کہ تیرا مقصود کون ہے؟ تیری یہ جستجو کیسی ہے؟ یہ وارفتگی کیوں؟!

کیا کسی گئے گزرے جنم میں تو نے مجنون کو تو نہیں دیکھ لیا تھا؟ اور اب اسی پچھلے جنم کی بھولی بسری یاد کو، محو شدہ راستوں کے نقش کو، دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش میں تو مصروف نہیں؟ کیا تو اسی غیر فانی تنِ لاغر کو دیکھنے کے لئے تو بے قرار نہیں ہو رہا؟ لیکن تو تو ایک ذراسی آہٹ سے یوں چونک اٹھتا ہے - جیسے کچھ تیری توقع کے خلاف ہو گیا؟ اس ویران صحرا میں تجھے اپنے مجنوں کے سوا اور کس کی موجودگی کی امید ہو سکتی ہے؟ تو پھر کسی آہٹ سے مقصود کے مل جانے کی امید، تیری حسرت بار نظروں میں خوشی کی چمک کیوں نہیں پیدا کرتی؟ تیری نظروں سے تو اور اضطراب اور وارفتگی برسنے لگتی ہے! اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض اس آہٹ سے تیرا سفر میلوں زیادہ ہو گیا! تو پھر یہ تلاش کیسی ہے جہاں مقصود کا ملنا بھی جستجو کا اختتام نہیں بلکہ ایک آغاز ہے؟!

(تاج)

"نام کیا لوں کوئی اللہ کا بندہ ہوگا"

میں اس مضمون کو منسوب کرتا ہوں اپنے ایک عزیز دوست کے نام۔ مگر کوئی یہ نہ دریافت کرے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جو حضرات ان کو جانتے ہیں۔ انہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ اور جو نہیں جانتے۔ ان کو میں بتانا نہیں چاہتا +

"قمر"

میں بے انتہا مصروف تھا، میرا قلم اپنی مسلسل مگر خاموش رفتار سے صفحے کے صفحے طے کرتا جارہا تھا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ دفتر میں کون نیا شخص آتا ہے۔ اور کون پرانا آدمی نکل جاتا ہے۔ کیونکہ مجھے شام تک پورے اسّی صفحات کا ایک مسودہ صاف کرلینا ضروری تھا۔ مختصر یہ کہ میں اپنی گردن جھکائے ہوئے۔ اپنا بایاں ہاتھ اک نرم گدے پر ٹکائے ہوئے، اک مشین کی طرح غیر منقطع طریقہ سے اپنے قلم کو حرکت دے رہا تھا۔ کہ دفعتاً روشنائی ختم ہوگئی مجھے یاد نہیں کہ اس وقت غصّہ دوات پر آیا یا روشنائی پر، مگر آیا ضرور۔ اور شاید وہ چپراسی کے سر پر جو دفتر میں سب سے زیادہ "عضوِ ضعیف" ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے اپنی تمام چین جبین کے ساتھ نازل ہوجاتے میں ذرا تامل نہ کرتا اگر نگاہ اٹھتے ہی مجھے ایک نہایت ہی "چھوٹی قسم" کا بادنجانی آدمی سامنے نظر نہ آجاتا +

میں سخت نادم ہوں کہ مجھ سے ہنسی نہیں رکی۔ اور میں خود بھی اپنی اس کمزوری کو محسوس کرتا ہوں، لیکن آپ یقین کیجئے۔ کہ اس وقت مجھے اس پاکٹ اڈیشن آدمی کو دیکھکر جو ہنسی آنی چاہئے تھی۔ وہ بہت کچھ حیرت میں تبدیل ہوگئی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مختصر سا گول مول، ہر وقت لڑھک پڑنے کے لئے آمادہ رہنے والا انسان ایسا نہ تھا کہ میں وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی زندگی کے سارے قہقہے صرف کردینے میں ذرا بھی تحمل سے کام لیتا۔

اب میں اپنی مصروفیت اپنے کام کی اہمیت کو بالکل بھول گیا۔ اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھنے لگا، کہ وہ بھی کیا حکیم و دانا ہے۔ ورنہ ایک انسان کے بس میں تو یہ کبھی نہ تھا۔ کہ وہ اتنے مختصر سے چہرے میں دو آنکھ، دو کان، ایک ناک مع دو نتھنوں کے، دو ہونٹ، دو گال، ایک ٹھوڑی، ایک پیشانی، پوری ایک درجن چیزیں اس صفائی سے تیار کرسکتا۔ ایک ترکی ٹوپی مع ایک عدد پھندنے کے جو بائیں طرف کنپٹی سے گزر کر گال کو چھو رہا تھا، فرقِ مبارک پر رکھی ہوئی تھی، ایک سرج کی دھاری دار شیروانی جس میں جگہ کم ہونے کی وجہ سے صرف پانچ ہی بٹن بالکل ملا ملا کر لگائے گئے تھے۔ زیب بدن تھی پاجامہ اور موزہ تھا یا نہیں۔ اس کا پتہ اس وقت نہیں چل سکا۔ کیونکہ شیروانی کا دامن نیچے کے سارے حصۂ جسم کو چھپاتا ہوا فرش پر اتنی دور تک پھیلا ہوا تھا کہ اگر ہوا کا سیر سمجھو تکا دامن کا ایک ایک فٹ حصہ بھی چادروں

طرف سے اُلٹ دیتا تو یہ نہ معلوم ہو سکتا۔ کہ اس کے اندر
سمائی ہوئی چیز کہاں سے شروع ہوئی ہے۔

میں یہ سوچ رہا تھا۔ کہ اللہ کی شان ہے یہ ہم
لوگوں کا سا لباس اختیار کرتے ذرا شرم نہیں کرتا کہ
دفعتہً اس کی آنکھوں نے، جن کو میں بیضاوی، گول
مربع مستطیل کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے دیکھا، میری اس
وقت عجیب کیفیت تھی۔ اس کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی
تھیں۔ اور میں سمجھ رہا تھا۔ کہ راجپوتانہ کے ریگستان میں
کسی نہایت عمیق کنوئیں کے اندر جھانک کر پانی کی سی
تاریک چمک دیکھ رہا ہوں۔

میں شاید عرصہ تک نہ ضبط کر سکتا۔ اور اسکی چھوٹی
چھوٹی آنکھیں جن کی نسبت بعد کو معلوم ہوا۔ کہ انہیں
وہ ہمیشہ انکھڑیاں کہا کرتا تھا۔ یقیناً میرے جسم کے اندر
گدگدی بن کر سما جاتیں۔ اگر اس وقت وہ ایک شخص سے
کچھ مسکرا کر باتیں نہ شروع کر دیتا۔ لیکن آپ کیا پوچھتے
ہیں میری اس وقت کی حیرت و بیتابی کا عالم۔ کیا مضطر
تھا کہ کوئی میرے پاس ہوتا اور میں اس سے کہتا "اے
تو یہ ہنستا بھی ہے اور بولتا بھی ہے" لیکن یہ میری تمام
حیرت بالکل ہیچ تھی۔ اس استعجاب کے سامنے، جب مجھے
زمانہ مابعد میں بے تکلف ہو جانے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ
عشق بھی کئی بار کر چکے ہیں۔ اور اب بھی اپنے سینے کی چھوٹی
سی دھونکنی کو لمبی لمبی سانسوں سے بھرنے اور خالی کرنے
کے لئے آمادہ ہیں۔ اگر کوئی معشوقہ دراز قامت ان پر
ہنسے نہیں۔ اور مذاق میں ناک نہ مل دے[1] +

آپ لوگ سمجھتے ہوں گے۔ کہ میں اپنے دوست کا
حال بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیتا ہوں لیکن اگر آپ
میں سے کوئی صاحب یہاں تشریف لانے کی تکلیف
گوارا فرمائیں تو میں ثابت کر سکتا ہوں۔ کہ جب ہمارے
دوست اول اول ڈاک خانہ میں ملازم ہو کر اپنی میز پر
گئے۔ تو دیر تک ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ کہ وہ تپائی
جس پر بیٹھ کر انہیں کام کرنا ہے۔ کیوں اتنی بلند بنائی
گئی تھی۔ مگر چونکہ آدمی ذہین و طباع تھے۔ فوراً ایک دوسری
کرسی کا زینہ بنا کر اس قطب کے مینار پر چڑھ گئے لیکن
دیکھنے کا تماشہ تو اس وقت تھا۔ جب انہیں پوسٹ ماسٹر
صاحب نے نہایت فوری میں طلب کیا۔ اور یہ بہت دیر
تک اُترنے کا راستہ نہ پا کر وہیں چکر لگایا کئے۔ اور پھر ایک
بار جو اللہ اللہ کہہ کر تپائی کے کوٹھے سے کودے ہیں
تو لڑھکتے ہوئے پوسٹ ماسٹر کی ردی کی ٹوکری کے برابر
کھڑے تھے۔

یہ کئی مہینے تک ڈاک خانہ میں رہے۔ اور یہیں قیامت
تک نہ معلوم ہو سکتا کیونکر اپنی جان سلامت لے گئے
اگر یہ خبر نہ ہو جاتی کہ روز صبح ڈاک خانہ جانے سے پہلے
دو چار پائیاں برابر برابر بچھا کر اور ان کی پٹیاں پکڑ کر
جمناسٹک کی مشق کر لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن ان کی
مسرت کی کچھ انتہا نہ تھی۔ جب وہ بغیر کسی مدد کے صرف
اپنے ہاتھوں کی قوت سے تین فٹ اونچی میز پر اُچک
کر جا بیٹھے۔ وہ پاؤں کو فرط مسرت سے لٹکائے ہوئے جنبش
دے رہے تھے۔ باچھیں کانوں تک پہنچی جاتی تھیں آنکھیں
خوشی سے چمک رہی تھیں۔ جب میں نے اس غیر معمولی انبساط

---

[1] میں اپنے دوست سے اس تلمیح کے اظہار پر معافی چاہتا ہوں

کی وجہ دریافت کی۔ تو جواب تو کچھ نہ ملا۔ مگر اس وقت میرے سامنے فوراً میز سے کود پڑے۔ اور پھر اُچک کر وہیں چڑھ گئے جہاں سے میں نے جاکر ان کے ڈنڈے اور نصیحت کی کہ آئندہ کسی دوسرے کے سامنے اپنی قوت کی ایسی نمائش نہ کیا کریں ورنہ ممکن ہے نظر لگ جائے۔ فطرت اتنی فیاض نہیں کہ روز روز ایسی قوت و جسامت والے آدمی پیدا کریگی +

ہر چند وہ اب مجھ سے دور ہیں۔ اور مجھے بالکل بھول چکے ہیں۔ لیکن میں انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اور کیونکر ممکن ہے۔ جبکہ اب بھی ان کی ہزاروں باتیں، لاکھوں ادائیں دن میں کئی بار یاد آ آکر مجھے بیقرار کر دیتی ہیں۔

انہیں اپنی خوش قامتی کا احساس ضرور تھا، لیکن اس کا ذکر اشارۃً کنایتاً بھی وہ پسند نہ کرتے تھے۔ نہ وہ کبھی کسی کے برابر ہو کر چلتے تھے۔ نہ کسی کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے۔ اگر اتفاق سے کبھی کوئی راستہ میں مل جاتا۔ شامتِ اعمال سے دوست ہوتا تو کہہ دیتے دُور رہو۔ اور کوئی ضرورت مند اجنبی ہوتا، تو اس کو ڈانٹ دیتے کہ راستہ ان کاموں کے لئے نہیں۔ ایک روز میں اور وہ اپنے ایک دوست کے یہاں جا رہے تھے، راستہ میں بارش شروع ہو گئی۔ اور مجبوراً ان کو میری چھتری کے نیچے پناہ لینی پڑی۔ لیکن وہ پانی سے کیونکر محفوظ رہتے۔ اور میں کیسے اتنا جھک سکتا کہ کم از کم ان کا سر تو بچ جائے۔ انہوں نے شکایت کی، میں نے کہا "بھائی دیکھ لو باوجود کوشش کے میں اپنی بنڈلیاں بھی تو بھیگنے سے نہیں بچا سکا"۔ اسے سن کر مجھے دیکھا اور برہم ہو کر میرے پاس سے چلے گئے۔ ہائے اس نوع کی خفگیاں عجیب و غریب نعمت تھیں۔ کاش جاپان نے مردوں کے لئے

بھی نہایت چھوٹی چھوٹی سبک چھتریاں ہندوستان کے بازاروں میں بھیجی ہوں۔

انہیں گانے کا بھی بہت شوق تھا لیکن جس لطف کے ساتھ وہ اس چیز کو سنتے،

"ذرا سے بالماں مندری کا نگینوا رے"

کسی دوسری چیز کو نہیں، وہ اس گیت پر اپنی چھوٹی چھوٹی "جھوم" سے ایسا جھومنے لگتے جیسے لٹّو اپنی گردش ختم کرتے وقت وہ چار بار ذرا سے چکر لگا کر گر پڑتا ہے۔

میں یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں، کہ وہ مجھ سے اور میں ان سے بے انتہا بے تکلف ہو گیا تھا۔ اور اس میری بے تکلفی کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ وہ نہایت اچھا شاعرانہ مذاق رکھتے تھے۔ اور میں ایسے لوگوں سے محبت کر لینے کا سخت عادی ہوں۔

دو چار بار انہوں نے دورانِ گفتگو میں اپنی تعشق خیز زندگی کا بھی ذکر کیا لیکن تفصیل کبھی نہیں بتائی۔ یقیناً خط و کتابت کا سلسلہ اب تک باقی تھا۔ کیونکہ مہینہ میں ایک آدھ بار ضرور وہ اپنے سیدھے اور سخت بالوں میں تیل اور پانی مل کر نرم بناتے اور کنگھی کر کے مانگ نکالا کرتے تھے اور یہ والی ہی ہوتا تھا جب کسی کی تحریر انکو مل جاتی تھی، یہ بات بہت کاوش سے معلوم ہو سکی کہ حسن و عشق کے باب میں ان کا فلسفہ یہ تھا کہ

محبوب ہو تو ہو لیکن اسکی تحریر بھی بغیر سلوٹ کے ہوئے نہ پڑھنی چاہیے تاکہ اپنے آپ کو اہلِ عشق سمجھنے کا خیال ضعیف نہ ہو جائے کہ پھر اس کے بعد حسن کی تمام عاشق نوازیاں بیکار ہیں۔

سب سے پہلے مجھے ان کی محبت کا علم کیونکر ہوا؟ ان... کی داستانِ عشق سننے کی [illegible] اور وہ داستان کسی لطیفہ سے کم نہیں [illegible]

ہذیانِ آرزو

دلسوز! دلسوزی چاہئے۔ مگر اس حد تک کہ رواں ئے عنصری یعنی ہستی کی بوسیدہ فرسودہ بنیادوں میں آگ لگ جائے۔ اور ظلمت کدۂ خیال سے آبِ حیات ٹپکنے لگے۔ آبِ حیات خضر کا بھولا اور سکندر کی خواہشات کا ڈھکوسلا نہیں۔ بلکہ خاک آب۔ ہوا اور آتش کی مواصلت کا جوہر۔ زندگی کی روح تصادمِ جذبات کا شرارہ!

فنا جس کی بقا پرکارِ عالم کا نقطہ ہے۔ میری نظر کی حدِ معین اور میرے دل کا اثرِ شوق بن گیا ہے۔ دنیا کے موہوم واسطے مجھ سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ اور دنیا کی آشنا سوز محفل سے "الفراق" کہتا ہوا اٹھتا چلا جاتا ہوں! آتشگیر مادے سے لبریز دریا ایک طرف موجیں مار رہا ہے۔ اور سمی بخارات سے معمور ریگستان دوسری جانب طوفان کا منتظر ہے شوق و ارمان کی کشمکش لمحہ بہ لمحہ ترقی پر ہے۔ اگر شرر ریزی پر آہِ سرد کی بدولت اوس پڑ گئی۔ اور زندگی کے یہ دونو پہلو مامون رہے تو خیر۔ ورنہ

راستے کعبے کا کھو کر یہ ملا ہو
بتکدے میں ٹھوکریں کھاتے ہیں ہم

ہم نوا! بیہودہ عدم یا ہستی یا مرگ اندوز زندگی کی نظم پیرائی کے خلاف اصرار کرنا تازہ بیاز کی ایک تازہ بحث چھیڑنا ہے۔ پردہ کشائی سوائے تحیر کے اور کیا سیر دکھا سکتی ہے۔ زخم کی کرید اس کی نوعیت پر وقوف پانے کے لئے حکیمانہ فعل نہیں ہے۔ دردمند نگاہ کی کارگزاری چاہیئے۔ مگر میرا زخمِ جگر جس میں سے خوناب رس رہا ہے دور ہی سے اپنے رنگ کی جھلک دے رہا ہے! اس صورت میں جذبات و خیالات نمائشِ اضطراب نہیں تو کیا ہے!

چھلک گیا جامِ عشق اچھا تڑپ سے حاصل بجز تماشا
جنوں ہے سر میں تو گھٹ کے مرنا نمائشِ اضطراب کب تک

دمساز! اب تو میں ہوں۔ اور محشرستانِ خیال کی خلش گبریاں۔ بتوں کی خدائی سے نکالا گیا۔ تو بیخودی کی نیرنگ سازیوں میں پھنس گیا۔ کامگاری اور سرمایۂ حیات عالمِ مجہول کی بے معنی اصطلاحیں ہیں۔ جن کو غفلت اور فراموش کاری سمیٹ رہی ہے۔ جس قدر جھکتا جاتا ہوں محبت کا کٹھن میدان وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جب روح تازہ دم تھی۔ گرمی وفا سرد مہری سے امتزاج پا لیا کرتی تھی لیکن گریہ و زاری غم سے اپنے ظاہری باطنی تمام قویٰ اس قدر نازک ہو گئے ہیں کہ ہنسی کے مقابلے میں بھی ستم کو بلانا پڑتا ہے

حوصلہ تنگ ہوا یاد یہ پیمائی کا
اور ابھی تو وہ ہے عالم مری رسوائی کا

تپش

چترا

تیسرا سین

چترا

نہیں۔ نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ان پرجوش نگاہوں
کا سامنا کرنا جو اپنے بھوکے اشتیاق کے جنگل کی طرح مجھے
دبوچ لینا چاہتی ہیں۔ اس کے دل کو اپنے بدن کے اندر
نالۂ دلسوز کی لہر دوڑاتے اور اپنے بندھنوں کو توڑ کر
آزاد ہو جانے کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے محسوس کرنا
اور پھر اسے بھکاری کی طرح لکھ کر نکال دینا۔ نہیں
نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا ؎

(مدن اور بسنت داخل ہوتے ہیں)

آہ اے پریم دیوتا! یہ کیسا بھیانک شعلہ ہے جس میں
تو نے مجھے لپیٹ دیا۔ میں خود جلتی ہوں، اور جس چیز کو
چھوتی ہوں۔ جلا دیتی ہوں ؎

مدن

میں جاننا چاہتا ہوں۔ کہ کل رات کیا ہوا؟

چترا

شام کے وقت میں گھاس کے ایک بستر پر جس پر بہار
کے پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ لیٹی تھی۔ اور اپنے
حسن کی ان حیرت ناک تعریفوں کی یاد دہرا رہی تھی جو
میں نے ارجن سے سنی تھیں۔ گویا اس شہد کا ایک ایک
قطرہ پی رہی تھی جو اس دن کئی دنوں میں نے جمع کیا تھا
میں اپنی گزری ہوئی زندگی کی سرگذشت کو بھی اپنی پچھلی
جون کی طرح بھول گئی تھی۔ میں اپنے آپکو اس پھول کی طرح
پاتی تھی جو صرف چند ناپائدار گھڑیوں کے لئے جنگل کے
خوشامدی بھنوروں کی بھنبھناہٹ۔ اور سرگوشیاں
کرتی ہوئی سانسیں سنتا ہے۔ اور پھر اس کے لئے
لازم ہوتا ہے۔ کہ آسمان سے اپنی آنکھیں نیچی کرکے سر
جھکا کر ایک سانس میں فریاد کئے بغیر اپنے آپ کو سپرد
خاک کر دے۔ اور اس طرح ایک بے عیب لمحے کی چھوٹی
سی کہانی کو ختم کر دے۔ جس میں نہ کوئی گذرے ہوئے
واقعات ہیں۔ نہ آنے والے ؎

بسنت

شان شوکت کی غیر محدود زندگی ایک ہی صبح بھر میں
کھل کر کملا سکتی ہے ؎

مدن

جیسے کسی گیت کے چھوٹے سے وقفے میں لا انتہا
معنی پوشیدہ ہوتے ہیں ؎

چترا

نسیم کی ہوا نے مجھے تھپک تھپک کے سلا دیا۔ پھولوں
سے لدی ہوئی مالتی کی ٹہنیوں کا جھنڈ میرے سر پر تھا
اور ان پر سے مجھ پر اور میرے جسم پر خاموش بوسے ٹپک

رہے تھے۔ میرے بالوں پر۔ میرے سینے پر۔ میرے پاؤں
پر۔ ہر پھول نے مرہٹنے کو بستر بچھایا۔ میں سوتی رہی اور
اچانک مجھے اپنی نیند کی گہرائیوں میں کیا معلوم ہوا۔
کہ کوئی گرم اور پُرجوش نگاہ شعلے کی نکیلی انگلیوں کی طرح
میرے سوتے ہوئے جسم کو چھُو رہی ہے۔ میں چونک اٹھی
اور اس جوگی کو اپنے سامنے کھڑے ہوئے پایا۔ چاند مغرب
کو جا چکا تھا اور پتّوں میں سے پرماتما کی اس عجیب صنعت
کو دیکھنے کے لئے جھانک رہا تھا۔ جو اس نے اس نازک
انسانی جسم کے بنانے میں صرف کر رکھی تھی۔ ہوا خوشبو سے
معطر تھی۔ رات کی خاموشی جھینگروں کی جھنکار سے گویا
ہو رہی تھی۔ درختوں کے عکس جھیل میں بالکل ساکن تھے
اور وہ اپنی چھڑی ہاتھ میں لئے کسی جنگل کے درخت کی
طرح بالا بلند سیدھا اور خاموش کھڑا تھا۔ مجھے ایسا
معلوم ہوا۔ جیسے میں زندگی کی تمام اصلی چیزوں کی طرف
سے مر گئی۔ اور کسی سایہ دار سرزمین میں سپنے کا سا جنم
لیا ہے۔ میری شرم کھلے ہوئے کپڑوں کی طرح اتر گئی
میرے کانوں میں اس کی آواز آئی "پیاری! میری
جان سے پیاری!!" میری تمام بھولی بسری زندگیاں
اکٹھی ہو کر ایک ہو گئیں۔ تاکہ اس کی آواز کا جواب دیں
میں نے اپنے دونو بازو اس کی طرف پھیلا دیئے اور
کہا "مجھے لے لے! میرا سب کچھ لے لے"! چاند درختوں
کے پیچھے ڈوب گیا! اندھیرے کے ایک پردے نے
سب کو ڈھانک لیا۔ آسمان اور زمین۔ زمان اور مکان
خوشی اور غم، موت اور زندگی سب مل کر ایک ناقابل
برداشت لذت کی لہروں میں ڈوب گئے۔ ... ...

روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ، پرندوں کے پہلے چہچہے کے
ساتھ میں اٹھی اور اپنے بائیں بازو پر ٹیک لگائے بیٹھ
گئی۔ وہ سو رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک غیر
معلوم مسکراہٹ تھی۔ جیسے دوج کا چاند صبح کے وقت
دکھائی دیتا ہے۔ صبح کی گلابی شفق اس کی نجیب پیشانی
پر پڑ رہی۔ میں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ اور اُٹھ کھڑی ہوئی
میں نے گنجان پتوں والی بیلوں کو آپس میں ملا ملا کر
ایک چلمن بنا دی۔ کہ سورج کی پھیلتی ہوئی کرنیں اس کے
چہرے پر نہ پڑیں۔ میں نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ اور
مجھے وہی پرانی زمین دکھائی دی۔ پھر مجھے یاد آیا۔ کہ
میں پہلے کیا ہوا کرتی تھی۔ یہ سوچ کر میں بھاگی۔ اور
اس ہرن کی طرح جو اپنی پرچھائیں سے ڈر رہا ہو جنگل
کی اس پگڈنڈی پر بھاگی۔ جس پر شیفالی کے پھول بکھرے
ہوئے تھے۔ میں ایک سنسان گوشے میں پہنچ کر بیٹھ گئی
دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانک لیا۔ اور رونے
اور چلانے کی کوشش کی۔ مگر میری آنکھوں میں آنسو نہ
آئے پر نہ آئے۔

مدن

افسوس اے انسانوں کی بیٹی! میں نے خدائی مینا
سے بہشت کی معطر شراب چرائی۔ اس سے دنیا کی ایک
رات کو لبالب بھر دیا۔ اور وہ تیرے ہاتھ میں دیدی
کہ تو پئے۔ لیکن اب بھی میں تجھ سے درد کی چیخیں سُن
رہا ہوں +

چترا

(درد ناک آواز سے)

ہندوستان کی نذر رسول اللہ کے دربار میں اقبال کے ہاتھ سے

شعلہ در آغوش دارد عشق بے پروائے من — برنخیزد یک شرار از حکمت نازائے من

چون تمام افتد سراپا ناز می گردد نیاز — قیس را لیلیٰ ہمی نامند در صحرائے من

تا دمِ گرمم زِ تابِ این چمن افزون تر است — نغمۂ شوخم بخود می پیچد اندر نائے من

خاک را از جرعۂ باز آتشے درگیر کن — ساقیِ من جامِ من مینائے من صہبائے من

بہرِ دہلیزِ تو از ہندوستاں آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من

کلامِ اکبر

از جناب لسان العصر مولانا اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی

ہر کس و ناکس سے دنیا میں تعلق کیجئے — یا جہاں تک ہو سکے ترکِ تعلق کیجئے

پھنسا ہوں زندگی میں سانس رو کے رک نہیں سکتی — مگر دنیا کی خاطر میری گردن جھک نہیں سکتی

آنکھ مجبور نہیں بت کو اگر تکتی ہے — ہو خدا پر جو نظر بند بھی ہو سکتی ہے

یہ دنیا اپنے سازوں میں اک وز بھی خوش آہنگ نہ تھی — وہ کون زمانہ گزرا ہے جب حرص نہ تھی جب جنگ نہ تھی

ہاں نفس کے بندے لڑتے ہیں شوکت کیلئے دنیا کے لئے — جو حق کیطرف ہے صلح میں ہیں یا تیغ بکف عقبیٰ کے لئے

صوفیٔ باصفا کا بھی اچھا مذاق ہے
اس فلسفے میں ہوش کا آنا فراق ہے

خدا خیر کرے

از جناب میر غلام بھیک صاحب نیرنگ

اک ہجومِ غم و کلفت ہے۔ خدا خیر کرے!
جان پر نت نئی آفت ہے۔ خدا خیر کرے!

جائے ماندن ہمیں حاصل ہے نہ پائے رفتن
کچھ مصیبت سی مصیبت ہے؟ خدا خیر کرے!

کہیں دانائی دشمن کہیں نادانی دوست
جس طرف دیکھیے شامت ہے۔ خدا خیر کرے!

ہوشیاروں سے پڑا ہے دلِ نادان پالا
اور تو سرخوشِ غفلت ہے۔ خدا خیر کرے!

ان کے ہر عہد میں مضمر ہے شکستِ پیماں
اپنی طینت میں صداقت ہے۔ خدا خیر کرے!

وہ جفاکار ہے بیگانۂ آئینِ وفا
وضعداروں کی بری گت ہے۔ خدا خیر کرے!

بتِ بے پیر کہ ہے دشمنِ جان و ایماں
مائلِ مہر و محبت ہے۔ خدا خیر کرے!

وہی دل جس پہ کبھی تیغِ ستم چلتی تھی
ہدفِ تیرِ عنایت ہے۔ خدا خیر کرے!

آچلا اس بتِ عیار کی باتوں کا یقیں
سادگی اپنی قیامت ہے۔ خدا خیر کرے!

دل گیا۔ جانے دو۔ کافر کی ہے ایماں پہ نظر!
آنکھ میں اپنی مروت ہے۔ خدا خیر کرے!

چارہ گر! ہم تو نہ جیتے ہیں نہ مر چکتے ہیں
کیا کہیں! نزع کی حالت ہے۔ خدا خیر کرے!

ابھی تشخیصِ مرض میں ہے طبیبوں کو کلام
جان ادھر در پئے رخصت ہے۔ خدا خیر کرے!

رہنماؤں کو نہیں خود بھی پتہ رستے کا
راہرو پیکرِ حیرت ہے۔ خدا خیر کرے!

پیش ہے مسئلہ موت و حیاتِ ملت
یعنی خطرے میں خلافت ہے۔ خدا خیر کرے!

اتفاقات نہیں ہیں یہ حوادث۔ نیرنگ!
یہ تو اعمال کی شامت ہے۔ خدا خیر کرے!

جذباتِ حشر

از جناب آغا محمد شاہ صاحب حشر کاشمیری

نہ پوچھ اے دل ہوئی کیا زندگی سے گفتگو میری
کہ اب وردِ زباں ہے یہ "نہ میں تیرا نہ تو میری"

اُمنگیں جن سے اک نشہ سا تھا اب مٹتی جاتی ہیں
اُڑی جاتی ہے ساغر سے شرابِ مشکبو میری

ہیں سیلِ موج بر موجِ زمانہ کا ہوں ہم قسمت
فرامش کردہ غائت ہے جہاں میں جستجو میری

مری کشتِ تمنا کا ہے حاصل سوز و بیتابی
مگر خرمنِ رگِ برقِ طپاں سے ہے نمو میری

لبِ تسکیں کی جنبش سے جلی پڑتی ہے اے ہمدم!
ہوا دے کر نہ بھڑکا آتشِ غم اور تو میری

شعاعِ مہر

از جناب مولوی سید خورشید علی صاحب مہر دہلوی

کیوں رو رو کر جی دیتا ہے کیوں ہر دم آہیں بھرتا ہے
اے مہر یہ جھوٹے جھگڑے ہیں بے موت بھی کوئی مرتا ہے

ہمنے جو دیا ہے دل تمکو کیوں ہم پہ جفائیں کرتے ہو
آخر یہ ہی تو اُلفت ہے جو سارا عالم کرتا ہے

اب جینے کی کیا آس کریں سب آرزو وں تیغ اوس بڑی
کل خود ہی کیا تھا اک وعدہ اور خود ہی آج مکرتا ہے!

مجھکو تو ہر اک سمجھاتا ہے اے مہر نہ رو رو کر رنج نہ تو
لانے کی یہاں تک اسکو مگر کوئی بھی حامی بھرتا ہے!

اپنے بھی ملامت کرتے ہیں اغیار بھی طعنے دیتے ہیں
اس عشق میں سب کچھ سنتا ہوں گو دل پہ شاق گزرتا ہے

کچھ دن کیلئے ہیں قید یہاں صیاد ہمارے پر نہ کتر
تو یہ تو سمجھ مہمان پر اپنے ظلم بھی کوئی کرتا ہے

کس شوق سے سننے بیٹھے ہیں وہ حال ہمارا آج مگر
اے مہر جو اپنے دل میں ہے وہ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے

کلامِ وحشت

از جناب مولانا رضا علی صاحب وحشت

ستم برپا کیا پھر اے دلِ ناشادماں تو نے
کہ چھیڑی عہد ماضی کی غم افزا داستاں تو نے

تری غفلت پرستی نے رکھا محوِ طرب تجھ کو
سُنی گو بارہا بانگِ درائے کارواں تو نے

تری تفریح دم بھر کی تھا سرمایۂ عشرت
نہ پایا بے خبر ذوقِ نشاطِ جاوداں تو نے

نہ سمجھا معنئ نفع و ضرر بازارِ ہستی میں
ہوائے سود میں دیکھا فقط روئے زیاں تو نے

تری لائی ہوئی تھی جو بلا ٹوٹی ترے سر پر
عبث چھیڑا ہے یہ ذکرِ جفائے آسماں تونے

کوئی ہمدرد بھی دیکھا کوئی غمخوار بھی پایا؟
سبھوں کو تو سنائی درد و غم کی داستاں تونے

زبانِ آفرینِ خلق سے کچھ کام بھی نکلا ؟
دکھائیں تو زمانے کو بہت رنگینیاں تونے

نہ دیکھی کیا کوئی خوبی بہارِ لالہ و گل میں
کہ گلشن سے اڑایا جاکے بس رنگِ خزاں تونے

مصیبت کیا پڑی تجھ پر کہ گویا دست و پا ٹوٹے
دکھائی اپنی کمزوری بوقتِ امتحاں تونے

ابھرنے کی کوئی صورت نہیں بحرِ معاصی سے
ڈبو یا لاکے مجھ کو اے غرور دشمن کہاں تونے

یہی ہوگا کہ آلودہ کرے گا خاکِ اقدس کو
اگر پیدا کیا شوقِ سجودِ آستاں تونے

مجھے تو خود نظر آتا ہے تو اک خاک کا تودہ
گرائی کس پہ برقِ نالۂ آذر فشاں تونے

تری فریاد نے کھینچا دلِ شیخ و برہمن کو
طلسم تازہ باندھا وحشتِ جادو بیاں تونے

حدیثِ درد

از جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش اسسٹنٹ ایڈیٹر شباب اردو

جب سے دل حسرت نوازِ ہوش ہے
سرگراں جانی سے بارِ دوش ہے

آرزو میں موت کی مرتا ہوں میں
زندگی میری فنا آغوش ہے

منتظر ہے کس کی اے بادِ خزاں
میری شمعِ آرزو گل پوش ہے

رنگِ رخ تفسیرِ حرفِ مدعا
جنبشِ لب معنیٔ خاموش ہے

اشکِ گلگوں شمعِ افروزِ حیات
دردِ غم طاعت ربائے ہوش ہے

دیدۂ پُر شوق کیسا انتظار
حسرتِ فردا تو محوِ دوش ہے

دے رہی ہے موت تسکینِ وصال
دردِ دل درماں سے ہم آغوش ہے

ہوگئی پیشِ نظر دنیائے یاس
یہ تماشائے وداعِ ہوش ہے

شورشِ نظارہ ہے آتش فشاں
ذرہ ذرہ طور در آغوش ہے

نقشِ حیرت ہوگیا طرزِ جنوں
سازِ وحشت نغمۂ خاموش ہے

اے تپش سرشار ہیں مستانِ عشق
ہر طرف گلبانگ نوشا نوش ہے

(تپش)

اضطرابِ شوق

از جناب محمد محمود صاحب مخمور اکبرآبادی

کاش مل سکتی کسی صورت وہ لذت آج ہی
شوق میں اتنی جوانی جسکے مشکل سے کٹی

یعنی وہ جس کے لئے اک عمر سے بیتاب ہوں
اضطرابِ شوقِ گوناگوں میں جوں سیماب ہوں

جب مری پہلی نظر اسکی نگاہوں سے ملے
دو تمناؤں میں جس دم ایک سا ہیجان پڑے

میں وفورِ شوق میں یکسر پذیرائی بنوں
اس حجابِ خلوت آرا کا تماشائی رہوں

خدنگ رزمی

ابوالہدیٰ مولانا سعید رزمی بھوپالی

رکھا کیا تھا اگر بجلی گری بھی میرے خرمن پر
مزا جب تھا کہ گرتی خانۂ آباد دشمن پر

کہوں کیا گریۂ پیہم کی میں نیرنگیاں ظالم
سرشکِ خونِ دل سے اک چمن پھولا ہے دامن پر

نہ ہوگا کوئی مجھ سا بھی شہیدِ رنجِ ناکامی
تمنا آجتک روتی ہے بیٹھی میرے مدفن پر

دلِ مجبور ضبطِ شوق کر یہ کیا تماشا ہے
کہیں رازِ محبّت کھُل نہ جائے حسنِ بدظن پر

نہ چھوڑا ایک بھی دستِ جنوں نے تارِ پیراہن
غبارِ وحشتِ دل خوب نکلا جیب و دامن پہ

نہ دیکھا جائیگا مجھ سے یہ جورِ باغباں ہرگز
الٰہی گر پڑے بجلی کہیں پہلے نشیمن پر

ہؤا کیا پھر کوئی مرغِ چمن نذرِ قفس رزمی
اُداسی کیوں یہ چھائی ہے در و دیوارِ گلشن پر

رشحاتِ مومن

از جناب شرف الدین صاحب مومن ٹونکی

مژے کی نوک جھوک اب مجھسے تجھسے چارہ جو ہوگی
مجھے ذوقِ جراحت ہے تجھے فکرِ رفو ہوگی

نہ یہ جوشِ ہوس ہوگا نہ یہ بزمِ عدو ہوگی
اب آنکھیں بند ہونگی اور تجھ سے گفتگو ہوگی

یہ پوری تجھ سے کیا اک آرزو لے آرزو ہوگی
کہ دم نکلیگا جب اسوقت دم کے ساتھ تو ہوگی

جب از خود رفتگی ہوگی کسی کی جستجو ہوگی
اگر یوں جستجو ہوگی تو منزل روبرو ہوگی

اٹھا پردہ خودی کا اب وہ صورت روبرو ہوگی
نہ آئیں ہوش تنہائی میں اس سے گفتگو ہوگی

ترے جور و جفا پر آتے آتے صبر آئے گا
ابھی خوگر نہیں ہوں ہوتے ہوتے اسکی خو ہوگی

یہ وہ دولت نہیں جس پر نہ آئے رشک عالم کو
ہوئے تم دوست اب ساری خدائی ہی عدو ہوگی

نگاہیں ہی محبت میں زباں کا کام دیتی ہیں
اشاروں ہی اشاروں میں اب اس سے گفتگو ہوگی

پڑھے گی پھر نمازِ قتل اس کی تیغ مقتل میں
ہمارے خون سے پہلے ادا شرطِ وضو ہوگی

بھلا میں اور شکوہ دوست کا پھر وہ بھی غیروں سے
یہ میری تو نہیں عادت تمہاری ہی یہ خو ہوگی

تمنا کیا ہے طوفاں خیز اک قطرہ لہو کا تھا
وہی کمبخت پھر گھٹ گھٹ کے اب دل میں لہو ہوگی

نگاہِ نازِ جاناں حشر کا کیا حشر ہونا ہے
خدائی ہی ادھر پھر جائیگی جس سمت تو ہوگی

رہے نظارہ یارب تا ابد صبح قیامت کا
بھلا اکدن میں کیونکر سیرِ چشمِ آرزو ہوگی

یہی معجز بیانی ہے تو مومن دیکھنا اک دن
زبانِ ٹونک بھی رشکِ زبانِ لکھنؤ ہوگی

حسیاتِ شوق

از جناب راجہ غضنفر علی صاحب شوق - بی۔ اے

جب سے اس کافر ادا کا قُرب حاصل ہوگیا
میں یہی سمجھا کہ میں جنت میں داخل ہوگیا

آپ پر کُھل جائیگا سب میری محویت کا راز
آئینہ جب آپ کے مدِ مقابل ہوگیا

تجھ سے وابستہ تھیں اپنی ساری بزم آرائیاں
تو نہ آیا تو پریشاں رنگِ محفل ہوگیا

کھینچ ہی لایا نہ آخر کو ہمارا جذب دل
اب تو دعوائے غرورِ حسن باطل ہوگیا

وادیٔ الفت کی کیونکر طے ہوں یارب منزلیں
خضر ہی جب راہزنِ سامانِ منزل ہوگیا

وادیٔ الفت کے ہر ذرے میں ہے لیلیٰ نہاں
قیس دیوانہ تھا جو شیدائے محمل ہوگیا

انتہائے عشق کی وہ منزلیں بھی یاد ہیں
جب تمہاری یاد سے بھی شوق غافل ہوگیا

پتھری کے مریض کے لئے

خدایا عشقِ بُت میں اسقدر سختی اُٹھائی ہے
کہ پہلو میں ہے اِک پتھر دلِ رنجور کے بدلے

بُت کے عشق میں پتھری کا ہو جانا کچھ بعید نہیں۔ بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ پتھری بڑا سخت مرض ہے +

اٹھا کر آئینہ کیوں سامنے سے رکھ دیا تم نے
ذرا دو چار چونچیں تو سہو تدِ مقابل کی